March 1995 • Issue 220 • Rs. 7

سوچ کر بولنے کا نام بولنا ہے، اور
منصوبہ کے تحت عمل کرنے کا نام عمل کرنا۔
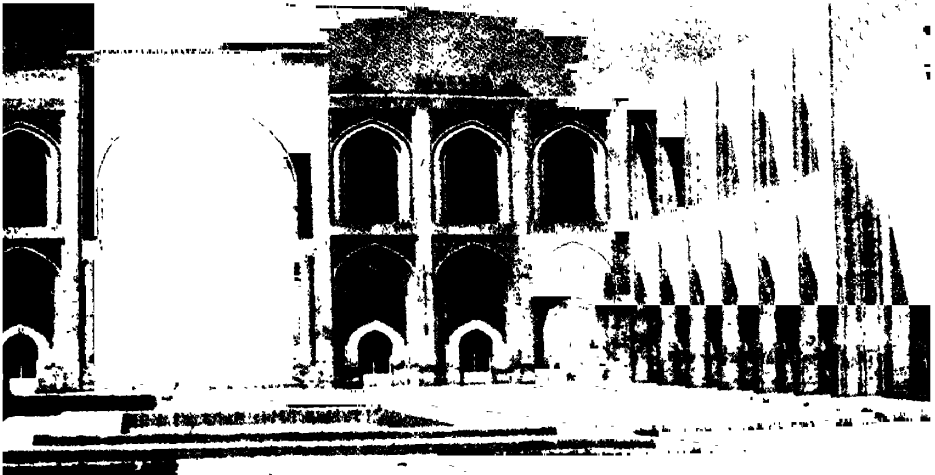
WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. njunctions about honour and respect enjoined for one sex are njoined equally for the other sex. So far as rights in this world nd rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference ›etween the sexes. In the organization of daily living, both are qual participants and partners. Yet Islam sees man as man and voman as woman and, considering the natural differences, it dvocates the principle of the division of labour between the two exes rather than the equality of labour.

Price Rs. 85
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
The Islamic Centre
(Publications Division)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110 002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مارچ ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۰

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 □ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

SV02 # امتیازی صفت

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ اس لئے اس کے اندر یہ امتیازی صفت پائی جاتی ہے کہ وہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ عقل غور وفکر یا علمی ترقی کا کوئی بھی درجہ ایسا نہیں جہاں اسلام میں اور عقل میں ٹکراؤ پیش آجائے اور انسان کے سامنے یہ مسئلہ پیدا ہو جائے کہ اگر وہ مذہب کو لیتا ہے تو اس کو علم اور عقل کے تقاضوں کو پہلے چھوڑنا پڑے گا۔

جارج برنارڈ شا نے اسلام کی اس صفت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب اسلامی اصلاح کی تحریک اٹھی تو اس کے پیرؤوں کو یہ زبردست موقع ملا کہ ان کا مذہب دنیا میں واحد قائم شدہ مذہب تھا جس کے عقائد کو کوئی بھی ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی تسلیم کر سکتا تھا:

When the Mahomedan reformation took place, it left its followers with the enormous advantage of having the only established religion in the world, in whose articles of faith, any intelligent and educated person could believe.

اسلام کی اسی خاص صفت کا یہ نتیجہ ہے کہ سائنسی دور سے پہلے کے زمانہ میں بھی لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوتے رہے اور آج سائنسی دور میں بھی ساری دنیا میں لوگ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ ذہن کے لئے اسلام کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہاں وہ اس مشکل سوال سے دوچار نہیں ہوتا کہ اسلام کو لے تو علم وعقل کو چھوڑنا پڑے گا اور علم وعقل کو لے تو اسلام کو چھوڑنا ضروری ہو جائے گا۔ اِلّا یہ کہ مصنوعی طور پر وہ اپنے ذہن کے دو خانے بنا لے۔ ایک میں اپنے دین کو رکھے اور دوسرے میں اپنے علم کو۔

جارج برنارڈ شا نے جس چیز کو دور اول کے اہل اسلام کے لئے عظیم موقع (enormous advantage) کہا ہے وہ موقع آج کے اہل اسلام کے لئے بھی پوری طرح موجود ہے۔ تاہم وہ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی راہ میں واحد رکاوٹ وہ قومی نفرت ہے جو داعی اور مدعو کے درمیان غلط طور پر قائم ہو گئی ہے۔ اس رکاوٹ کو اگر دور کر دیا جائے تو دوبارہ اسلام ایک عظیم سیلاب کی مانند انسانی آبادیوں میں داخل ہو جائے گا۔

محنت کی روزی

صحیح البخاری، کتاب البیوع (باب کسبِ الرجلِ وعملہ بیدہ) کے تحت چند حدیثیں منقول ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے جس کو امام بخاری نے مِقدام رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے درج کیا ہے :

ما اکل احد طعاماً قطّ خیراً من ان یأکل من عمل یدہ وَاِنّ نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل مِن عَملِ یَدہٖ	کسی آدمی نے کبھی اس سے اچھا کھانا نہیں کھایا کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھائے۔ اور اللہ کے رسول داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

"ہاتھ کی کمائی" سے مراد اپنی محنت کی کمائی ہے۔ اور محنت کی کمائی بلاشبہ تمام کمائیوں میں سب سے اچھی کمائی ہے۔ محنت کی کمائی اور بے محنت کی کمائی میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ اس کو انسانی زبان میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

بے محنت کمائی کیا ہے۔ مثلاً آپ کے والد آپ کے لئے بہت سی عمارتیں چھوڑ گئے ہیں جن کے کرایہ پر آپ آرام سے رہ رہے ہیں۔ بنک میں آپ کی کوئی بڑی رقم جمع ہے جس کا انٹرسٹ ہی آپ کے ماہانہ خرچ کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ آپ کو اتفاق سے کوئی ایسی گدی مل گئی ہے جس میں چندے، ہدیے اور تحفے تحائف آتے رہتے ہیں اور لوگ خود آکر آپ کو نذرانہ پیش کرتے رہتے۔ پٹرو ڈالر کا کوئی دہانہ آپ کو مل گیا ہے اور صرف کچھ خوبصورت الفاظ بول کر آپ بڑی بڑی رقمیں حاصل کر لیتے ہیں۔

اس قسم کی تمام کمائی بے محنت کی کمائی ہے۔ ایسی کمائی آدمی کے بدن کو تو موٹا کرتی ہے مگر اس کی روح کے لئے وہ قاتل ہے۔ ایسی ہر کمائی آدمی کی شخصیت کے ارتقاء کے لئے مستقل رکاوٹ ہے۔ ایسے آدمی میں اور خوبصورت حیوان میں کوئی فرق نہیں۔

محنت کی کمائی وہ ہے جس کے لئے آپ کو خود سوچنا پڑے۔ جس میں نفع کے ساتھ گھاٹے کا بھی اندیشہ ہو۔ جس کا حصول تمام تر آپ کی ذاتی جدوجہد پر منحصر ہو۔

ایک ہے دوسرے کی کمائی پر جینا۔ دوسرا ہے خود اپنی کمائی پر جینا۔ حدیث میں دوسرے کی کمائی پر جینے کو کمتر ذریعہ بتایا گیا ہے۔ زیادہ بہتر اور اعلیٰ ذریعہ یہ ہے کہ آدمی خود اپنی محنت کی کمائی پر جئے۔

زکوٰۃ وصدقات

جب ایک آدمی زکوٰۃ اور صدقہ کے تحت کسی کو کچھ دیتا ہے تو بظاہر وہ کسی غیر کو دے رہا ہوتا ہے ۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کا رخ خود دینے والے کی طرف ہوتا ہے ۔ دوسرے کو دے کر آدمی خود اپنی پاکی کا اہتمام کرتا ہے ۔

ایسا کرکے آدمی اپنے دل سے مال کی محبت کو نکالتا ہے ۔ وہ اس یقین کو تازہ کرتا ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ خدا کی امانت ہے نہ کہ اس کی ذاتی ملکیت ۔ اس طرح وہ اپنے اندر اس احساس کو جگاتا ہے کہ اس کے اوپر دوسروں کا حق ہے ۔

زکوٰۃ یا صدقہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی انسان کو دے مگر وہ اس کا بدلہ خدا سے پانے کی امید رکھے ۔ وہ یک طرفہ طور پر دوسرے انسانوں کا خیر خواہ اور مددگار بنے ۔ وہ اپنی زندگی میں ایسے لوگوں تک کا حق سمجھے جن سے اسے کچھ پانے کی امید نہ ہو ۔

زکوٰۃ دینا گویا کہ دوسروں کے لیے نفع بخش بننا ہے ۔ اس طرح زکوٰۃ آدمی کے لیے اس یاد دہانی کا ذریعہ ہے کہ تم کو اس دنیا میں مانگنے والا نہیں بننا ہے بلکہ دینے والا بننا ہے ۔ تم کو اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہے ۔ تمہیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ تمہارا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہے ، وہ کبھی نیچے نہ ہونے پائے ۔

زکوٰۃ گویا ایک قسم کی عملی دعا ہے ۔ زکوٰۃ دینے والا اس لیے دیتا ہے تاکہ وہ خدا سے پائے ۔ وہ اس لیے دوسروں کے کام آتا ہے تاکہ خدا اس کے کام بنادے ۔ وہ اس لیے یک طرفہ طور پر مدد پہنچاتا ہے تاکہ خدا بھی اس کو یک طرفہ طور پر اپنی رحمت اور بخشش کے سایہ میں لے لے ۔

اس دنیا میں بظاہر ایک آدمی بے مال ہے اور دوسرا آدمی صاحب مال ۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی محتاج ہے ۔ کیوں کہ کسی کا مال بھی ذاتی مال نہیں ۔ ہر آدمی کا مال خدا کا عطیہ ہے ۔ مال والا ایک آدمی جب کسی بے مال والے کو کچھ دیتا ہے تو اس عمل کے ذریعہ وہ خود اپنی ہی حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے ۔ وہ گویا زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ میں بھی وہی ہوں جو تم ہو ۔ اگر خدا چاہے تو کل کے دن وہ میرا حال تمہارے جیسا کر دے اور تمہارا حال میرے جیسا ۔

دو قسم کے آدمی

ایک آدمی وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ کرے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو زیادہ بولے اور کم کرے۔ پہلی قسم کا آدمی ہی آدمی ہے، دوسری قسم کا انسان آدمی کے بھیس میں غیر آدمی ہے۔

ہندستان میں ایمرجنسی (۷۷-۱۹۷۵) کے زمانہ میں فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ تھے۔ ان کے پاس یوپی کا ایک مسلمان آیا۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی کو پولیس نے میسا کے قانون کے تحت گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا ہے، حالاں کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔ فخر الدین علی احمد نے بھائی کا نام و پتہ لکھ کر مذکورہ مسلمان کو رخصت کر دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ فخر الدین صاحب نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مگر جب وہ ٹرین سے سفر کر کے اپنے گھر پہنچے تو ان کے بھائی رہا ہو کر گھر واپس آچکے تھے۔

قصہ یہ تھا کہ مذکورہ مسلمان کو رخصت کرنے کے بعد فخر الدین علی احمد صاحب نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ فلاں ضلع کے کلکٹر کو ٹیلیفون کرو اور اس سے کہو کہ اِس نام کے ایک صاحب آپ کے یہاں جیل میں ہیں۔ صدر صاحب نے ان کی خیریت پوچھی ہے۔ کلکٹر نے جب یہ سنا تو وہ ڈر گیا۔ وہ سمجھا کہ جس آدمی کو اس نے جیل میں بند کر رکھا ہے، وہ کوئی اہم شخصیت ہے، اسی لئے تو صدر صاحب اس کی خیریت پوچھ رہے ہیں۔ چنانچہ فوراً ان کو جیل سے رہا کر دیا۔

دہلی کے ایک صاحب مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ انگریزی اخباروں میں میرے تعلقات ہیں۔ میں مسلم نوجوانوں کو انگریزی اخبارات میں جگہ دلا سکتا ہوں۔ مگر مسلمانوں میں شوق ہی نہیں۔ اس کے بعد میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ انھوں نے انگریزی سے ایم اے کیا تھا اور محنتی بھی تھے۔ میں نے ان کو مذکورہ صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے نوجوان کو مکتوب الیہ کا نام درج کئے بغیر ایک خط لکھ کر دیا جس کا مضمون یہ تھا: "میں اِن سے براہ راست واقف نہیں۔ آپ ان کا ٹسٹ لے لیں اور اپنے ٹسٹ میں جیسا پائیں اس کے مطابق ان سے معاملہ کریں۔" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نوجوان نے اس خط کو استعمال نہیں کیا۔

زندگی میں کرنے کی اہمیت ہے نہ کہ بولنے کی۔ کم بولنا اور زیادہ کرنا، آدمی کو باقیمت بناتا ہے۔ اس کے برعکس زیادہ بولنا اور کم کرنا آدمی کو بے قیمت بنا دیتا ہے۔ بندوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں بھی

صحیح طریقہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ سلطنت دسویں صدی قبل مسیح ہے۔ انھوں نے یمن کی حکمراں ملکۂ سبا کے نام یہ خط بھیجا کہ تم لوگ میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور بلا مقابلہ میری اطاعت قبول کر لو۔ ملکہ نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے عدم اطاعت اور ٹکراؤ کا مشورہ دیا۔ اس پر ملکۂ سبا نے کہا: بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں۔ اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور یہی یہ لوگ کریں گے (النمل ۳۱-۳۴) اس کے بعد ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان کی اطاعت قبول کر لی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمراں سے ٹکراؤ کا نتیجہ اگر فساد اور تباہی کی صورت میں نکلنے والا ہو تو ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اس سے مصالحت کر لینا چاہئے۔ جو اقدام الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (counter-productive) ہو اس سے احتراز کرنا عقل کا تقاضا بھی ہے اور اسلام کا تقاضا بھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی عدم احتیاط کی بنیاد پر بالفعل ٹکراؤ میں مبتلا ہو جائے اور اس کا نقصان اس کے حصہ میں آنے لگے۔ ایسے لوگوں کے لئے قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ وہ تضرع کا طریقہ اختیار کریں (الانعام ۴۳)۔ یعنی وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ وہ اللہ سے رہنمائی اور مدد کے طالب بن جائیں۔

یہ ایمان اور عقل کے اعتبار سے دوسرا مطلوب طریقہ ہے۔ یہ غلطی کے بعد ندامت کی روش اختیار کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا ثبوت دے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ ایسا کریں کہ وہ بھڑک کر اہل اقتدار سے لڑ جائیں اور جب قانون الٰہی کے مطابق، ہلاکت اور نقصان سے دوچار ہوں تو یہ اعلان کرنا شروع کر دیں کہ ان کے خلاف ظلم ہو رہا ہے۔ ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ وغیرہ۔ ایسے لوگ بلاشبہ اللہ کے راستہ سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں اور عقل کے راستہ سے بھی بہت دور ہیں۔

اقدام کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار نتیجہ ہے نہ کہ کوئی خودساختہ نظریہ۔

تکرار کی حکمت

قرآن میں ہے کہ اے مومنو، اللہ کا ذکر کثیر کرو (الاحزاب ۴۱) حدیث میں ان لوگوں کی فضیلت آئی ہے جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں (مشکاۃ المصابیح ۲/۶۹۸) بہت سے الفاظ یا کلمات کے بارہ میں عدد کی صراحت کے ساتھ اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قال سبحان اللہ وبحمدہ فی یوم مائۃ مرۃ حطت خطایاہ وان کانت مثل زبد البحر (متفق علیہ)

جو شخص دن میں سو بار کہے کہ سبحان اللہ وبحمدہ تو اس کی سب خطائیں مٹ جائیں گی خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

الفاظ یا کلمات کی اس تکرار میں اصل اہمیت تکرار کی نہیں بلکہ نتیجۂ تکرار کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سات یا دس یا سو کی گنتی میں کوئی پر اسرار خاصیت چھپی ہوئی ہے۔ اور اگر اس مقرر عدد کے ساتھ اس کو دہرا دیجئے تو محض عدد پورا ہونے کی بنا پر وہ عظیم ثواب کا باعث بن جائے گا۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ کسی خاص کلمہ کو بار بار کہنے سے اس کے موافق کیفیت ابھرے گی۔ یہ کیفیت آدمی کے اندر روحانیت اور ربانیت پیدا کرے گی۔ پھر اس حالت میں وہ جو دعا یا عبادت کرے گا وہ اتنی خالص ہوگی کہ فرشتے اس کو لینے کے لئے دوڑیں گے۔ ایسا عمل اپنی کیفی خصوصیات کی بنا پر سیدھے خدا تک پہنچ جائے گا اور مقبول بارگاہ ہوگا۔

جب آدمی دیر تک قرآن کی تلاوت کرے۔ وہ کثرت سے حمد و تسبیح کے کلمات کو اپنی زبان سے دہرائے۔ وہ فرض نمازوں کے علاوہ مزید سنت و نوافل میں مشغول ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے گرد ایک روحانی ماحول بنتا ہے۔ اس کا ذہن دینی رخ پر یکسو ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر ربانی کیفیات ابھر آتی ہیں۔ یہی کیفیت یا روحانیت دین کا اصل مطلوب ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ جو زندگی گزرے وہی سچے مومن کی زندگی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ابدی جنتوں میں داخل کیا جائے۔

یہ فائدہ تکرار کے کیفی نتیجہ کا ہے نہ کہ مجرد تکرار الفاظ کا۔

انسانی المیہ

ابا ایبان فروری ۱۹۱۵ میں پیدا ہوا۔ وہ ایک صہیونی لیڈر ہے۔ تاہم اس کا ایک قول زندگی کی ایک حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ افراد اور قومیں کوئی سنجیدہ کام صرف اس وقت کرتے ہیں جب کہ دوسرے انتخابات کو انھوں نے کھو دیا ہو:

Men and nations do the sensible thing only after they have exhausted the other options.
Abba Eban, *Liberty's Nation.*

کہنے والے نے یہ بات دنیا کے بارہ میں کہی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی شخص ہو یا کوئی گروہ وہ اس وقت تک سنجیدگی اور معقولیت کو اختیار کرنے پر راضی نہیں ہوتا جب تک اس کے لئے غیر سنجیدہ اور غیر معقول رویہ اختیار کرنے کا موقع سرے سے چھن گیا ہو۔

دنیا میں ہر طرف انفرادی اور اجتماعی سطح پر ظلم، دھاندلی، بے انصافی، بددیانتی اور جھوٹ کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کو اپنے حالات کے اعتبار سے ایسا کرنے کا موقع حاصل ہے۔ کوئی شخص یا گروہ اس سے اسی وقت دست بردار ہوتا ہے جب کہ اس قسم کی روش کا موقع اس کے لئے باقی نہ رہے۔

یہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر قیامت کے دن پیش آئے گا۔ دنیا میں امتحان کی بنا پر ہر شخص کو آزادی ہے۔ اس لئے اس کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ چاہے تو حق کا انکار کر دے۔ وہ چاہے تو حق کو اس طرح نظر انداز کر دے گویا کہ اس کا وجود ہی نہیں۔ مگر قیامت کے دن یہ موقع آخری حد تک ختم ہو جائے گا۔

لوگ اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب کہ انھیں مجبورانہ اعتراف کرنا پڑے، حالانکہ مجبورانہ اعتراف کا کوئی فائدہ نہیں۔ لوگ اس آنے والے دن کے منتظر ہیں جب کہ انھیں حق کی ادائگی پر مجبور کر دیا جائے، حالاں کہ مجبورانہ ادائگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ لوگ اس دن کے منتظر ہیں جب کہ ان کے لئے انصاف کے سوا کوئی اور چارہ باقی نہ رہے۔ مگر مجبورانہ انصاف ذلت کا ایک واقعہ ہے نہ کہ عزت کا واقعہ۔ یہ ایک ایسا انسانی المیہ ہے جس سے بڑا المیہ اور کوئی نہیں۔

غیر فطری عقیدہ

موجودہ مسیحیت کا ایک بنیادی عقیدہ کفارہ (Atonement) ہے۔ یعنی آدم کے ممنوعہ پھل کھانے کے بعد نہ صرف آدم بلکہ تمام انسان پیدائشی گنہ گار ہو گئے۔ نسل آدم کو اس پیدائشی گنہ گاری سے بچانے کے لئے خدا نے اپنا اکلوتا بیٹا زمین پر بھیجا تاکہ وہ مصلوب ہو کر نسل انسانی کے گناہ کا کفارہ بن جائے۔

یہ عقیدہ عقلی اعتبار سے ناقابل فہم ہے اور علمی اعتبار سے بھی وہ بالکل لغو ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس کے علمی پہلو کے بارہ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ اگر نسل انسانی کو پیدائشی گنہ گاری سے بچانے کے لئے خدا کی اسکیم یہی تھی کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیج کر مصلوب کرائے۔ تو خدا کو یہ کام بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔

مسیحی عقیدہ کے مطابق، مسیح کی مصلوبیت کے مذکورہ عقیدہ کو ماننے کے بعد ہی آدمی پیدائشی گنہ گاری سے نجات پاتا ہے۔ جو اس پر ایمان نہ لائے اس کے لئے جہنم کی آگ ہے۔ ایسی حالت میں خدا نے نعوذ باللہ ان کروڑوں انسانوں پر بہت بڑا ظلم کیا جن کو اس نے مسیح سے پہلے پیدا کیا۔ مسیح کے بعد پیدا ہونے والے تو مسیح کی مصلوبیت پر ایمان لاکر نجات پاسکتے ہیں۔ مگر جو بے شمار لوگ مسیح سے پہلے پیدا ہوئے، وہ آخر کس جرم میں جہنم میں جائیں گے۔ جب کہ ان کے لئے یہ موقع ہی نہ تھا کہ وہ مسیح کو جانیں اور ان پر ایمان لاکر اپنی نجات کی تدبیر کریں۔

یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ اسلام کے خلاف اگر ضد اور عناد کی فضا ختم ہو جائے اور لوگوں کو معتدل ذہن کے ساتھ سوچنے کا موقع دیا جائے تو لوگوں کے لئے اسلام کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہے گا۔ داعی کے لئے یک طرفہ صبر کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے۔ داعی یک طرفہ صبر و اعراض کے ذریعہ داعی اور مدعو کے درمیان ضد اور عناد کی فضا کو ختم کرتا ہے، تاکہ قبول اسلام کی واحد رکاوٹ دور ہو اور مدعو کے لئے اسلام میں داخلہ کا راستہ آزادانہ طور پر کھل جائے۔

موت کا شعور

نباتات، حیوانات اور انسان، تینوں موت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہر درخت آخر کار اپنی سرسبزی کھو دیتا ہے۔ ہر جانور پر ایک وقت آتا ہے جب کہ وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک روز مر جاتا ہے۔ موت اس دنیا کا ایک عالمگیر قانون ہے۔ جس سے کوئی بھی ذی حیات مستثنیٰ نہیں۔

مگر دوسری ذی حیات اشیاء کے برعکس، یہ صرف انسان ہے جو یہ جانتا ہے کہ کسی بھی لمحہ اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر اس کو زندگی کی پوری متوقع مدت مل جائے تب بھی لازماً اس کا جسم تنزل کا شکار ہوگا اور مقرر وقت پر وہ مر جائے گا:

> Unlike other living creatures, he knows that his life may be cut short at any moment and that, even if he attains the full expectation of a human life, his growth is bound to be followed by eventual decay and, in due time, death. (18/411)

تمام ذی حیات اشیاء میں صرف انسان کے اندر موت کا تصور ہونا بے حد بامعنی ہے۔ یہ استثناء بتاتا ہے کہ موت کا معاملہ انسان کے لئے اس سے مختلف ہے جو دوسری ذی حیات اشیاء کے لئے ہے۔ دوسری ذی حیات اشیاء کے لئے موت ایک بے خبری کا واقعہ ہے اور انسان کے لئے مکمل طور پر باخبری کا واقعہ۔

انسانی موت کی یہ استثنائی نوعیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان کے لئے موت کے ساتھ شعور موت بھی درکار ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ موت کا وقت آنے سے پہلے موت کے بارہ میں سوچے، اور اس کا سامنا کرنے کے لئے پہلے سے تیاری کرے۔ دوسری ذی حیات اشیاء کے لئے موت سادہ طور پر خاتمۂ حیات کے ہم معنی تھی، اس لئے ان کو اس کا شعور دینے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر انسان کے لئے موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک نئے دور حیات کا آغاز ہے۔ اسی لئے ضروری ہوا کہ انسان کو پیشگی طور پر اس مرحلۂ حیات سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ وہ اس کے لئے ضروری تیاری کر سکے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ شعوری موت مرے نہ کہ جانوروں کی طرح محض بے شعوری کی موت۔

قیامت کی خبر

صحافت کی دنیا میں خبروں کے لئے دو اصطلاحیں رائج ہیں۔ کرنٹ اشو (current issue) اور دوسرے بریکنگ نیوز (breaking news) کرنٹ اشو سے مراد وہ موضوع ہے جو روزانہ چل رہا ہو۔ اور بریکنگ نیوز سے مراد وہ خبر ہے جو اچانک خلاف توقع پیش آجائے۔

ایک اخبار کل صبح کے لئے مرتب کیا جارہا ہے۔ تمام کرنٹ اشو اس نے اپنے صفحات میں لے لئے ہیں۔ اخبار ترتیب کے آخری مرحلہ سے گزر کر اب چھپنے کے لئے پریس میں بھیجا جانے والا ہے۔ اس وقت اچانک یہ خبر آتی ہے کہ وزیر اعظم کو قتل کر دیا گیا۔ یہ ایک بریکنگ نیوز ہے۔ اس کے علم میں آتے ہی اخبار کے صفحہ اول کا نقشہ بدل دیا جائے گا۔ اب دوسری خبروں کو پیچھے ڈال دیا جائے گا یا ان کو حذف کر دیا جائے گا۔ اور وزیر اعظم کے قتل کو پہلی خبر کے طور پر صفحہ اول پر نمایاں کر کے شائع کیا جائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا بھی ہے۔ انسان اس دنیا میں اپنے روزمرہ کے مشاغل میں مبتلا ہے۔ انسان کی کچھ معلوم ضرورتیں ہیں یا اس کی کچھ خواہشیں ہیں جن میں وہ صبح وشام مشغول رہتا ہے۔ گویا ہر آدمی "کرنٹ اشوز" کے تحت اپنا اخبار نکال رہا ہے۔

مگر یہ صورت حال ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والی نہیں۔ یہاں بھی ایک بریکنگ نیوز آنے والی ہے۔ یہ قیامت کی آمد ہے۔ اسرافیل کا صور اس کی آمد کی خبر دے گا۔ اور پھر زندگی کا سارا چلتا ہوا نقشہ بدل جائے گا۔ اس وقت آدمی تمام دوسری باتوں کو بھول جائے گا۔ تمام دوسری مشغولیتیں اچانک اس سے چھوٹ جائیں گی۔ اس وقت قیامت کی بریکنگ نیوز ہی اس کے اخبار حیات کی اہم ترین خبر بن جائے گی۔ اسی لئے قرآن میں اس خبر کو النبأ العظیم کہا گیا ہے۔

لوگ وقتی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، مستقل مسئلہ پر دھیان لگانے کی کسی کو فرصت نہیں۔ مگر جب پردہ ہٹے گا اور حقیقت سامنے آجائے گی تو لوگ اچانک دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ لوگ محسوس کریں گے کہ ہم تو نان اشو میں مصروف تھے، اور اصل اشو سے بالکل بے خبر رہے۔ کیسی عجیب محرومی ہے جس کی طرف تمام انسان چلے جارہے ہیں۔

۱۳ الرسالہ مارچ ۱۹۶۵

رمضان کا روزہ

رمضان کے روزہ کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ روزہ تمہارے اوپر اس لئے فرض کیا گیا ہے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو (لعلکم تتقون ، البقرۃ ۱۸۳)

تقویٰ کا مطلب بچنا ہے۔ ایک خاردار راستہ ہو اور آپ اس سے بچتے ہوئے گزریں تو یہ تقویٰ ہوگا۔ مومن کو دنیا میں اسی طرح بری چیزوں سے بچتے ہوئے اپنا سفرِ حیات طے کرنا ہے۔ اسی پرہیزگارانہ روش کا نام تقویٰ ہے، اور رمضان کا مہینہ اسی تقویٰ کی ماہانہ تربیت کا مہینہ ہے۔

روزہ میں کھانا اور پانی چھوڑنا ایک علامتی ترک ہے۔ اصل میں جو چیز ترک کرنا ہے وہ تو خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔ غیر ممنوعات کا وقتی ترک اسی ممنوعات کے مستقل ترک کی مشق ہے۔ کیوں کہ جو آدمی اللہ کے لئے غیر ممنوع کو چھوڑنے پر راضی ہوجائے وہ ممنوع کو بدرجۂ اولیٰ چھوڑنے پر راضی ہوجائے گا۔

اس دنیا میں آدمی کا جو امتحان ہے وہ یہی ہے کہ وہ حرام اور حلال میں فرق کرے۔ وہ حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والا بنے۔ وہ آزاد زندگی کے بجائے پابند زندگی گزارے۔ اسی ذمہ دارانہ زندگی کی تربیت کے لئے روزہ کا طریقہ اہل ایمان کے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

روزہ محض اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ اپنی حقیقی اسپرٹ کے اعتبار سے مطلوب ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جس آدمی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پانی چھوڑ دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے ایسا کیا کہ انھوں نے کھانے پینے کا روزہ رکھا۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے غیبت کا فعل کیا جو اسلام میں حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ انھوں نے اللہ کی جائز کی ہوئی چیز سے روزہ رکھا، اور پھر اللہ کی ناجائز کی ہوئی چیز سے افطار کرلیا۔

متقیانہ زندگی کو دوسرے لفظوں میں محتاط زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو

احتیاط کے تصور سے خالی ہو۔ وہ بلاقید جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو احتیاط کے طریقہ کو اختیار کئے ہوئے ہو۔ وہ ایک محکم اصول کے تحت کسی روش کو اختیار کرے، اور کسی دوسری روش کو اختیار نہ کرے۔ یہی معاملہ متقی انسان کا ہے۔ متقی انسان مکمل طور پر ایک محتاط انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے قول وعمل کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔

روزہ آدمی کے اندر تقویٰ اور احتیاط کا یہی مزاج پیدا کرتا ہے۔ رمضان کی ماہانہ تربیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ پورے سال تک اس طرح زندگی گزارے کہ وہ مباحات کے لئے مُضطر ہو، اور ممنوعات کے لئے وہ صائم بن جائے۔

روزہ کے دوران آدمی کا صرف کھانا پینا نہیں چھوٹتا۔ اس کو اپنی بہت سی عادتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں پر روک لگاتا ہے۔ اس طرح وہ اس بات کی تربیت حاصل کرتا ہے کہ وہ کچھ چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ وہ کچھ چیزوں سے بچ کر دنیا میں زندگی گزارے روزہ اس پرہیزگاری کی انتہائی تربیت ہے۔ روزہ رکھ کر آدمی یہ عہد کرتا ہے کہ ناجائز چیزیں تو درکنار، اگر اللہ کی مرضی ہو تو وہ جائز چیزوں کو بھی اللہ کی خاطر چھوڑ دینے کے لئے تیار ہے۔

رمضان کا مہینہ قمری کیلنڈر کا نواں مہینہ ہے۔ اس مہینہ کو اسلام میں روزہ کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ رمضان کے مہینے کا روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ اور اس کی بہت فضیلت بتائی گئی ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے ہر نیک عمل کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر روزہ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا انعام دوں گا۔ بندہ میرے لئے اپنی خواہش کو اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی افطار کے وقت، اور دوسری خوشی اس وقت جب کہ وہ اپنے رب سے ملے گا۔ اور روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ اور روزہ ڈھال ہے۔ جب تم میں سے کسی شخص کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ گالی دے اور نہ شور کرے۔ اور اگر کوئی آدمی اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ کہہ دے: میں تو روزہ دار ہوں۔

رمضان کے مہینہ کو ایک حدیث میں صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا اتنا بڑا درجہ کیوں ہے کہ اس پر بے حساب اجر کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ صبر کی عبادت ہے۔ روزہ صبر کا عمل ہے۔ روزہ میں کھانا اور پینا چھوڑ کر آدمی علامتی طور پر یہ عہد کرتا ہے کہ دنیا میں وہ صبر کا طریقہ اختیار کرے گا۔ وہ ہر حال میں اللہ کے حکموں پر عمل کرے گا، خواہ اس کے لئے اسے صبر و برداشت کے مرحلہ سے گزرنا پڑے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے صبر کرنے والے بے حساب اجر پائیں گے (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب، الزمر ۱۰) یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام اعمال میں صبر کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ جس خدائی حکم کو انجام دینے کے لئے آدمی کو صبر کے مرحلہ سے گزرنا پڑے، وہ عمل اللہ کی نظر میں اتنا زیادہ محبوب ہو جاتا ہے کہ اس پر بے حساب انعام کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

روزہ کی خاص اہمیت اسی اعتبار سے ہے۔ روزہ دراصل صبر کی تربیت ہے۔ روزہ کی عبادت آدمی کو اس بات کے لئے تیار کرتی ہے کہ وہ اپنی خواہش کو دبا کر اللہ کے حکم پر عمل کرے۔ وہ اپنی ضرورتوں کو روک کر اللہ کی راہ میں چلے۔ وہ اپنے ذاتی تقاضوں کو نظر انداز کر کے اللہ کے دین کے تقاضے پورے کرے۔ روزہ چوں کہ صبر جیسی عظیم عبادت کی تربیت ہے، اس لئے روزہ کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

روزہ کے اسی خاص پہلو کی بنا پر حدیث میں فرمایا گیا کہ روزہ دار کو چاہئے کہ اگر کوئی آدمی اس کو برا کہے تو وہ خود بھی اس کو برا نہ کہنے لگے۔ بلکہ اس کے اندر یہ احساس جاگنا چاہئے کہ میں تو روزہ رکھے ہوئے ہوں۔ میں نے تو اپنے آپ کو صبر اور برداشت کے تربیتی کورس میں داخل کر رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں بے برداشت ہو کر جوابی کارروائی کروں تو گویا کہ میں نے اپنا روزہ توڑ دیا، میں نے روزہ کے اصل مقصد کو باطل کر دیا۔

روزہ کا بلاشبہ بہت بڑا ثواب ہے۔ مگر یہ بڑا ثواب اس شخص کے لئے ہے جس کا روزہ صبر کا روزہ بن جائے۔ جو روزے سے یہ سبق لے کہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے سب سے ناخوشگوار باتوں کو برداشت کرنا ہے۔ لوگوں کے کڑوے بول کا جواب مجھے میٹھے بول سے دینا ہے۔

لوگوں کی طرف سے اشتعال انگیزی کے واقعات ہوں تب بھی مجھے اپنے آپ کو مشتعل ہونے سے بچانا ہے۔ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو اللہ کے خانہ میں ڈالتے ہوئے مجھے ہر ایک کے ساتھ ہر حال میں اچھا سلوک کرنا ہے۔

خدا کے حکم کی ایک تعمیل وہ ہے جو معمول کے حالات میں کی جائے۔ اس کی دوسری تعمیل وہ ہے جو غیر معمولی حالات میں کی جائے۔ معمول کے حالات کے مقابلہ میں غیر معمولی حالات میں کیا ہوا عمل ہمیشہ زیادہ عظیم ہوتا ہے۔ صبر یہی عظیم عمل ہے، اور روزہ اسی عظیم عمل کے لئے ایک ماہانہ تربیتی کورس۔

گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو خدا کا دین پورا کا پورا صبر کا دین ہے۔ پورا قرآن صبر کی کتاب ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات میں کسی نہ کسی اعتبار سے صبر کا پہلو شامل ہے۔

موجودہ دنیا میں اسلامی زندگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ غیر اسلامی زندگی کو چھوڑے گا اور اسلامی اصولوں پر اپنی زندگی کو چلائے گا۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر معاملہ میں آدمی کے سامنے دو امکانات ہوتے ہیں۔ کوئی شخص جب دینی زندگی اختیار کرتا ہے تو وہ درحقیقت ایک روش کو چھوڑ کر دوسری روش کو اختیار کرتا ہے۔ یہ ایک کو چھوڑنا اور دوسرے کو پکڑنا صبر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ہر اسلامی عمل میں صبر کا پہلو لازمی طور پر شامل ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو شیطان کے راستہ سے ہٹ کر خدا کے راستہ پر چلنا ہے۔ اس کو نفس پرستی کی روش چھوڑ کر بے نفسی کی روش کو اختیار کرنا ہے۔ اس کو بے اصول زندگی کو ترک کرکے بااصول زندگی کو اپنانا ہے۔ اس کو بے قید طریقہ سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور پابند طریقہ پر قائم رہ کر زندگی گزارنا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں اس کو حرام کی ہوئی چیزوں سے دور رہنا ہے اور صرف حلال دائرہ میں لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔

ایک کو چھوڑنے اور دوسرے کو پکڑنے کے اس عمل کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔ روزہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر یہی صبر والی صفت پیدا کرتا ہے۔

نوٹ: یہ تقریر ۷ فروری ۱۹۹۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

عید الفطر

عید الفطر کا مطلب ہے افطار کی عید، کھانے پینے کی عید۔ اس کو عید الفطر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رمضان کے مہینہ کے فوراً بعد آتی ہے۔ رمضان کا مہینہ کھانے پینے پر پابندی لگانے کا مہینہ ہے۔ اور عید الفطر کا دن ان پابندیوں سے آزاد ہونے کا دن ہے۔

روزہ اور عید کے درمیان اس ترتیب کا ایک پہلو یہ ہے کہ بندہ نے رمضان میں ایک مہینہ تک اللہ کے حکم کی تعمیل کی، تو اب اللہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے اپنے انعام کے طور پر بندہ کو یہ موقع دیا کہ وہ پابندیوں سے آزاد ہو کر جو چاہے کھائے اور جو چاہے پئے۔ روزہ اگر اس کے لئے عمل کا مہینہ تھا تو عید الفطر اس کے لئے انعام کا دن ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھئے تو روزہ اور عید اس قانون فطرت کو بتا رہے ہیں جس کے مطابق موجودہ دنیا کا نظام بنایا گیا ہے۔ اس دنیا میں آسانی کے ساتھ مشقت جڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہر کامیابی سے پہلے محنت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ یہاں پہلے "بھوک" کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد آدمی کے لئے کھانے اور پینے کا دسترخوان لگایا جاتا ہے۔

روزہ اور عید انھیں دونوں حقیقتوں کی علامت ہیں۔ روزہ پہلے مرحلہ کی علامت ہے، اور عید دوسرے مرحلہ کی علامت۔ روزہ اور عید کا یہ نظام انسان کو یہ سبق دے رہا ہے کہ اس دنیا میں اگر تم خوشی اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس سے پہلے محنت اور مشقت کی وادیوں سے گزرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

رمضان کے مہینہ کا آخری روزہ جب ختم ہوتا ہے تو نئے مہینہ کا چاند ہلال کی صورت میں آسمان کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی خدا کے بندے یہ کہتے ہیں کہ اے خدا، اس چاند کو تو ہمارے لئے امن و امان کے ساتھ نکال، اس کو تو ہمارے لئے سلامتی اور اسلام کا چاند بنا دے۔

یہ اس بات کا سبق ہے کہ عید کا مہینہ امن و سلامتی کا مہینہ ہے۔ اس دن خدا کے بندوں کو یہ عہد کرنا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے خیر خواہ بن کر رہیں گے۔ وہ امن والے بول بولیں گے

اور سلامتی والے عمل کریں گے۔

عید کے دن تمام چھوٹے اور بڑے اپنے گھروں سے "اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے" کہتے ہوئے نکلتے ہیں۔ پھر وہ ایک جگہ جمع ہو کر دو رکعت اجتماعی نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا عہد ہے کہ وہ بڑائی کا درجہ صرف خدا کو دیں گے۔ اور خود اپنے لئے تواضع کی روش کو پسند کریں گے۔ وہ سرکشی کا طریقہ چھوڑ دیں گے، اللہ کے مقابلہ میں بھی اور بندوں کے مقابلہ میں بھی۔

عید کی نماز سے واپسی کے بعد لوگ آپس میں ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ یہ بھی ایک علامتی عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اسی طرح پورا سال گزارنا ہے۔ انھیں علاحدگی پسندی کا طریقہ چھوڑ دینا ہے اور سب کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنا ہے۔ کسی آدمی کو دوسروں کے لئے بوجھ نہیں بننا ہے۔ ہر آدمی کو یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ دوسروں کو دے۔ آدمی کو اس دنیا میں دینے والا بن کر رہنا ہے نہ کہ دوسروں سے لینے والا بن کر۔

عید کے دن یہ کام اس انتظار کے بغیر کیا جاتا ہے کہ دوسرا ہم سے ملنے کے لئے آئے تب ہم اس سے ملیں، یا دوسرا ہم کو تحفہ دے تو اس کے بعد ہم اسے تحفہ دیں۔ عید کے دن یہ سارے کام یکطرفہ جذبہ کے تحت کئے جاتے ہیں نہ کہ دو طرفہ جذبہ کے تحت۔

اس میں یہ سبق ہے کہ اس دنیا میں وہی شخص انسانیت اور اخلاق کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے جو یک طرفہ طور پر انسانیت اور اخلاق کا اصول اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسروں سے تعلق پیدا کرنا ہے، خواہ دوسرے اس کے ساتھ تعلق نہ پیدا کر رہے ہوں۔ یہاں آدمی کو اپنے پڑوسی سے محبت کرنا ہے، خواہ اس کا پڑوسی اس کے ساتھ محبت کا اظہار نہ کر رہا ہو۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے انسانوں کو دوست بنانا ہے، خواہ دوسرے انسان اس کے ساتھ دوستی کا معاملہ کرنے پر راضی نہ ہوں۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے انسانوں کے لئے نفع بخش بننا ہے خواہ دوسرے انسانوں سے اس کو نفع بخشی کا تجربہ نہ ہو رہا ہو۔

روزہ اور عید سال میں ایک بار آتے ہیں، مگر وہ پورے سال کے لئے ہماری زندگی کا کورس متعین کرتے ہیں۔ روزہ اور عید علامتی طور پر خدا کے بندوں کو یہ بتاتے ہیں کہ خدا

کی زمین پر انھیں کس طرح رہنا چاہئے۔ روزہ اگر آغازِ حیات کی علامت ہے تو عید انجامِ حیات کی علامت۔

روزہ رکھنے کے بعد لوگ عید کے انعام کے مستحق بنتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں تاکہ اس کے بعد وہ اپنے حقوق کو پاسکیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ پابندیوں کو نبھائیں تاکہ وہ انعامات کے مستحق ٹھہریں۔ ان کو چاہئے کہ وہ دوسروں کے خیر خواہ بنیں تاکہ دوسرے بھی ان کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ ان کو چاہئے کہ وہ سماج میں دینے والے بن کر رہیں تاکہ انھیں بھی سماج میں عزت کا مقام مل سکے۔ ان کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اور اپنے انسانی بھائیوں کے ساتھ یکطرفہ طور پر اچھا سلوک کریں۔ کیوں کہ جو لوگ اس طرح اچھا سلوک کریں۔ ان کے لئے ان کا دشمن بھی ان کا دوست بن جاتا ہے۔

روزہ اور عید کے درمیان ایک اور گہرا فرق پایا جاتا ہے۔ روزہ گویا نہ کرنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں کرنے کا دن۔ روزہ گویا رکنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں چلنے کا دن۔ روزہ گویا چپ رہنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں بولنے کا دن۔ روزہ گویا ٹھہرنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں اقدام کا دن۔

اس فرق میں یہ سبق ہے کہ زندگی میں دونوں ہی قسم کی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی میں کبھی کرنا ہوتا ہے اور کبھی نہ کرنا۔ کبھی چلنا ہوتا ہے اور کبھی ٹھہر جانا۔ کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی چپ ہو جانا۔ کبھی اقدام کرنا ہوتا ہے اور کبھی پیچھے رک جانا۔

روزہ اور عید دونوں ایک اعتبار سے عبادت ہیں اور دوسرے اعتبار سے تربیت۔ روزہ اور عید میں ایک طرف خدا کو راضی کرنے کے پہلو موجود ہیں۔ اور دوسری طرف ان کا عملی نقشہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ وسیع تر زندگی کے لئے تربیت کا کورس بن جائیں۔ وہ علامتی طور پر پورے سال کے لئے رہنمائے حیات کا کام دیں۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

نادر چیز

ٹامس کارلائل (Thomas Carlyle) نے کہا ہے کہ ایک اچھی لکھی ہوئی سوانح حیات اتنی ہی نادر ہے جتنا کہ ایک اچھی گزاری ہوئی زندگی :

A well-written life is almost as rare as a well-spent life.

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں نہ ایک معیاری زندگی گزارنا ممکن ہے اور نہ ایک معیاری سوانح حیات لکھنا۔ موجودہ محدود دنیا کے حالات اس میں مانع ہیں کہ کوئی شخص معیاری زندگی گزار سکے۔ اسی طرح موجودہ زبانوں کی وسعت اس سے بہت کم ہے کہ کوئی شخص معیاری انداز پر ایک سوانح حیات مرتب کر سکے۔

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ میں نے اپنی سوانح حیات لکھنے کی کوشش کی۔ مگر بار بار لکھنا شروع کیا اور بار بار قلم رک گیا۔ جب بھی میں نے اس کا کوئی باب یا اس کا کوئی صفحہ لکھا تو آخر میں مجھے محسوس ہوا کہ اصل بات تو اس میں لکھنے سے رہ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے الفاظ کسی واقعہ کو بیان کرنے کے لئے انتہائی حد تک ناکافی ہیں۔ وہ اتنے ناکافی ہیں کہ آدمی خود اپنے حالات زندگی بھی نہیں لکھ سکتا۔ وہ دوسروں کے بارہ میں کیا لکھے گا۔ یہ انسانی محدودیت کا بڑا عجیب ثبوت ہے۔

بعض لوگ ایک کتاب لکھتے ہیں اور اس پر ناز کرتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک قابل ذکر اور قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ :

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

مگر اس قسم کا ناز صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ کام کرنا تو درکنار، ابھی تک آدمی یہ بھی نہ جان سکا کہ کام ہے کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ آدمی اپنے عجز کو جان لے۔ اور یہی وہ کام ہے جس کو کرنا کوئی شخص نہیں جانتا۔

برخود غلط آدمی اپنے کمال کو جانتا ہے۔ مگر صاحب معرفت اپنے عجز کو جانتا ہے۔ کیوں کہ آدمی کے پاس عجز کے سوا کوئی اور سرمایہ نہیں۔

حکمت دین

ایک صاحب نے اپنے حج کا سفرنامہ لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۸ بار حج کیا ہے اور اسی کے ساتھ وہ ایک عالم بھی ہیں۔ سوال کرنے والے کا سوال یہ تھا: "یہ ایک عجیب بات ہے کہ حجر اسود جو محض ایک پتھر ہے اس کو تو لوگ چومنے کے لیے ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ اور جمرات بھی پتھر ہی کی شکل میں نصب ہیں مگر لوگ ان کو پتھر مارنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ ایک پتھر کو تو لوگ عقیدت سے چومتے ہیں، جب کہ دوسرے پتھر پر وہ پتھراؤ کرتے ہیں"

مذکورہ صاحب نے جواب دیا کہ اسلام اطاعت اور فرماں برداری کا نام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرنے کے لیے عقل اور دلیل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ صرف تسلیم و رضا کے جذبہ کے ساتھ اس پر عمل کرنا چاہیے۔ (البلاغ، جولائی ۱۹۹۳)

یہ جواب درست نہیں۔ اسلام بلاشبہ تعمیل حکم کا نام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ جس چیز کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے وہ سراپا حکمت پر مبنی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاہ ولی اللہ دہلوی کو حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اصل یہ ہے کہ یہ حجر میں فرق کا معاملہ نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حجر میں فرق کا معاملہ ہے۔ نہ محض پتھر کی وجہ سے ایک کا احترام ہے اور نہ محض پتھر کی وجہ سے دوسرے کی بے احترامی۔ اصل یہ ہے کہ دونوں پتھر الگ الگ چیزوں کی علامت ہیں۔ حجر اسود ابراہیم خلیل اللہ کی علامت ہے اس لیے وہ قابلِ احترام ہے۔ اور جمرات شیطان لعین کی علامت ہے اس لیے وہ سنگ باری کا مستحق ہے۔ حجر اسود کو چومنا سنت ابراہیمی سے عقیدت کا اظہار ہے اور جمرات کو پتھر مارنا عمل شیطانی کے ساتھ نفرت کا اظہار۔

ایک فوج اپنے ملک کے جھنڈے کا احترام کرتی ہے، مگر وہ دشمن ملک کے جھنڈے کو پیروں تلے روندتی ہے۔ حالانکہ دونوں ہی کپڑا ہیں۔ دونوں میں یہ فرق اس لیے ہے کہ ایک جھنڈا وطن دوستی کی علامت ہے اور دوسرا جھنڈا وطن دشمنی کی علامت۔

کو بھی استعمال نہیں کر سکیں گے۔

میرے سائق (السید محمد البدوائی) تعلیم یافتہ اور نہایت مہذب ہیں۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ میں ہر وقت یہاں آپ کے لئے سیارہ لے کر موجود رہتا ہوں۔ مگر آپ اس کو استعمال نہیں کرتے۔ آج ان کے اصرار پر ہوٹل سے نکلا اور شہر رباط دیکھنے کے لئے گیا۔ شہر نہایت خوبصورت نظر آیا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ بے شمار گاڑیوں کے باوجود پلیوشن بہت کم تھا۔

انھوں نے مختلف چیزیں دکھائیں۔ مثلاً تقلیدی صنعت کے مراکز، وزارتی دفاتر، القصر الملکی وغیرہ۔ ہر جگہ بورڈ عربی اور فرینچ میں مشترک طور پر نظر آیا۔ پورے شہر میں صرف ایک فقیر دکھائی دیا۔ سمندر کے ساحل سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر روشنی کا مینار (light house) بنا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر قدیم دور کی جہاز رانی کا منظر سامنے آگیا۔

یہاں کے قدیم متحف کو دیکھا۔ اس میں قدیم بادشاہوں نیز عام انسانوں کے آثار تھے۔ ایک جگہ شیشہ کے کیس کے اندر ایک قدیم انسان کا ڈھانچہ رکھا ہوا تھا جو کسی مقام پر ملا ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کی صورت میں تھا۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ ایک روز آئے گا جبکہ میرا جسم بھی اسی طرح ہڈیوں کا ایک وحشت خیز ڈھانچہ بن چکا ہوگا۔ پھر وہ مجھ کو "ضریح محمد حسن ثانی" دکھانے کے لئے لے گئے۔ یہاں غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا۔ خاص قبر مکمل طور پر سفید سنگ مرمر کی ہے۔ دیواروں پر سونے کے کام ہیں۔ چاروں طرف غیر معمولی اہتمام ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر کسی یورپین خاتون نے کہا تھا کہ اگر میری قبر پر اس قسم کا تاج محل بنایا جائے تو میں ابھی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح بادشاہوں کے عظیم الشان مقبروں کو دیکھ کر بہت سے لوگ حرص کرتے ہیں کہ کاش ہمارا بھی ایسا ہی شاندار مقبرہ ہوتا۔ مگر میرا حال یہ ہے کہ میں مٹی کی قبر اور سنگ مرمر کے تاج محل میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اصل اہمیت مرنے کے بعد والے اخروی انجام کی ہے نہ کہ مرنے کے بعد دنیا میں بننے والے ڈھانچہ کی۔

ہوٹل یہاں کے اہم ترین علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف بہت بڑے بڑے پارک ہیں۔ میں ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اندر سے ایک سڑک گزرتی ہے۔ چنانچہ گھوڑوں کا ایک دستہ گزرا۔ تمام گھوڑے نہایت تندرست تھے۔ اور نہایت شان کے ساتھ چل رہے

تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک تاریخ کا سفر گھوڑوں ہی پر ہوا ہے۔ گھوڑوں نے تاریخ انسانی کو ابتدائی حرکت دی ہے۔ میں گھوڑے کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ مشینی سواریوں کے ظہور میں آنے سے پہلے خدا نے زندہ سواری کے لئے انسان کو گھوڑا دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم احسان ہے۔ اس کے بغیر انسانی تاریخ کا سفر ہی شاید رک جاتا۔

آج ایک واقعہ گزرا۔ اس کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ غماً بغم لکیلا تأسو اعلیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اُتاکم کا مطلب یہ ہے کہ غم پر غم ڈال کر آزمائش کی گئی کہ کیا تمہارے اندر یہ صفت پائی جاتی ہے کہ فوت ہونے پر تمہارے اندر یاس نہ پیدا ہو اور یافت پر تمہارے اندر فرحت نہ پیدا ہو۔

۱۶ فروری کو یہاں کے ریڈیو کے نمائندہ عبد الرحیم برقیہ آئے اور الاسلام یتحدی کے مباحث پر انٹرویو لیا۔ ان کے چار خاص سوال تھے۔

۱. نیچرل لا کی بنیاد پر جدید ملحدین کا جو استدلال ہے اس کو آپ کیوں بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ کیا یہ ملحدانہ استدلال اب بھی کوئی علمی اہمیت رکھتا ہے۔

۲. لاشعور کے نظریہ کے تحت کہا جاتا ہے کہ دینی عقائد محض ذہنی اختلال کا نتیجہ ہیں، اس دعویٰ کا علمی رد آپ کے نزدیک کیا ہے۔

۳. کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ آفات جن کے مقابلہ میں انسان بے بس ہے، ان کو دیکھ کر انسان کے اندر جو خوف کی نفسیات پیدا ہوئی، اس نے خدا کا عقیدہ پیدا کیا۔

۴. آپ نے لکھا ہے کہ اس بحث میں سب سے اہم مسئلہ طریق استدلال کا مسئلہ ہے۔ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ استدلال کا طریقہ اب پوری طرح دین کے حق میں ہے۔

ان سوالات کے جوابات میں نے اپنی ہندستانی عربی میں دئے۔ تاہم اس کو انھوں نے سمجھا اور خوش ہوئے۔ اگر ممکن ہوا تو ان شاء اللہ ان جوابات کو مزید مفصل کرکے الرسالہ میں سوال وجواب کی صورت میں چھاپ دیا جائے گا۔

۱۷ فروری کو الدروس الحسنیہ کا آغاز ہوا۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے شرکا اجتماعی طور پر

القصر الملکی میں لے جائے گئے۔ وہاں فرداً فرداً ہر ایک سے الملک الحسن الثانی نے ملاقات کی۔ میں نے ملاقات کے وقت اپنی عربی کتابوں کا سٹ انھیں پیش کیا۔ میں اپنے ساتھ دہلی سے کوئی کتاب نہیں لایا تھا۔ یہ سب تیونس سے آنے والے ایک نوجوان نے مجھے دیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے رباط آئے تھے۔ اور اپنے ساتھ یہ کتابیں بھی لے آئے۔

۱۶ فروری (۵ رمضان ۱۴۱۴ھ) کا درس الاستاذ عبدالکبیر العلوی المدغری (وزیر الاوقاف والشئون الاسلامیہ) نے دیا۔ موضوع علم الناسخ والمنسوخ تھا۔ انھوں نے کہا کہ علماء نے پانچ سو سے بھی زیادہ منسوخات بتائے ہیں۔ اس کو مانا جائے تو قرآن کا معظم حصہ منسوخ قرار پاتا ہے۔ یہ ناقابل فہم ہے۔ مفسرین عام طور پر قتال کی آیت کو صبر و اعراض اور عفو و صفح کی آیتوں کے لئے ناسخ مانتے ہیں۔ حالاں کہ صبر و اعراض اور عفو و صفح دین کی اہم ترین تعلیمات ہیں۔ نسخ کے معاملہ میں یہی نقطہ نظر صحیح ہے۔ چنانچہ الزرکشی نے البرھان فی علوم القرآن میں نسخ کی بابت لکھا ہے کہ ھو تبدیل الحکم لِتَبدُّلِ المصلحۃ العملیۃ۔ یعنی نسخ حقیقۃً عملی مصالح کے بدلنے کی بنا پر (وقتی طور پر) حکم میں تبدیلی کا نام ہے۔

ہوٹل کے نیچے ہال میں آنے والے کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پاس کی نشست پر زیادہ عمر کے ایک شیخ تھے جو لبنان سے آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہند سے۔ انھوں نے پوچھا کہ ہند میں مسلمانوں کا حال کیسا ہے (کیف احوال المسلمین فی الھند) میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ انھوں نے دوبارہ کہا: مصائب، مش مصیبۃ واحدۃ۔ یعنی ہندستان کے مسلمان کسی ایک مصیبت میں نہیں بلکہ بہت سی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔

ہندستان کے بارہ میں زرد صحافت اور زرد قیادت کے پروپگنڈے کے نتیجہ میں لوگوں کو یہ بات تو معلوم ہے کہ بابری مسجد کو ہندوؤں نے ڈھا دیا۔ مگر یہ بات انھیں سرے سے معلوم نہیں کہ خود نا اہل مسلم رہنماؤں نے نہایت غلط سیاست چلا کر اس معاملہ کو بگاڑا۔ اسی طرح لوگوں کو یہ بات بھی معلوم نہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کے خود ساختہ نمائندہ بن کر جو لوگ مسلمانوں کی تباہی کا چرچا کر رہے ہیں وہ خود اسی ہندستان میں اپنے پورے خاندان سمیت نہایت شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ باریش رہنما بھی اور بے ریش رہنما بھی۔

یہاں معلوم ہوا کہ ایک عرب نوجوان روس (ماسکو) میں فضائی دفاع کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ الرسالہ مشن سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے طے کیا ہے کہ اس مشن کی تمام انگریزی کتابوں کو روسی زبان میں چھپوائیں۔ ان کی کوشش سے ایک تعلیم یافتہ روسی نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس روسی نومسلم کی مدد سے وہ اسلامی مرکز کی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کروا رہے ہیں۔ اب تک انھوں نے سترہ کتابوں کا روسی ترجمہ تیار کر لیا ہے۔

بنگلہ دیش کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو عرب میں رہتے ہیں۔ وہ "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا ترجمہ بنگالی زبان میں کر کے چھپوا رہے ہیں۔ یہ کام انھوں نے بنگلہ دیش کے ایک اور مسلمان کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ ایک صاحب نے ترجمہ کیا ہے، دوسرے نے طباعت کے سلسلہ میں مالیاتی مدد کی ہے۔

ایک صاحب نے ایک عربی مثل بتائی: اذا اردتَ ان تَنْجح کل وَوَکِّلْ۔ اس مثل میں وَکِّلْ کا لفظ فصیح عربی نہیں ہے بلکہ دارجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو خود کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ یعنی لا تأکل وحدك

۷ فروری کو درس کا موضوع تھا: مھمات من قواعد الاسلام۔ آج الاستاذ محمد الحبیب بلخوجہ نے درس دیا۔ انھوں نے اپنے درس کی بنیاد اس حدیث پر رکھی:

الطھور شطر الایمان والحمد للہ تملأ المیزان وسبحان اللہ والحمد للہ تملأ مابین السماوات والارض والصلاۃ نور والصدقۃ برھان والصبر ضیاء والقرآن حجۃ لك او علیك کل الناس یغدو فبائع نفسہ فمعتقھا او موبقھا

یہ حدیث جس کو امام مسلم نے کتاب الطہارت (باب فضل الوضوء) میں نقل کیا ہے۔ اس میں صبر کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کے لئے روشنی ہے۔ گویا کہ صبر ایک انتہائی اعلیٰ درجہ کا مثبت رویہ ہے جو آنکھ کھولنے والا اور راستہ کو صاف کرنے والا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بات کتنی زیادہ غلط ہوگی کہ صبر کو ایک سلبی رویہ یا مجبورانہ خاموشی کے ہم معنی سمجھ لیا جائے۔

آج درس سے پہلے وزارۃ الاوقاف کے ہال میں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے علماء جمع ہوئے۔ اور کل کے درس پر مناقشہ ہوا۔ سب سے پہلے کل کی تقریر اور مجلس کا پورا ٹیپ وی سی آر پہ دکھایا

گیا تاکہ اصل بحث لوگوں کے ذہن میں تازہ ہو جائے۔ جو واقعہ میں نے کل دیکھا اور سنا تھا، آج ٹھیک اسی طرح اس کو مشینی سطح پر دہرایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے قرآن کی آیت وھو یبدئ ویعید یاد آئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ عملی مشاہدہ بن کر آنکھوں کے سامنے آگئی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ نسخ کی چار قسمیں ہیں: نسخ التلاوۃ والحکم، نسخ التلاوۃ وبقاء الحکم، نسخ الحکم وبقاء التلاوۃ، نسخ الکتاب بالسنۃ ونسخ السنۃ بالکتاب۔ ایک صاحب نے کہا کہ قرآن میں تقریباً ۲۰ نسخ ثابت ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ علماء نے اس میں وسعت دی اور اس کی تعداد کو پانچ سو تک پہنچا دیا (ان العلماء مع الاسف الشدید، توسعوا فی الناسخ والمنسوخ) کسی نے کہا نسخ صرف فرع میں ہے، اصل میں نہیں۔ اسی لئے نسخ کی آیتیں مدینہ میں اتریں، مکہ میں نسخ کی آیتیں نہیں اتریں۔ ایک صاحب نے کہا کہ قرآن اترنے کے بعد اور رسول اللہ کی وفات کے بعد اب کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی حکم کو ناسخ یا منسوخ قرار دے۔ وغیرہ

میں نے کہا کہ نسخ کے معاملہ کو محض کچھ آیتوں یا حدیثوں کا مسئلہ سمجھنا درست نہیں۔ نسخ ایک اصول (مبدأ) ہے نہ کہ محض کچھ آیتوں کی تفسیر کا مسئلہ۔ اگر آپ نسخ کو صرف کچھ آیتوں سے جوڑ دیں تو وہ انھیں آیتوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ مگر اس کو اصول شریعت ماننے کی صورت میں وہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ دراصل عملی حالات کی رعایت کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے وہ ایک حکیمانہ اصول کے طور پر ہمیشہ باقی رہے گا۔ مذکورہ آیتوں کی حیثیت اس معاملہ میں علامتی نمونہ کی ہے۔ یہ آیتیں برائے توضیح ہیں نہ کہ برائے تعیین۔

اس سفر میں حسب معمول میں اپنے ساتھ کوئی کتاب یا الرسالہ کا کوئی شمارہ نہیں لے گیا تھا۔ رباط پہنچا اور وہاں آنے والے علماء سے ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اکثر لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اکثر لوگوں نے مزید عربی کتابوں کا مطالبہ کیا۔ اتفاق سے ایک نوجوان (سید صالح الشوکات) قاہرہ سے آگئے تھے۔ وہ میری آمد کی خبر سن کر مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے کیوں کہ یہاں کے نظام کے مطابق الدروس الحسنیہ کا پروگرام ہر روز ساتھ ساتھ ٹی وی پر نشر کیا

جاتا ہے جو پوری عرب دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ وہ عربی کتابوں کا ایک بنڈل بھی اپنے ساتھ لائے تھے جو قاہرہ سے چھپی ہیں۔ یہ کتابیں یہاں کے بہت سے لوگوں کو دی گئیں۔ چند نام یہ ہیں: الملك المغربي الحسن الثاني، الاستاذ عبد الكبير العلوي المدغري (وزیر الاوقاف والشئون الاسلامیہ) محمد الكبير العلوي (مدیر وزارة الاوقاف) دكتور ابراهيم السيد الرفاعي (چیرمین ڈپارٹمنٹ آف بیالوجی، کویت یونیورسٹی)، الشيخ طٰه الولي (لبنان)، دكتور محمد يعقوب خبيزه (فاس، المغرب) دكتور عبد الرحيم برقيه (رباط)، عبد السلام ادمي (ٹوکیو) الحاج عبد الله المشري (موریتانیہ)، دكتور محمد السليماني (الجزائر) وغیرہ

۱۸ فروری کو الاستاذ احمد الغازی الحسینی (استاذ کرسی التوحید بجامع القرویین بفاس) کا درس تھا۔ اس کا عنوان تھا: مجامع مکارم الاخلاق۔ اپنے درس کے لئے انھوں نے اس آیت کو منتخب کیا: خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلين. وإما ينزغنك من الشيطٰن نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم (الاعراف ۲۰۰)

درس زیادہ تر نحوی اور فنی انداز میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت میں اہم نکتہ یہ ہے کہ عفو اور اعراض کا حکم دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہارے دل میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو تم اس کے بارہ میں اللہ سے پناہ مانگو۔ اس سیاق میں شیطانی وسوسہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کوئی ایسا فعل کرتا ہے جس کے بارہ میں اللہ نے عفو اور اعراض کا حکم دیا ہے اور اس وقت تمہارے دل میں انتقامی جذبہ آجاتا ہے یا وقار کا سوال تم کو اس سے روکنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس قسم کے جذبات واحساسات کو تم شیطانی وسوسہ سمجھو۔ تم کو چاہئے کہ غصہ اور انتقام کے جذبہ کو دباؤ اور وقار کے سوال کو اس طرح کے سلوک میں رکاوٹ نہ بننے دو۔ انسانی زیادتی کو اللہ کے خانہ میں ڈالتے ہوئے ہر حال میں عفو اور اعراض کے مسلک پر قائم رہو۔

۱۸ فروری کو جمعہ کا دن تھا۔ دروس حسنیہ کے شرکا، کاروں پر رباط سے الدار البیضاء لے جائے گئے۔ یہ سو کلومیٹر کا راستہ تھا جو ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہوا۔ میں نے سنا اور پڑھا تھا کہ الدار البیضاء کی مسجد حسن ثانی حرمین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ واقعۃً وہ ایسی ہی نظر آئی۔ بہت بڑی اور بہت خوبصورت انداز میں بنائی گئی ہے۔ سمندر اٹلانٹک کے عین کنارے ہونے کی وجہ سے

اس کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ صف کے آگے مسلسل جوتوں کی قطار نظر آئی۔ لوگ زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے اس لئے مسجد کے اندر آواز کافی گونج رہی تھی۔ نمازیوں کو قرآن برائے تلاوت تقسیم کیا جا رہا تھا۔ مجھ کو بھی ایک مجلد قرآن دیا گیا۔ اس کو کھولا تو اندازہ ہوا کہ اس کے انداز تحریر کی وجہ سے اس کو پڑھنا مشکل ہو رہا ہے۔ آخر میں دیکھا تو "وفقاً للخط العثمانی" لکھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہاں کے لوگ اس کے عادی ہوں مگر عام مسلمانوں کے لئے اس کے ذریعہ تلاوت کرنا آسان نہیں۔

مغربی لہجہ میں لاؤڈ اسپیکر پر قرآن پڑھا جا رہا تھا۔ یہ بھی ہم لوگوں کے لہجہ سے بہت مختلف تھا اس پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ لہجوں کا فرق کیوں واقع ہوتا ہے۔ قرآن ابتداءً قریش کے لہجہ پر اترا۔ اس کے بعد وہ پھیلا یہاں تک کہ دور دور کے علاقوں میں پہنچ گیا۔ یہ لوگ اپنے اپنے لہجہ میں اپنی زبان بولتے تھے۔ اب انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد جب قرآن پڑھا تو اس کو انھوں نے اپنے لہجہ میں پڑھا۔ ہر ایک اپنے مقامی لہجہ میں قرآن کے عربی الفاظ دہرانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مسلم قوموں کا مکتوب قرآن اگرچہ ایک ہے۔ مگر اس کو پڑھنے کے لئے ہر ایک کا لہجہ الگ الگ ہوگیا ہے۔

مسجد الحسن الثانی (الدار البیضاء) کے تعارف کے لئے جو باتصویر کتاب چھاپی گئی ہے، اس کے آغاز میں یہ آیت درج ہے: وکان عرشہ علی الماء (ہود ۷) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عظیم مسجد پانی کے اوپر بنائی گئی ہے۔ یعنی سمندر (اٹلانٹک) کے ساحل پر ہے اور پانی کو پاٹ کر اور اس کے اوپر ستون قائم کرکے اس کو تعمیر کیا گیا ہے۔ الملک الحسن الثانی، جن کو صوفی بادشاہ کہا جاتا ہے انھوں نے ۸ جولائی ۱۹۸۸ کو مسجد کی تعمیر کا اعلان کرتے ہوئے اس کی مصلحت ان الفاظ میں بیان کی تھی: أردتُ أن أبنی ھٰذا المسجد علی الماء (وکان عرشہ علی الماء) کما اردتُ ان یکون المصلّی فیہ والداعی والذاکر والشاکر والراکع والساجد محمولا علی الارض ولکن اینما نظر یجد سماء ربہ وبحر ربہ۔

۸ فروری کو افطار کا انتظام ایک وزیر کی رہائش گاہ پر تھا۔ جس ہوٹل میں ہم لوگوں کا قیام ہے وہ ایک امریکی ہوٹل ہے۔ وہاں کھانے کا انتظام زیادہ تر مغربی انداز کا ہے۔ وزیر صاحب کا معاملہ

اس سے مختلف تھا۔ وہاں وہ انداز تھا جو عرب رؤساء کے یہاں رمضان کی دعوت میں اختیار کیا جاتا ہے۔ پہلے انواع واقسام کی چیزوں کے ساتھ افطار کرایا گیا۔ پھر مغرب کی نماز ہوئی۔ اس کے بعد تمام لوگ ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوئے۔ یہاں دیر تک قرآن کی قرأت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت ہوگیا اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ اس کے بعد تمام لوگ کھانے کے کمرہ میں آئے۔ جہاں دوبارہ قسم قسم کے کھانوں سے میز بھرا ہوا تھا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک کھانے پینے کا دور جاری رہا۔ یہ سلسلہ سوا چھ بجے افطار سے شروع ہوا تھا۔ جب ہم لوگ واپس لوٹے تو گھڑی میں ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

لوگ خوش ہو کر کھا رہے تھے مگر میں غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ مجھے اس قسم کی دعوتوں سے کوئی رغبت نہیں۔ وہ چیز جس کو پر تکلف دعوت کہا جاتا ہے وہ میرے لئے صرف پر تکلیف دعوت ہے۔ مجھے سادہ اور مختصر کھانا پسند ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں بہت کم لوگ ہیں جو اس قسم کی دعوت کریں، اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی دعوت کو دل سے پسند کریں۔

ٹوکیو سے جاپان مسلم ایسوسی ایشن کے نمائندہ عبد السلام اریمی آئے تھے۔ وہ ایک نومسلم نوجوان ہیں۔ انھوں نے اپنا قدیم نام جیرو اریمی (Jiro Arimi) بتایا۔ ان سے معلوم ہوا کہ جاپان کے مسلمان انوکھے قسم کے مسائل سے دوچار ہیں جن سے ہم لوگ اپنے ملک میں واقف نہیں۔ مثلاً تدفین کا مسئلہ۔ قبر کی معروف تدفین جاپان میں غیر قانونی ہے۔ تدفین کے لئے لاش کو مخصوص قسم کے تابوت میں بند کرنا ضروری ہے جو بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اس کام کو بھی کوئی رجسٹرڈ ادارہ ہی کر سکتا ہے۔ ابھی تک ان کے پاس کوئی باقاعدہ مقبرہ نہیں۔

ہندستان میں مقامی کرنسی کے مقابلہ میں ڈالر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مگر جاپان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جاپان مسلم اسوسی ایشن کو رابطۃ العالم الاسلامی (مکہ) کی طرف سے مالی تعاون ملتا ہے جو ڈالر کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر اس وقت یہ صورتحال ہے کہ جب وہ اس تعاون کو جاپانی سکہ ین میں تبدیل کرتے ہیں تو وہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ین کے مقابلہ میں امریکی ڈالر کی شرح گھٹ گئی ہے۔ انھوں نے کہا: وبما ان الدعم المادی تقدمہ رابطۃ العالم الاسلامی یرسل بالدولار فانہ تأثر کثیراً بارتفاع قیمۃ الین الیابانی۔ وھکذا فھو یقدر

حاليا بعشرة آلاف ين ياباني فقط شهريا۔

۱۹ فروری کو الاستاذ طٰہ الولی (لبنان) کا درس تھا۔ موضوع تھا: المسجد و دورہ فی حضارۃ الاسلام وتراث المسلمین۔ انھوں نے اپنے درس کے لئے اس آیت کو بنیاد بنایا: انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر واقام الصلاۃ وآتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسیٰ اولئک ان یکونوا من المھتدین (التوبہ)

مسجد کے بارہ میں انھوں نے مختلف تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ گستاولی بان نے لکھا ہے کہ مسجد مسلمانوں کے لئے مرکزحیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے۔ مگر اکثر لوگ مرکز حیات کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد کے اندر ہر قسم کی سرگرمیاں جاری ہوں۔ حتی کہ مسجد کے اندر قید خانہ بھی موجود ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام ظاہری نوعیت کی چیزیں ہیں۔ مسجد اصلاً خشیت الٰہی کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد سے لوگوں کو سب سے زیادہ جو چیز ملنی چاہئے وہ یہی خشیت اور تقویٰ کی غذا ہے۔

دکتور ابراہیم الرفاعی نہایت سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی ہیں۔ انھوں نے مغربی دنیا اور مسلم دنیا کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ مغرب کے لوگوں کی طاقت یہ ہے کہ وہ تنقید کو برداشت کرتے ہیں۔ ان کو ان کی غلطی بتائی جائے تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ تنقید کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے (ھم یعترفون بخطایاھم ونحن لا نعترف بخطایانا) یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے امکانات کے باوجود مسلم دنیا خائب وخاسر بنی ہوئی ہے۔

رباط سے ایک عربی اخبار العلم (جاری شدہ ۱۹۴۶) نکلتا ہے۔ یہ حزب الاستقلال کا ترجمان ہے۔ اس کا شمارہ ۹ فروری ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک رپورٹ چھپی ہوئی تھی جس کا عنوان تھا ــــــ مصر: حرب بین السلطۃ والاسلامیین۔ یعنی مصر میں ارباب اقتدار اور اسلام پسندوں کے درمیان جنگ۔ ایک اور خبر میں بتایا گیا تھا کہ حکومت الجزائر نے پاکستان اور ایران پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ الجزائر کے اسلام پسندوں کو مسلح کر رہے ہیں (الجزائر: تتھم باکستان وایران بتسلیح الاسلامیین)

میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان نفاذ اسلام کے نام پر حکمرانوں سے مسلح جنگ چھیڑے ہوئے ہیں

وہ دور جدید کا سب سے بڑا جرم کر رہے ہیں۔ یہی وہ نادانی ہے جس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی دعوت کا راستہ روک رکھا ہے۔ یہ برائی جس دن ختم ہو گی اسی دن اسلام کی اشاعت کے دروازے کھل جائیں گے۔

۲۰ فروری کو ایک نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ ان کا نام الحیلة لی مُصدِّق ہے۔ الحیلہ لی ان کا خاندانی نام ہے جو عام رواج کے خلاف شروع میں لکھا جاتا ہے۔ یہ نوجوان جریدہ الرائے (رباط) کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے الرائے کے لئے انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے دینی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ: ما ھی نصیحتکم الی الشباب المسلم (مسلم نوجوانوں کے لئے آپ کی نصیحت کیا ہے)، میں نے کہا کہ میری نصیحت صرف ایک ہے ـــــ وہ سیاست سے دور رہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

الحیلہ لی مصدق نے الاسلام یتحدی اور بعض دوسری عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مغرب (مراکو) میں خاص طور پر الاسلام یتحدی بہت پھیلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رباط میں ہم مسلم نوجوانوں کو اکھٹا کریں گے، آپ وہاں چل کر انھیں خطاب کریں۔ مگر بعض وجوہ سے میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب تھا کہ مراکو کے بیشتر تعلیم یافتہ حضرات الاسلام یتحدی سے واقف ہیں اور اس کو پڑھے ہوئے ہیں۔ اس کا راز استاذ محمد مقر (وزارۃ الاوقاف) کے ذریعہ معلوم ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ الاسلام یتحدی مراکو کے ثانوی مرحلہ کے نصاب میں عرصہ سے داخل ہے۔ اس بنا پر وہ بہت بڑی تعداد میں یہاں بار بار منگوائی گئی اور کثرت سے پھیلی۔ رباط کے ایک نوجوان الحبشی علال نے کہا: حتی لا یکاد یخلو منہ بیت۔ اس طرح کے احساسات بہت سے لوگوں نے بیان کئے۔

دکتور محمد فتحی عثمان نے کہا کہ امریکہ میں لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے اور مسیحیت محبت کا مذہب (ان دین الاسلام دین تشدد ودین المسیحیة دین حب)
انھوں نے اس غلطی کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ برداشت سے کام لیں اور جذبات میں آکر ایسی کارروائی نہ کریں جس سے خدا کے دین کی تصویر اغیار کی نظر میں بگڑ جائے۔ انھوں نے ایک تقریر میں واضح طور پر کہا کہ آجکل کے اسلام پسند

(اسلامیین) بدقسمتی سے تشدد کو اسلام کی اقامت کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ہیں، اسی کی وجہ سے یہ ساری غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

یہی بات دکتور ابراہیم الرفاعی نے کہی۔ انھوں نے کہا کہ ضروری ہے کہ ہم دوبارہ نبوی اصول کی طرف واپس لوٹیں (لابد من الرجوع الى القاعدة النبوية)

اخوانی فکر کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کو غلط سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میری رائے کوئی نئی یا منفرد رائے نہیں ہے۔ ایک رائے بلاشبہ وہ ہے جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول میں بیان کیا ہے۔ مگر علما کے درمیان ایک اور رائے بھی موجود ہے۔ چنانچہ مرتد کے بارہ میں (اور اس پر قیاس کرتے ہوئے شاتم کے بارہ میں بھی) ابراہیم النخعی اور سفیان الثوری کی رائے یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ صرف توبہ کا تقاضا کیا جائے گا، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا (يُستتاب ابداً ولا يُقتل)۔

عمر عبدالسلام رباط میں عربی اخبار الشرق الاوسط کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے ۱۹ فروری کو انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے حالات اور معاملات سے تھا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمان جن مسائل سے دوچار ہیں عام طور پر اس کی ذمہ داری ہندستان کے غیر مسلم فرقہ پر ڈالی جاتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے واحد ذمہ دار خود مسلمانوں کے نااہل لیڈر ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر اس عربی مثل کے مصداق ثابت ہوئے ہیں :

اذا کان الغراب رئیس قوم　　سيهديهم الى دار البوار

افغانستان کے بارہ میں سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ جنگجوئی افغانیوں کی قومی صفت ہے۔ کبھی ان کے اس مزاج کا مظاہرہ اغیار کے خلاف ہوتا ہے اور کبھی خود اپنوں کے خلاف :

واحیانا علیٰ بکر اخینا　　اذا ما لم نجد الا اخانا

۲۰ فروری کی شام کو شہر کے ایک ہوٹل نزل المارشی میں تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع تھا۔ اس میں شرکت کی۔ ڈھائی گھنٹہ تک ان کے سامنے دین کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔

اس اجتماع سے واپسی میں رات کے گیارہ بجے کا وقت ہوگیا۔ جب میں مقام اجتماع سے نکل کر باہر آیا تو سڑک پر مردوں اور عورتوں کی زبردست بھیڑ نظر آئی۔ میں نے پوچھا کہ آدمی رات کو آخر اتنے زیادہ لوگ کیوں چل رہے ہیں اور یہ کہاں جارہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رمضان میں یہی عرب ملکوں کا دستور ہے۔ رمضان کی رات کا زیادہ حصہ وہ بازار میں خرید وفروخت میں گزارتے ہیں۔ پرانی دہلی کے مسلم محلوں میں بھی اسی قسم کی بھیڑ ہوتی ہے۔ مگر وہ رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ عرب ملکوں میں یہ بھیڑ رمضان کے پورے مہینہ میں جاری رہتی ہے۔

ایک مجلس میں ایک عالم نے یہ مشہور مقولہ دہرایا: ان للہ عبادا اذا ارادوا اراد۔ میں نے کہا کہ یہ بندے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اتنا زیادہ مٹاتے ہیں کہ وہ ذاتی خواہش سے بلند ہوجاتے ہیں حتی کہ وہ خود بھی وہی چاہنے لگتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ اور جب ان کی روحانی ترقی کا یہ درجہ آجائے تو اس کے بعد وہی واقعہ رونما ہوتا ہے جس کا اوپر کے مقولہ میں ذکر ہے۔ تاہم یہ ایک ایسا لطیف معاملہ ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

۲۱ فروری کی صبح کو عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں دور جدید میں اسلام کے احیاء کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ ان میں سے ایک عرب ڈاکٹر بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ میرے بھائی روسی زبان جانتے ہیں اور وہ ماسکو میں رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک روسی ادیب کی مدد سے الرسالہ مشن کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ انسان اپنے آپ کو پہچان (انگریزی) کا ترجمہ روسی زبان میں وہ چھپوا چکے ہیں۔ اسی طرح تمام کتابوں کو چھپوانا چاہتے ہیں۔

دوپہر کو وزارۃ الاوقاف کے ہال میں مناقشہ ہوا۔ یہ مناقشہ مجامع مکارم الاخلاق والے مقالہ پر تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم الرفاعی نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام پسندوں نے تشدد کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس کے بجائے اسلامی تحریک کو دعوت کے اصول پر چلانا چاہئے۔ اس رجوع کے بغیر اسلام کی تاریخ کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔

شام کو ۹ بجے ملک محمد الخامس کی ضریح پر "الحفل الدینی" منعقد کیا گیا۔ یہاں اعیان سلطنت اور اور شرکاء درس بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ملک محمد حسن الثانی بھی اس میں موجود تھے۔ پہلے

قرآن کی تلاوت ہوئی۔ پھر عربی نعت پڑھی گئی۔ اس کے بعد دعا پر مجلس برخاست ہوئی۔

ایک گفتگو کے ذیل میں میں نے کچھ عرب حضرات سے کہا کہ عمر ابوریشہ کی ایک مشہور نظم ہے۔ اس میں وہ جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ اے میری قوم کیا دنیا کی قوموں کے درمیان تلوار یا قلم میں تیرا کوئی مقام ہے:

أُمّتی هَلْ لكِ بَیْنَ الأُمَمِ مِنبرٌ للسیفِ أَو لِلقلمِ

میں نے کہا کہ یہ شعر موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کو صرف ان کی قومی تاریخ کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ قومی تاریخ کے اعتبار سے مسلمان بلند نظر آئیں تو وہ بلند ہیں اور قومی تاریخ کے اعتبار سے وہ پست نظر آئیں تو وہ پست ہیں۔ یہ مسلم دانشور شعوری طور پر اس سے بے خبر ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس ان کی قومی تاریخ کے علاوہ ایک اور چیز ہے، اور وہ دین اسلام ہے۔ تاریخ پستی اور بلندی کا شکار ہوتی ہے، مگر دین اسلام جو خدا کا محفوظ دین ہے، وہ اپنی نظریاتی صداقت کے اعتبار سے ہمیشہ بلند رہتا ہے، اس کے لئے پستی کا کوئی سوال نہیں۔

۲۲ فروری کی صبح کو کئی عرب نوجوان میرے کمرہ میں آگئے۔ ان سے کئی گھنٹہ تک دینی اور ملی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ آخرت میں تین قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک وہ جن کا بدن اور جن کی روح دونوں دنیا میں پاک رہی۔ وہ سیدھے جنت میں داخل کر دئے جائیں گے۔ دوسرے وہ جن کی روح گندی نہیں ہوئی تاہم ان کا جسم بعض اوقات گناہوں سے آلودہ ہوا۔ ایسے لوگوں پر خدا اپنی رحمت کا پانی بہا دے گا۔ وہ پاک وصاف ہو کر جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو جائیں گے۔ تیسرے وہ لوگ جن کا جسم بھی گندا تھا اور جن کی روح بھی گندی تھی۔ یہ لوگ قابل تزکیہ نہیں ہوں گے۔ وہ جنت میں داخلہ کے لئے نااہل قرار دیدئے جائیں گے۔

آج دوپہر کو وزارۃ الاوقاف کے ہال میں مناقشہ کی مجلس ہوئی۔ یہ مناقشہ المسجد ودورها فی الاسلام والے محاضرہ پر تھا۔ اسٹیج پر بولتے ہوئے ایک صاحب نے آیت پڑھی۔ اس کو انھوں نے اس طرح کہا: فلا تقربوا بعد عامهم هذا فوراً ہی حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا تقربوا نہیں یقربوا۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لئے

یہ غیر معمولی انتظام کیا ہے کہ ہر جگہ ایسے لوگ کھڑے ہوئے ہیں جو ایک لفظ کی غلطی کو بھی پکڑ لیں اور فوراً اس کی تصحیح کر دیں۔

سینیگال کے ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ آجکل المساجد قبل الساجد کے اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے ہم کو الساجد قبل المساجد کے اصول پر عمل کرنا چاہئے۔ یعنی پہلے عبادت کی روح لوگوں کے اندر پیدا کرنا چاہئے، اس کے بعد مسجدیں اپنے آپ بن جائیں گی۔

انڈونیشیا کے الاستاذ مسلم نے کہا کہ ادخالُ غیر المسلمین فی المسجد حرام۔ انھوں نے کہا کہ فقہاء اس معاملہ میں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم ھٰذا۔ مگر اس آیت سے یہ مسئلہ نہیں نکلتا۔ اس آیت میں "مشرکین" سے مراد ساری دنیا کی مشرک کمیونٹی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ مشرکین ہیں جن پر خدا کے پیغمبرؐ نے اتمام حجت کی حد تک دعوت پہنچائی۔ اس کے باوجود انھوں نے حق کو نہیں مانا یہاں تک کہ سنت اللہ کے مطابق ان کے استیصال کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک صاحب نے ایک عربی مقولہ سنایا: معرفۃ الرجال کنز (آدمیوں کو پہچاننا ایک خزانہ ہے)

رباط کے عربی ہفت روزہ الرائے کے مراسل الھیلالی مصدق نے بوسنیا کے صدر علی عزت بیغوفتش کی کتاب کا عربی ترجمہ البیان الاسلامی دیا۔ اس تقریب سے ان سے جہاد اسلامی کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل مسلمان جگہ جگہ لڑ رہے ہیں اور اس کو جہاد کا نام دیتے ہیں۔ مگر جہاد کی ایک لازمی شرط ہے، اس شرط کے بغیر جو حربی اقدام کیا جائے وہ شرعی اعتبار سے جہاد نہیں ہوگا۔ وہ شرط قرآن کی اس آیت میں ہے: واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد سے پہلے اعداد (تیاری) ضروری ہے۔ اس کا معیار ہے — اعداد الی حد الارھاب۔ میں نے کہا کہ موجودہ مجاہدین نے کیا ارہاب کی حد تک تیاری کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں میں نے کہا کہ جب شرط ہی پوری نہ کی گئی ہو تو وہ جہاد کیسے ہو جائے گا۔ کیا وضو کی شرط پوری کئے بغیر

کوئی نماز شرعی نماز ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر حسن محمد الفاتح قریب اللہ سوڈان کی جامعہ ام درمان میں استاد ہیں۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ آپ تو لیبیا میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، میں تو دہلی میں رہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ آپ لیبیا میں رہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کتنی غیر ذمہ داری لوگوں کے اندر آگئی ہے۔ کسی کے بارہ میں کوئی بھی الٹی بات کہنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ زبان کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ بعض باتیں آدمی کو جہنم میں پہنچا دیتی ہیں۔

۲۱ فروری کی شام کو تمام لوگ والی رباط (گورنر رباط) کی رہائش گاہ پر لے جائے گئے۔ یہاں والی کی طرف سے افطار کا انتظام تھا۔ ہم لوگ پہنچے تو افطار کے سامان سے میز بھری ہوئی تھی۔ لمبی افطار کے بعد نماز باجماعت ادا کی گئی۔ اس کے بعد لوگ ایک کمرہ میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد تین بار کھانے کے سامان سے میز لبریز کی گئی۔ حسب عادت میں نے چند سادہ چیزیں کم مقدار میں کھائیں۔ ہر ایک کی پلیٹ میں بریڈ رکھی جانے لگی۔ میں نے ڈاکٹر ابراہیم الرفاعی سے کہا کہ نصف لی و نصف لك اور ان کی بریڈ میں سے آدھا لے لیا۔ اس کے بعد میں روٹی اور سلاد ملا کر دھیرے دھیرے کھاتا رہا۔ ڈاکٹر حسن محمد الفاتح قریب اللہ (سوڈان) مجھ سے نزدیک کی کرسی پر تھے، آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ تو کھاتے ہی نہیں۔

کھانے کی بڑی میز پر مختلف قسم کے کھانے جمع تھے۔ لوگ کھا رہے تھے اور تفریحی باتیں کر رہے تھے۔ میں نہ ان کی ہنسی میں شریک ہو سکا اور نہ ان کی باتوں میں۔ میں بس خاموش بیٹھا ہوا سنتا رہا۔ ڈاکٹر احمد علی الامام (مدیر جامعہ ام درمان، سوڈان) بھی قریب ہی تھے۔ وہ دیر تک میری حالت دیکھتے رہے۔ اس کے بعد میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور یہ عربی شعر پڑھا:

وحيد من الخلان في كل مَقْـمَـدٍ إذ أعظم المطلوب قلّ المساعد

ایک بار کھانے سے فراغت کے بعد کچھ عرب علما بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مصری کو نعتیں یاد تھیں انھوں نے مختلف عربی نعتیں سنانا شروع کیا۔ میں سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا کہ یہ نعتیں جو آپ نے سنائی ہیں وہ سب کی سب لفظی تعریف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں آپ کو ایک اور نعت سناتا ہوں

جو پیغمبر کی معنوی تعریف میں ہے۔ یہ ایک برطانی مستشرق ای ای کیلیٹ کی منثور نعت ہے۔ کم از کم اپنے بارہ میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو، فارسی، عربی میں نعتیہ اشعار کا جو ذخیرہ ہے، یہ نعت ان سب پر بھاری ہے۔ یہ منثور نعت انگریزی میں ہے، اس کا عربی ترجمہ یہ ہے: محمد واجه الصعوبات بعزم ان يعصر الفوز من الفشل۔

ایک مجلس میں ایک عرب عالم نے کہا کہ آج کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ہمارے درمیان عز الدین عبد السلام جیسے علماء موجود نہیں جن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ: اذا خرج خرجت الامة كلها (جب وہ نکلے تو پوری امت ان کے ساتھ نکل پڑی)

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ آج بھی ہمارے یہاں بہت سے علماء پیدا ہوئے۔ مثلاً حسن البنا ۱۹۴۸ میں یہ کہہ کر اٹھے کہ لبیك یا فلسطین تو ان کے ساتھ مصری قوم سڑکوں پر نکل آئی۔ انڈیا میں مولانا محمد علی جوہر نے خلافت کا نعرہ لگایا تو تمام مسلمان ان کے پیچھے چل پڑے۔ الجزائر میں کچھ علماء نے استعمار سے آزادی کا نعرہ دیا تو لاکھوں لوگ گولی کھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں جب کوئی عالم ایک کام کے لئے اٹھا تو اس کے عمل کا نتیجہ برآمد ہوا۔ موجودہ زمانہ میں جو علماء اٹھے ان کی کوششیں مکمل طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ نتیجۂ عالم کے فقدان کو خود عالم کے فقدان پر محمول کر رہے ہیں۔ حالانکہ جو چیز مفقود ہے وہ نتیجۂ عالم ہے نہ کہ عالم۔

ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے اپنا نام العمرانی بتایا۔ وہ مراکو ریڈیو کے دفتر سے بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ روزانہ ہم ریڈیو پر آپ کی ٹاک رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ رمضان کے آخر مہینہ تک میں یہاں رہوں گا۔ میں نے معذرت کی۔ میں نے کہا کہ اب تو میرا جانے کا وقت آگیا ہے۔ اب میں آپ کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔

۲۳ فروری کو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ سارے دن ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر عرب نوجوانوں سے ہوئیں۔ ایک نوجوان نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ موجودہ حالات کو دوسرے لوگ مشکلات کا نام

یتے ہیں مگر میں ان کو چیلنج کہتا ہوں۔ اور چیلنج ہمیشہ فرد یا قوم کی صلاحیتوں کو ابھارنے کا ذریعہ بنتا ہے۔
س لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ حالات مسلمانوں کے لئے نئی کامیابی کا زینہ ہیں۔

شام کو تمام شرکا، جنرل قادری کی رہائش گاہ پہونچائے گئے۔ یہاں افطار کا انتظام تھا۔ دیر
تک افطار کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگ ذوق وشوق کے ساتھ کھاتے رہے اور تفریحی باتیں کرتے
رہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اعلان کیا کہ مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے آجائیں۔ ایک عرب عالم
نے اٹھتے ہوئے کہا : ما اکلنا لا یُعضم الا بالصلاۃ۔

ہندستان میں جہاں کہیں کچھ پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے ہیں تو زیادہ تر وہ تفریحی باتیں کرتے
ہیں۔ اگر کسی علمی نکتہ کا ذکر آتا ہے تو وہ بھی تفریح کے انداز میں۔ یہاں بھی تقریباً یہی حال تھا،
اس فرق کے ساتھ کہ ہندستان میں اردو میں تفریحی باتیں ہوتی ہیں اور یہاں عربی میں۔ میز پر کیلا
آیا تو ایک صاحب نے اس کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا : الامام مالک کان یحب الموز۔ دوسرے
صاحب نے کہا کہ وہ کیلے کو بھی پسند کرتے تھے اور موت کو بھی۔

ایک لبنانی عالم تھے۔ انھوں نے کہا کہ ویحمل عرش ربك یومئذ ثمانیۃ (الحاقہ)
میں ثمانیہ سے مراد آٹھ پہاڑ ہیں، ان میں سے ایک لبنان کا پہاڑ ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ
یہ تفسیر غلط ہے۔ لبنانی بزرگ نے کہا کہ ہم تو کتابوں میں جو پڑھتے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔
الراسخون فی العلم یؤمنون بہ۔ تفریح کے موڈ میں ان کو یاد نہیں رہا کہ آیت میں ایمان
سے مراد قرآن پر ایمان ہے نہ کہ تفسیری حاشیوں پر ایمان۔

ایک مجلس میں چند علما بیٹھے ہوئے تھے۔ دکتور ابراہیم الرفاعی نے ایک مراکشی عالم سے میرا
تعارف کرانا چاہا۔ انھوں نے کہا : ان کو کون نہیں جانتا ان کی کتابیں تو اسلامی بیداری کی تمہید ہیں۔
(کتبہ مقدمۃ الصحوۃ)

۲۴ فروری کی صبح کو فجر کی نماز ادا کی تو ذہن پر یہ خیال طاری تھا کہ کل صبح کو مجھ کو یہاں سے
روانہ ہونا ہے۔ نماز کے بعد دعا کہتے ہوئے یہ الفاظ زبان پر آگئے : رب ادخلنی مدخل صدق
واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنك سلطانا نصیرا (اے میرے رب، مجھ کو داخل کر سچا داخل
کرنا، اور مجھ کو نکال سچا نکالنا۔ اور مجھ کو اپنے پاس سے مددگار قوت عطا فرما) بنی اسرائیل ۸۰

۲۴ فروری کو الاستاذ التلامی الراجی الہاشمی کا درس تھا۔ اس کا موضوع تھا: القرآت المتواترة والوقف القیرو انی۔ انھوں نے الترمذی میں انس ابن مالک کی اس روایت کو عنوان بنایا تھا کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأ أَنَّ النفسَ بالنفسِ وَالعینُ بالعینِ (المائدہ) انھوں نے خالص فنی انداز میں قرآن میں اختلاف قرأت اور اختلاف وقف کے اوپر روشنی ڈالی۔

درس کے فوراً بعد افطار کے لئے جانا تھا۔ یہ افطار قصر ملکی کے جنرل کی رہائش گاہ پر تھا۔ رؤساء عرب کے عام دستور کے مطابق بے شمار قسم کے کھانے وافر مقدار میں میزوں پر سجائے ہوئے تھے۔ سوا چھ بجے افطار شروع ہوا۔ واپس فندق میں آئے تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔

سب سے پہلے انواع واقسام کی چیزوں سے افطار کیا گیا جو پورے کھانے کے برابر تھا۔ کھانے کے دوران لوگ طرح طرح کی تفریحی باتیں کرتے رہے۔ آدمی پانی کی ٹرے لے کر آیا تو ایک صاحب نے کہا: الماء لمن طلب۔ دوسرے نے کہا والحلیب لمن حلب۔ اس طرح تفریحی باتوں کے درمیان لوگ کھاتے رہے۔ اس کے بعد مغرب کی نماز کا اعلان ہوا تو ایک صاحب نے کہا: ما اکلنا لا یھضم الا بالصلاۃ۔

مغرب کی نماز کے بعد ایک بڑے کمرہ میں نشست ہوئی۔ یہاں لوگوں کے اوپر عطر چھڑکا گیا۔ بخور جلائے گئے۔ مختلف قاریوں نے قرآن کی تلاوت کی۔ ایک قاری نے اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ کو سات قرأتوں کے ساتھ پڑھ کر سنایا۔ ایک بار دو قاریوں نے مل کر کورس کی صورت میں قرآن کے کچھ حصے پڑھے۔ کسی نے یمن کی قرأت سنائی، کسی نے مغرب کی اور کسی نے مصر کی۔

اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا۔ ایک کے بعد ایک تین بڑی بڑی ٹرے میں لاکر ہر میز پر گوشت رکھ دیا گیا۔ میں تو گوشت کا ایک ریزہ بھی نہ لے سکا۔ تاہم لوگ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ کھاتے رہے۔ حمامہ (کبوتر) کی ٹرے آئی تو ہر شخص نے ایک ایک مسلم کبوتر اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لی۔ ایک صاحب نے کہا: کل واحد بحمام دوسرے صاحب نے کہا: فکل انسان طائرہ فی عنقہ۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا صرف کھانے والوں کا منظر دیکھتا رہا۔ ہر بار گوشت اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ کافی کھانے کے بعد بھی بہت زیادہ بچ جاتا تھا۔

عربوں میں بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جن کو الرسالہ مشن سے گہری دلچسپی ہے۔ عرب نوجوانوں کا ایک حلقہ ہے جس نے ایک درجن سے زیادہ کتابوں کا عربی ترجمہ کروایا ہے اور ان کو قاہرہ سے شائع کیا ہے۔ یہ لوگ ایک اردو داں عالم کی مدد سے ہر ماہ اردو الرسالہ کا مکمل ترجمہ عربی میں کراتے ہیں اور پھر اس کو اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں۔ اس حلقہ کے کئی نوجوان رباط آئے۔ کئی دن تک ان سے اسلام اور الرسالہ مشن کے بارہ میں گفتگو ہوتی رہی۔

دکتور عبد الصبور شاہین (قاہرہ) نے ۲۴ فروری کی ملاقات میں کہا کہ جمال عبد الناصر اقتدار پانے سے پہلے ایک اخوانی تھا۔ اس کی پرورش اخوان کے اندر ہوئی، اس کے بعد اس نے خیانت کی (جمال عبد الناصر رُبّیَ فی الاخوان ثم خان) انھوں نے بتایا کہ ناصر کے ساتھی حسن تہامی کی شہادت ہے کہ ناصر کافر تھا، وہ منکر تھا۔ عبد الصبور شاہین نے کہا کہ ناصر بیسویں صدی کا سب سے بڑا دشمن اسلام تھا۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی باتوں کو پہلے میں اہمیت دیتا تھا، مگر اب میں ایسی باتیں سنتا ہوں تو میں اس کو اہمیت نہیں دے پاتا۔ اس کا سبب میرا ذاتی تجربہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہی اسلام پسند لوگ میرے بارہ میں کہتے ہیں کہ میں اسلام دشمنوں کا ایجنٹ ہوں۔ میں اسلام دشمن طاقتوں سے پیسے لیتا ہوں۔ حالاں کہ یہ باتیں سراسر جھوٹ اور اتہام ہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں صرف قرآن وسنت کے مطالعہ کی بنیاد پر کہتا ہوں، کسی بھی دوسرے شخص یا گروہ کے اشارہ پر ہرگز نہیں کہتا ہوں۔ اس ذاتی تجربہ سے میں نے جانا کہ لوگ اپنے مخالفین کے بارہ میں کتنی زیادہ بے بنیاد بات کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اب میں وہی بات مانتا ہوں جس کا مجھے خود براہ راست علم حاصل ہوا ہو۔

مراکو کے کچھ نوجوانوں نے ایک دینی اور اصلاحی تنظیم قائم کی ہے۔ اس کا نام ہے: حرکۃ الاصلاح والتجدید المغربیۃ۔ ایک نوجوان نے اس کا ۴۲ صفحہ کا میثاق دیا۔ اس کا دسواں قاعدہ التعاون مع الغیر لمصلحۃ المسلمین۔ اس کے تحت درج تھا: ان التعاون علی تحقیق الخیر قد یتجاوز دائرۃ الاسلامیین لیشمل غیرہم من الطاقات الفاعلۃ فی البلد علی ان تحکم ذالک التعاون مصلحۃ راجحۃ للاسلام۔ ومالم یستلزم ذالک مفسدۃ اکبر مصداقا لقول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ لقد شہدت فی دار عبد اللہ بن جدعان حلفا ما احب ان لی بہ حمر النعم۔ ولو دعیت بہ فی الاسلام لاجبت)

۲۵ فروری کی صبح کو رباط سے واپسی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو یہ الفاظ زبان پر آگئے: خدایا آپ ہی مجھ کو خیریت کے ساتھ دہلی سے مراکو لے آئے۔ اب آپ ہی مجھ کو خیریت کے ساتھ دوبارہ دہلی پہنچائیں گے۔ آپ ہی نے مجھ کو پیدا کر کے دنیا میں رکھا، آپ ہی مجھ کو آخرت میں خیریت کے ساتھ داخل کریں گے۔

روانہ ہوا تو خیال آیا کہ سفر میں روزہ رکھوں تاکہ ناغہ نہ ہو۔ پھر یہ حدیث یاد آئی کہ لیس من البر الصیام فی السفر۔ چنانچہ میں نے ۲۵ فروری کو روزہ نہیں رکھا۔ البتہ ۲۶ فروری کی صبح آئی تو روزہ کی نیت کر لی۔

۲۵ فروری کی صبح کو واپسی تھی۔ ہوٹل سے ایرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ دکتور ابراہیم الزفاعی کا ساتھ رہا۔ وہ بیک وقت علمی اور صوفیانہ مزاج کے آدمی ہیں۔ اتفاق سے یہی میرا مزاج بھی ہے۔ چنانچہ راستہ میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایرپورٹ پہنچے تو میرے ساتھ حسب معمول صرف ایک بیگ تھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا: فاز المخفقون۔

الدار البیضاء (کیسابلانکا) سے پیرس کے لئے ایرمراک، فلائٹ ۳۸۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف چیزیں پڑھیں۔ نیوز ویک (۲۸ فروری ۱۹۹۴) کی کور اسٹوری کا عنوان تھا:

A child's diary of war.

ایک تیرہ سالہ لڑکی (Zlata Filipovic) بوسنیا کے شہر سراجیو (Sarajevo) میں رہتی تھی۔ اب وہ پیرس میں ہے۔ اس نے سراجیو میں ڈائری لکھنا شروع کیا۔ اس کی یہ ڈائری حال ہی میں امریکہ سے چھپی ہے۔ اس میں اس نے اپنے احساسات درج کئے ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ اس کا ایک تاثر انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا تھا کہ سرب، کرواٹ اور مسلمان سب ایک قوم کے لوگ ہیں۔ سیاست کیوں ہم کو الگ کر رہی ہے۔ یہ سیاست بڑی عمر کے لوگ چلا رہے ہیں۔ ہم نوجوان اس کو زیادہ بہتر طور پر چلا سکتے ہیں:

Serbs, Croats and Muslims — they are all people. Why is politics separating us. Politics are conducted by grown-ups. We young would do it better. (12)

اس ڈائری کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ بوسنیا میں اسی قسم کی سیاست چلائی گئی جو برصغیر ہند میں چلائی

کئی مسلم لیڈروں نے تقسیم ہند کی تحریک چلائی۔ اس کے جواب میں اکھنڈ بھارت کی تحریک چلی۔ ان تحریکوں کے نتیجہ میں جو گرمی پیدا ہوئی اس نے ہندستان کو جھلس کر رکھ دیا۔ ٹھیک یہی بوسنیا میں بھی پیش آیا۔

راستہ میں ایئر انڈیا کا فلائٹ میگزین (جنوری۔ فروری ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۱۷ پر یہ جاذب سرخی تھی ـــــ سکائی ٹیلیفون (sky phone) اس سرخی کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ دنیا آپ کی انگلی کے تحت (The world at your tip) اس میں بتایا گیا تھا کہ ایئر انڈیا کے بوئنگ جہاز میں سفر کرتے ہوئے آپ سکائی ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا کے کسی بھی مقام پر ٹیلیفون کر سکتے ہیں:

On the Boeing 747-400, you can call anywhere around the globe, using skyphone.

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مشینی واقعات گویا قدرت الٰہی کا تعارف ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ ہر جگہ جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اپنے حکم کی تنفیذ کر رہا ہے۔ یہ عظیم واقعہ کیوں کر انجام پاتا ہے، موجودہ مشینی ترقیاں اسی کا ابتدائی سطح پر امکانی تعارف ہیں۔

اگر آپ نقشہ پر دیکھیں تو کیسا بلانکا سے دہلی آنے کے لئے سیدھا راستہ اس طرح ہے ـــــ کیسا بلانکا، طرابلس، اسکندریہ، کویت، بندر عباس، دہلی۔ مگر میں کیسا نکا سے پیرس جا رہا ہوں۔ یہ گویا الٹی طرف سفر ہے۔ پھر پیرس سے میں دہلی کے لئے فلائٹ لوں گا۔ یہ مسلم دنیا کے پچھڑے پن کی قیمت ہے۔ کیوں کہ مناسب پرواز مجھے پیرس ہی سے مل سکتی ہے۔

کیسا بلانکا (الدار البیضاء) سے پیرس جاتے ہوئے ہمارا جہاز اسپین کے اوپر سے گزرا۔ اسپین کے تصور سے ماضی کی تاریخ کی بہت سی باتیں تازہ ہوگئیں۔ اسپین میں مسلمانوں کا دور ایک بے حد پُراز واقعات دور تھا۔ شاید کسی بھی دوسرے مقام سے اتنے زیادہ اسلامی واقعات وابستہ نہیں ہیں جتنا کہ اسپین سے وابستہ ہیں۔ اسپین میں تقریباً ہر قسم کے واقعات موجود ہیں۔ وہ بذاتِ خود ایک مکمل تاریخ ہے۔ تاہم اس وقت میں مسلم اسپین کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ کیوں کہ جلد ہی اِن شاء اللہ اسپین کے لیے میرا ایک سفر ہوگا۔ اس وقت سفرنامہ اسپین کے تحت اِن شاء اللہ اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون (۲۵ فروری) دیکھا۔ اس کے ایڈورٹائزمنٹ سکشن میں نوصفحے کویت کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ خلیج کی جنگ کے بعد کویت کس طرح دوبارہ معمول پر آگیا ہے اور ترقی کی طرف اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ اس دنیا میں نقصانات پیش آتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ دنیا میں یہ امکان بھی وافر مقدار میں موجود ہے کہ اگر ہمت اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو ہر نقصان نئے عظیم تر فائدہ کا زینہ بن جاتا ہے۔ اخبار میں نئے کویت کی جو تصویریں دی گئی تھیں ان میں سے ایک مسجد بھی تھی جو جدید کویت کے اوپر گویا خدائی نگراں کے طور پر کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مذکورہ ٹریبون کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ بوسنیا کے مسلمان اور کرواٹ دونوں کے نمائندے واشنگٹن میں اس ہفتہ کے آخر میں ملنے والے ہیں تاکہ بوسنیا میں مشترکہ دوقومی ریاست (unified bi-national Bosnian state) کی تجویز پر گفت گو کرسکیں۔ حالات بتاتے ہیں کہ بوسنیا کے لوگوں نے زندگی کا یہ راز پالیا ہے —— لیک بعد از خرابی بسیار۔
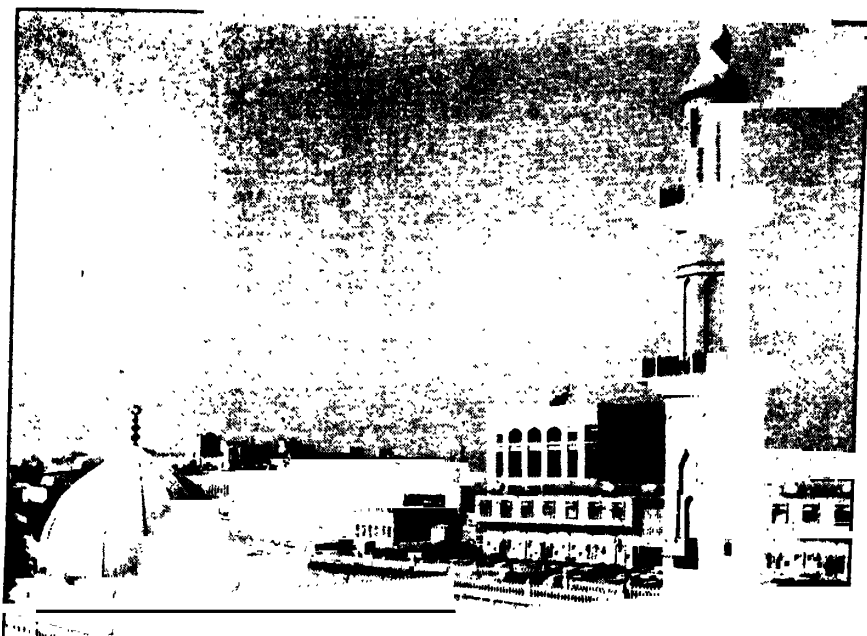
Mosques and minarets across a changing skyline in Kuwait City. Falling oil prices may slow construction activity.

ہر زبان میں ایک مقام اور دوسرے مقام کے لہجہ میں فرق ہوتا ہے۔ یہی معاملہ عربی زبان کا بھی ہے۔ مراکو مغربی سمت میں عرب دنیا کا بعید ترین ملک ہے۔ چنانچہ یہاں آتے آتے لہجہ کا فرق آخری حد تک مختلف ہو گیا ہے۔ یہاں کے علما ہم لوگوں سے فصیح زبان میں بولتے تھے۔ اس لئے ان کی بات تو بخوبی سمجھ میں آتی تھی۔ مگر عوام کی بولی سمجھنا میرے لئے سخت مشکل تھا۔

عوام کی سطح پر یہاں کا عربی لہجہ اتنا زیادہ مختلف ہے کہ جب ایک شخص بولتا ہے اگرچہ وہ عربی بول رہا ہوتا ہے مگر کتابی عربی جاننے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر زبان بول رہا ہے۔ مثلاً میرے ساتھ جو سائق تھا، اس نے اپنا نام لبدوی محمد بتایا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ لبدوی اصل میں البدوی ہے۔ سائق جب کچھ کہتا تو مشکل سے اس کا کوئی لفظ میری سمجھ میں آتا۔ میں صرف اندازہ سے سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مثلاً ایک بار جب مجھے درس میں شرکت کے لئے شاہی قصر میں جانا تھا۔ میں نے ایک صاحب کی بابت پوچھا۔ سائق (ڈرائیور) نے کہا: ماشَن کافی سوچنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ رہا ہے: مَشیٰ یعنی وہ چلے گئے۔

یہ قرآن کی طاقت تھی جس نے عربی زبان کو سابقہ حالت پر باقی رکھا۔ ورنہ اب تک عربی زبان بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہوتی۔ بلکہ لہجوں میں تقسیم ہوتے ہوتے وہ کئی الگ الگ زبان کی صورت اختیار کر لیتی۔

کیسابلانکا سے آنے والے جہاز نے مجھ کو اورلی (مقامی ایرپورٹ) پر اتارا تھا۔ اس کے بعد مجھ کو چارلس ڈیگال (انٹرنیشنل ایرپورٹ) پر جانا تھا۔ دونوں ایرپورٹ کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ تاہم ایرفرانس کی طرف سے ہر وقت بس آتی جاتی رہتی ہے۔ ایرپورٹ کے باہر آکر میں نے یہ بس پکڑی اور اس کے بعد چارلس ڈیگال ایرپورٹ آگیا۔ یہاں سے ایرانڈیا کی فلائٹ ۱۴۸ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ پیرس سے دہلی تک ۶۵۹۲ کیلومیٹر کا سفر تقریباً آٹھ گھنٹہ میں طے ہوا۔

پیرس ایرپورٹ پر فرانسیسی پولیس نے میرا پاسپورٹ لے لیا اور مجھ کو "انٹروگیشن" کے کمرہ میں لے گئی۔ وہاں پہنچا تو ایک اور داڑھی والے مسلمان کو پولیس نے بٹھا رکھا تھا۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مراکو کے بن حماد مولای عمر ہیں جو کہ کلیۃ الآداب والعلوم الانسانیہ (المحمدیہ) میں

استاد ہیں۔ تعارف کے بعد وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس الاسلام یتحدی کے دو نسخے ہیں۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا ہے اور اپنی تقریروں میں اس سے بہت کام لیتا ہوں۔

فرانسیسی پولیس نے میری ایک ایک چیز کی نہایت مکمل جانچ کی۔ اور دیر تک مجھے ایئر پورٹ پر روکے رکھا۔ مذکورہ مراکشی عالم سے میں نے پوچھا کہ آخر یہ لوگ اتنی سخت جانچ کیوں کر رہے ہیں۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ خود اپنے کچھ لوگوں کی نادانی کے نتیجہ میں ایسا پیش آیا ہے۔ کچھ مسلمان ان کے ملکوں میں تخریبی کارروائی کرتے ہیں اور تمام مسلمانوں کو وہ مشتبہ سمجھ لیتے ہیں۔ ہم اسی کی قیمت ادا کر رہے ہیں (نحن نؤدی الثمن)

پیرس سے دہلی کے راستہ میں مختلف پرچے دیکھے۔ الشرق الاوسط (۲۵ فروری) میں صفحہ پر ایک مضمون کا عنوان تھا: الآخرون تعلموا من مصائبنا، فمتی نتعلم (دوسروں نے ہماری مصیبتوں سے سبق لیا، پھر ہم کب سبق لیں گے) اسی طرح ادارتی نوٹ کا عنوان ان لفظوں میں تھا: الحرب الباردة وھبا تھا الساخنة (سرد جنگ اور اس کے گرم جھونکے) اس کو پڑھ کر خیال آیا کہ آجکل ہر مسلم اخبار، خواہ وہ کسی زبان میں ہو، اسی قسم کی شکایتی باتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم صحافت فریاد اور احتجاج کی صحافت بن کر رہ گئی ہے۔

یہ پیرس سے دہلی تک کی نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ تقریباً آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ۲۶ فروری ۱۹۹۴ کی صبح کو جہاز دہلی کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ جہاز سے باہر آیا تو کسٹم کے ہال میں بہت بڑی تعداد میں لوگ اپنے بھاری سامانوں کے ساتھ مختلف کھڑکیوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ دستی بیگ کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ چنانچہ میں کسی حساب کتاب کے بغیر چلتا ہوا ایئر پورٹ کے باہر آگیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کی طرف سے مظفر نگر میں مسلمانوں کے لئے ریزویشن اور ایجوکیشن کے موضوع پر ایک سمینار ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۴ کو ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے چیف گیسٹ کی حیثیت سے شرکت کی اور تعلیم کے موضوع پر خطاب کیا۔ مظفر نگر میں حاجی عقیل احمد صاحب کے مکان پر قیام تھا۔ یہاں متعدد تعلیم یافتہ اصحاب سے ملی مسائل پر گفت گو ہوئی۔

انگریزی اخبار ایشین ایج کی نمائندہ مسز مینل باگمیل نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد اجودھیا کے بارہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ (۲۳ اکتوبر) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ صدارتی ریفرنس کو واپس کرکے سپریم کورٹ نے اپنے آپ کو اس معاملہ میں شمولیت سے بچالیا اور معاملہ کو گویا دوبارہ حکومت کے حوالے کر دیا:

It is like throwing the ball back into the government's court.

ہفت روزہ نئی دنیا کے نمائندہ مسٹر جمال فہمی نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد اشو پر صدارتی ریفرنس کے بارہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس میں ضمنی امور پر تو فیصلہ دیا گیا ہے۔ مگر اصل مسئلہ بدستور برقرار ہے۔ یعنی یہ کہ کیا بابری مسجد کسی مندر کو توڑ کر بنائی گئی تھی۔

پروفیسر جیمز پسکاٹوری (James Piscatori) نیویارک کی کونسل آن فارین ریلیشنز میں سینئر فیلو ہیں۔ وہ مسلم پالی ٹکس پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۴ کو وہ مرکز میں آئے اور اس موضوع پر صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام مغرب کے لئے خطرہ نہیں ہے۔ البتہ کچھ پرجوش مسلمان اپنی نادان کارروائیوں سے مغرب کے لئے بعض مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اسلام اور مسلمانوں کو الگ کرکے دیکھیں۔ موصوف کا ایک خط ملا ہے جو اگلے صفحہ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

14 November 1994

Mawlana Wahiduddin Khan
C-29 Nizamuddin West
New Delhi 110013

Dear Mawlana,

I write to thank you ever so much for kindly seeing me when I was briefly in Delhi. It was an honour to have met you after having read so many of your imporant works. I learned a great deal from our discussion, and I was especially pleased to have your thoughts on my project. I do agree with you that a distinction ought to be drawn between "political Islam", which does not really exist, and "political Muslims", who do.

Your gift of the book, Indian Muslims, was most generous, and I will look forward to reading it very soon. I am sure that I will find in it the same cogency and insight that I heard from you in Delhi.

I hope you will not mind if I stay in touch. I would very much like to meet you again on my next visit.

With my warm thanks again for your hospitality and assistance, and very best wishes to you.

Yours sincerely,

James Piscatori

James Piscatori

58 EAST 68TH STREET NEW YORK, NY 10021 ■ TEL (212) 734-0400 ■ FAX (212) 861-1916

۲۸ الرسالہ مارچ ۱۹۹۵

صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس تقریر کا عنوان تھا : تصوف اور تہذیب نفس۔
بڑودہ میں ۱۳ نومبر ۱۹۹۴ کو ریلیجن اینڈ سوسائٹی کے موضوع پر ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس سے خطاب کیا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔
محمد اقبال صاحب (اندور) لکھتے ہیں : الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۴ میں آپ نے اپنے دلائل، خصوصاً مولانا مودودی، مولانا علی میاں، مولانا حسین احمد مدنی کی جو تحریریں پیش کی ہیں ان کے بعد اگر کوئی نہ مانے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ ورنہ بات تو پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی اور اتمام حجت ہو چکا۔
کچھ حضرات نے توجہ دلائی ہے کہ الرسالہ مشن کی مخالفت میں جو کتابیں چھاپی جا رہی ہیں ان کا جواب دیا جائے۔ مگر یہ کتابیں اتنی لغو ہیں کہ ان کا جواب دینا وقت ضائع کرنا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب چھپی ہے۔ "مولانا وحید الدین کی فکری قلابازیاں"۔ اس کے صفحہ ۷۰ پر "میوات کا سفر" نامی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے درج ہے کہ " مولانا صاحب صاحب لکھتے ہیں کہ الجمعیۃ ویکلی کی ادارت کے زمانہ میں مجھے میوات جانے اور وہاں کے حالات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا"۔ اس اقتباس کے بعد اس میں لکھا ہے کہ " بات پوری نہیں ہوتی۔ آگے کا جملہ یہ کہ .....؟ " آگے کا جملہ یہ ہے کہ" لکھ کر جو سطریں درج ہیں وہ سراسر جھوٹ ہیں۔ اصل کتاب (میوات کا سفر) میں ایسی کوئی بات سرے سے موجود ہی نہیں۔
۹ بھارتیہ ودیا بھون کے نمائندہ مسٹر پی ورڈ برا جی ۱۰ نومبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز سے ملے۔ اور اسکول کے بچوں کے لئے ایک ایسی ریڈر تیار کرنے کی فرمائش کی جس میں اسلامی شخصیتوں کے پچیس اخلاقی واقعات سادہ انداز میں بیان کئے گئے ہوں۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہوگی۔
۱۰ اسفار ہند کے نام سے ایک کتاب ترتیب کے آخری مرحلہ میں ہے۔ یہ کتاب گویا سفروں کی صورت میں ملک کے اندر دعوتی اور تعمیری امکانات کا ایک مطالعہ ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	\$20 / £10	\$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	\$35 / £18	\$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	\$50 / £25	\$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	\$80 / £40	\$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	\$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اپریل ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۱

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 □ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

خدا کا قانون

ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ وشاقوا الرسول من بعد ما تبین لہم الہدیٰ لن یضروا اللہ شیئا وسیحبط اعمالہم (محمد ۳۲)

بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا اور رسول کی مخالفت کی جب کہ ہدایت ان پر واضح ہو چکی تھی، وہ اللہ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ ان کے اعمال کو ڈھا دے گا۔

اس آیت میں اور اس نوعیت کی دوسری آیتوں میں اللہ کے ایک نہایت اہم قانون کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ حق کا انکار کریں اور حق کے راستہ میں رکاوٹ ڈالیں اور حق کے داعیوں کے مخالف بن کر کھڑے ہوں، وہ حق کا اور حق کے علم برداروں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ ان کی تمام مخالفانہ کارروائیاں عین قانون خداوندی کے تحت ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں گی۔

مگر اس کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ یہ مخالفین وہ ہوں جن پر ہدایت کی تبیین کی گئی ہو۔ جن کے اوپر امر حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہو۔

اس شرط کا تعلق مخالفین سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق خود حق کے داعیوں سے ہے۔ حق کے داعیوں کی طرف سے اگر یہ شرط پوری کر دی گئی ہو تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دشمنان حق کی کوئی بھی سازش یا کوئی بھی مخالفانہ کارروائی اہل حق کے اوپر کارگر نہ ہو سکے گی۔ وہ اپنی تمام تدبیروں کے باوجود یقینی طور پر اس میں ناکام رہیں گے کہ حق کے داعیوں کو کوئی واقعی نقصان پہنچا سکیں۔

جب کچھ لوگ خالص حق کی دعوت لے کر اٹھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ اس کو تکمیل تک پہنچائیں تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ فریق ثانی کے اندر جتنی سعید روحیں ہوتی ہیں، وہ سب اللہ کی توفیق سے حق کو قبول کر کے حق پرستوں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ تبیین کے باوجود حق کے منکر بنے رہیں، وہ اپنی دانستہ سرکشی کی بنا پر اس کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ انھیں پکڑے اور ان کو مغلوب کر کے اہل حق کو ان کے اوپر غلبہ عطا کر دے۔

ربانی، سیاسی

موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی کتابوں میں اسلامی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، وہ وسیع تر تقسیم میں صرف دو ہے۔ ایک وہ جو روحانی ماڈل پر مبنی ہے۔ دوسرا وہ جو نظامی ماڈل پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کو ربانی ماڈل اور سیاسی ماڈل کہا جا سکتا ہے۔

ربانی ماڈل میں اسلام کے داخلی تقاضوں پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں انفرادی شخصیت کی تعمیر کو ساری اہمیت حاصل ہے۔ اس میں صِلۃُ العبد بربّہ کے پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ ربانی ماڈل میں معرفتِ خداوندی کی غذا ہے۔ اس میں حکمت کی روشنی ہے۔ اس میں اللہ سے ڈرنے اور اللہ سے محبت کرنے کے تجربات ہیں۔ اس میں جہنم سے بھاگنا اور جنت کی طرف دوڑنا ہے۔ اس میں آنکھوں سے آنسو نکلنا اور جسم کے رونگٹے کھڑے ہونا ہے۔ ربانی ماڈل میں اپنا احتساب ہے۔ بولنے سے زیادہ چپ رہنا ہے۔ اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھنا ہے۔ دنیا میں کھو کر آخرت میں پانا ہے۔ نفرت کے جواب میں محبت اور بدخواہی کے بدلے میں خیر خواہی ہے۔ لوگوں کی زیادتیوں پر معاف کرنا اور ستانے والوں کے حق میں دعا کرنا ہے۔

اس کے مقابلہ میں سیاسی ماڈل تمام تر خارجی نقشوں پر قائم ہے۔ وہ بظاہر داخلی الفاظ بھی بولتا ہے مگر عملاً اس کی ساری توجہ زندگی کے بیرونی ڈھانچہ کے گرد گھومتی ہے۔ سیاسی ماڈل میں سماجی اور قانونی مسائل پر بحثیں ہیں۔ حکومتوں سے ٹکراؤ کرنا ہے۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے منصوبے ہیں۔ جہاد کے نام پر گن کلچر چلانا ہے۔ انسان کو دشمن اور دوست کے خانوں میں بانٹنا ہے۔ محبت کے بجائے نفرت کو فروغ دینا ہے۔ امن کے بجائے تشدد کے طریقہ کو رائج کرنا ہے۔ ربانی ماڈل کا فوکس اگر آخرت ہے تو سیاسی ماڈل کا فوکس صرف دنیا۔

تاہم ربانی ماڈل ہی سچا اسلامی ماڈل ہے۔ سیاسی ماڈل اسلام میں بالکل اجنبی ہے۔ سیاسی ماڈل کو اختیار کرنے والے لوگ وقتی طور پر کچھ دنیوی چیزیں حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر آخرت کی ابدی دنیا میں وہ بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ آخرت میں انھیں لوگوں کو عزت اور مقام ملے گا جو اسلام کے ربانی ماڈل کو اختیار کریں۔

۵ الرسالہ اپریل ۱۹۹۵

نفسیاتِ دعا

امریکہ کے سفر میں ایک مسلمان بھائی مجھے اپنے شاندار مکان میں لے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے میز پر پرتکلف کھانا رکھا جس کو میں حسب عادت کھا نہ سکا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ مجھے کوئی بہت اچھی سی دعا بتائیے جو میرے اور میرے بچوں کے لیے دین اور دنیا کی فلاح کی ضامن بن جائے۔ میں کچھ دیر تک خاموش ہو کر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ دعا عربی الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ دعا حقیقۃً ان روحانی کلمات کا نام ہے جو دعا والی نفسیات کے ساتھ آدمی کے اندر سے نکلے ہوں۔ جو لوگ دعا کی اعلیٰ نفسیات سے خالی ہوں وہ یقیناً اعلیٰ دعا کی نعمت سے بھی محروم رہیں گے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا حال یہ ہے کہ آپ لوگ دنیوی اسٹیٹس (status) کو اپنا سب سے بڑا کنسرن بنائے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی اصل انکم سے زیادہ بڑی حیثیت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے آپ میں سے ہر شخص سودی قرضوں میں نہایا ہوا ہے۔ آپ چھوٹے مکان کو چھوڑ کر بڑا مکان لیتے ہیں۔ آپ سکنڈ ہینڈ کار کے بجائے نئی شاندار کار خریدتے ہیں۔ آپ سادہ فرنیچر کے بجائے زرق برق فرنیچر سے اپنا گھر سجاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ سودی قرض پر ہوتا ہے جس کی قسطیں آپ زندگی بھر ادا کرتے رہتے ہیں۔

اس قسم کی مصنوعی زندگی نے آپ لوگوں کو دعا والی نفسیات سے محروم کر دیا ہے۔ دعا کی نفسیات جن تجربات کے دوران بنتی ہے، وہ ہیں — عجز، پستی، دل شکستگی، کم مائگی، احساس محرومی، عدم یافت۔ مگر آپ اپنے کو ان چیزوں سے دور رکھتے ہیں۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ مسائل حیات کے دوران آپ کو ان قیمتی تجربات سے گزارے۔ مگر آپ کی مسلسل یہ کوشش ہوتی ہے کہ سودی قرضوں کی مصنوعی تدبیر سے اپنے کو اور اپنے بیوی بچوں کو تجرباتِ حیات کے اس کورس سے گزرنے نہ دیں۔

آپ کو جاننا چاہئے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اسی طرح یقیناً دعا کی بھی ایک قیمت ہے۔ اچھی دعا اچھے الفاظ کا نام نہیں ہے۔ اچھی دعا اچھی نفسیات کا نام ہے۔ جس طرح اچھے گھر کی ایک قیمت ہوتی ہے، اسی طرح اچھی دعا کی بھی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں قیمت ادا کئے بغیر کوئی چیز نہیں ملتی، نہ ایک اچھا مکان اور نہ ایک اچھی دعا۔

لوگ دعا کا نتیجہ چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے دعا کی قیمت ادا کی ہو، بغیر اس کے کہ انھوں نے خدا کے سامنے حقیقی دعا کا تحفہ پیش کیا ہو۔

تقویٰ کا مرکز

بدر الدین محمد بن بہادر الزرکشی (م ۷۹۴ھ) قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی کتاب إعلام الساجد میں مسجد سے متعلق بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

قال ابو الدرداء لابنه - یا بنی، لیکن المسجد بیتك۔ فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: المساجد بیوت المتقین۔ فمن یکن المسجد بیته یضمن الله له الروح والرحمة والجواز علی الصراط الی الجنة۔

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اے میرے بیٹے مسجد کو اپنا گھر بناؤ۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں۔ پس مسجد جس کے لئے گھر ہو جائے اللہ اس کو رحمت اور مہربانی کی ضمانت دیدیتا ہے اور اس کو جنت کے راستہ کا پروانہ عطا فرماتا ہے۔

اس حدیث میں بیت کا لفظ سادہ طور پر گھر کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ دراصل اس معنی میں ہے کہ جس معنی میں آجکل مرکز کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد کسی بستی کا وہ مقام ہے جہاں اجتماعی طور پر لوگوں کو متقیانہ زندگی کا سبق دیا جاتا ہے۔

ایک مومن کو اس دنیا میں جو دین دارانہ زندگی گزارنا ہے، اس کا مکمل نمونہ نماز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی لئے حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ نماز دین کا کھمبا ہے۔ جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے اس کو ڈھادیا اس نے دین کو ڈھادیا (الصلاة عماد الدین، فمن اقامها اقام الدین ومن هدمها هدم الدین)

مسجد سے روزانہ اللہ اکبر کی آواز سنائی جاتی ہے۔ یہ اس بات کی یاد دہانی ہے کہ انسان چھوٹا ہے اور خدا بڑا۔ مسجد میں داخل ہوکر آدمی وضو کرتا ہے، یہ اس بات کا سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ پاک صاف رہنا چاہئے۔ مسجد میں آدمی رکوع اور سجدہ کرتا ہے، یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ دنیا میں تواضع کے ساتھ رہو۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی ہے، یہ اس بات کی تربیت ہے کہ اجتماعیت کے ساتھ زندگی گزارو۔

دنیا، آخرت

اس دنیا میں آدمی کبھی کھوتا ہے اور کبھی پاتا ہے۔ کبھی اس کو زخم لگتا ہے اور کبھی اس کو راحت ملتی ہے۔ کبھی وہ خوشی کا تجربہ کرتا ہے اور کبھی غم کا تجربہ۔ کبھی اس کی خواہش پوری ہوتی ہے اور کبھی اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ مگر یہ سب کے سب اضافی ہیں۔ دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ دنیا کا واقعہ صرف دنیا کا ایک واقعہ تھا یا دنیا کے اس واقعہ میں آدمی کو آخرت کی کوئی خوراک حاصل ہوئی۔

کامیابی حقیقۃً یہ نہیں ہے کہ آپ نے دنیوی اہمیت کی کوئی چیز پالی۔ اسی طرح ناکامی یہ نہیں ہے کہ آپ نے دنیوی اہمیت کی کوئی چیز کھو دی۔ کامیابی اور ناکامی دونوں کا معیار آخرت ہے۔ کامیابی بھی آخرت کی کامیابی ہے اور ناکامی بھی آخرت کی ناکامی۔

آپ کے سامنے حق آیا۔ اس کا اعتراف کرنے میں آپ کا مرتبہ نیچا ہو رہا تھا اور اس کا انکار کرنے میں آپ کا مرتبہ بلند ہو رہا تھا۔ اب اگر آپ اس کو رد کرنے کے لئے ایک شاندار لفظ پالیں اور اس طرح اپنے مرتبہ کو اونچا رکھنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ آپ کی کامیابی نہیں ہوگی بلکہ عین ناکامی ہوگی۔ کیونکہ آپ نے وقتی طور پر کچھ انسانوں کی نظروں میں اپنے کو اونچا اٹھایا، مگر آپ نے خدا کی نظر میں ہمیشہ کے لئے اپنے کو نیچا کر لیا۔

اس کے برعکس اگر آپ نے اپنے مرتبہ کا لحاظ کئے بغیر سیدھی طرح حق کا اعتراف کر لیا اور اس کے نتیجہ میں آپ کا درجہ عوام کی نظر میں نیچا ہو گیا تو بظاہر اگرچہ آپ ناکام رہے۔ مگر یہ آپ کے لئے عین کامیابی تھی۔ کیونکہ وقتی پستی کو گوارا کر کے آپ نے آخرت کی ابدی بلندی کا درجہ حاصل کر لیا۔

یہی معاملہ تمام دنیوی تجربات کا ہے۔ ہر تجربہ، خواہ وہ منفی تجربہ ہو یا مثبت تجربہ، اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے کا اصلی معیار آخرت ہے۔ دنیا کی تلخی اگر آدمی کے ربانی احساس کو جگا دے۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑیں کہ خدایا، میں اس چھوٹی مصیبت پر صبر کرتا ہوں تاکہ تو آئندہ آنے والی بڑی مصیبت سے بچا لے تو اس نے اپنے دنیوی نقصان کو اخروی فائدہ میں تبدیل کر لیا۔ اس کے برعکس اگر آدمی کو سکھ ملے اور وہ اس میں مگن ہو کر خدا کو بھول جائے تو اس کا سکھ اس کے لئے سب سے بڑا دکھ تھا۔ کیوں کہ اس نے اس کو آخرت کی فکر سے غافل کر دیا۔

دنیا سے دنیا کو لینے کا نام ناکامی ہے اور دنیا سے آخرت کو لینے کا نام کامیابی۔

انسان کی کہانی

پبلی لیس سائرس (Publilius Syrus) پہلی صدی قبل مسیح کا ایک رومی مصنف ہے۔ اس کی تحریریں لاتینی زبان میں ہیں۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے:

A good opportunity is seldom presented, and is easily lost.

یعنی ایک اچھا موقع مشکل سے آتا ہے اور وہ بہت آسانی سے چلا جاتا ہے۔

لاتینی مصنف نے یہ بات دنیا کے اعتبار سے کہی ہے۔ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے قیمتی مواقع ہر وقت موجود نہیں رہتے۔ وہ کبھی کبھی سامنے آتے ہیں۔ مگر اکثر لوگ اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ وہ بر وقت اس کو استعمال نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ موقع نکل جاتا ہے اور اس کے بعد لوگوں کے حصہ میں جو چیز باقی رہتی ہے وہ صرف یہ افسوس ہوتا ہے کہ کیسا قیمتی موقع میں نے کتنی نادانی سے کھو دیا۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کا ہے۔ آخرت کے لئے کچھ کرنے کا موقع ہر آدمی کو ملتا ہے۔ مگر یہ موقع کسی آدمی کو صرف ایک بار ملتا ہے۔ پھر یہ موقع اچانک آدمی کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد جب آدمی کی آنکھ کھلتی ہے تو اس کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ اب یہ ابدی افسوس اس کا مقدر بن جاتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کو کمانے کا کتنا قیمتی موقع اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا تھا اور میں نے کتنی غفلت میں اسے کھو دیا۔

دنیا میں ہر آدمی کو یکساں مواقع دئے گئے ہیں۔ مگر آخرت میں کسی آدمی کا کیس ضائع شدہ مواقع (Missed opportunities) کا کیس ہوگا اور کسی آدمی کا کیس استعمال شدہ مواقع (Availed opportunities) کا کیس۔ یہی چند الفاظ میں ہر ایک کی کہانی ہے۔

یہ صورت حال دنیا میں زندگی کے معاملہ کو بے حد نازک بنا دیتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے اعتبار سے تو ایک موقع کھونے کے بعد دوسرا موقع ملنے کا بھی امکان رہتا ہے۔ مگر آخرت کا موقع ایک بار ملنے کے بعد دوسری بار ملنے والا نہیں۔ یہاں جو شخص ایک بار کامیاب ہوا وہ ہمیشہ کے لئے کامیاب ہو گیا اور جو ایک بار ناکام ہوا وہ ہمیشہ کے لئے ناکام رہ گیا۔

آج اور کل

اقوامِ متحدہ نے ۱۹۷۵ میں رزولیوشن نمبر ۳۳۷۹ پاس کیا تھا۔ اس میں صہیونیت (zionism) کے برابر قرار دیا گیا تھا (racism) کونسل پرستی۔ اس وقت انڈیا نے بھی رزولیوشن کی تائید کی تھی۔

یہودی لابی اور امریکہ اسی وقت سے اس کوشش میں تھے کہ اس رزولیوشن کو اقوام متحدہ میں ختم کرائیں۔ مگر حالات ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ خاص طور پر سوویت یونین کے زیر اثر ممالک (East Block) تمام کا تمام اس رزولیوشن کی حمایت میں تھا۔

مگر سوویت یونین کے ٹوٹنے کی وجہ سے یہودی لابی اور امریکہ کو موقع مل گیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۹۱ کو امریکہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس رزولیوشن کی تنسیخ کا رزولیوشن پیش کیا۔ انڈیا سمیت پورے ایسٹ بلاک نے امریکی تجویز کی حمایت کی۔ ۲۵ کے مقابلہ میں ۱۱۱ ووٹوں سے سابق رزولیوشن منسوخ کر دیا گیا۔ واضح ہو کہ بوقت رائے شماری اقوام متحدہ کے ممبروں کی تعداد ۱۶۶ تھی۔ ان میں سے ایک تعداد نے غیر جانب داری کا طریقہ اختیار کیا۔

امریکی نمائندہ ایگل برگر (Lawrence Eagleburger) نے کہا کہ وہ دور جس نے رزولیوشن ۳۳۷۹ کو پیدا کیا تھا وہ اب تاریخ کی چیز بن چکا ہے:

The era which produced resolution 3379 has passed into history.

۱۹۷۵ سے ۱۹۹۱ تک سوویت یونین کو سپر پاور کی حیثیت حاصل تھی۔ امریکہ کے خلاف اپنا جتھا بنانے کے لئے وہ مذکورہ رزولیوشن کی تائید کر کے اس کو قائم کئے ہوئے تھا۔ اب امریکہ کو واحد سپر پاور کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نے ۱۶ سال بعد اس رزولیوشن کا خاتمہ کر دیا۔

جس کو بھی طاقت ملتی ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق تاریخ لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں کسی کو بھی مستقل حیثیت حاصل نہیں۔ یہاں کسی کے لئے ۱۶ سال کا موقع ہے اور کسی کے لئے ۱۶ دن کا۔ مگر ہر آدمی اپنی اس حیثیت کو بھولا ہوا ہے، بے زور بھی اس سے اتنا ہی بے خبر ہے جتنا کہ کوئی زور آور۔

ایمان ایک معرفت

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا۔ الامن تاب و آمن وعمل صالحاً فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئاً۔ (مریم ۵۹ - ۶۰)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو کھودیا اور خواہشوں کے پیچھے پڑگئے۔ پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے۔ البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

قرآن کی اس آیت میں خلف یا اخلاف سے مراد کسی امت کی بعد کی نسلیں ہیں۔ یہ بعد کو پیدا ہونے لوگ، خود قانون قدرت کے تحت، پہلی نسل کے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے اندر مقصد کے بجائے خواہشات کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ ان کے یہاں عبادت کی ظاہری شکل باقی رہتی ہے مگر اس کی اندرونی روح نکل جاتی ہے۔ کسی امت میں بعد کو پیدا ہونے والے افراد کا ہمیشہ یہی انجام ہوتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو از سر نو ایمان اور توبہ اور عمل صالح کی توفیق حاصل ہو۔

ایمان کیا ہے۔ ایمان ایک ذہنی انقلاب کا نام ہے جس کو حدیث میں عرفان یا معرفت کہا گیا ہے (من عرف اَن لا الٰہ اِلّا اللہ دخل الجنۃ) یہ ذہنی انقلاب ایک ناقابل انتقال چیز ہے۔ وہ باپ سے بیٹے کو منتقل نہیں ہوتی۔ باپ اگر سائنس کا عالم ہو تو اس کا علم اس کی نسل کو منتقل نہیں ہوگا۔ اگلی نسل کو خود ذاتی محنت سے سائنس کا علم حاصل کرنا پڑے گا۔

اسی طرح اسلام کی معرفت ایک فرد کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اندر جو فکری انقلاب آتا ہے وہ اس کا ذاتی اکتساب ہوتا ہے۔ وہ وراثتی طور پر اپنے آپ اگلی نسل کو نہیں مل جاتا۔ اسلام کی معرفت حاصل کرنا ایک ایسا عمل ہے جو ہر نسل میں دوبارہ جاری ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی ذاتی محنت سے اس کو از سر نو حاصل کرتا ہے۔ ایمان ایک دریافت ہے، اور دریافت مکمل طور پر ایک ذاتی اکتساب ہے، وہ کسی بھی درجہ میں وراثتی اثاثہ نہیں۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ ہر سو سال کے سرے پر ایسا شخص پیدا کرے گا جو لوگوں کے دین کی تجدید کرے گا۔ یعنی اپنی مصلحانہ کوشش سے از سر نو انھیں ایمانی معرفت عطا کرے گا۔

احیاء ملت

دہلی کا قطب مینار تیرھویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اگر آپ اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہیں کہ "اے قطب مینار، تو وہی بلند مینار ہے جس کو قطب الدین ایبک نے اپنی فتح کے نشان کے طور پر سات سو سال پہلے بنوایا تھا" تو یہ ایک صحیح بات ہوگی۔ لیکن اگر آپ کسی جلسہ میں اس طرح تقریر کریں کہ "اے مسلمانو، تم وہی خیر امت ہو جس کو پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال پہلے بنایا تھا اور جس نے عرب کے صحرا سے نکل کر روم و ایران کی سلطنت کو الٹ دیا تھا" تو یہ دوسری بات سراسر بے اصل اور خلاف واقعہ قرار دی جائے گی۔

قطب مینار ایک جامد وجود ہے۔ وہ عین اپنے سابق وجود کا تسلسل ہے۔ وہ اپنے ابتدائی وجود ہی کے ساتھ تاریخ میں مسلسل چلا آرہا ہے۔ جو بلند سنگی عمارت آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسی سنگی عمارت کو سات سو سال پہلے بھی دیکھنے والوں نے دیکھا تھا۔

مگر مسلمان ایک انسانی گروہ کا نام ہے۔ انسان کی عمر محدود ہوتی ہے۔ وہ ۶۰ سال یا اس سے کم و بیش مدت میں مر جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے انسانی مجموعہ کے لئے پہلی نسل، دوسری نسل اور بعد کی نسل کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ انسانوں میں اسلاف و اخلاف ہوتے ہیں۔ جبکہ تاریخی عمارتوں میں اسلاف و اخلاف کا کوئی تصور نہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۸ - ۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ اے مسلمانو، تم وہی تو ہو جنھوں نے ایسا اور ایسا کیا تھا" مگر موجودہ دور پریس میں مسلمانوں کے اندر جو مصلح اور رہنما پیدا ہوئے، تقریباً سب نے اسی انداز میں مسلمانوں کو خطاب کیا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ان سب کی کوششیں بالکل رائیگاں ہو گئیں۔ اور امت میں مطلوبہ بیداری پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طرز خطاب قرآن کے الفاظ، میں قول غیر سدید تھا۔ اور قول غیر سدید کے ذریعہ کبھی اصلاح احوال نہیں ہوتی (الاحزاب ۷۱)

موجودہ نسلوں میں بیداری لانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کے اندر سچی معرفت پیدا کی جائے۔ ان کے اندر دوبارہ ذہنی انقلاب والا ایمان زندہ کیا جائے۔

دلائل قرآن

قرآن میں ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے اس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں (وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ (المومنون ۱۱۷)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک عالم نے کہا کہ موحد کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، مشرک کہتا ہے کہ خدا کئی ہیں۔ اس طرح ایک خدا کا وجود دونوں کے درمیان متفق علیہ ہوگیا۔ کیونکہ مشرک نے جب کہا کہ خدا کئی ہیں تو ایک خدا کو اس نے پہلے ہی مان لیا۔ اس طرح ایک خدا کا وجود تو اپنے آپ ثابت ہے۔ اب دلیل کی ذمہ داری موحد پر نہیں ہے بلکہ مشرک پر ہے۔ ایک کے بعد بقیہ خداؤں کے وجود پر وہ دلیل لائے۔

یہ سادہ استدلال کا ایک نمونہ ہے۔ ہر معاملہ میں استدلال کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ اور دوسرا علمی۔ کچھ لوگوں کے لئے سادہ دلیل کافی ہو جاتی ہے۔ مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ زیادہ علمی انداز میں ان کے سامنے بات کو واضح کیا جائے۔ قرآن میں دونوں سطح کے دلائل موجود ہیں۔

اوپر کی مثال برہان کی سادہ تفسیر ہے۔ مگر اس برہان کی علمی اور سائنٹفک تفسیر بھی یہاں موجود ہے۔ راقم الحروف نے اس کی وضاحت مختلف کتابوں میں کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو تمام حاصل شدہ شہادتیں خالق کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ کہ خالق کے تعدد کی طرف۔ مثلاً وسیع کائنات کے تمام اجزاء کا ترکیبی مادہ صرف ایک ہے، اور وہ ناقابل مشاہدہ ایٹم ہے۔ پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی کارفرمائی ہے۔ کائنات میں بے شمار سرگرمیاں ہیں مگر سب کی سب متوافق طور پر کام کرتی ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان سب کا ناظم ایک ہی ہے۔ کائنات کا کوئی جزء اپنے عمل کے دوران جب کوئی مسئلہ پیدا کرتا ہے تو اس کا دوسرا جزء فوراً اس کی تلافی کے لئے آجاتا ہے۔ تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہیں۔ مگر دونوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ دونوں بالکل کاگ وصیل کی طرح مل کر کام کرتے ہیں۔ اگر دونوں کے الگ الگ خدا ہوتے تو دونوں میں اس طرح کامل ہم آہنگی نہیں ہو سکتی تھی

ایک تقابل

ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم نے اسلام اور بدھزم کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں اخلاق کی بنیادیں کمزور ہیں۔ جبکہ بدھزم میں انسانی اخلاقیات کو بہت مضبوط بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اسلام کے پانچ ارکان (ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) صرف عقیدہ اور عبادت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ بدھزم کے پانچ ارکان (پنچ شیل) سب کے سب انسانی اخلاق سے تعلق رکھنے والے اصول ہیں۔ بدھزم کے پانچ ارکان یہ ہیں — قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جنسی بے راہ روی نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، نشہ کی چیز استعمال نہ کرنا:

> The five precepts (panca-sila) for the layman prohibit killing, stealing, engaging in sexual misconduct, lying, and drinking intoxicating liquor. (3/390)

مگر ایسا کہنا درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ بدھزم میں جس طرح اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسی طرح اسلام میں بھی اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بدھزم اخلاق کی تلقین سماجی سلوک کے طور پر کرتا ہے۔ جبکہ اسلام میں متقیانہ روش کی حیثیت سے اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

اسلام کے پانچوں ارکان میں اخلاق کا تصور بطور تقاضا موجود ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود کھائے مگر اس کے قریب کا پڑوسی بھوکا رہے۔ نماز کے لئے قرآن میں ہے کہ نماز آدمی کو فحش اور منکر سے روکتی ہے۔ زکوٰۃ ایک اعتبار سے عبادت ہے اور دوسرے اعتبار سے اپنی چیزوں میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا ہے۔ روزہ کے بارہ میں حدیث میں ہے کہ جو آدمی روزہ رکھ کر جھوٹ بولے اس کا روزہ روزہ نہیں۔ اسی طرح اس آدمی کا حج باطل ہو جاتا ہے جو حج کے رسوم ادا کرے مگر اسی کے ساتھ وہ لڑائی جھگڑے میں ملوث ہو۔

قرآن و حدیث میں کثرت سے اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں (بُعثتُ لاُ تمم مکارم الاخلاق)۔ اس کو خلاصۂ اسلام بتایا گیا ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بدھزم میں اخلاق کی حیثیت ایک قسم کی اصلاحی سفارش کی ہے۔ جب کہ اسلام میں اس کا رشتہ خدا کے سامنے جوابدہی سے جڑا ہوا ہے۔ جوابدہی کا یہ پہلو اخلاق کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

افغانستان : ایک جائزہ

اکتوبر ۱۹۸۸ میں راقم الحروف نے افغانستان کا سفر کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایک
فصل سفرنامہ لکھا تھا جو دو قسطوں میں الرسالہ فروری۔ مارچ ۱۹۸۹ میں شائع ہو چکا ہے۔
س وقت افغانستان کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

"مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر بالفرض روسی اثر و نفوذ افغانستان سے ختم ہو جائے
ب بھی یہاں کا اصل مسئلہ ختم ہونے والا نہیں۔ کیوں کہ افغانوں کا عدم برداشت کا مزاج جو
ں وقت روسیوں یا روس نواز افغانی حکومت کے خلاف کام کر رہا ہے، وہی بعد کو خود اپنے
لوں کے خلاف کام کرنے لگے گا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز برداشت ہے، (اور وہ افغانوں
کے اندر موجود نہیں) افغانستان کے سرسبز علاقے اس وقت اجڑے ہوئے صحرا کا منظر پیش
رتے ہیں۔ تمام قربانیوں کے باوجود افغانستان کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ مجاہدین کا حال یہ ہے
وہ سات گروپ میں بٹے ہوئے ہیں۔ افغانستان کے مستقبل کے نقشہ کے بارہ میں ان کے
رمیان اتفاق نہیں۔ افغانی مجاہدین کے پاس پولیٹیکل لیڈرشپ نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔
جیسا کہ ڈاکٹر نلسن منڈیلا کی صورت میں ساؤتھ افریقہ میں موجود تھی) اس سلسلہ میں ایک رپورٹر

Mujahideen and other rebel groups based in Afghanistan, Pakistan (Peshawar) and Iran

Hezb-i-Islami (faction no. one) Gulbuddin Hekmatyar	Mehaz-i-Meli-Islami
Hezb-i-Islami (faction no. two) Yunus Khalis	Jabhah-i-Nijoti-Meli-Islami
Jamait-i-Islami Ahmed Shah Masood	Hezb-i-Hitahadi-Islami
General Rashid Dostam	Hezb-i-Wahadati-Islami
Sibatullah Mojadeddo — head of Provincial government in Pakistan, not supported by Gulbuddin Hekmatyar	Sozman-i-Islami Nasar
Syed Amed Gilani	Harakat-i-Islami
Maulvi Mohammed Nadi Mohammedi	Sozman-i-Pasdarani Jahadi-Islami
Commander Abdul Haq	Jabahaye-Matahidi-Islami
Jammat-i-Islami — Burhanuddin Rabbani	Niroye-Islami
Haraka-i-Inquilab-Islami	Nohzati-Islami
	Hezbullah
	Hezb-i-dawate Islami
	Shoroye Itefaqui

نے قندھار کے ملا نقیب اللہ سے گفتگو کی۔ ان کا جواب یہ تھا کہ صدر نجیب اللہ کے چلے جانے کے بعد ہم ایک کونسل بنائیں گے تاکہ تمام افغانی مل کر یہ فیصلہ کریں کہ ملک کے اوپر کون حکومت کرے۔

جہاں دورِ جدوجہد میں اتحاد نہ ہو، وہاں دورِ اقتدار میں اتحاد اور بھی زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ مگر افغانی لیڈروں کو اس کی خبر نہیں۔" (الرسالہ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۳۲-۳۴)

یہ بات راقم الحروف نے ۱۹۸۸ میں لکھی تھی جب کہ تمام دنیا کے مسلمان افغانی جنگ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔ اب یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ افغانستان میں آزادی حاصل ہو جانے کے بعد بھی تباہ کن لڑائی جاری ہے تو وہ سخت پریشان ہوتے ہیں۔ اس پریشانی کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اس کو اسلامی جہاد سمجھ رہے تھے۔ مگر راقم الحروف کے لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک افغانستان کی جنگ ایک قبائلی جنگ تھی۔ اور یہ جنگ ان کے یہاں روسی فوجوں کے داخلہ کے بہت پہلے سے جاری ہے۔

مسلم فوجوں نے ۶۴۲ء میں ساسانی سلطنت کو شکست دی جس کی سرحدیں افغانستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے افغانستان کا رخ کیا، مگر مخصوص حالات کی بنا پر ان کو صرف عارضی کامیابی مل سکی۔ جن شہروں نے مسلم فوجوں کے مقابلہ میں اطاعت قبول کی وہاں جلد ہی ان کے خلاف بغاوت ابھر آئی۔ نویں اور دسویں صدی میں کئی مقامی سلطنتیں وجود میں آگئیں۔ شروع میں وہ خلیفہ بغداد کے ماتحت تھے مگر ۸۲۰ء میں انھوں نے بغداد سے علیحدگی اختیار کرلی۔ تاہم بہت کم ایسا ہوا کہ ان کے درمیان لڑائی جاری نہ ہو۔ مسلسل ان کی حالت یہ رہی کہ یا تو باہر کی طاقت سے ٹکراؤ، اور اگر باہر کی طاقت نہ ہو تو آپس میں ٹکراؤ۔

افغانی لوگ بیشتر جاہل ہیں۔ وہ اس کو فخر سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ماتحتی کو قبول نہ کریں۔ یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ایک ہزار انسانوں میں ۹۹۹ آدمی جب ماتحت بننے پر راضی ہوتے ہیں، تب ایک شخص کی لیڈرشپ قائم ہوتی ہے۔ جہاں ہر آدمی کے اندر سرداری کا مزاج ہو وہاں نہ لیڈرشپ وجود میں آئے گی اور نہ اتحاد اور استحکام قائم ہوگا۔ افغانستان عرصۂ دراز سے اپنے اسی مزاج کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ اگلے صفحہ پر ایک نقشہ دیا جا رہا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ افغانستان میں اقتدار کی جنگ نے کس طرح عدم استحکام کی صورت پیدا کر رکھی ہے۔

فروری ۱۹۱۹ امیر حبیب اللہ خاں کی اعتدال پسند پالیسی کی بنا پر انتہا پسند افغانوں نے انھیں قتل کر دیا۔ اس کے بعد ان کے لڑکے امان اللہ خاں افغانستان کے تخت پر بیٹھے۔

جنوری ۱۹۲۹ ملک میں خانہ جنگی۔ امان اللہ خاں کو جلاوطن ہو کر اٹلی جانا پڑا۔ اس کے بعد حبیب اللہ غازی نے افغانستان کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔

اکتوبر ۱۹۲۹ حبیب اللہ غازی کو اولاً تخت سے معزول اور اس کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد قبائل کے مشورہ پر محمد نادر شاہ کو افغانستان کا حکمراں بنایا گیا۔

نومبر ۱۹۳۳ محمد نادر شاہ کو ناراض گروپ نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ۱۹ سالہ لڑکے محمد ظاہر شاہ کو افغانستان کے تخت پر بٹھایا گیا۔

جولائی ۱۹۷۳ وزیر دفاع سردار محمد داؤد خاں نے فوجی بغاوت کے ذریعہ محمد ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اور افغانستان کی حکومت پر قابض ہو گئے۔ ظاہر شاہ کو روم بھیج دیا گیا۔

مئی ۱۹۷۸ کرنل عبد القادر کی قیادت میں افغانی فوج نے سردار محمد داؤد کے خلاف بغاوت کر دی۔ ان کو مع اہل خاندان قتل کر دیا گیا۔ اشتراکی لیڈر نور محمد ترکی افغانستان کے حکمراں بن گئے۔

اگست ۱۹۷۸ کرنل عبد القادر کو حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اولاً پھانسی اور اس کے بعد عمر قید کی سزا ہوئی۔

ستمبر ۱۹۷۹ محل کے اندر لڑائی میں نور محمد ترکئی کو گولی لگی۔ بعد کو وہ ماسکو کے ایک اسپتال میں مر گئے۔ اس کے بعد حفیظ اللہ امین کو افغانستان کا صدر بنایا گیا۔

دسمبر ۱۹۷۹ افغانستان پر سوویت یونین کا حملہ۔ حفیظ اللہ امین مار ڈالے گئے۔ ان کے کئی رشتہ داروں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ببرک کرمال افغانستان کے صدر مقرر ہوئے۔

مئی ۱۹۸۶ ڈاکٹر نجیب اللہ نے فوجیوں کی مدد سے بغاوت کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ببرک کرمال کو اقتدار سے ہٹا دیا اور ان کو علاج کے نام پر جبراً ماسکو بھیج دیا۔ ۱۵ فروری ۱۹۸۹ کو سوویت یونین کا آخری فوجی دستہ افغانستان سے واپس چلا گیا۔

اپریل ۱۹۹۲ باغی مجاہدین نے کابل پر قبضہ کر کے ڈاکٹر نجیب اللہ کو گرفتار کر لیا۔ ڈاکٹر نجیب اللہ اقتدار سے بے دخل کر کے علیحدہ کر دئے گئے۔ جنرل نبی عظیمی کی قیادت میں مجاہدین کونسل کا قیام۔

جون ۱۹۹۲ ۲۸ اپریل کو صبغۃ اللہ مجددی نئے افغانستان کے کارگزار صدر مقرر ہوئے تھے۔ ۲۸ جون ۱۹۹۲ کو انھوں نے استعفا دیدیا۔ اس کے بعد برہان الدین ربانی مجاہدین کی عارضی حکومت کے صدر بنے۔

افغانستان میں اصل تقسیم اسلام اور غیر اسلام کی نہیں ہے۔ بلکہ اصل تقسیم نسلی اور قبائلی ہے۔ لوگوں کی وفاداریاں اپنے اپنے نسلی گروپ سے وابستہ ہیں۔ اس وقت افغانستان میں چار بڑے نسلی گروہ ہیں ــــــ پشتون، تاجک، ہزارہ، ازبیک۔ موجودہ افغانستان عملاً انہیں چار گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ ملکی مفہوم میں وہاں کوئی افغانی حکومت موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہر گروہ اپنے اپنے علاقے میں تسلط قائم کئے ہوئے ہے۔ ملاحظہ ہو نقشہ ذیل۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۲ کے اخبارات کی اہم ترین سرخی یہ تھی ــــــ مجاہدین نے کابل پر قبضہ کر لیا (Mujahideen take over Kabul)

اس طرح بظاہر ۱۳ سالہ جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر جنگ کا یہ خاتمہ مسائل کا خاتمہ نہیں۔ کیوں کہ ایک مبصر کے الفاظ میں، یہاں بندوقیں تو بہت زیادہ ہیں۔ مگر زندگی کی ضرورت کی تمام چیزیں المناک حد تک کم ہیں:

(in this country) guns are plentiful but everything needed to support human existence is woefully short.

اقتصادی کمزوری کسی قوم کو ہر اعتبار سے کمزور کر دیتی ہے۔ اقتصادی بدحالی کی دلدل سے نکلنے کا واحد ذریعہ دانش مند قیادت ہے۔ افغانستان کی تعمیر نو کے لئے افغانستان کو اسی حکمت کی
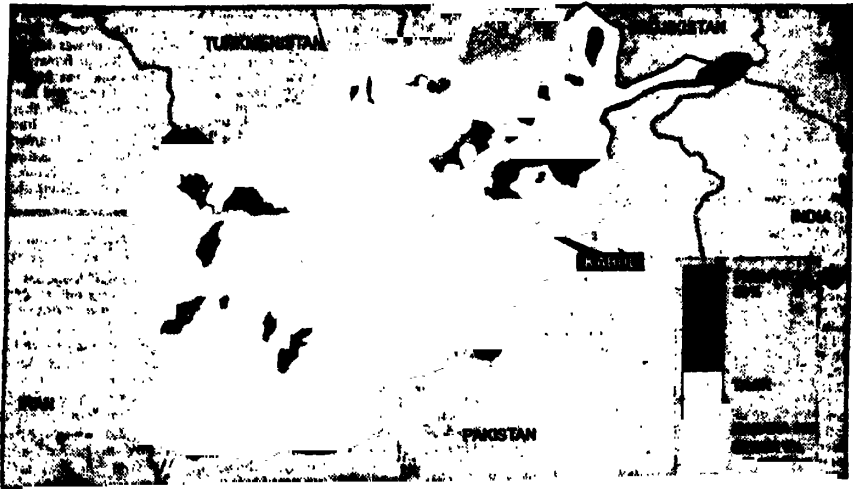
ضرورت تھی جس کو دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان کے لیڈروں نے معکوس عمل (ریورس کورس) کے عنوان سے اپنایا تھا۔ یعنی جنگ کا ذہن ختم کرکے کامل طور پر امن کا طریقہ اختیار کرنا۔ مگر افغانی قوم اپنے جنگ جوئی کے مزاج کی بنا پر ایسا نہ کرسکی۔ چنانچہ ملک بدستور امن سے محروم رہا۔

ڈاکٹر نجیب اللہ تقریباً چھ سال تک افغانستان کے حکمراں تھے۔ افغان مجاہدین کے مسلسل حملوں کے بعد آخر کار ۱۶ اپریل ۱۹۹۲ کو انھوں نے اقتدار کی کرسی مجاہدین کے لئے خالی کر دی اور کابل کے صدارتی محل کو چھوڑ کر چلے گئے۔ روسی فوجوں کے افغانستان میں داخلہ (دسمبر ۱۹۷۹) کے بعد پچھلے تقریباً ۱۴ سال کی جنگ میں ۲۰ لاکھ افغانی ہلاک ہوگئے۔ اس دوران جو دوسرے نقصانات ہوئے ان کی مقدار اس سے بھی زیادہ ہے۔

ڈاکٹر نجیب اللہ کے ہٹنے کے بعد اقوام متحدہ کے نمائندہ بنان سیون (Benon Seven) کابل پہنچ گئے۔ وہ مسلسل کوشش کرتے رہے کہ کابل میں افغانی مجاہدین کے مختلف گروپ کی ایک مشترک کونسل بنائی جائے۔ وہ عارضی طور پر افغانستان کا اقتدار سنبھال لے۔ پھر اس کی رہنمائی میں الکشن ہو اور جو لوگ عوام کی رائے سے چنے جائیں وہ اگلی مدت کے لئے افغانستان پر حکومت کریں۔

مگر اقوام متحدہ کے نمائندہ اور دوسرے بہی خواہوں (بشمول پاکستان) کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ۲۷ اپریل ۱۹۹۲ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ کابل میں خود مجاہدین کے دو گروپ گلبدن حکمت یار کی جمعیت اسلامی اور احمد شاہ مسعود کی حزب المجاہدین میں گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ اسٹیٹسمین (۲۷ اپریل) نے بامعنی طور پر اس کی یہ سرخی لگائی — کابل میں اقتدار کی جنگ:

Battle for power in Kabul.

حقیقت یہ ہے کہ افغانی جنگجوؤں کی لڑائی ان کے قبائلی مزاج کا نتیجہ تھی۔ تاہم یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پچھلے تیرہ سال کے دوران روس کے براہ راست یا بالواسطہ تدخل نے انھیں یہ موقع دیدیا کہ وہ اپنی اس جنگ کو خالص اسلامی جہاد کا عنوان دے سکیں۔ مگر روسی فوجوں کی واپسی اور ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اب وہ حالات ختم ہوگئے۔ نئی صورتحال یہ ثابت کر رہی ہے کہ

ان کا معاملہ دراصل وہی معاملہ ہے جس کی تصویر قدیم عرب شاعر کے اس شعر میں ملتی ہے کہ کبھی ، ہم اپنے بھائی بکر پر حملہ کر دیتے ہیں جب کہ اپنے بھائی کے سوا کوئی اور موجود نہ ہو :

واحیانا علی بکر اخینا   اذا مالم نجد الا اخانا

حقیقی اسلامی جہاد فتح سے پہلے اگر " اشداء علی الکفار " کا نمونہ ہوتا ہے تو فتح کے بعد وہ " رحماء بینھم " کا نمونہ بن جاتا ہے ۔ یہی صفت کسی جہاد کو تاریخ ساز عمل بناتی ہے ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسول جو اغیار سے لڑائی کے مقابلہ میں بے لچک مجاہد بنے ہوئے تھے ، فتح کے بعد اپنوں کے لئے وہ سراپا نرم بن گئے ۔

اس جہاد میں دو بڑے گروہ ، مہاجرین اور انصار شریک تھے ۔ فتح کے بعد سیاسی اقتدار تمام تر مہاجرین کے قبضہ میں دیدیا گیا ۔ انصار کو نہ امیر بنایا گیا اور نہ وزیر ۔ مگر وہ اپنی اس " سیاسی محرومی " پر راضی رہے ۔ یہاں تک کہ ایک ایک کرکے اس دنیا سے چلے گئے اور کسی نے بغاوت نہیں کی ۔

افغانستان کے " مجاہدین " میں اس کے برعکس منظر دکھائی دیتا ہے ۔ اس سے پہلے وہ بیرونی دشمن سے لڑ رہے تھے ۔ مگر جب بیرونی دشمن چلا گیا تو اب وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی کرکے خود آپس میں لڑ رہے ہیں ۔ ہر افغان لیڈر سیاسی منصب پر فائز ہونا چاہتا ہے ۔ کوئی بھی سیاسی محرومی کے لئے راضی نہیں ۔

۲۶ اپریل ۱۹۹۲ کو افغانی مجاہدین نے کابل پر قبضہ کر لیا تھا ۔ روسی فوجیں مکمل طور پر افغانستان سے واپس چلی گئی تھیں ۔ اب پورا ملک افغانیوں کے اپنے قبضہ میں تھا ۔ اب ملک کے اندر مکمل امن قائم ہو جانا چاہئے تھا ۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا ۔ چوں کہ افغانستان میں کوئی واحد لیڈر شپ موجود نہ تھی ، اس لئے بہت سے دعویدار پیدا ہو گئے جن کا خیال تھا کہ ان کو حق ہے کہ وہ افغانستان پر اپنی سرداری قائم کریں ۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا چنانچہ خود افغانی لیڈروں کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی ۔

امریکہ نے تمام جنگجو گروہوں کو بڑی مقدار میں ہتھیار دئے تھے ۔ یہ ہتھیار جو پہلے روسی فوجوں کے خلاف استعمال ہوتے تھے ، اب وہ آپس کی لڑائی میں استعمال ہونے لگے ۔ کابل اور دوسرے مقامات پر راکٹوں کی بارش شروع ہو گئی ۔ اس صورت حال کا اندازہ کرنے کے لئے اگلے صفحہ پر کچھ اخباری سرخیاں نقل کی جاتی ہیں :

احمد شاہ مسعود اور حکمت یار کے مجاہدین میں لڑائی چھڑ گئی، زبردست فائرنگ	نوائے وقت، ۲۱ اپریل ۱۹۹۲
کابل فتح ہوگیا، حکمت یار اور احمد شاہ مسعود میں ٹھن گئی	نوائے وقت، ۲۶ اپریل ۱۹۹۲
حکمت یار کی پوزیشنوں پر مسعود فضائیہ کی بمباری، مشین گنیں گولیاں اگلتی رہیں	نوائے وقت، ۲۸ اپریل ۱۹۹۲
کابل پر راکٹوں اور توپوں کے گولوں کی بارش، گزشتہ ہفتہ کی لڑائی سے زیادہ شدید	نوائے وقت، ۵ مئی ۱۹۹۲
کابل پر حملہ، حزبِ اسلامی شہر پر راکٹ اور گولے برسا رہی ہے	نوائے وقت، ۹ اگست ۱۹۹۲
کابل میں شدید لڑائی، ۹۰ منٹ کے اندر کابل پر ۶۵ سے زاید راکٹ برسائے گئے	نوائے وقت، ۱۱ اگست ۱۹۹۲
کابل میں دست بدست لڑائی، پرانا شہر ملبہ کا ڈھیر بن چکا ہے	نوائے وقت، ۱۲ اگست ۹۹۲
افغان طیاروں کی حزبِ اسلامی کے ٹھکانوں پر شدید بمباری، کابل پر تین ہزار راکٹ گرے	نوائے وقت، ۱۳ اگست ۹۹۲
راکٹوں اور کلسٹر بموں نے کابل کو خون میں نہلا دیا، لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی ہیں	نوائے وقت، ۱۴ اگست ۹۹۲
کابل میں گھمسان کی جنگ، نصف شب تک راکٹوں کے شدید حملے	نوائے وقت، ۱۸ اگست ۱۹۲
کابل شہر اور ایئرپورٹ پر راکٹوں اور گولوں کی بارش۔ ہزاروں کی تعداد میں نقل مکانی	نوائے وقت، ۱۹ اگست ۹۹۲
کابل پر راکٹوں کی بارش، بھاری گولہ باری سے دور تک دھواں ہی دھواں	جسارت، ۲۵ اگست ۱۹۲
سارا دن راکٹ اور میزائل آبادیوں پر بارش کی طرح برستے رہے، کابل میں عام لوٹ مار	نوائے وقت، ۲۸ اگست ۱۹۲
افغان قوم کا خودکشی کرنے کا عزم بالجزم (تجزیہ)	نوائے وقت، یکم ستمبر ۱۹۲
کابل پر راکٹوں کی بارش، شدید جنگ اور انسانی جانوں کا ضیاع	وفاق ۴ فروری ۱۹۳
کابل میں رات بھر شدید گولہ باری، سڑک پر نکلنا موت کے برابر	نوائے وقت، ۵ فروری ۹۳
کابل پر شدید گولہ باری، ہر طرف خون ہی خون بکھر گیا	نوائے وقت، یکم مارچ ۹۳
کابل کی سڑکیں لہولہان ہوگئیں، ۱۲۰ ملی میٹر دہانے کی توپوں سے گولہ باری	نوائے وقت، ۱۰ مارچ ۹۳
کابل پر راکٹوں کی بارش، سو افراد ہلاک و زخمی، عمارتوں کو کافی نقصان	نوائے وقت، یکم اپریل ۹۳
کابل پر ایک بار پھر راکٹوں اور توپوں سے حملہ	نوائے وقت، ۴ مئی ۹۳
کابل میں بدترین لڑائی، سڑکیں لاشوں سے بھر گئیں، دو گھنٹے میں شہر پر تین سو راکٹ گرے	نوائے وقت، ۱۳ مئی ۹۳
کابل کی نئی لڑائی میں ایک ہزار افراد ہلاک و زخمی، بازاروں پر شدید گولہ باری	نوائے وقت، ۱۴ مئی ۹۳
کابل شہر پر راکٹوں کی بارش، جلتی ہوئی عمارتوں کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہوگیا	نوائے وقت، ۱۵ مئی ۹۳
حزبِ وحدت اور ربانی کی فوجوں میں شدید لڑائی، مغربی کابل میں پچاس راکٹ گرے	نوائے وقت، ۲۶ جون ۹۳
حکمتیار اور ربانی کی فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ اور خوں ریزی	قومی آواز ۱۷ نومبر ۹۳

مئی ۱۹۹۲ کے تیسرے ہفتہ میں حکمتیار اور احمد شاہ مسعود کے درمیان کئی بار ملاقات کا پروگرام بنا مگر ملاقات نہ ہوسکی۔ جنرل عبد الرشید دوستم کو صبغۃ اللہ مجددی کی حکومت نے ترقی دے کر مکمل جنرل (full general) بنا دیا۔ اب حکمتیار اور جنرل دوستم کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ چودہ سال کے سول وار کے بعد افغانستان میں دو ملین افغانی مر گئے۔ تین ملین افغانی زخمی یا ناکارہ ہوگئے اور چھ ملین افغانی رفیوجی ہوگئے (ہندستان ٹائمس ۲۴ مئی ۱۹۹۲)

صبغۃ اللہ مجددی ۲۸ اپریل ۱۹۹۲ کو نئے افغانستان کے کارگزار (caretaker) صدر مقرر ہوئے۔ دو مہینہ بعد ۲۸ جون ۱۹۹۲ کو انھوں نے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد برہان الدین ربانی عارضی حکومت کے صدر مقرر ہوئے۔

المجلۃ ایک ممتاز عربی ہفت روزہ ہے۔ وہ جدہ میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۵ - ۱۱ اگست ۱۹۹۲ (۷ - ۱۳ صفر ۱۴۱۳ھ) میں صفحہ ۳۰ - ۳۱ پر ایک رپورٹ افغانستان کے بارہ میں چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ افغانی قوم سب سے زیادہ خسارہ میں (الشعب الأکبر الخاسرین) اس رپورٹ کا خلاصہ اس کے ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

الحرب لم تتوقف ابداً فی افغانستان والمعارك الیوم ھی بین فصائل المجاھدین الذین یتقاتلون علی کرسی السلطۃ بعد ان سقطت عنھا رموز النظام الشیوعی السابق

افغانستان میں جنگ بالکل بند نہیں ہوئی۔ آج وہاں مجاہدین کی مختلف جماعتوں کے درمیان معرکے جاری ہیں جو کہ اقتدار کی کرسی کے لئے آپس میں لڑ رہے ہیں، جب کہ افغانستان میں سابق اشتراکیت نواز حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

آزادی حاصل ہونے کے باوجود کابل پر راکٹوں کی بارش نے ہر جگہ مسلمانوں کو بے چین کر دیا۔ افغانی لیڈر پہلے عمرہ کے لئے مکہ لے جائے گئے اور وہاں ان کی ملاقات سعودی ذمہ داروں سے ہوئی۔ اس کے بعد اگست ۱۹۹۲ میں وہ لوگ اسلام آباد میں اکٹھا ہوئے۔ اس وقت کے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کے ساتھ کئی روز تک بات چیت ہوئی۔ آخر کار مختلف افغانی لیڈروں کے درمیان وہ معاہدہ طے پایا جس کو معاہدہ اسلام آباد کہا جاتا ہے۔

لاہور کے اخبار نوائے وقت (۳۰ اگست ۱۹۹۲) کی صفحہ اول کی پہلی سرخی یہ تھی: ربانی اور حکمت یار میں معاہدہ، جنگ بندی کردی گئی۔ لاہور کے دوسرے اخبار وفاق (۳۰ اگست ۱۹۹۲) نے ان الفاظ میں سرخی قائم کی: کابل میں پائیدار امن کا معاہدہ طے پا یا۔ وفاق (۳۱ اگست ۱۹۹۲) کے مطابق وزیر اعظم نواز شریف نے ایک بیان میں کہا: افغانستان میں جنگ بندی پاکستان کا شاندار کارنامہ ہے۔

دنیا بھر کے مسلم پریس نے اس معاہدہ کو غیر معمولی اہمیت دی۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوة (۲۴ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ) نے ایک رپورٹ چھاپی جس کا عنوان یہ تھا کہ دنیا آج زمین پر ایک نئی اسلامی حکومت کے قیام کا مشاہدہ کر رہی ہے (العالم يشهد اليوم قيام دولة اسلامية حديثة على الارض)

معاہدۂ اسلام آباد کا مکمل متن

افغان رہنماؤں میں جو معاہدہ اسلام آباد میں ہوا ہے اس کا متن درج ذیل ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر سر تسلیم خم کرتے ہیں اور قرآن حکیم اور سنت سے رہنمائی حاصل کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

ہم اس موقع پر غیر ملکی تسلط کے خلاف افغان عوام کے عظیم الشان جہاد کی شاندار کامیابی یاد کرتے ہیں۔

ہم اس بات کے خواہش مند ہیں کہ افغان عوام کے لئے اس عظیم الشان جہاد کے ثمرات یعنی امن، ترقی اور خوشحالی کو یقینی بنایا جائے۔

ہم مسلح جدوجہد ختم کرنے پر متفق ہیں۔

ہم وسیع البنیاد اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں جس میں مسلم افغان معاشرہ کے تمام طبقوں، گروپوں اور پارٹیوں کی نمائندگی ہو تاکہ پرامن نظم وضبط اور استحکام کے ماحول میں سیاسی عمل میں پیش رفت ہو سکے۔

ہم افغانستان کے اتحاد خود مختاری اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کے پابند ہیں۔

ہم افغانستان کی تعمیر نو آبادکاری اور تمام افغان مہاجرین کی سہولت کے ساتھ واپسی کی فوری

ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔

ہم علاقہ میں امن اور سلامتی کو فروغ دینے کے پابند ہیں۔ ہم نے خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز کی اس خواہش پر لبیک کہا ہے کہ افغان بھائی تمام اختلافات پُرامن مذاکرات کے ذریعہ حل کریں۔

ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف کے تعمیری کردار اور افغانستان میں فروغ امن اور مفاہمت کے لئے ان کی مخلصانہ کوششوں کو سراہتے ہیں۔

ہم ان کوششوں کی خاطر مملکت سعودی عرب اور اسلامی جمہوریہ ایران کی مثبت حمایت کرتے ہیں جنھوں نے اسلام آباد میں ہونے والی مفاہمت کے مذاکرات میں اپنے خصوصی نمائندے بھیجے۔

انھوں نے عظیم الشان جہاد کے ثمرات کو مستحکم کرنے کے لئے ہم سے علٰحدہ علٰحدہ اور مشترکہ طور پر طویل مذاکرات کئے۔

تمام متعلقہ پارٹیاں اور گروپ حسب ذیل امور پر متفق ہیں۔

۱۔ ۱۸ ماہ کے لئے حکومت کی تشکیل جس میں برہان الدین ربانی صدر رہیں گے اور انجنیئر گلبدین حکمت یار یا ان کے نمائندے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالیں گے۔ وزیر اعظم اور ان کی کابینہ جو باہمی مشورے سے تشکیل دی جائے گی، کے اختیارات اس معاہدہ کا ایک حصہ ہوں گے جو علٰحدہ دئے گئے ہیں۔

۲۔ وزیر اعظم اس معاہدہ پر دستخط ہونے کے دو ہفتے کے اندر صدر اور مجاہدین کی جماعتوں کے رہنماؤں کے مشورہ سے کابینہ تشکیل دیں گے۔

۳۔ حسب ذیل انتخابی طریقہ کار پر سمجھوتہ ہوگیا ہے جس پر ۱۸ ماہ میں عملدرآمد کیا جائے گا۔ اور اس مدت کا آغاز ۲۹ دسمبر ۹۲ء سے ہوگا۔

الف۔ تمام جماعتیں باہم مل کر ایک آزاد اور بااختیار الیکشن کمیشن فوری طور پر تشکیل دیں گی۔

ب۔ الیکشن کمیشن کو اس معاہدہ پر دستخط کی تاریخ سے ۸ ماہ کے اندر دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کرانے کا اختیار دیا جائے گا۔

ج ۔ اس طرح منتخب شدہ عظیم دستور ساز اسمبلی ایک آئین مرتب کرے گی جس کے تحت مذکورہ ۱۸ ماہ کی مقررہ مدت میں صدر اور پارلیمنٹ کے لئے عام انتخابات ہوں گے۔

د ۔ ہر پارٹی کے دو ارکان پر مشتمل دفاعی کونسل قائم کی جائے گی:

الف ۔ جو قومی فوج تیار کرے گی۔

ب ۔ جو تمام پارٹیوں اور ذرائع سے بھاری اسلحہ واپس لے گی اور یہ اسلحہ کابل اور دوسرے شہروں سے دور منتقل کیا جائے گا تاکہ دار الحکومت کی سلامتی کو یقینی بنایا جائے۔

ت ۔ اس بات کو یقینی بنائے گی کہ افغانستان میں تمام سڑکیں عام استعمال کے قابل رہیں۔

ث ۔ اس بات کو یقینی بنائے گی کہ نجی فوج یا مسلح افراد کو سرکاری فنڈ سے مالی امداد نہ دی جائے۔

ج مسلح جدوجہد کے دوران حکومت اور مختلف جماعتوں نے جن افغان باشندوں کو گرفتار کیا ہے انھیں فوراً غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے گا۔

ح ۔ جنگ کے دوران مختلف مسلح گروپوں نے جن سرکاری اور نجی عمارتوں، رہائشی علاقوں اور جائداد وغیرہ پر قبضہ کیا ہے وہ ان کے اصل مالکان کو واپس کر دی جائیں گی۔ بے گھر ہونے والے افراد کی ان کے متعلقہ گھروں اور مقامات پر واپسی کے لئے مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔

خ ۔ مالیاتی نظام اور کرنسی کے قواعد وضوابط کی نگرانی کے لئے ایک کل جماعتی کمیٹی قائم کی جائے گی تاکہ انھیں موجودہ افغان بنکنگ کے قوانین اور ضوابط کے ہم آہنگ بنایا جاسکے۔

م ۔ کابل شہر میں خوراک ایندھن اور ضروری اشیاء کی تقسیم کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جائے گی۔

ن ۔ جنگ بندی پر فوری طور پر عمل ہوگا۔ کابینہ کی تشکیل کے بعد جارحانہ کارروائیاں مستقل طور پر ختم ہو جائیں گی۔

و ۔ جنگ بندی اور جارحانہ کارروائیوں کے خاتمہ کی نگرانی کے لئے اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی) اور تمام افغان جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ کمیشن قائم کیا جائے گا۔

مذکورہ معاہدہ کو منظور کرتے ہوئے حسب ذیل رہنماؤں نے ۷ مارچ ۱۹۹۳ بروز اتوار اسلام آباد پاکستان میں دستخط کئے۔ پروفیسر برہان الدین ربانی، جمعیت اسلامی، صدر اسلامی مملکت

افغانستان۔ انجینئر گلبدین حکمت یار، حزب اسلامی۔ مولوی محمد نبی محمدی، حرکت انقلاب اسلامی۔ پروفیسر صبغت اللہ مجددی، جبہ نجات ملی۔ پیر سید احمد گیلانی، محاذ ملی۔ انجینئر احمد شاہ احمد زئی، اتحاد اسلامی۔ شیخ آصف محسنی، حرکت اسلامی۔ آیت اللہ فاضل، حزب وحدت اسلامی۔ (ماخوذ از تکبیر، کراچی)

یہ معاہدہ امن افغانی قوم کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ وہ بس پکڑ دھکڑ کر کیا گیا تھا۔ چنانچہ معاہدہ کے جلد ہی بعد وہ خونیں لڑائی دوبارہ جاری ہوگئی جو اس معاہدہ سے پہلے جاری تھی۔ اس معاملہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی اپیلیں غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہیں۔ اپیلوں کے غیر موثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مختلف ملکوں کے مسلمان خود بھی ان لوگوں سے لڑ رہے ہیں جن سے ان کو اختلاف ہے۔ پھر ان کی لفظی اپیل پر افغانی لوگ کیوں اپنی لڑائی بند کر دیں۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کو پہلے اختلاف کے باوجود پر امن تعلقات کا نمونہ پیش کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ان کی اپیلوں میں کوئی وزن پیدا ہو سکتا ہے۔

ساری دنیا کا مسلم پریس جو پہلے جہاد افغانستان کے پر فخر تذکرہ سے بھرا رہتا تھا۔ اب اس کے برعکس خبروں سے بھرا رہنے لگا۔ ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۶ جنوری ۱۹۹۴) نے اپنی رپورٹ کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی: ابناء افغانستان یدمرونہا۔ یعنی افغانستان کے باشندے خود ہی اپنے ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔ نوائے وقت (۴ مارچ ۱۹۹۴) کی ایک سرخی یہ تھی: کابل میں جنگ کے شعلے پھر بھڑک اٹھے۔ ہندستان ٹائمس (۸ مئی ۱۹۹۲) کی ایک رپورٹ کی سرخی یہ تھی:

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (یکم نومبر ۱۹۹۲) نے افغانستان سے متعلق ایک رپورٹ میں لکھا تھا:

پشاور معاہدہ میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ اقتدار میں شامل حضرات ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ انسانی، دینی اور قومی کسی بھی قسم کی قدروں کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ جو مجاہد اسلام کے نام پر جہاد کر رہے تھے، اب اسلام کے نام پر ہی مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں، کیا یہ بعد از جنگ مال غنیمت کی تقسیم کا جھگڑا ہے؟۔ سالہا سال کیا اسی امید پر لڑتے رہے؟

روسی تو اب جاچکے۔ کیمونسٹ تو اب اقتدار میں نہیں رہے۔ پھر یہ جنگ وجدال کس کے خلاف ہے۔ جہاد تو کامیاب ہوگیا۔ ختم ہوگیا اب تو محض قتل و غارت گری ہے یا مال غنیمت کی ہوس۔

خلاصہ کلام

اصل یہ ہے کہ بشمول افغانستان، ساری دنیا کے مسلمانوں کی مشترک کمزوری یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے رہنماؤں نے انھیں جنگ وقتال والے اسلام سے واقف کرایا۔ صبر واعراض والا اسلام موجودہ مسلم نسلوں کو بتایا ہی نہیں گیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اکثریت اس طرح کی گئی ہے کہ وہ لڑنے بھڑنے کو جہاد سمجھتے ہیں۔ اور صبر کی پالیسی کو بزدلی سمجھنے لگے ہیں۔ اسی مزاجی کمی کا نتیجہ افغانستان کی خانہ جنگی ہے۔ اور اسی مزاجی کمی کا نتیجہ اس قسم کے دوسرے تمام مسائل۔

کشمیر سے لے کر بوسنیا تک اور برما سے لے کر الجزائر تک مسلمانوں کی تمام لڑائیاں اسی بگڑے ہوئے مزاج کا نتیجہ ہیں جن کو غلطی سے جہاد سمجھا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی یہ نفسیات اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ جہاں گن پکھر چلانے کے مواقع موجود نہیں ہیں وہاں وہ اپنی زبان وقلم کو جارحیت کا آلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے پرامن طور پر اپنے مقصد کے لئے جدوجہد کرنا ہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد ذریعہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنی غلط رہنمائی کے ذریعہ مسلمانوں کو اس حکمت سے یکسر محروم کر دیا ہے۔

یہی واحد وجہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کی بربادی کو دشمنان اسلام کے خانہ میں ڈال رہے ہیں وہ صرف اپنی نادانی کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کا تعلق نہ قرآن سے اور نہ تاریخ سے۔

اسپین کا سفرنامہ

اسپین کا سفرنامہ زیر تیاری ہے۔ اس کی خصوصی اہمیت کی بنا پر اس کو ایک ہی شمارہ میں بطور نمبر شائع کیا جائے گا۔ اس کی ضخامت موجودہ الرسالہ سے زیادہ ہوگی اس لیے اس کی قیمت بھی کچھ زیادہ ہوگی۔ تفصیلی اعلان ان شاء اللہ آیندہ شائع کیا جائے گا۔

منیجر الرسالہ

ایک سفر

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی (کیلی فورنیا، امریکہ) کے زیر اہتمام چھٹی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کیلی فورنیا میں ۲۵ - ۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو ہوئی۔ اس میں خطاب کرنے کے لئے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں امریکہ کا سفر ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

دہلی سے روانگی ۲۲ اور ۲۳ دسمبر کی درمیانی رات کو ہوئی۔ اب سے ۴۴ سال پہلے اسی تاریخ کی درمیانی رات میں اجودھیا کی بابری مسجد کے اندر رام کی مورتیاں رکھ دی گئی تھیں۔ اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان مختلف واقعات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۱ کو اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والی ایک بھیڑ اجودھیا میں اکٹھا ہوئی اور اس نے بابری مسجد کو ڈھاکر وہاں ایک عارضی مندر بنا دیا۔

آج کے اردو اخبار میں دہلی کے ایک خود ساختہ مسلم لیڈر نے مسلمانوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ ۲۳ دسمبر کو بابری مسجد پر غیر قانونی قبضہ کی یادگار منائیں۔ عملاً یہ اپیل غیر مسموع ہوکر رہ گئی۔ تاہم میں نے سوچا کہ یہ نام نہاد مسلم لیڈر اگر ہوش مند ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ اب تم "یوم احتجاج" منانا چھوڑ دو، اب تم "یوم شکر" مناؤ۔ کیوں کہ ملک کی انتہا پسند طاقتوں نے ۴۴ سال کے اندر اپنی تمام تخریبی طاقت استعمال کر ڈالی۔ اس کے باوجود ملت اسلامی کا قافلہ انڈیا میں اور ساری دنیا میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات تو ہماری گاڑی کے لئے گویا راستہ کی وہ رکاوٹیں (frictions) ہیں جو گاڑی کو تیز دوڑنے میں مددگار کا کام کرتی ہیں۔

رات کو ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلا تو میری زبان پر یہ دعا تھی: اَللّٰھُمَّ اَنتَ الصاحبُ فی السفر و الخلیفۃ فی الاھل (اے اللہ، تو ہی میرے سفر کا ساتھی ہے اور تو ہی میرے اہل میں خلیفہ ہے)

میرے بچپن میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈریں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگرچہ اس کے بعد سیکڑوں یا شاید ہزاروں درسی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ویسی اردو ریڈر آج بھی کوئی دوسری

موجود نہیں۔

اس ریڈر میں دو کبوتروں کا قصہ تھا۔ ایک کا نام تھا بازندہ، دوسرے کا بازندہ۔ ایک نے دوسرے سے کہا چلو، دنیا کی سیر کریں۔ اس نے ہچکچاہٹ ظاہر کی۔ اس پر پہلے والے نے کہا:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

میرا حال یہ ہے کہ "نوجوانی" کی عمر میں بھی سفر میرے لئے پسندیدہ چیز نہ تھا۔ اب 'بڑھاپے' کی عمر میں تو اس کے پسندیدہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ پہلے اگر سفر میرے لئے غیر مرغوب تھا تو اب سفر میرے لئے مصیبت بن چکا ہے۔ تاہم ایک شخص جو کوئی مشن چلا رہا ہو اس کے لئے اس دنیا میں سفر کے بغیر چارہ بھی نہیں۔

گھر سے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات کو روانہ ہوا۔ دہلی ایرپورٹ پہنچا تو گھڑی میں سوا بارہ کا وقت تھا۔ گویا کہ گھر سے میں ۲۲ دسمبر کو نکلا اور ایرپورٹ پہنچا تو ۲۳ دسمبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ ایرپورٹ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخری گیٹ پر پہنچا جہاں لوگوں کا سفری بیگ ایک خاص مشین سے گزارا جاتا ہے۔ یہاں پولیس کے دو آدمی بیٹھے ہوئے اسکرین پر اپنی نظر جمائے ہوئے تھے۔ اسکرین پر ہر آدمی کے بیگ کا اندر کا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ مثلاً ایک بیگ کے اندر کالی لمبی سی چیز دکھائی دی۔ وہ بیگ فوراً روک لیا گیا۔ مسافر سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک لمبی چھری رکھی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح خدا اپنے عالمی انتظام کے تحت ہر شخص کے اندرون کو دیکھ رہا ہے۔ اوپر سے آدمی خواہ جو بھی لبادہ اوڑھے ہوئے ہو، مگر خدا اندر کی حقیقتوں تک سے واقف ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو آدمی کے اندر احتساب ذات کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ آدمی چاہنے لگتا ہے کہ خدا کے یہاں حساب کئے جانے سے پہلے وہ خود اپنا حساب کر لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے ___ حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔

ایرپورٹ کی انتظارگاہ میں میرے پاس دو آدمی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ لباس سے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے انگریزی میں پوچھا کہ آپ لوگ کون سی زبان

دل رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تبتی زبان۔ مزید گفت گو سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک تبتی ہے اور دوسرا بھوٹانی۔ دونوں کا تعلق بدھ مذہب سے تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ دلائی لاما کو ریلیجس ہیڈ سمجھتے ہیں یا گاڈ۔ مسٹر وانچوک (Jigme Wangchuk) نے جواب دیا :

He is everything for us.

(وہ ہمارے لئے سب کچھ ہیں) یہ لوگ دلائی لاما کو خدا کی طرح مقدس سمجھتے ہیں۔ موجودہ دلائی لاما چودھویں دلائی لاما ہیں۔ ۱۹۴۰ میں وہ تبت میں روحانی اور دنیوی حاکم مقرر ہوئے۔ مگر تبت پر چینی قبضہ کے خلاف ناکام بغاوت کے بعد ۱۹۰۹ میں وہ بھاگ کر انڈیا آگئے۔ تاہم تبتیوں کی نظر میں ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

دہلی ایرپورٹ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مسلم عورتوں کے پچھڑے پن کی بات کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک چلی ہوئی بات ہے جس کو لوگ سوچے سمجھے بغیر دہراتے ہیں۔ ورنہ آج مسلم خواتین کا تعلیمی معیار چالیس سال پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ چکا ہے۔

اتفاق سے میرے پاس آج کا ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر) تھا۔ اس کے درمیانی صفحہ پر ایک رپورٹ مسلم خواتین کی تعلیمی حالت کے بارہ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ آج مسلم خواتین تعلیم کے میدان میں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر اس میں بتایا گیا تھا کہ حال میں پٹنہ کی ایک لڑکی بہار پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں شریک ہوئی۔ یہ انٹرویو آیورویدک سسٹم کی ایک پوسٹ کے بارہ میں تھا۔ مسلم خاتون نے مقابلہ میں ٹاپ کیا۔ اس نے ویدوں کے اشلوک اتنی روانی کے ساتھ سنائے کہ انٹرویو لینے والے ماہرین حیرت زدہ رہ گئے :

A Muslim girl from Patna appeared for the Bihar Public Service Commission examination for a post in Ayurvedic system and topped the list. All the examiners which included Ayurvedic experts judged her to be the best candidate. She could, with great fluency, cite vedic slokas which surprised everyone.

میں نے کہا کہ پچھلے پچاس سال کے دوران نا اہل مسلم لیڈروں نے مسائل کی اتنی رٹ

لگائی کہ مسلمان وقتی طور پر بھول گئے کہ مسائل کے باوجود یہاں بے شمار مواقع بھی ان کے لئے موجود ہیں۔ اب تجربات کے بعد ہندستانی مسلمان اپنے نااہل لیڈروں کی گرفت سے باہر آگئے ہیں۔ اب وہ مسائل کے خلاف چیخ پکار کے بجائے مواقع کو استعمال کرنے پر توجہ دے رہے ہیں۔ اس تبدیلی نے اب مسلمانوں کو ایک نئے دور ترقی میں داخل کر دیا ہے۔

دہلی سے سوئس ایر کی فلائٹ ۱۹۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ۲۳ دسمبر کو ٹھیک دو بجے جہاز روانہ ہوا۔ آجکل سوئس ایر اول درجہ کی ہوائی کمپنی سمجھی جاتی ہے۔ اس کا انتظام معیاری نظر آیا۔ میں نے دہلی میں لکھوا دیا تھا کہ میرے لئے ایشیائی ویجٹیرین کھانا (Asian Vegetarian meal) دیا جائے۔ چنانچہ مزید فرمائش کے بغیر میری سیٹ پر ویجیٹرین کھانا پہنچتا رہا۔ کچھ وقت سونے میں اور کچھ اخبار اور میگزین پڑھتے گزرا۔

انٹرنیشنل ہرالڈ ٹریبون (۲۲ دسمبر) میں ایڈورڈ ڈیمنگ (W.Edwards Deming) کے حالات شائع ہوئے تھے جن کا ابھی ۲۰ دسمبر ۱۹۹۳ کو ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ایڈورڈ ڈیمنگ ایک امریکی ماہر شماریات (statistician) تھے۔ جاپان پر امریکی قبضہ کے بعد ۱۹۴۷ میں وہ امریکی حکومت کے مشیر کی حیثیت سے جاپان آئے۔ ۱۹۵۰ میں انھوں نے ٹوکیو میں ایک لکچر دیا۔ یہ لکچر کوالٹی کنٹرول کے بارہ میں تھا۔ انھوں نے جاپانیوں کو بتایا کہ کس طرح شماریاتی طریقہ کو اشیاء کے نقص کو دریافت کرنے میں استعمال کیا جاسکتا ہے، بجائے اس کے کہ صرف نگرانی پر اعتماد کیا جائے:

He taught Japanese how to use statistical methods to discover the cause of product defects, instead of relying only on inspections.

جاپانیوں نے بہت دلچسپی لی اور فوراً اس کو پکڑ لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جاپان کے کارخانے جو پہلے خراب سامان کے لئے مشہور تھے، اب بے نقص سامان بنانے لگے۔ انھوں نے ڈیمنگ کو اتنی اہمیت دی کہ اس کے نام پر ایک ڈیمنگ انعام (Deming Prize) جاری کر دیا۔ جاپان میں مقبولیت کے ۳۰ سال بعد اپنے وطن امریکہ میں ڈیمنگ کا اعتراف کیا گیا جب کہ فورڈ کمپنی نے ۱۹۸۱ میں اس کو اپنا مشیر مقرر کیا۔ جاپان کے لوگ اس امریکی کو کوالٹی کنٹرول کا دیوتا

(god of quality contro کہتے ہیں۔
اعتراف کا یہ مزاج کسی بھی ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ جاپانی اگر اپنے آپ میں گم
ہتے، وہ باہر سے نئی چیز لینے کی کوشش نہ کرتے تو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ جاپانیوں کے اسی
زاج کا نتیجہ ہے کہ فیکس کا طریقہ امریکہ میں دریافت ہوا مگر اس کو سب سے پہلے مارکٹ میں
انے والے جاپانی تھے۔

جس وقت ہمارا جہاز یورپ کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا، مجھے یاد آیا کہ یہی وہ سرزمین ہے
جس کے بارہ میں مسلم دنیا میں روز سازش اور ظلم کی داستانیں چھپتی رہتی ہیں۔ مثلاً موجودہ سفر پر
روانگی سے پہلے میں نے ایک پاکستانی اخبار (نوائے وقت ۳ دسمبر ۹۳) میں ایک رپورٹ پڑھی
اس کا عنوان تھا "مغرب کا مسلم دشمن رویہ"۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ سارا مسیحی یورپ مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا ہے۔
مسلم دشمنی یورپ کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا تھا: مغربی عیسائیوں
میں یہ رجحان واضح ہے کہ یورپ میں کوئی مسلمان مملکت نہ ہو۔ اس پس منظر میں جب یورپ کے
عین قلب میں بوسنیا کی مسلم مملکت ابھری تو سرب عیسائی اس پر چڑھ دوڑے اور مغربی ممالک نے
ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی تاکہ عین یورپ میں واقع اس مسلم مملکت سے چھٹکارا حاصل ہو۔ یورپ
اور امریکہ نے اپنے سیکولرزم کے تمام بلند بانگ نعروں کے باوجود بوسنیا میں مسلمانوں
کا قتل عام نہیں روکا۔ بلکہ بوسنیا کو ہتھیاروں کی فراہمی بند کر کے اس قتل عام کو سہل بنا دیا
تاکہ نہتے مسلمان کسی مزاحمت کے قابل ہی نہ رہیں (صفحہ ۶)

آجکل تمام مسلم دانشور بوسنیا کے معاملہ کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا کہ وہ یورپ کی
مسلم دشمنی کی یقینی علامت ہے، حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ بوسنیا خود نام نہاد مسلم دانشوروں
اور نااہل مسلم رہنماؤں کی اپنی نادانی کی عبرت ناک مثال ہے۔

بوسنیا اور اس طرح کے دوسرے مقامات میں جو کچھ پیش آیا وہ دراصل شریعت کے
اصول ترك المصلحة للمفسدة کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا۔ اس شرعی اصول کا مطلب یہ ہے
کہ ہر اس اقدام سے پرہیز کیا جائے جو نتیجہ کے اعتبار سے الٹا (counter-productive)

ثابت ہونے والا ہو۔ بوسنیا اور کشمیر اور فلپائن اور اراکان اور اس طرح کے ہر دوسرے مقام پر نااہل مسلم لیڈروں نے وہی غلطی کی جس کو عوامی مثل میں "آ بیل مجھے مار" کہا جاتا ہے۔ ہر جگہ وہ خود اپنے غیر دانشمندانہ اقدام کی سزا بھگت رہے ہیں اور اس کا الزام غلط طور پر وہ فریق ثانی کے اوپر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مزید تعجب یہ ہے کہ انھیں لوگوں کو سروس آف اسلام کا خطاب دیا جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اگر یہ سروس آف اسلام ہے تو ڈس سروس آف اسلام آخر کس چیز کا نام ہوگا۔ ان کی زیادہ صحیح تصویر اس انگریزی مثل میں ہے:

Fools rush in where angels fear to tread.

سوئس کمپنی کا فلائٹ میگزین (Swissair Gazette) دسمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس میں سب کے سب اشتہار یا اشتہاری مضامین تھے۔ ایک اشتہار میں ایک مخصوص بریف کیس کی تصویر تھی۔ اس میں سٹلائٹ ٹیلیفون نصب تھا۔ اور یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ عالمی ٹیلیفون (global telephone) آپ اپنے ساتھ رکھئے اور پھر آپ کسی بھی مقام سے کسی بھی مقام پر ربط قائم کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں عوامی مواصلاتی انقلاب کہاں تک پہنچ گیا ہے۔

ساڑھے آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز زیورک (سوئزرلینڈ) میں اتر گیا۔ ایئر پورٹ کے اندر چلتے ہوئے ایک دیوار پر ایک روشن بورڈ نظر سے گزرا۔ یہ مقامی ہوٹل کا اشتہار تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

Another 10 minutes and you'll be at the Hilton singing in the shower.

(مزید دس منٹ، اور آپ ہلٹن ہوٹل کے غسل خانہ میں گا رہے ہوں گے) میں نے سوچا کہ کاش دنیا کے لوگوں کو بتایا جا سکتا کہ اس سے بھی زیادہ بڑا ایک امکان ۱۰ منٹ بعد تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ وہ ہے باایمان موت اور اس کے بعد خدا کی جنت میں داخلہ۔

زیورک میں مجھے اگلی فلائٹ کے لئے چھ گھنٹہ تک ٹھہرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ متعلقہ کاؤنٹر پہنچ کر معلومات حاصل کروں۔ مگر وسیع ایئرپورٹ میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک سفید فام نوجوان نظر آیا جو ایک جگہ کھڑا ہوا تھا۔ اس سے میں نے کہا کہ میری مدد کیجئے۔ کیوں کہ میں یہاں نووارد (new commer) ہوں۔ وہ فوراً میرا ٹکٹ لے کر ساتھ ہو گیا۔ اور متعلقہ کاؤنٹر پر پہنچ

ساری معلومات حاصل کیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں بھی کہیں نو وارد ہوں گا اور وہاں کوئی شخص اسی طرح میری مدد کرے گا۔ اس نے اپنا نام کلاؤس بتایا۔

اس سفر میں اپنے عجز کا احساس بہت زیادہ غالب رہا۔ ۲ دسمبر کی دوپہر کو جبکہ میں زیورک ائیرپورٹ پر بیٹھا ہوا تھا، غیر معمولی احساس عجز کے تحت یہ شعر میری زبان پر آگیا:

نہ گلے نہ برگ سبزے نہ ثمر نہ سایہ دارم   درحیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

زیورک ہی میں ۱۹۵۹ میں ترکوں اور قبرص کے عیسائیوں کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جس کو زیورک معاہدہ (Zurich Agreement) کہا جاتا ہے۔ عثمانی ترکوں نے ۱۵۷۰ میں قبرص کو فتح کیا تھا۔ ۱۹۱۴ میں وہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب برطانیہ کی طاقت کمزور ہوئی تو قبرص کے یونانیوں اور ترکوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہوا۔ ترک مسلمان قبرص کی تقسیم چاہتے تھے تاکہ مشرقی قبرص کے مسلم اکثریتی علاقہ کو علیحدہ ملک بنایا جاسکے۔ لمبے خونیں ٹکراؤ کے بعد آخر کار برطانیہ کے دباؤ کے تحت مذکورہ زیورک معاہدہ ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی امن قائم نہ ہوسکا۔ پرتشدد ٹکراؤ کے نتیجہ میں ترکوں نے بہت سی ملی ہوئی چیزیں بھی کھودیں۔ اور اپنا سیاسی مقصود بھی حاصل نہ کرسکے۔

۲۳ دسمبر کی سہ پہر کو زیورک سے لاس اینجلز کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۰۶ کے ذریعہ طے ہوا۔ راستہ میں روزنامہ فائننشل ٹائمس (۲۳ دسمبر) کا مطالعہ کیا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ ساؤتھ افریقہ کی آخری سفید فام پارلیمنٹ نے ۴۵ کے مقابلہ میں ۲۳۷ ووٹوں سے فیصلہ کیا کہ ایک عارضی دستور بنایا جائے جو اکثریت کی حکومت کی بنیاد پر ہو اور اپریل ۱۹۹۴ء میں تمام نسلوں کی شرکت کے ساتھ الکشن کرایا جائے۔

South Africa's last white parliament voted by 237 to 45 to adopt an interim constitution leading to majority rule after all-race elections next April.

ساؤتھ افریقہ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ ساؤتھ افریقہ میں سفید فام لوگوں نے اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ سیاہ فام لوگوں کو ہر قسم کے حقوق سے محروم کئے ہوئے تھے۔ اس کے

خلاف وہاں تحریک اٹھی۔ مگر انھوں نے اس تحریک کو پوری طرح پرامن طوق پر چلایا۔ سفید فام حکومت نے ان کے خلاف تشدد کیا۔ مگر اس کا جواب انھوں نے گن کلچر سے نہیں دیا۔ وہ ہر حال میں عدم تشدد کے اصول پر قائم رہے۔ اس کا نتیجہ آخر کار سیاہ فام نسل کی کامیابی کی صورت میں نکلا۔

اس کے مقابلہ میں ان مسلم تحریکوں کی مثال لیجئے جو گن کلچر کے طریقہ پر چلائی گئیں۔ ان تحریکوں نے اپنی قوم کو یا ملک کو بربادی کے سوا کوئی اور تحفہ نہیں دیا۔

زیورک سے لاس اینجلز کا سفر ساڑھے گیارہ گھنٹہ کا تھا۔ یہ طوالت بہت زیادہ تھکا دینے والی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نیند کی صورت میں انسان کو بڑی عجیب نعمت عطا فرمائی ہے۔ نیند روزمرہ کی زندگی میں وہی کام کرتی ہے جو آپریشن تھیٹر میں مخدرات۔ چنانچہ سفر کے دوران کئی بار گہری نیند آئی اور یہ لمبا گھبرا دینے والا سفر بہ آسانی طے ہوگیا۔

لاس اینجلیز میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے سفید فام امریکی نے میرے پاسپورٹ کو چیک کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کا مقصد سفر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کانفرنس میں شرکت۔ دوبارہ پوچھا کہ کونسی کانفرنس۔ میں نے کہا کہ اسلامی کانفرنس۔ بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب بھی نہیں سمجھا ہے۔ اس نے کہا:

So it is business or pleasure.

میں نے کہا کہ نہ بزنس اور نہ پلیزر بلکہ مشن۔ اس نے مسکرا کر او کے کہا اور پاسپورٹ پر اسٹمپ لگا کر مجھے دیتے ہوئے کہا: تھینک یو۔

امریکی ذہن کے مطابق، باہر کا ایک شخص جب امریکہ آئے گا تو اس کا مقصد دو میں سے ایک ہوگا ـــــ تجارت یا تفریح۔ اس کے ذہنی سانچہ میں "اسلامی کانفرنس" ایک اجنبی چیز ہے۔ چنانچہ ہوائی جہاز کے اندر جو فارم ہم کو دیا گیا، اس میں مقصد سفر کے خانہ میں یہی دو لفظ لکھے ہوئے تھے۔

لاس اینجلیز ایئر پورٹ پر دو گیٹ ہیں۔ گیٹ اے، اور گیٹ بی۔ میں غلط طور پر گیٹ اے سے باہر آگیا۔ یہاں کوئی صاحب دکھائی نہیں دئے۔ میں کسی قدر پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسلامک سوسائٹی کو ٹیلیفون کر کے معلوم کروں۔ اتنے میں ایئر پورٹ کے

ایک صاحب سید بشیر شاہ آگئے۔ دریافت حال کے بعد وہ مجھ کو گیٹ بی کی طرف لے گئے۔ وہاں دو صاحبان میرے انتظار میں موجود تھے۔

ایئرپورٹ سے ڈاکٹر سلمان ندوی اور عبدالحمید سیمی صاحب کے ساتھ روانگی ہوئی۔ راستہ میں دونوں صاحبان سے گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر سلمان ندوی ساؤتھ افریقہ کی ایک یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلسطین میں اسرائیل کا اپنے سابقہ موقف سے ہٹ کر فلسطینیوں سے صلح کرنا اور ساؤتھ افریقہ میں سفید فام لوگوں کا سیاہ فام لوگوں کو یکساں سیاسی حقوق دینا، دونوں کے پیچھے تشدد کا زور کام کر رہا ہے۔ اسرائیل انتفاضہ کی سرگرمیوں سے جھکا ہے اور ساؤتھ افریقہ میں جب بم پھٹنے لگے تو ان لوگوں کو جھکنا پڑا۔ تاہم میں اس سوچ سے اتفاق نہ کر سکا۔

عبدالحمید سیمی صاحب نے بتایا کہ آرنج کاونٹی میں ایشین ۵ فیصد ہیں۔ مگر یہاں کی یونیورسٹی میں ایشیائی طلبہ کی تعداد ۲۵ فیصد ہے۔ یہی حال امریکہ کی اکثر یونیورسٹیوں کا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ کی سب سے زیادہ پرسٹیجس یونیورسٹی ہارورڈ میں وہاں کے ۲۰ ہزار طلبہ میں ایشیائی کافی ہیں۔ گیارہ سو کے اسٹاف میں ایک سو ایشیائی استاد ہیں۔ خود ان کے بھی دو لڑکے وہاں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں انتہائی سخت ڈسپلن ہے۔ مثلاً استاد، طلبہ یا کارکن کے سوا کوئی وہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ والدین بھی نہیں۔ وہاں صرف آئیڈنٹیٹی کارڈ پر کیمپس میں داخلہ ہوتا ہے۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں لائبریریاں ۲۴ گھنٹہ کھلی رہتی ہیں۔ اور طلبہ کثرت سے اس میں مطالعہ کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ لائبریری میں فاضل بات تو درکنار، کوئی شخص زور سے بول بھی نہیں سکتا۔ حال میں اسلام کے مطالعہ کے لئے ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک اسلامک ریسرچ کا شعبہ قائم ہوا ہے، اس شعبہ کو شاہ فہد کی طرف سے پانچ ملین ڈالر کا عطیہ دیا گیا ہے۔

یہاں میرا قیام جناب صغیر اسلم صاحب (پریسیڈنٹ اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی) کے مکان پر تھا۔ میں ان کے یہاں پہنچا تو مغرب بعد کا وقت ہو چکا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت جناب تشبیہ سید اور ان کے ایک ساتھی آگئے۔ ان لوگوں سے دیر تک بات ہوتی رہی۔

تشبیہ سید صاحب نے بتایا کہ ایک کمیونسٹ مسلمان کو ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر

مسجد میں دعا کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ تم کو لینن اور ماو سے دعا کرنا چاہئے۔ مگر تم اللہ سے دعا کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ہماری ذہنی کنڈیشننگ کی وجہ سے ہے۔ میں نے کہا کہ انھوں نے ایک صحیح بات غلط الفاظ میں کہی۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر آدمی مشکل اوقات میں اللہ سے دعا کرنے لگتا ہے۔ مگر اس کا سبب سماج کی طرف سے ہونے والی کنڈیشننگ نہیں ہے۔ اس کا اصل سبب نیچر ہے۔ اور نیچر پیدائش سے آتا ہے نہ کہ کسی خارجی قسم کی کنڈیشننگ سے۔

۲۴ دسمبر کو عشاء کی نماز جناب منیر اسلم صاحب کے مکان پر پڑھی۔ نماز کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو زبان پر یہ الفاظ آگئے: خدایا، میرے سفر کو اور میرے قیام کو، میرے چلنے اور میرے ٹھہرنے کو، میرے بولنے اور میرے چپ رہنے کو میرے لئے خیر کا باعث بنا، مجھے تمام آفتوں سے اپنی پناہ میں لے لے۔

ایک تعلیم یافتہ پاکستانی سے گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ میاں نواز شریف کے مداح تھے۔ انھوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ایٹم بم بنانا نہیں چاہتی۔ میں نے کہا کہ نواز شریف کا بیان تو یہ ہے کہ بے نظیر نے تین سال پہلے ایٹمی عمل کو رول بیک کر دیا تھا۔ پھر اس کے بعد جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انھوں نے کیوں نہیں اس کو دوبارہ جاری کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ یہ امریکہ کے اشارہ پر ہوا۔

میں نے بہت سے پاکستانیوں سے بات کی۔ تقریباً ہر شخص امریکی مخالف بات کرتا ہے۔ اس کے باوجود پاکستان میں امریکہ کا عمل دخل کیوں۔ انھوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ پاکستان کبھی بھی امریکی مخالفت کو افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ آخر کیوں۔ انھوں نے کہا: انڈیا کا خوف۔ میں نے کہا کہ یہ پاکستانی سیاست کی پہلی اینٹ ہے، اور یہ پہلی اینٹ ہی غلط ہے۔ انڈیا پاکستان کا دشمن نہیں، انڈیا پاکستان کا ایک طاقت ور پڑوسی ہے۔ اگر آپ طاقتور امریکہ سے خود اس کے ٹرم پر دوستی کر سکتے ہیں تو انڈیا سے بھی آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اخوانی فکر سے متاثر تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کئی چیزیں پڑھی ہیں۔ العالم الاسلامی (۲۱ اکتوبر ۱۹۹۳) میں آپ کا مفصل انٹرویو بھی پڑھا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کو بس پرامن داعی بنا دینا چاہتے ہیں اور

INFORMATIONAL HANDOUT

Muslim Populations

According to U.S. Census Bureau records, the total population of the world is five and a half billion people. Over twenty percent(over one billion) of these five billion are Muslims. Furthermore, Muslims live in all parts of the world, including Asia, Africa, the Middle East, Southeast Asia, Australia, Europe, and the Americas. The following chart lists the populations of Muslims in various regions of the world.

India/Pakistan	250-300 million
Africa	200 million
Arab countries	180 million
Southeast Asia	170 million
Europe	65 million
Iran	50 million
Central Asia	50 million
China	50 million
Afghanistan	15 million
North America	6 million
South America	3 million
Australia	1 million
Worldwide	***over 1 billion***

Sources (1993):
American Muslim Council, Washington, D.C.
Islamic Affairs Dept., Embassy of Saudi Arabia, Washington, D.C.
World Almanac

علاوہ مسلسل امریکہ میں اسلامی لٹریچر مغربی زبانوں میں پہنچ رہا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا بحیثیت قوم تعلق ہے، ان کی حالت کسی بھی ملک میں اچھی نہیں۔ مگر عین اسی وقت اسلامی دعوت کا عمل ہمیشہ کی طرح جاری ہے۔ اس میں کوئی وقفہ نہیں آیا۔ یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ کوئی بھی طوفان اس کے تاریخی تسلسل کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

ایک پرچہ میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد کے بارہ میں نقشہ چھپا تھا۔ یہ یہاں علحدہ صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

۲۴ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں پڑھی۔ اندر سے لیکر باہر تک پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔ نہایت پر سکون ماحول میں نماز ہوئی۔ پہلی اذان اور دوسری اذان دونوں لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہوئی۔ مگر اتنے بڑے مجمع میں کسی بھی شخص نے یہ تجویز پیش نہیں کی کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہونا چاہئے تاکہ اسلام کی عظمت یہاں کی فضاؤں میں گونجے۔ اس کے برعکس ہندستان میں لاؤڈ اسپیکر اسلام کی عظمت کا نشان بن گیا ہے۔ اگر وہاں کی مسجدوں کی چھت سے لاؤڈ اسپیکر اتارنے کی بات کی جائے تو فوراً کچھ لوگ اس کو اسلامی وقار کا مسئلہ بنالیں گے۔ اور نادان لیڈروں کی رہنمائی میں بہت سے مسلمان کفن بردوش ہو کر سڑکوں پر نکل آئیں گے۔

لاؤڈ اسپیکر کی اذان امریکہ کی سوسائٹی میں غیر ضروری شور کے ہم معنی ہے۔ اب مسلمان یہ نہیں کرتے کہ جلسہ کر کے کہیں کہ یہ شور نہیں ہے، یہ اذان ہے۔ اس طرح باہر کے ملکوں میں مسلمان وہاں کے حالات سے ہم آہنگ ہو کر رہتے ہیں، چنانچہ وہاں ان کو امن بھی حاصل ہے اور ترقی کے مواقع بھی۔ ہندستان کے مسلمان یہاں کے حالات سے موافقت کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے یہاں وہ امن سے بھی محروم ہیں اور ترقی سے بھی۔

ایک صاحب نے مسجد میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکہ میں ہمارا اصل مسئلہ اپنے اسلامی تشخص کی حفاظت ہے۔ اگر ہم نے اپنا اسلامی تشخص کھو دیا تو اس ملک میں مسلمان کی حیثیت سے ہمارا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔

مغربی ملکوں میں ہر "اسلام پسند" مسلمان یہی لکھتا یا بولتا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس

قسم کی باتیں محض فریاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور فریاد سے کبھی کسی قوم کا مستقبل تعمیر ہونے والا نہیں۔ یہاں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کا مسلم نوجوان دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف جدید تہذیب کی مونقیں ہیں۔ دوسری طرف آپ اسلامی تشخص یا ملی تشخص کے نام پر جو چیز ان کو دے رہے ہیں اس میں انھیں اسلام بظاہر کمتر دکھائی دیتا ہے اور جدید تہذیب برتر نظر آتی ہے اور یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ جس چیز کو بہتر سمجھے اس کو چھوڑ کر کمتر کو اختیار کرے۔

میں نے کہا کہ اس کا حل یہ ہے کہ آپ جدید تہذیب کے مقابلہ میں اسلام کی برتر آئیڈیالوجی کو پیش کریں نہ کہ اس چیز کو جس کو اسلامی تشخص کہا جاتا ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی بلاشبہ تمام چیزوں سے اعلیٰ ہے۔ جو آدمی اسلامی آئیڈیالوجی کو اعلیٰ فکری سطح پر پالے اس کو بقیہ تمام چیزیں اتنی حقیر معلوم ہوں گی کہ وہ خود ہی ان کو چھوڑ کر اسلام کو اپنی عزیز ترین متاع بنا لے گا۔

ایک صاحب نے تعجب کے ساتھ کہا کہ ہندستان میں ہریجن ترقی کر رہے ہیں اور مسلمان پیچھے جا رہے ہیں۔ اس میں ہندستانی حکومت کی کوئی بہت گہری سازش نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہے۔ مگر وہ کسی سازش کی بنا پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ خود قانون قدرت کے تحت ہو رہا ہے۔

ہریجنوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنی پوری تاریخ میں ترقی سے محروم رہے ہیں۔ جس قوم نے ترقی نہ کی ہو وہ ہزاروں سال تک بھی زندہ رہتی ہے، اس پر موت طاری نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی قوم مسلسل دباؤ میں رہتی ہے۔ یہ دباؤ اس کی زندگی کا ضامن بن جاتا ہے۔

زندہ سے مردہ بن جانے کا واقعہ ہمیشہ اس قوم کے ساتھ ہوتا ہے جو ترقی اور عروج کا درجہ حاصل کر لے۔ ایسی قوم میں وہ صورت پیش آتی ہے جو مسلمانوں میں پیش آئی۔ ان میں ایسے شعراء اور خطباء اور انشا پرداز پیدا ہوتے ہیں جو قوم کی گزری ہوئی عظمت کے ترانے گاتے ہیں۔ بطور خود وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ قوم کو جگا رہے ہیں۔ حالاں کہ باعتبار نتیجہ وہ ان کی عملی قوت کو سرد کر رہے ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس سے پدرم سلطان بود (paranoic character) کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنا تشخص ماضی کے اعتبار سے قائم کرتے ہیں۔ جب کہ ان کے معاصر لوگ ان کے ساتھ ان کے آج کے اعتبار سے معاملہ کرتے ہیں۔ یہی فرق مذکورہ نفسیات

کو جنم دیتا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے سانحہ کے بعد بمبئی میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اس کی رپورٹ امریکی اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ ایک امریکی صحافی اینڈریو وارڈ (Andrew Ward) نے بمبئی جا کر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ اس کی رپورٹ واشنگٹن پوسٹ ۱۶ مارچ ۱۹۹۳ میں چھپی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ میں نے یہاں کے مسلم میگزین (The Orange Crescent) کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۳ میں دیکھا۔

اینڈریو وارڈ نے اپنا ایک احساس اس طرح لکھا ہے کہ جب میں نے بمبئی کے ہندوؤں سے پوچھا کہ وہ متعین طور پر بتائیں کہ مسلم پڑوسیوں کے ہاتھوں سے انھیں کیا تکلیف پہنچی ہے تو انھوں نے ہمیشہ قومی واقعات بیان کئے۔ انھوں نے پڑوس کے اچھے مسلم خاندان سے اپنے ذاتی تجربات کو نظر انداز کرتے ہوئے ناقابل لحاظ مستثنیات کو عموم کی حیثیت دے دی:

When I asked Hindus how, specifically they had suffered at the hands of their Muslim neighbours, they reverted to nation alist abstractions and reduced their own experiences with the nice Muslim family next door to insignificant exceptions to the general rule.

اس معاملہ میں ٹھیک یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے۔ ہر مسلمان اپنے قریبی ہندو سے اچھے سلوک کا تجربہ کر رہا ہے۔ مگر جب قومی سطح پر رائے قائم کرنا ہو تو وہ بعض مستثنیٰ واقعات (مثلاً اجودھیا) کو لے کر پوری ہندو قوم کے بارہ میں منفی احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔ طرز فکر کی اسی غلطی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی تعلقات کو غیر ضروری طور پر تلخ بنا دیا ہے۔

شکاگو کے ایک مسلم ادارہ کی طرف سے بڑے سائز پر چھپا ہوا ایک آرٹیکل نظر سے گذرا۔ اس کا عنوان تھا ــــ اسلام کو عقلی انداز میں کس طرح پیش کیا جائے:

How to present Islam : A rational approach

اس آرٹیکل میں اسلام کی مختلف تعلیمات کا مختصر تعارف تھا۔ مگر اس کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ بس عام روایتی انداز میں ہے۔ اس کا انداز مجھے ریشنل کے بجائے ٹریڈیشنل نظر آیا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ انگریزی میں تھا۔

صبر کے بارہ میں اس میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان کی زندگی مستقل جہاد کی زندگی ہے۔ اس جہاد میں مسلمان کو مخالفین کی طرف سے مختلف قسم کی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ ان مصیبتوں کو سہتے ہوئے جہاد جاری رکھنے کا نام صبر ہے (صفحہ ۱۹) پھر جہاد کے تعارف میں بتایا گیا تھا کہ جہاد اس کوشش کا نام ہے کہ خدا کے مکمل قانون کو زمین پر نافذ کیا جائے:

This is hardest of the struggles (jihad), that is,to implement the rule of God on earth.

اصل حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک عبادت ہے۔ موجودہ دنیا آدمی کے لئے آزمائش گاہ ہے۔ اس آزمائش میں اترنے کے لئے مستقل صبر کی ضرورت ہے۔ مومن کا اصل مقصد زمین پر نفاذ قانون نہیں ہے بلکہ اپنی ذات کو خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اس صابرانہ زندگی میں کبھی مخالفین سے مقابلہ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس وقت بشرط استطاعت، مخالفین کے مقابلہ میں جمنے کا نام صبر ہوگا۔

میں نے ایک ہندستانی بزرگ کا عربی مقالہ پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: الأُمّةُ الاسلاميةُ مُعَرّضَةٌ لِلخطر (امت اسلامیہ خطرات کی زد میں) اسی طرح ایک اردو ہفت روزہ میں ایک اور عالم کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا "امت اسلامیہ عالمی سازش کے نرغہ میں" ان مقالات میں بتایا گیا تھا کہ مسلم ملت اس وقت ساری دنیا میں خطرات و مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ ہر جگہ اس کے وجود کو چیلنج کیا جارہا ہے۔ تمام قومیں اس کے خلاف سازش کا جال بچھانے میں مصروف ہیں۔ وغیرہ۔

یہ بات میں نے ہندستان میں پڑھی تھی۔ امریکہ کے مسلمانوں سے ملاقات اور گفتگو میں میں نے پایا کہ ان کا ذہن بھی ٹھیک یہی ہے۔ ایک صاحب جو امریکہ میں عزت اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں انھوں نے جب یہی بات دہرائی تو میں نے کہا کہ آپ اس "دشمن ملک" میں اتنی اچھی زندگی گزار رہے ہیں، پھر آپ اپنی سوچ کو خود اپنے آپ سے کیوں نہیں شروع کرتے۔ آپ اخباری خبروں کی بنیاد پر کیوں ملت مسلمہ کے بارہ میں تبصرہ کر رہے ہیں۔

آجکل کے تعلیم یافتہ مسلمان مغربی پریس پر منفی خبر رسانی (disinformation) کا الزام دیتے

ہیں۔ مگر یہ الزام خود مسلم پریس پر اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر چسپاں ہوتا ہے۔ مسلم پریس اچھی خبروں کو نمایاں نہیں کرتا۔ وہ صرف ان خبروں کو مبالغہ آمیز انداز میں چھاپتا ہے جو منفی نوعیت کی ہیں۔ مسلم پریس کی اس منفی رپورٹنگ نے ساری دنیا میں مسلمانوں کے ذہن کو اس طرح بگاڑا ہے کہ وہ مثبت طرز فکر سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ ایک بار کسی علاقہ میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس دوران انھیں ایک قلعہ کا محاصرہ کرنا پڑا۔ مگر انھوں نے پایا کہ محاصرہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ لمبی مدت تک قلعہ کا محاصرہ کرنے کے باوجود قلعہ فتح نہ ہو سکا۔

محاصرہ کی مدت جب غیر معمولی طور پر طویل ہو گئی تو ایک روز وہ لوگ مشورہ کے لئے بیٹھے۔ مشورہ میں جو بات خاص طور پر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں سے کوئی تعلیم ہم سے چھوٹ گئی ہے۔ اسی لئے قلعہ کی فتح میں ہم کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ تمام لوگ بیٹھ کر یہ سوچنے لگے کہ وہ کون سی اسلامی تعلیم ہے جو ہم سے چھوٹی ہے تاکہ اس پر فوراً عمل شروع کر دیا جائے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج اگر مسلم دنیا کے نمائندہ افراد ایک مقام پر جمع ہوں اور اس اسوۂ صحابہ کی روشنی میں یہ سوچیں کہ ہم سے کون سی سنت نبوی چھوٹ گئی ہے جس کی وجہ سے ہم پر موجودہ مصیبتیں آرہی ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس رائے پر پہنچیں گے کہ ہم سے سنت دعوت چھوٹ گئی ہے۔ اس لئے کہ آج ہر سنت مسلمانوں میں دکھائی دیتی ہے مگر واحد سنت جس پر آج عمل مفقود ہے وہ سنت دعوت ہے۔

سیرت کانفرنس کا آغاز بوئنا ہوٹل (Buena Park Hotel) میں ۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ کو ہوا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ ہال میں ڈیڑھ ہزار کے لئے کرسیاں تھیں۔ کھڑے ہوئے لوگوں کو ملا کر تقریباً سترہ سو آدمی موجود تھے۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں نے تقریریں کیں۔ مقررین کے نام یہ ہیں:

مسٹر صغیر اسلم صدر اسلامک سوسائٹی، ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی، ڈاکٹر جعفر عبدالسلام

ڈاکٹر سید سلمان ندوی، ڈاکٹر حسن حتحوت، ڈاکٹر جعفر شیخ ادریس، ڈاکٹر سلیمان نیانگ، ڈاکٹر عبداللہ غازی، ڈاکٹر اسلم عبداللہ، ڈاکٹر فضل مرزا، ڈاکٹر احمد صقر، ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی، ڈاکٹر یحیی عبدالرحمان، ڈاکٹر احسان باغبی، ڈاکٹر نشارعُی، ڈاکٹر نذیر خواجہ، ڈاکٹر حسن الدین ہاشمی، ڈاکٹر احمد النجار، ڈاکٹر محمد یونس، ڈاکٹر غلام نبی فائی، وغیرہ۔

میرے ساتھ عجیب قصہ ہوا۔ میں دہلی سے چلا تو میرے ذہن میں یہ تھا کہ کانفرنس میں زیادہ تر اردو داں لوگ ہوں گے اور میں زبانی تقریر کی صورت میں وہاں اپنے خیالات کا اظہار کر دوں گا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس میں سارا انگریزی کا ماحول ہوگا اور انگریزی ہی میں تمام تقریریں ہوں گی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ ۲۳ دسمبر کی شام کو میں صغیر اسلم صاحب کے مکان میں اپنے کمرہ میں سو گیا۔ پہلی نیند کے بعد آنکھ کھلی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کل کے لئے انگریزی میں پیپر لکھنا شروع کر دیا۔ فجر کے وقت تک پانچ صفحہ کا ایک مضمون تیار ہو گیا۔ اس میں سیرت کی روشنی میں زندگی کی کامیابی کے دس اصول بتائے گئے تھے۔

اب سوال ٹائپ کرانے کا تھا۔ صغیر اسلم صاحب نے اس کو اسلامک سوسائٹی کے ٹائپسٹ کو دیا۔ مگر وہ شروع کرنے کے بعد اس کو پورا نہ کر سکے۔ کیوں کہ آج ان کو غیر معمولی مصروفیت تھی۔ اس کے بعد اس کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے لے لیا۔ وہ اس کو اپنے گھر لے گئے۔ وہاں ان کے صاحبزادہ نے اس کو کمپیوٹر پر ٹائپ کیا۔ پھر انھوں نے فیکس کے ذریعہ اس کو میری قیام گاہ پر بھیج دیا۔ یہ سب کام جمعہ کی رات تک ہو گیا۔ اگلے دن اجلاس میں میں نے اس کو پڑھا۔

لوگوں نے اس کو پسند کیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی کاپی طلب کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اس کو فریم کر کے ہر جگہ لٹکا دینا چاہئے۔ ڈاکٹر یحیی رحمان نے کہا:

It is because of people like you, that Islam keeps growing.

یہ مقالہ ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔

اس کانفرنس میں امریکہ کے مختلف حصوں سے ڈیڑھ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ یہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان میں بہت سے الرسالہ پڑھنے والے بھی ملے۔ میں نے پایا کہ جو لوگ الرسالہ برابر پڑھتے ہیں انھیں کے اندر مثبت طرز فکر ہے۔ دوسرے لوگ عام طور پر منفی طرز فکر میں

مبتلا نظر آئے۔

قرآن وحدیث کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر کیا جائے تو ان میں مثبت تفکیر کا پیغام ملے گا۔ مثلاً آپ قرآن کھولیں تو پہلی آیت شکر کی آیت ملے گی (الحمد للہ رب العالمین) گویا کہ قرآن وہ ذہن بنانا چاہتا ہے جو احساس یافت سے سرشار ہو۔ مگر آج مسلمانوں کا ذہن احساس محرومی سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح آپ صحیح بخاری کھولیں تو شروع ہی میں آپ کو یہ حدیث پڑھنے کو ملےگی کہ انما الاعمال بالنیات۔ گویا پیغمبر اسلام مسلمانوں میں وہ ذہن پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اندرونی حقیقتوں کو اہمیت دے، ظاہری باتوں کو وہ نظر انداز کر دے۔ مگر آج مسلمانوں کی پوری سوچ ظواہر پر اٹکی ہوئی ہے۔ حقائق کی انھیں سرے سے خبر ہی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے فہم اسلامی کا ماخذ حقیقۃً قرآن وحدیث نہیں ہے۔ اس کا ماخذ ان مفکرین کی کتابیں ہیں جو ردعمل کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ اسی نفسیات کے تحت انھوں نے اسلام کی تعبیر پیش کی۔ اس تعبیری لٹریچر نے مسلمانوں کے اندر قرآن وسنت والا ذہن نہیں بنایا بلکہ ردعمل کا ذہن بنا دیا۔ یہی منفی ذہن ہے جس کا مظاہرہ آج ہر طرف نظر آتا ہے۔ اسی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہر جگہ یا تو لفظی ٹکراؤ جاری ہے یا شمشیری ٹکراؤ۔

ایک سیاہ فام نومسلم نے تقریر کرتے ہوئے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انٹلکچول نہیں تھے:

Prophet Muhammad was not an intellectual.

اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ نومسلم کی نیت بخیر تھی۔ وہ جو بات کہنا چاہتا تھا اس کے لئے اس نے غلط لفظ کا استعمال کیا۔ غالباً وہ کہنا چاہتا تھا کہ پیغمبر اسلام آجکل کے رسمی تعلیمی تصور کے مطابق کوئی ڈگری یافتہ آدمی نہیں تھے۔ اسی بنا پر آپ کو اُمّی کہا گیا ہے۔ مگر انٹلکچول ہونا اس سے الگ چیز ہے، اور اس اعتبار سے بلاشبہ آپ ایک سپر انٹلکچول انسان تھے۔

۲۵ دسمبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد اعزازی دعوت (banquet) کا انتظام تھا۔ اس میں پرنس محمد فیصل السعود بھی شریک ہوئے۔ وہ امریکہ کی سعودی ایمبیسی میں ڈپارٹمنٹ آف

اسلامک افیرس کے چیرمین ہیں۔ چند خاص افراد ان کے ساتھ کھانے میں بٹھائے گئے تھے۔ مجھ کو بھی بلاکر اس میں شریک کیا گیا تھا۔ میں خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔ انھوں نے ابتداءً مجھ کو پہچانا نہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ گفت گو میں مشغول رہے۔ اس درمیان ایک عرب ڈاکٹر عبد القادر النجار آگئے۔ انھوں نے میرے بارہ میں بتایا کہ یہ فلاں شخص ہیں اور ان کی بہت سی کتابیں ہیں۔ پرنس فیصل اس سے پہلے رزرویشن کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ مگر میرے بارہ میں جانتے ہی وہ بہت خوش ہوئے اور کھل کر باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدیٰ اس وقت پڑھی جب کہ میری عمر ۱۶ سال تھی۔ ہم لوگ اس کے بارہ میں مذاکرے کیا کرتے تھے۔ شیخ نجار نے میرے بارہ میں بتایا کہ انھوں نے انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا آف قرآن تیار کی ہے اور اب اس کو چھپوا رہے ہیں۔ پرنس نے بہت دلچسپی ظاہر کی اور کہا کہ چھپتے ہی ان کے نام ایک نسخہ روانہ کیا جائے۔

ان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی وہاں بھی انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں سب سے پہلے یہی بات کہی کہ مجھے آکر جب معلوم ہوا کہ یہاں شیخ وحید الدین موجود ہیں تو مجھے تعجب انگیز خوشی (pleasant surprise) ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مسلم نوجوانوں کو یہ کتاب خاص طور پر پڑھنا چاہئے جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ وغیرہ۔

جلسہ کے خاتمہ پر جب پرنس محمد فیصل السعود باہر نکلے تو گیٹ پر تین مسلم نوجوان انگریزی میں ان کے خلاف زور زور سے بولنے لگے۔ منتظمین جلسہ کے بارہ میں انھوں نے کہا کہ آپ لوگ ان کو ہزاکسی لنسی کہکر خطاب کرتے ہیں، حالاں کہ سعودی تو ایسے اور ایسے ہوتے ہیں۔ پرنس تو فوراً چلے گئے۔ مگر نوجوان بدستور زور زور سے چلاتے رہے۔

میں وہاں کھڑا ہوکر اس منظر کو خاموش دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ہوٹل کے جنرل منیجر مسٹر جاوید نواز آگئے۔ اگرچہ لڑکے نہایت اشتعال انگیز انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔ مگر مسٹر جاوید نواز ذرا بھی مشتعل نہیں ہوئے۔ انتہائی ٹھنڈے انداز میں انھوں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے۔ آپ کو میں پانچ سکنڈ دیتا ہوں۔ آپ پانچ سکنڈ میں یہاں سے چلے جائیے۔ ورنہ میں آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ یہ سنتے ہی ان نوجوانوں کا حال ایسا ہوگیا

بیسے غبارہ کی ہوا نکل جائے۔ وہ خاموش ہو کر تیزی سے باہر چلے گئے —— میں نے سوچا کہ موٹی بہادری ہمیشہ جھوٹی بزدلی پر ختم ہوتی ہے۔

امریکہ میں مسلم نوجوانوں کی ایک انتہا پسند جماعت ہے۔ غالباً یہ لوگ اسی جماعت سے ملق رکھتے تھے۔ یہ لوگ ان مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے ہیں جو " خلافت " کے لئے کوشش نہ کر رہے ہوں۔ ہ امریکہ میں اسلامی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کیلی فورنیا در اصل خلیفورنیا ہے ور سب سے پہلے اسلامی خلافت یہیں قائم ہوگی۔

اس طرح کی کانفرنسوں میں عام طور پر اہل علم جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں اسٹیج کی قریریں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ یہاں کھانے کی میز پر یا دوسرے مواقع پر جو ملاقاتیں ہوتی ہتی ہیں، ان میں بھی اکثر علمی باتیں جاری رہتی ہیں۔

ایک بار کھانے کی میز پر طرز تحریر کے بارہ میں باتیں ہونے لگیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف اتیں سنائیں۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے بتایا کہ ٹامس جیفرسن کی عادت تھی کہ وہ مختصر خط لکھا کرتا تھا۔ کسی نے اس سے کہا کہ آپ ہمیشہ مختصر خط لکھتے ہیں۔ ٹامس جیفرسن نے جواب دیا کہ کہ میرے پاس زیادہ وقت ہوتا تو میں اور بھی مختصر خط لکھتا :

If I had more time, I would have written even shorter letters.

نیویارک کے انگریزی سہ روزہ (The Minaret) کے اڈیٹر مسٹر محمد عبد المنعم نے ۲۶ دسمبر کی شام کو انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ بہت سے لوگ انڈیا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ کوئی استثنائی ملک ہو اور وہاں مسلمانوں کے لئے ظلم ہی ظلم ہو۔ میں اس قسم کے نظریہ کو بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ انڈیا میں بھی مسلمانوں کے لئے ترقی کے وہی مواقع ہیں جو دوسرے ملکوں میں ان کے لئے ہیں۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے سو سال میں بدقسمتی سے انڈیا میں ایسے مسلم لیڈر اٹھے جو مسلمانوں کو زندگی کی شاہراہ سے بھٹکاتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے ذہن کو مسائل میں الجھائے رکھا۔ جب کہ صحیح رہنمائی یہ ہے کہ لوگوں کو مواقع کو استعمال کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔

۱ اسپین کی راجدھانی میڈرڈ میں ۲۸ -- ۳۰ نومبر ۱۹۹۴ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی جس میں عیسائیت، یہودیت اور اسلام کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور وہاں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے ذیل میں الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲ بڑودہ (گجرات) میں ۱۳ نومبر ۱۹۹۴ کو ایک نیشنل سینار ہوا۔ اس میں پورے ملک سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: ریلیجن اینڈ سوسائٹی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے خطاب کیا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۳ سودیسی بھنڈار سنیٹر (نانگلوئی) کی طرف سے ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مشترک مجمع سے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا ــــ نیچرل وے لائف۔

۴ ۱۹ - ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کو نہرو میوزیم (نئی دہلی) میں ایک سینار ہوا۔ سینار کا موضوع تعلیمی سدھار تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ ۱۹ نومبر کی صبح کو افتتاحی اجلاس میں ایک تقریر کی۔ دوسری تقریر ۲۰ نومبر کی شام کو ہوئی۔

۵ رائٹر نیوز ایجنسی کے نمائندہ مقیم بمبئی مسٹر جارج فرنانڈیس نے ۲ دسمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلیفون پر لیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ دو سال پورا ہونے کے بعد اب مسلم عوام کے جذبات اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں کیا ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اب ہندو عوام اور مسلم دونوں کو امن سے دلچسپی ہے۔ دونوں ہی جھگڑے والی باتوں سے دور ہو چکے ہیں۔

۶ خدا کے فضل سے پریس کے تعاون کے تحت مسلسل اردو، انگریزی، ہندی، تامل، گجراتی اور دوسری زبانوں میں اسلامی تعارف کا سلسلہ جاری ہے۔ اس سلسلہ میں دہلی کے انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس میں شائع شدہ مضمون (اسلام ان انڈیا) کا ایک

پیراگراف بطور نمونہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ صدر اسلامی مرکز کا یہ مضمون ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ میں چھپا ہے:

Islam is a natural faith, free of all adulterations. By sheer virtue of its own strength, it can make inroads into the hearts of the people. The only barrier to its natural acceptance by others is the atmosphere of belligerence. If the message of Islam is to be successfully communicated, Muslims themselves must prevent any unfavourable atmosphere from coming in its way. If Muslims can achieve only this, Islam will begin again to command respect of others and enter the hearts of people on its own. There will be no further need to make any direct efforts towards this end.

حوض رانی (دہلی) میں ۱۰ دسمبر ۱۹۹۴ کو بھائی چارہ دیوس کے تحت ایک جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اسلامی نقطہ نظر پیش کیا۔ لوگوں نے اس کو پسند کیا۔ منتظمین نے کہا کہ ہم ان خیالات کو زیادہ سے زیادہ میڈیا میں پھیلائیں گے۔ اس جلسہ کا انتظام سدبھاو مشن نے کیا تھا۔

۸ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (نئی دہلی) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ کو ان کے اجتماع میں شرکت کی اور "ہندستانی مسلمانوں کی تاریخی تصویر" کے موضوع پر مفصل تقریر کی۔ تقریر کے بعد آدھ گھنٹہ تک سوال وجواب ہوا۔

۹ ہندی اخبار ہندستان کی سینئر رپورٹر مسز بایوری بھردواج نے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ماہنامہ کادمبنی کے لئے تھا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ سیاست اور مذہب ایک ہیں یا الگ الگ ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ سیاست سے مذہب کو جوڑنے کا کام پر امن جدوجہد کے ذریعہ ہو سکتا ہے نہ کہ زور زبردستی سے۔ زور زبردستی سے جو چیز لائی جائے گی وہ مذہب نہیں ہوگا بلکہ صرف تباہی ہوگی۔

۱۰ سودیسی جاگرن منچ کی طرف سے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۴ کو سپرو ہاؤس میں ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ ہندستان کے لئے ملٹی نیشنل کمپنیوں کا آنا مفید ہے یا مضر۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۱۱ نیو انڈیا موومنٹ کی طرف سے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۴ کو دہلی یونیورسٹی (گاندھی بھون) میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع بحث تھا: نیشنل آلٹرنیٹو۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۲ ڈاکٹر شیام پرساد مکرجی (دہلی) میں ۱۸ دسمبر ۱۹۹۴ کو اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد کی طرف سے ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع موجودہ ایجوکیشنل سسٹم تھا۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ انھوں نے اس جلسہ میں شرکت کی اور موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۳ سنٹر فار پیس اسٹڈیز (نئی دہلی) کی طرف سے ۲۷ دسمبر ۱۹۹۴ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: انڈیا اینڈ دی اسلامک ورلڈ۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اختتامی خطاب کیا۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں موضوع زیر بحث کی وضاحت کی گئی۔

۱۴ یکم جنوری ۱۹۹۵ کو ہیلی روڈ (نئی دہلی) پر تعلیم یافتہ افراد کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع "نیشن بلڈنگ" تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کئے۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ آزادی کی تحریک نے انڈیا کو سیاسی قیادت دی۔ مگر اس تحریک سے کوئی فکری قیادت ابھر نہ سکی۔ یہی ہمارے ملک کا سب سے بڑا خلا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک میں ایک نئی تحریک اٹھے جو صحیح فکری قیادت پیدا کرے۔

۱۵ سابق صدر گیانی ذیل سنگھ کی وفات پر ۲۷ دسمبر ۱۹۹۴ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اپنی مختصر تقریر میں انھوں نے بتایا کہ گیانی ذیل سنگھ کی زندگی میں ایک بہت بڑا سبق ہے۔ وہ ۱۹۱۶ میں ایک بڑھئی کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہوسکی۔ مگر وہ پنجاب کے منسٹر اور پھر چیف منسٹر ہوئے۔ اس کے بعد وہ پریسیڈنٹ آف انڈیا کے عہدہ پر پہنچے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی محنت کے ذریعہ ہر قسم کی ترقی اور کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرِ سرپرستی

مولانا وحیدالدین خان

صدر، اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۲

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333

Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7 ☐ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)

Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

ایک آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : اور اسی طرح ہم نے شریر آدمیوں کو اور شریر جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کو پرفریب باتیں سکھاتے ہیں دھوکا دینے کے لئے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرسکتے۔ پس تم انھیں چھوڑ دو کہ وہ جھوٹ باندھتے رہیں۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کریں (الانعام ۱۱۴ - ۱۱۳)

یہ معاملہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ حق کی دعوت اپنی بے آمیز صورت میں سامنے آجائے۔ جو لوگ خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت ان کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب چوں کہ دعوت حق کو دلیل سے رد کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اس لئے وہ عیب جوئی اور کردار کشی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ مخالفین اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بے بنیاد شوشے نکالتے ہیں۔ وہ داعی کے خلاف الزام بازی کی مہم چلاتے ہیں۔ وہ اس کی ذات کو بدنام کرنے کے لئے پرفریب باتیں پھیلاتے ہیں۔ یہ صورت حال ہر آدمی کو برہنہ کر دیتی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ کے خوف نے آخری حد تک سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ان کی بڑھی ہوئی سنجیدگی اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ دلیل اور عیب جوئی میں فرق کرسکیں۔ مگر جن لوگوں کے دل خدا کی پکڑ کے احساس سے خالی ہو جاتے ہیں، وہ سنجیدہ غور وفکر سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ یہ دوسری قسم کے لوگ آسانی سے اس پرفریب پروپگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت حال امتحان کی غرض سے ہے۔ اس لئے وہ لازماً باقی رہے گی۔ اس دنیا میں بہرحال آدمی کو اس آزمائش میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ سچی دلیل اور بے بنیاد بات میں فرق کرے۔ وہ بے بنیاد بات کو رد کرکے سچی دلیل کو قبول کرلے۔ الفاظ کی آزمائش سب سے بڑی آزمائش ہے کامیاب وہ ہے جو اس نازک آزمائش میں کامیاب رہے۔

۴ الرسالہ مئی ۱۹۹۵

صبر کی عبادت

نماز کا وقت ہو اور مسجد سے اذان کی آواز آئے تو ایک مسلمان خوش ہوتا ہے کہ اس کے لئے وقت آگیا کہ وہ نماز ادا کرے اور عبادت کا ثواب حاصل کرے۔ اسی طرح جب رمضان کا نیا چاند آسمان پر نظر آتا ہے تو مسلمان خوش ہوتے ہیں کہ رمضان کے مہینہ کی آمد نے ان کو موقع دیا کہ وہ روزہ رکھ کر اپنے آپ کو اس کے ثواب کا مستحق بنائیں۔

اسی طرح ایک اور عظیم عبادت ہے جس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔ (الزمر ۱۰) حدیث میں ہے کہ صبر سے زیادہ بہتر عطیہ کبھی کسی کو نہیں دیا گیا (ولن تعطوا عطاء خیراً و اوسع من الصبر) صبر ایک عبادت ہے۔ بلکہ تمام عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت۔

عصر کی نماز کا ثواب بہت زیادہ ہے، مگر آپ عصر کی نماز دوپہر کے وقت نہیں پڑھ سکتے۔ اسی طرح رمضان کے روزہ کے لئے غیر معمولی ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے۔ مگر یہ ثواب محرم کے مہینہ میں روزہ رکھ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ صبر کی عبادت کا بھی ہے۔ صبر کی عبادت صبر کے حالات میں انجام دی جا سکتی ہے، غیر صابرانہ حالات میں صبر کی عبادت کی انجام دہی ممکن نہیں۔

صبر کا موقع کب پیش آتا ہے۔ صبر کا موقع اس وقت پیش آتا ہے جبکہ آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کی جائے۔ آپ کے ساتھ برا برتاؤ کیا جائے۔ جب کوئی شخص ایسی بات کہے جس سے آپ کی انا پر چوٹ لگتی ہو۔ صبر پر عمل کرنے کا موقع ہمیشہ مخالفانہ حالات میں ہوتا ہے نہ کہ موافقانہ حالات میں۔

صبر کے حالات پیش آنے پر اکثر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ شعوری طور پر جانیں کہ یہ تو ان کے لئے صبر کی عبادت کا موقع ہے تو وہ صبر کے وقت کا اسی طرح استقبال کریں جس طرح وہ نماز اور روزہ کے وقت کا استقبال کرتے ہیں۔

صبر کا موقع عبادت کا موقع ہے۔ ایسا موقع پیش آنے پر آدمی کو یقین کرنا چاہئے کہ وہ وقت آگیا جب کہ عبادتِ عظیم کا ثبوت دے کر وہ ثوابِ عظیم کا مستحق بن جائے۔

تحدیات عصریہ

اکتوبر ۱۹۹۴ میں دارالعلوم دیوبند میں مدارس اسلامیہ عربیہ کا ایک کل ہند اجتماع ہوا۔ اس موقع پر دارالعلوم کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے خطبۂ صدارت پیش کیا۔ اس مفصل خطبہ میں ایک بحث " مدارس دینیہ اور عصری علوم" کی ہے۔ مہتمم صاحب کا ارشاد ہے کہ مدارس دینیہ کے عربی نصاب کے ساتھ علوم عصریہ کو جوڑنے کی تجویز غیر دانش مندانہ ہے۔ مدارس دینیہ کا نصاب خالص دینی علوم پر مشتمل رہنا چاہئے۔ اس میں علوم عصریہ کی آمیزش نہیں ہونا چاہئے (الفرقان، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴)

جو لوگ اس قسم کا خیال رکھتے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ اصل مسئلہ علوم عصریہ کا نہیں ہے بلکہ تحدیات عصریہ کا ہے۔ خود مدارس اسلامیہ کے مقاصد کے تحت ہی یہ ضروری ہے کہ زمانہ حاضر کی فکری تحدیات کو مع ان کے جواب کے داخل نصاب کیا جائے۔ ورنہ مدارس کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

مدارس اسلامیہ کا اولین مقصد دینی رہنما اور داعی تیار کرنا ہے۔ کوئی عالم مخالف اسلام نظریات سے واقفیت کے بغیر یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ اسی لئے علماء سلف نے مدارس کے نظام میں وقت کے فرق باطلہ کا تعارف اور ان کا رد نصاب تعلیم میں شامل کیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے یونانی فلسفہ کو اسلامائز کر کے اس کو معقولات کے طور پر نصاب میں شامل کیا۔

مگر یہ سب دور قدیم کی تحدیات تھیں۔ اب وہ قصۂ پارینہ بن کر ماضی کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ خود اصول نصاب کا یہ تقاضا ہے کہ ان قدیم معقولات کی جگہ جدید معقولات کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ یہ کام نہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے مدارس ایسے علماء تیار کر رہے ہیں جو تحدیات قدیمہ کو تو جانتے ہیں اور اس پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ مگر تحدیات جدیدہ کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ وہ نہ ان جدید تحدیات کو جانتے اور نہ اسلام کی طرف سے ان کا جواب دے سکتے۔ موجودہ علماء اسلام کی طرف سے عصری فتنوں کا دفاع کرنے میں ناکام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی تعلیم گاہوں میں نہ ان فتنوں کا تعارف کرایا گیا اور نہ ان کے مقابلہ میں اسلام کی نمائندگی کرنے کے لئے انھیں تیار کیا گیا۔

اختلاف رائے

مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۹۲۰-۱۸۵۱) تحریک خلافت کے پرجوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) تحریک خلافت کے مخالف تھے۔ وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس "گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں:
"حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے بھلے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کئے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے، اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروانہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے۔"

ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ ۱۱۴

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علماء امت کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہئے جس کو امام شافعی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمالِ خطا کے ساتھ، دوسرے کی رائے غلط ہے مگر احتمال صحت کے ساتھ۔
(رأئی صواب یحتمل الخطأ ورأئی غیری خطأ یحتمل الصواب)

یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریق ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ ۵۰ فیصد اور ۵۰ فیصد کا ہے نہ کہ صد فی صد کا۔

بارڈر لائن

۹ نومبر ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب دہلی میں میرے کمرہ میں داخل ہوئے۔ تندرست جسم، شاندار شخصیت، گفت گو کا انداز نہایت مؤثر، ان کو دیکھکر مجھے رشک آیا۔ ان کے واپس جانے کے بعد بھی دیر تک میں ان کے بارہ میں سوچتا رہا۔ یہ پاکستان کے مولانا کوثر نیازی تھے۔ انھوں نے میری ڈائری میں اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھا تو اس میں اپنا نام "سینیٹر کوثر نیازی" تحریر کیا۔

اس کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۹۴ کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیرمین تھے۔ صرف ۵۱ سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۹ مارچ ۱۹۹۴) میں ان کے انتقال سے ایک دن پہلے کی تفصیلات پڑھیں۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ "مولانا کوثر نیازی جنھیں دماغ کی رگیں پھٹنے کے باعث، ہسپتال کمپلکس میں داخل کیا گیا تھا، جمعہ کو ماہر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ان کے دماغ کا آپریشن کیا۔ مولانا کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا جا رہا ہے۔ جہاں ڈاکٹروں کی ٹیم ان کی جان بچانے کے لئے مصروف ہے۔ ان پر غشی طاری ہے۔ صدر اور وزیر اعظم نے ان کے لئے گلدستے بھجوائے۔ رات گئے ہسپتال کمپلکس کے ڈاکٹروں نے نوائے وقت کو بتایا کہ مولانا کی جان بچانے کے لئے انسانی حد تک تمام کوششیں کر رہے ہیں مگر ان کی حالت اس قدر تشویشناک ہے کہ اب وہ بارڈر لائن پر پہنچ گئے ہیں۔ (صفحہ ۵)

غور کیجئے تو ہر آدمی بارڈر لائن پر ہے۔ کیوں کہ ہر آدمی ہر لمحہ موت کے کنارے ہے۔ کسی بھی وقت اس کی موت آسکتی ہے۔ کسی بھی آدمی کے بارہ میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کب تک زندگی کے اِس پار ہے اور کب وہ اچانک زندگی کے اُس پار چلا جائے گا۔

میڈیکل ڈاکٹر کسی ایسے ہی شخص کے بارہ میں بارڈر لائن پر ہونے کا اعلان کرتے ہیں جس کا کیس مولانا کوثر نیازی جیسا بن گیا ہو۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی کا کیس یہی ہے۔ آدمی کو اگر اس سنگینی کا احساس ہو تو وہ جیتے جی اپنے آپ کو موت کے کنارے سمجھے، زندگی سے زیادہ وہ اپنے آپ کو موت کے قریب کھڑا ہوا پائے۔

فتنۂ مال

محمد صلاح الدین صاحب پاکستان کے معروف صحافی تھے۔ کراچی سے ان کا ہفت روزہ تکبیر نکلتا تھا۔ وہ اپنے قلم سے سیاسی نشتر کا کام لیتے تھے۔ ان کو پاکستان میں "بے باک صحافت کا امام" کہا جاتا تھا۔ ۴ دسمبر ۱۹۹۴ کو کراچی میں گولی مار کر انھیں قتل کر دیا گیا۔ بوقت وفات ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ صلاح الدین صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر محمد فاروق خاں صاحب ان کے بارہ میں لکھتے ہیں:

"عمر کا ایک بڑا حصہ انھوں نے کراچی میں ٹین کی چھت والے ایک گھر میں گزارا۔ ان کی ساری زندگی کی کمائی بس ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ تین برس پہلے کی بات ہے، ان کے دفتر سے ان کے گھر تک ہم ڈیڑھ گھنٹے میں بس کے ذریعہ سے اس طرح پہنچے کہ ہم دونوں سارے راستہ میں کھڑے رہے۔ گھر پہنچے تو ان کی بیٹھک اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وفات سے چار دن قبل لاہور میں ہم سب کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حلیم (سالن) کا ذکر چھڑ گیا تو انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ ایک زمانہ میں ہم سب دوست باری باری دعوت کیا کرتے تھے۔ جب میری باری آئی تو حلیم کی فرمائش ہوئی۔ وہی ٹین کی چھت والے گھر میں احباب جمع تھے۔ ماہر القادری صاحب کھا چکے تو انھوں نے کہا: ارے تم نے یوں ہی اپنی زندگی صحافت میں خوار کر لی۔ اس کے بجائے اگر حلیم کی دو دیگیں صبح و شام پکا کر بیچتے تو اب تک تمہارا بنگلہ بن چکا ہوتا"

(ماہنامہ اشراق، لاہور، جنوری ۱۹۹۵ صفحہ ۱۲)

یہ لطیفہ موجودہ زمانہ کے ایک دردناک پہلو کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم اور دین کے شعبوں میں مادی فوائد بہت کم ہو گئے۔ اس کے بجائے دنیوی اور مادی شعبوں میں مالی فوائد بے پناہ حد تک بڑھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ غیر دینی شعبوں کی طرف بھاگ گئے۔ اور دینی شعبوں میں کام کرنے کے لئے صرف تیسرے درجہ کے لوگ باقی رہے۔

موجودہ زمانہ میں دین کا کوئی اعلیٰ کام نہیں ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ کام اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کرتے ہیں اور ایسے تمام لوگ اب "حلیم" کے کاروبار میں لگ گئے۔

ایک دن

دہلی میں مہرولی کے علاقہ میں ایک اسلامی ادارہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ فیض القرآن کے نام سے ہے۔ اس کو مولانا محمد طلحہ صاحب اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے ۱۹۹۲ میں قائم کیا تھا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۹۴ کو اس کا پہلا دینی تعلیمی جلسہ ہوا۔ اس کے مہمان خصوصی مولانا محمد صدیق باندوی تھے۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے بھی اس میں شرکت کی۔

نظام الدین سے روانہ ہو کر ہم دہلی کے مختلف حصوں سے گزرے۔ جب ہم مہرولی میں داخل ہوئے تو قطب مینار پر نظر پڑی جو اس علاقہ کی سب سے بلند عمارت کے طور پر دور دور سے دکھائی دیتا ہے۔ قطب مینار تیرھویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کی بابت تاریخ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ دہلی کا قطب مینار ابھی تک قطب الدین ایبک کی فتوحات کی یاد دلاتا ہے:

The Qutub Minar in Delhi still stands to commemorate his victories. (VIII/362)

مگر اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ مینار اپنی بلندیوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بڑی ایک حقیقت کی یادگار ہے۔ اور وہ یہ کہ کامیابی عمل سے ملتی ہے نہ کہ پیدائش سے۔

قطب الدین ایبک ابتداءً ایک غلام کی حیثیت سے محمد غوری کی ملازمت میں آیا۔ اس کے بعد اپنی ممتاز کارکردگی کی بنا پر اس نے ترقی شروع کی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد غوری کے قتل (۱۲۰۶ء) کے بعد وہ اس کا جانشیں بنا۔ اور پھر اپنی حکیمانہ تدبیروں سے وہ دہلی کی سلطنت کا مالک بن گیا۔ اگرچہ وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ گھوڑوں کے ایک کھیل میں وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا۔ اسی میں ۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس دنیا میں کامیابی کے امکانات بے شمار ہیں۔ یہاں ایک معمولی انسان بھی بادشاہ کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو حکیمانہ طور پر استعمال کرے۔

کمال پیدا کیجئے

۲۵ مارچ ۱۹۹۲ کو ملبورن میں ورلڈ کرکٹ کپ کا فائنل مقابلہ تھا۔ پاکستان کی ٹیم نے انگلینڈ کی ٹیم کو ہرا کر ورلڈ کپ جیت لیا۔ پاکستان کی ٹیم کو یہ غیر معمولی کامیابی اس کی ٹیم کے کیپٹن عمران خاں کی قیادت کے تحت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا سے عمران خاں کے لئے مبارک باد کے پیغامات کا سیلاب امنڈ پڑا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ) نے اس خبر کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی:

Pakistan rule the world with a flawless display.

اس سلسلہ میں ہندستان کے مشہور کھلاڑی مسٹر منوج پربھاکر کا انٹرویو اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ اس کو ویڈیو میگزین اسپورٹس چینل (Sports Channel) نے ریکارڈ کیا تھا۔ مسٹر پربھاکر نے کہا:

India needed an Imran Khan-like captain to motivate the team. I think there should be some gap like age between the team and captain. You can see the way Imran is doing his job. He is marvellous. We need that type of captain who can be a good leader. That is what we need. Otherwise we have the best team.

انڈیا کو عمران خاں جیسے ایک کیپٹن کی ضرورت ہے جو ہماری ٹیم کو متحرک کرے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیم اور کیپٹن میں عمر کی طرح کچھ فرق ہونا چاہئے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ عمران کس طرح اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ ایک حیرت انگیز شخص ہیں۔ ہم کو اس قسم کے کیپٹن کی ضرورت ہے جو ایک اچھا قائد بن سکے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ ورنہ ہمارے پاس بہترین ٹیم ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۲۶ مارچ ۱۹۹۲)

انسان کمال کو پسند کرتا ہے۔ کوئی شخص کمال کا مظاہرہ کرے تو دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کمال موافقت اور مخالفت سے بلند ہو کر اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ کسی بھی میدان میں اگر آپ کمال پیدا کریں تو انسان آپ کی قدردانی اور اعتراف پر مجبور ہو جائے گا، خواہ بظاہر آپ غیر قوم کے فرد کیوں نہ ہوں۔

انسان کا مستقبل

گیانی ذیل سنگھ ۱۹۱۶ میں راجکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کا باپ ایک غریب بڑھئی تھا۔ ان کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ انھوں نے سیاست میں حصہ لے کر شہرت پائی۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ منسٹر اور چیف منسٹر بنے۔ آخر میں وہ انڈیا کے صدر مقرر ہوئے۔ اس طرح پنجاب کے ایک جھونپڑے سے زندگی شروع کر کے وہ دہلی کے راشٹرپتی بھون تک پہنچ گئے۔

۲۹ نومبر ۱۹۹۴ کو ان کی کار کے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ اس کے بعد انھیں چنڈی گڑھ کے نہرو ہاسپٹل میں داخل کر دیا گیا۔ مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ "جھونپڑے" سے زندگی شروع کرنے والا دوبارہ "جھونپڑے" کی طرف لوٹ گیا۔

اخبار میں جس دن میں نے گیانی ذیل سنگھ کی وفات کی خبر پڑھی، اسی دن ایک پرچہ میں ایک کارٹون نظر سے گزرا۔ اس میں ایک بوڑھے موٹے آدمی کو کرسی پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ بڑھاپے سے وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ کارٹون کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے میں نے سخت محنت کی اور اتنی دولت اکٹھا کر لی جو میری تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔ مگر اب میں اتنا زیادہ بوڑھا ہو چکا ہوں کہ میں اپنی دولت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا:

I've worked hard. And finally amassed all the money I'll ever need. But I'm too old to enjoy it.

یہی ہر انسان کی کہانی ہے۔ آدمی اپنے جسم اور اپنے دماغ کی ساری طاقت خرچ کر کے مادی ترقی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر جب وہ اپنی مادی ترقی کی آخری حد پر پہنچتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی اس کے کسی کام کی نہیں۔ ترقیوں کے ڈھیر میں وہ ایک بے ترقی کا کیس بن کر رہ جاتا ہے۔ کیسا عجیب ہے انسان کا یہ معاملہ، وہ صرف اپنے ماضی اور اپنے حال کا مالک ہے، اپنے مستقبل پر اس کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

اس دنیا میں دولت مندی بھی ویسی ہی ہے جیسے غریبی۔ یہاں محل کی زندگی بھی اتنی ہی بے حقیقت ہے جتنا کہ جھونپڑے کی زندگی۔

رجوع واعتراف

" المجلة" عربی کا مشہور میگزین ہے۔ وہ جدہ (سعودی عرب) میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع ہو کر ساری دنیا میں پہنچتا ہے۔ اس میگزین کے شمارہ ۵- ۱۱ دسمبر ۱۹۹۳ (۲۲ - ۲۸ جمادی الآخر ۱۴۱۴ھ) میں لیبیا کے صدر معمر القذافی کا خصوصی انٹرویو اس عنوان کے تحت چھپا ہے: القذافي يعترف: الانقلابات والثورات لم تحقق المطلوب. اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہ ہے:

هل يمكن ان توضح لنا الفارق بين عهد الشباب الماضي ثم عهد النضج الحالي؟

- كنا في الماضي نحرص على الثورة من اجل اقامة الوحدة العربية مثلاً، وكنا نحرص على الدعوة الى الحرب من اجل تحرير فلسطين. لكن وضع الثورات في الوطن العربي في الماضي وبعده اثبت انه ليس من الضروري ان يقع انقلاب حتى تتحقق هذه الأهداف. عاصرت خمسة او ستة انقلابات في موريتانيا، ومثلها اليمن وكذلك السودان. وعاصرت تغييراً في الحكام. فقد مر على اليمن الشعبي وسالم البيض وصالح وعلي عنتر وعبد الفتاح والغشمي والحمدي. كلهم عاصرتهم، والسودان مثلا مر عليه النميري والصادق المهدي وسوار الذهب وسوار الفضة (ضاحكاً) وان شاء الله نقف عند الفضة. عاصرت انقلابات واغتيالات وتغييرات ولكنها لم تؤد الى حل. والذي يمكن تطويره هو هذه الأنظمة لتصبح مثل اوروبا، أي تصل الى الوحدة بالاقناع. يمكن الاقناع ان يوصلنا الى تغيير ميثاق الجامعة العربية واقامة وحدة اقتصادية ودفاعية. وكل يبقى في مكانه. فالملك ملك، والرئيس رئيس، والسلطان سلطان. فقد ثبت لنا ان تصفية الرموز ليست هي الحل. واما حرب فلسطين فانظر الى جنوب افريقيا صار فيها حل بدون حرب بعد ان كنت اقول انه يجب ابادة البيض. ليس ضروريا ان نشن الحرب (لتحرير فلسطين) فلو يرجع الشعب الفلسطيني الى ارضه ويكون هناك خمسة او ستة ملايين في دولة مع اليهود ضمن ديموقراطية لوجد الحل.

سوال: کیا آپ وضاحت کے ساتھ ہمیں بتائیں گے کہ آپ کے گزشتہ عہد جوانی اور موجودہ پختگی کے دور میں کیا فرق ہے؟

جواب: پہلے ہم مثال کے طور پر عرب اتحاد قائم کرنے کے لئے انقلاب پر ابھارتے تھے۔ آزادی فلسطین کے بارے میں جنگ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن عالم عربی میں ماضی وحال کے انقلابات کی

صورتحال نے ثابت کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ پہلے کوئی انقلاب برپا کیا جائے تب ہی مذکورہ مقاصد حاصل ہوں گے۔ میں اپنے زمانے میں موریتانیا کے اندر پانچ یا چھ انقلابات دیکھ چکا ہوں۔ یہی حال یمن اور سوڈان کا ہے۔ میں نے حکمرانوں کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ یمن میں الشعبی، سالم البیض، صالح، علی عنتر، عبد الفتاح، الغشمی، الحمدی، یہ سب میرے معاصر رہے ہیں۔ اسی طرح سوڈان میں مثلاً نمیری تھے ان کے بعد صادق المہدی آئے، پھر سوار الذہب اور سوار الفضہ۔ میرے زمانے میں کئی انقلابات، حکمرانوں کے قتل اور حکومتوں کی تبدیلی کے واقعات ہوئے مگر وہ سب کے سب بے سود ثابت ہوئے۔ جس چیز کو بدلنا اور ترقی دینا ممکن ہے وہ ہمارا موجودہ طریق کار ہے تاکہ وہ یورپ کی طرح ہو جائے۔ یعنی اتحاد کے حصول کے لئے (بات چیت کے ذریعہ) یقینی دہانی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس طریقہ کو استعمال کرکے ہم عرب لیگ کے دستور کو بدل سکتے ہیں اور اپنے درمیان ایک اقتصادی اور دفاعی اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔ ہر شخص جہاں ہے وہ وہیں رہے، بادشاہ اپنی جگہ صدر اپنی جگہ، سلطان اپنی جگہ۔ کیوں کہ تجربہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی علامتوں کو ہٹانا ہمارے مسئلہ کا حل نہیں۔ جہاں تک جنگ فلسطین کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ کو دیکھئے جہاں جنگ کے بغیر اسی نوعیت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ جب کہ اس سے پہلے میرا کہنا تھا کہ سفید فام نسل کو نابود کئے بغیر وہ حل ہونے والا نہیں۔ آزادئ فلسطین کے لئے بھی ضروری نہیں کہ ہم جنگ چھیڑیں۔ اگر فلسطینی لوگ اپنی سرزمین میں واپس آ جائیں اور ان کی ۵ یا ۶ ملین تعداد یہودیوں کے ساتھ ایک جمہوری نظام حکومت میں شرکت پر راضی ہو جائے۔ تو بالآخر ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔

معمر قذافی نے لیبیا کے سابق شاہ ادریس کو ملک کی خرابیوں کا اصل سبب سمجھا اور فوجی انقلاب کے ذریعہ ۱۹۶۷ میں ان کا خاتمہ کر دیا۔ مگر انقلاب کے باوجود وہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو اس سے متوقع تھے۔ یہی حال اکثر مسلم ملکوں میں ہوا ہے۔ ہر انقلاب صرف افراد کی تبدیلی کے ہم معنی ثابت ہوا نہ کہ حالات کی تبدیلی کے ہم معنی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی حکمراں کو برائی کی علامت قرار دے کر اس کے خلاف ہم چلانا ایک طفلانہ حرکت ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف تخریبی تحریکیں ہیں، ان کو انقلابی اور اصلاحی تحریک وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو نہ تاریخ کی خبر ہو اور نہ انسانی نفسیات کی۔

عبرت ناک

عراق کے صدر صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ واضح طور پر ایک جارحانہ فعل تھا۔ اس کے بعد ۶ اگست کو بغداد میں امریکہ کے قائم مقام سفیر جوزف ولسن نے صدام حسین سے ملاقات کی اور انھیں امریکی صدر جارج بش کا پیغام پہنچایا۔ امریکی سفیر نے ڈپلومیٹک انداز میں صدام حسین کو متنبہ کیا کہ انھوں نے جارحیت کا فعل کیا ہے۔ کویت سے ان کے جو اختلافات تھے، اس کو انھیں باہمی بات چیت سے حل کرنا چاہئے تھا نہ کہ طاقت کے استعمال سے۔ صدام حسین اس وقت فاتحانہ جوش میں تھے۔ انھوں نے امریکی سفیر کو جو جواب دیا وہ انگریزی رپورٹنگ میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا:

Give my regards to President Bush and tell him that Al-Sabah family has now become history.

صدر بش کو میرا سلام پہنچائیے اور ان سے کہہ دیجئے کہ کویت کا شاہی خاندان الصباح اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ صدام حسین نے اس کے اگلے دن ۷ اگست کو مزید یہ اعلان کر دیا کہ کویت اب "کویت" نہیں رہا۔ وہ اب عراق کا ۱۹واں صوبہ ہے۔

مگر کہانی یہیں ختم نہیں۔ اس کے بعد کویت کی درخواست پر امریکہ براہ راست سامنے آگیا۔ اس نے صدام حسین کو وارننگ دی کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک اپنی فوجیں کویت سے نکال کر واپس لے جائیں۔ مگر صدام حسین نے اس الٹی میٹم کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو امریکہ نے عراق کے اوپر زبردست حملہ کیا۔ صدام کی فوجیں اس کے دفاع میں سراسر ناکام رہیں۔ یکم مارچ ۱۹۹۱ کو یہ جنگ عراق کی بدترین شکست پر ختم ہوگئی۔

اس کے بعد امریکہ نے چاروں طرف سے عراق کی ناکہ بندی کر دی۔ اس ناکہ بندی نے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا۔ چنانچہ صدام حسین نے مجبور ہو کر امریکہ کے تمام مطالبات کو مان لیا۔ آخر کار ۱۰ نومبر ۱۹۹۴ کو صدام حسین کی قیادت میں عراقی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ اس میں متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ عراق ایک آزاد ریاست (independent state) کے طور پر

دیت کو تسلیم کرتا ہے۔

عراق کے ڈپٹی پرائم منسٹر طارق عزیز نے ۱۴ نومبر ۱۹۹۴ کو اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل سے نیو یارک میں ملاقات کی اور ان کو تحریری طور پر عراق کے اس فیصلہ سے مطلع کر دیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ نومبر ۱۹۹۴)

صدام حسین کویت کو تاریخ کا حصہ بنانا چاہتے تھے مگر وہ خود تاریخ کا حصہ بن گئے۔ اس فعل سے انھوں نے ثابت کیا کہ وہ صرف اپنے حال کو جانتے تھے۔ اپنے مستقبل کے بارہ میں وہ آخری حد تک بے خبر بنے ہوئے تھے۔

یہی موجودہ دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی اپنے آج کو جانتا ہے، اپنے کل کو وہ نہیں جانتا۔ اپنی کارروائی کی اسے خبر ہے، مگر خدا کے فرشتے اس کے خلاف جو کارروائی کر رہے ہیں، اس کی اسے خبر نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کے بارہ میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اپنے بارہ میں فیصلہ کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہے۔

صدام حسین کا یہ انجام اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے۔ ایسے واقعات اس لئے پیش آتے ہیں تاکہ لوگ جان لیں کہ اسی قسم کا شدید تر انجام ان کے لئے آخرت میں ہونے والا ہے۔ صدام حسین کو جاننے والا وہ ہے جو صدام حسین کے واقعہ میں خود اپنے آپ کو جانے۔ جو صدام حسین کے دنیوی انجام میں اپنے اخروی انجام کو دیکھ لے۔

جھوٹ کی بنیاد پر

پراودا (Pravda) ایک روسی روزنامہ تھا۔ پراودا کے لفظی معنی سچ (truth) کے ہیں۔ روس کی کمیونسٹ پارٹی نے اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) سے کچھ پہلے ۱۹۱۲ میں اس کو ماسکو سے جاری کیا تھا۔ پراودا سابق سوویت روس کا سب سے زیادہ اہم اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اس کا سرکلیشن گیارہ ملین کاپی روزانہ تھا۔ ابتدائی زمانہ میں اسٹالن اور لینن جیسے لوگ اس کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ اس کے نامہ نگاروں کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔

پراودا کے پاس بڑی بڑی جائدادیں تھیں۔ حکومت کی طرف سے اس کو ہر قسم کی غیر معمولی امداد ملتی تھی۔ سوویت یونین کے سقوط (۱۹۹۱) کے بعد اچانک ساری امداد بند کر دی گئی۔ اگست ۱۹۹۱ میں اس کی جائدادوں کو ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد اخبار ناقابل عبور مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴ مارچ ۱۹۹۲ کو وہ بند کر دیا گیا۔

پراودا کی ساری اہمیت اشتراکی نظام کے ساتھ وابستہ تھی۔ اشتراکی لیڈروں نے سوویت یونین کے نام سے ایک معاشی اور سیاسی جہنم بنا رکھا تھا۔ مگر پراودا اس کو برعکس طور پر معاشی اور سیاسی جنت کے روپ میں پیش کرتا تھا۔ یہی پراودا کی قیمت تھی جب اشتراکی جھوٹ کا طلسم ٹوٹ گیا تو اس کے بعد پراودا کے لئے یہ موقع بھی ختم ہو گیا کہ وہ اس جھوٹ کو سچ بتائے۔ یہی سنگین حقیقت تھی جس نے پراودا کا خاتمہ کر دیا۔

ایک مبصر (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ مارچ ۱۹۹۲) نے سچائی کی موت (Truth is dead) کے زیر عنوان بجا طور پر لکھا تھا کہ اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ اب وہ اس کو سخت مشکل پا رہا ہے کہ وہ اس سچائی کا سامنا کرے جو اشتراکی روس کے بعد کے دور میں کوئی مقام نہیں رکھتی:

No wonder, it now finds it difficult to face up to the truth that has no place in post-Communist Russia.

دنیا کا یہی معاملہ آخرت میں بھی پیش آئے گا۔ بہت سے لوگ جو آج بظاہر سچائی کے علمبردار بنے ہوئے ہیں، آخرت کا انقلاب آتے ہی ان کی حقیقت کھل جائے گی۔ اس کے بعد اچانک انھیں معلوم ہوگا کہ گیارہ ملین تو درکنار، گیارہ آدمی بھی ان کی نام نہاد سچائی کے خریدار نہیں ہیں۔

تخریبی منصوبہ ناکام

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۴ جون ۱۹۹۴) میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے:
ایک ٹیلیفون نمبر نے چار ڈاکوؤں کو پکڑوا دیا۔ اخبار کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے:
سی آئی اے اسٹاف نے مسلم ٹاؤن (لاہور) میں ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس شاہین اصغر کے گھر ڈکیتی کرنے والے چار ڈاکوؤں کو ایک ٹیلیفون نمبر کے ذریعہ پکڑ لیا۔ پولیس افسر مسٹر احمد خان نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ واقعہ کے روز مسلم ٹاؤن کے علاقہ میں چاروں ڈاکوؤں نے ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس اور ان کے ملازم کو رسیوں سے جکڑا اور ڈی سی کو اتنا مارا کہ ان کا جبڑا اور ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس دوران ایک ملزم کے کپڑے خون آلود ہو گئے تو اس نے اپنے کپڑے اتار کر شاہین اصغر کے کپڑے پہن لئے اور اپنے کپڑے موقعہ پر چھوڑ گیا۔ جب پولیس نے ان کپڑوں کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے ایک ٹیلیفون نمبر نکلا جس کا پتہ ٹیلیفون ایکسچینج سے کروایا گیا تو وہ نمبر ملت پارک فلیٹ نمبر ۸ کا تھا جس کی پولیس نے نگرانی شروع کر دی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ ڈاکو وہاں آئے ہیں۔ فلیٹ کے مالک فاروق احمد کا بھانجا علی عمران جو گلبرگ میں رہتا تھا وہ بھی اس واردات میں ملوث پایا گیا۔ ایس پی سی آئی اے نے بتایا کہ پولیس نے جب گلبرگ میں چھاپہ مار کر علی عمران کو پکڑا تو اس نے ڈپٹی کمشنر والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کی جیب سے ڈی سی کا ڈرائیونگ لائسنس بھی برآمد ہوا۔ پولیس نے اس کی نشاندہی پر مناواں میں بھٹی پولٹری فارم پر چھاپہ مار کر اس کے دوسرے ساتھیوں ناہد رفیق، بشر ریاض اور محمد حسین کو بھی گرفتار کر لیا۔ ان سے دو گھڑیاں، نقدی اور بھاری مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔ معلوم ہوا ہے کہ بشر ریاض سابق پولیس اہلکار محمد ریاض کا بیٹا تھا۔ اور علی عمران ایک پولیس انسپکٹر کا سوتیلا لڑکا ہے۔

اس دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ کوئی تخریب کار خواہ کتنی ہی زیادہ ہوشیاری کرے اس کے منصوبے میں کہیں نہ کہیں ایسا خلا رہ جاتا ہے جس کو استعمال کر کے اس کے پورے منصوبہ کو ناکام بنا دیا جائے۔ تعمیری طاقت ہمیشہ تخریب سے زیادہ ہوتی ہے، اور یہی فرق تعمیر کی ابدی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔

انھوں نے کہا کہ حیدر آباد میں تقسیم سے پہلے ایک بار ایسا ہوا کہ بہادر یار جنگ کے ایک عزیز کو ہندوؤں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان تلوار لے کر نکل آئے۔ وہ ایک طرف سے ہندوؤں کو مارنا چاہتے تھے۔ مگر بہادر یار جنگ نے کہا کہ جس ہندو نے میرے عزیز کو قتل کیا ہے تم صرف اس کو مار سکتے ہو، سارے ہندوؤں کو نہیں مار سکتے۔ کیا آپ ہندوؤں میں ایسی کوئی ایک مثال بتا سکتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کو ایک نہیں، بہت سی مثالیں بتا سکتا ہوں۔ میرے خود اپنے وطن کا قصہ ہے۔ ایک مسلمان نے ایک ہندو (چھتر دھاری سنگھ) کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد سیکڑوں ہندو مقتول کے گھر پر جمع ہو گئے۔ انھوں نے چاہا کہ قاتل مسلمان کا تعلق جس گاؤں سے ہے اس گاؤں کے تمام مسلمانوں کو سخت سزا دیں۔ مگر مقتول کے بھائی نے زبردست مخالفت کی۔ اس نے ہندوؤں کی بھیڑ کو گاؤں میں داخل ہونے نہیں دیا۔ اس نے کہا کہ ہم دوسرے مسلمانوں کو نہیں ماریں گے اور نہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ ہم قاتل مسلمان کو عدالت سے سزا دلوائیں گے۔ چنانچہ اس نے عدالتی کارروائی کی۔ چند سال تک مقدمہ جاری رہا۔ آخر کار عدالت سے قاتل کو لمبی مدت کی قید کی سزا ملی۔ ہندو مقتول کے بھائی نے روکا نہ ہوتا تو یقیناً بپھری ہوئی بھیڑ مسلمان قاتل کے گاؤں کو جلا دیتی۔ مقتول کے بھائی چھتری سنگھ ابھی زندہ موجود ہیں۔

۲۷ دسمبر کو فجر کی نماز اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں پڑھی۔ ایک عرب امامت کر رہے تھے۔ انھوں نے پہلی رکعت میں قرأت یہاں سے شروع کی: إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (النمل ۷۶) اس آیت پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ ٹھیک یہی کام خود مسلمانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ ہر سو سال میں ایک شخص اٹھاتا ہے جو دین کی تجدید کرتا ہے۔ یہ تجدید عین وہی چیز ہے جس کا مذکورہ آیت میں ذکر ہے۔ وقت گزرنے پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف معاملات میں دینی نقطۂ نظر کیا ہے، یہ گم ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے منحرف نقطۂ نظر رائج ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ کی توفیق سے ایک آدمی فہم و بصیرت والا اٹھتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں صحیح دینی نقطۂ نظر کا اعلان کرتا ہے۔ وہ تطہیر افکار کا کام انجام دیتا ہے۔ یہی کام بذریعہ قرآن اہل کتاب کے درمیان انجام پایا۔ اور یہی کام، ختم نبوت کے بعد، مجدد

کے ذریعہ امت محمدی میں جاری رہے گا۔

امام صاحب نے دوسری رکعت کے آخر میں لمبی قنوت نازلہ پڑھی۔ اس میں دو بار انھوں نے کہا: اللھم دمر دیار الکافرین۔ اسی قسم کے الفاظ انڈیا کی مسجدوں میں بھی سنائی دیتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مسلمانوں کی اس دعا کو قبول نہیں کیا۔ اگر فی الواقع یہ دعا قبول ہوجاتی اور کافروں کی تدمیر دیار کردی جاتی تو خود دعا کرنے والوں کا بھی خاتمہ ہوجاتا۔ کیوں کہ یہ حضرات خود بھی انھیں کافروں کے درمیان رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا ہجرت کے بعد ہے نہ کہ ہجرت سے پہلے۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے یہ دعا جائز ہی نہیں۔ اس وقت ہم دعوت کے مرحلہ میں ہیں نہ کہ برأت کے مرحلہ میں۔ دعوت کے مرحلہ میں صبر ہے نہ کہ بد دعا۔ داعی کو یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر دعوت کے عمل کو انجام دینا ممکن نہیں۔

آرنج کاونٹی کے روزنامہ رجسٹر، ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا صفحہ ۴ جنگ (War) کی خبروں کے لئے تھا۔ اس صفحہ پر تین بڑے بڑے اشتہار تھے۔ صرف ایک خبر جنگ کی تھی اور وہ بوسنیا کے بارہ میں تھی۔ اس کی سرخی یہ تھی:

Muslim-led forces fight to win back lost territory.

دوسری خبر صفحہ ۸ پر اختلاف (Dispute) کے زیر عنوان تھی۔ یہ پیرس کے بارہ میں تھی۔ اس کا خلاصہ اس کی سرخی میں اس طرح تھا:

Muslim leader criticized schools' anti-scarf rules.

موجودہ زمانہ کے عالمی میڈیا میں مسلمان تشدد، اختلاف اور ٹکراؤ کا نشان بن گئے ہیں۔ مسلم دانشور اس کو غلط اطلاع (disinformation) کہتے ہیں۔ میں نے بہت غور کیا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں جب کہ بطور واقعہ ہر جگہ وہ یہی کر رہے ہیں۔ مسلم ملکوں میں نفاذ قانون کے نام پر، غیر مسلم ملکوں میں مداخلت فی الدین کے نام پر، اسی طرح کہیں جہاد حریت کے نام پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لیڈر چاہتے ہیں کہ وہ خواہ جو کچھ کریں ہر حال میں ان کو اسلام کا کریڈٹ

حاصل رہے۔ وہ دنیا کے لئے زحمت بنیں اس کے باوجود دنیا ان کو رحمت کا خطاب دے۔ مگر خدا کی دنیا میں کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔ مسلمان کی تصویر ان کے اپنے اعمال کی بنیاد پر بنے گی نہ کہ ان کی خواہش کی بنیاد پر۔

کشمیر کے ڈاکٹر غلام نبی فائی بھی اس کانفرنس میں آئے تھے۔ ان کے خط کے جواب میں صدر کلنٹن کے خط (مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کا ہندستانی اخباروں میں کافی چرچا ہوا۔ انھوں نے اس خط کی ایک کاپی مجھے دی۔ امریکہ کے شعبہ خارجہ کے ایک افسر مسٹر ایوجین پرائس جونیر (Eugene D. Price Jr.) سے میں نے اس خط کی بابت پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے غیر ضروری طور پر اس خط کو اہمیت دے دی۔ اس طرح کا خط تو روٹین کے طور پر ہمارے یہاں سے روزانہ جاتا رہتا ہے۔ دفتر خارجہ کے کارکنوں کو ایک عام پالیسی بتادی جاتی ہے۔ اس کے تحت وہ خود اس طرح کے خطوط کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ خود صدر کلنٹن ڈکٹیٹ کرا کے اس خط کو لکھوائیں۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر کے بارہ میں ہماری پالیسی وہی ہے جو پہلے تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ایک کشمیری مسلمان نے کہا کہ ظہیر الدین کا ایک کھلاڑی ٹینس کا ماہر تھا۔ وہ شاندار کھیل دکھا رہا تھا کہ اچانک فیلڈ کے اندر ہی گر پڑا اور فوراً مر گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس واقعہ کو اخبار میں پڑھا تو میں نے کہا کہ آج مجھے یقین ہو گیا کہ کشمیر آزاد ہو کر رہے گا۔

یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ کشمیری تحریک میں ایک لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ کشمیر کی پر تشدد تحریک چلا رہے ہیں وہ کتنے سادہ لوح لوگ ہیں۔

شکاگو کے الینوئی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (I.I.T.) میں انڈین طلبہ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ لوگ مذاق سے اس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کہنے لگے ہیں۔ یہ بات عبد الحمید سیمی نے بتائی۔ کھانے کی میز پر ایک صاحب نے کہا کہ "یہودی مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں"۔ عبد الحمید سیمی نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہی ذہن ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری لڑکی نیوجرسی کے اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ وہاں ایک یہودی جونیر ڈاکٹر میری بیٹی کو آنٹی کہتا ہے۔ جو کام وہ کہتی ہے فوراً بھاگ کر اس کو کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک مسلم خاتون ہیں۔ مگر وہ

صرف اس لئے ایسا کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی تعلیمی ترقی جاری رکھ سکے گا۔ لوگوں کا اصل کنسرن ان کا اپنا انٹرسٹ ہے نہ کہ دوسروں کی دشمنی۔ عبد الحمید سیجی صاحب اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ اس دور میں ترقی کا راز تعلیم ہے۔ اپنے سب بچوں کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم پر لگایا ہے۔

ایک بچہ جو یہاں کے ایک اسلامی اسکول میں پڑھتا ہے، اس سے میں نے کہا کہ کوئی آپ سے یہ پوچھے کہ اسلام کیا ہے (What is Islam) تو آپ کیا جواب دیں گے۔ بچہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ اسلام کے ارکان (Pillars) کتنے ہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا: پانچ، اور پھر شہادہ سے لے کر حج تک پانچ ارکان گنا دئے۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کے اسلامی اسکولوں سے بچہ ایک رٹے ہوئے اسلام کو تو جان لے گا مگر وہ اس اسلام کو نہیں سیکھ سکتا جو اس کے ذہن کا جزء بن گیا ہو۔ وہ رٹی ہوئی باتوں کا جواب دہرائے گا۔ مگر اپنی سمجھ کو کام میں لا کر کوئی جواب دینا ہو تو وہ ایسا جواب دینے سے عاجز ثابت ہوگا۔

ایک صاحب کی تقریر یہاں کی ایک مسجد میں سنی۔ وہ انگریزی میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کیوں ایسا ہے کہ ساری دنیا اسلام کی مخالف ہوگئی ہے:

Why is it that the whole of the world is against Islam

اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں تمام لوگ سیکولر ہوگئے ہیں۔ حتی کہ مسلم ممالک بھی سیکولرزم کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سوال اور یہ جواب دونوں ہی غلط ہیں۔ نہ تو ایسا ہے کہ ساری دنیا اسلام کے خلاف ہوگئی ہے، اور نہ ایسا ہے کہ سیکولرزم اسلام کا دشمن ہے۔

بالفرض اگر دنیا اسلام کی مخالف ہوگئی ہو اور بالفرض سیکولرزم اسلام کے دشمن کے طور پر ظاہر ہوا ہو تب بھی اس قسم کی تقریر کرنا درست نہیں۔ ایسی حالت میں بھی مقرر کو یہ کہنا چاہئے کہ اسلام کی مخالفت اسلام کے نئے دور کی تمہید ہے۔ کیوں کہ جس نظریہ کی زیادہ مخالفت کی جائے وہ ہمیشہ ابھر کر رہتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسلام کی مخالفت کو اسلام کے چرچا کے معنی میں لیں اور اس کو اسلام کی دعوت کے لئے استعمال کریں۔

ایک مسلم ملک کے خطیب کنا ڈا امریکہ آئے۔ یہاں انھوں نے اردو داں مسلمانوں کے

سامنے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر چھپی ہوئی مجھ کو ملی جس کو میں نے پڑھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ "اسلامی تحریک، خواہ وہ امریکہ میں ہو یا اور کسی ملک میں، وہ کوئی تبلیغی تحریک نہیں، وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی انقلابی مہم ہے۔ ہم اللہ کے دین کو ایک کامل سماجی سیاسی، سماجی، اقتصادی نظام (politico-socio-economic system) کی حیثیت سے قائم و نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس قیام و نفاذ کے لئے ہم مسلح ٹکراؤ تک جانے کے لئے تیار ہیں" اسلام کی یہ تشریح سراسر بے بنیاد ہے۔ اسلامی تحریک اصلاً تبلیغی تحریک ہی ہے۔ امریکہ میں یہ اعلان لغویت کی حد تک بے معنی ہے کہ تم اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی، سماجی، معاشی قانون نافذ کرو، ورنہ ہم تم سے مسلح جہاد شروع کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو ہم توحید اور آخرت کی حقیقت سے آگاہ کریں۔ اسلام کے اجتماعی قانون کا نفاذ نشانۂ دعوت نہیں ہے۔ وہ کسی خطۂ ارض میں مسلم معاشرہ بن جانے کے بعد اس معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

انڈو اسلامک فاؤنڈیشن آف امریکا (شکاگو) نے ۸۰ صفحہ کی ایک کتاب بابری مسجد کے موضوع پر ۱۹۹۳ میں چھاپی ہے۔ اس کے مؤلف ڈاکٹر عبد اللہ غازی ہیں۔ اس انگریزی کتاب کے آغاز میں اقبال کی اردو نظم "رام" ایک صفحہ پر نمایاں انداز میں چھاپی گئی ہے اور اگلے صفحہ پر اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار میں نے اقبال کی یہ پوری نظم دیکھی۔ وہ اس طرح تھی:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

ایک پاکستانی مسلمان (مسٹر ریاض احمد۔ مقیم نیویارک) نے کہا کہ میں آپ کے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی تحریریں دورِ حاضر کے لئے بے حد مفید ہیں۔ مگر ایک چیز مجھے

کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تقسیم ہند کے خلاف ہیں۔ مگر آپ کی یہ رائے درست نہیں۔ جب سے میں امریکہ آیا ہوں مجھے یقین ہوگیا کہ جناح صاحب نے پاکستان بنوا کر بہت اچھا کیا۔ کیوں کہ ہم مسلمانوں کا اپنا ایک دیش تو ہے جو ہماری قومی پہچان ہے۔

میں نے کہا کہ جب آپ اور آپ جیسے لاکھوں پاکستانی مسلمان علیٰحدہ دیش کو اتنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنا الگ دیش بنوانے کے بعد وہ دوبارہ یورپ اور امریکہ میں آکر بے دیش کیوں ہورہے ہیں۔ آپ لوگوں کا پاکستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہونا خود آپ کے بیان کی تردید ہے۔ اگر پاکستان بننے کے بعد بھی آپ لوگوں کو غیر پاکستان میں رہنا تھا تو ایسی حالت میں پاکستان بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ لوگ علیٰحدہ ملک بنوانے کے بعد دوبارہ مشترک ملک میں رہ رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس تقسیمی سیاست نے مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہوسکتی۔

واشنگٹن کے سعودی سفارت خانہ کی طرف سے ایک عربی پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ اس میں شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے کچھ فتاویٰ جمع کئے گئے تھے۔ ایک سوال وجواب یہ تھا:

س هل يجوز أنْ يُعطَى الكافر نسخة من معاني القرآن الكريم علما انها تحتوي على القرآن الكريم كاملاً في الصفحة المقابلة۔

ج لا حرج في إعطاء الكافر نسخة من معاني القرآن الكريم لِأن الحكم للترجمة ولما في ذالك من البلاغ والدعوة الى الاسلام۔

یعنی ایک کافر کو باترجمہ قرآن دیا جاسکتا ہے۔ اس میں اگرچہ متن شامل ہے مگر وہ ترجمہ کے حکم میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تبلیغ و دعوت کا فائدہ مضمر ہے۔ یہ بلاشبہ صحیح فتویٰ ہے۔ جو لوگ غیر مسلموں کو باترجمہ قرآن دینے سے منع کرتے ہیں وہ دعوت و تبلیغ کے احساس سے خالی ہیں۔ وہ اسلام کی اسپرٹ کو سمجھنے سے محروم ہیں۔

ایک امریکی خاتون نے اسلام قبول کرلیا۔ اب وہ ایک پاکستانی مسلمان نصیر احمد مرزا سے نکاح کرکے اوٹا (Utah) میں رہتی ہیں۔ ان کا نام جے اسے مرزا (Jeanine Aisha Mirza) ہے۔ ان کا ایک انٹرویو میں نے پڑھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ اکثر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم بیویاں

زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ مگر ان کے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ تو محض ایک تقسیم ہے۔ گھر کے باہر میرا شوہر باس ہے۔ لیکن گھر کے اندر میں باس ہوں:

While most Americans are under the impression that Muslim wives are oppressed, Mirza said, she hasn't found that to be true. "It's just a different division. Outside the home, my husband's the boss. But in my house, I'm the boss."

اس طرح کے متعدد واقعات میرے علم میں آئے۔ امریکہ کی لڑکیاں سفید فام نسل کے لڑکوں سے شادی کرنے میں متردد رہتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں ہر وقت طلاق کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس بنا پر اکثر سنجیدہ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ یہ وہ لڑکے ہیں جو تعلیم وغیرہ کے مقصد سے امریکہ آتے ہیں۔ اس طرح کی شادیاں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ کیوں کہ اخبار کے لوگ ان امریکی لڑکیوں سے سوالات کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت عمدہ انداز میں اسلام کی طرف سے دفاع کرتی ہیں۔ جس کی ایک مثال اوپر نقل ہوئی۔

امریکہ میں انڈیا کے "مظلوم مسلمانوں" کے نام پر بہت سی تنظیمیں قائم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انڈیا سے براہ راست یا براستہ پاکستان امریکہ گئے اور پھر وہاں کے شہروں میں آباد ہو گئے۔ اپنی معاشی سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے انڈین مسلمانوں کی ہمدردی میں مختلف ناموں سے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔

اس قسم کے ایک مسلمان نے مجھے ۸۰ صفحہ کی ایک انگریزی کتاب دی۔ اس میں مختلف اخبارات سے انڈیا کے مسلمانوں کے بارہ میں خبروں اور رپورٹوں کو جمع کیا گیا تھا۔ اس کا نام تھا:

Oppression in India : A Case Study of Human Rights Violations

میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگوں کو اگر انڈیا کے مسلمانوں سے واقعی ہمدردی ہے تو آپ ان کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کے مضامین اور کتابیں چھاپ کر آپ انڈیا کے مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا کے مسلمانوں کے جو مسائل ہیں اس کے ذمہ دار خود آپ جیسے مسلم دانش ور ہیں۔ آپ لوگ خود تو امریکہ میں آخری حد تک ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کو یہ سکھلاتے ہیں کہ وہاں وہ ٹکراؤ کر کے رہنے کی کوشش کریں۔

امریکہ میں آپ لوگوں کو جو پیس حاصل ہے وہ ایڈجسٹمنٹ کی قیمت ہے، اور انڈیا کے مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں وہ ایڈجسٹمنٹ نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔

انھوں نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ مگر ان کے ایک ساتھی نے یہ کہہ کر انھیں چپ کر دیا کہ مولانا صاحب صحیح کہہ رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ لوگ انڈیا اور پاکستان میں گاڑی چلاتے ہیں تو بار بار ہارن بجاتے ہیں مگر آپ ہی لوگ جب امریکہ کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے ہیں تو کبھی ہارن نہیں بجاتے۔ یہی تو وہ کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اگر ہمت ہے تو یہاں اسی طرح ہارن بجا کر دیکھ لیجئے۔

۲۷ دسمبر کی شام کو میں صغیر اسلم صاحب کے دفتر میں تھا۔ انھوں نے ایک پیکٹ نکالا۔ اور اس کو مجھے دیتے ہوئے کہا کہ یہ کیلی فورنیا کی کھجور ہے۔ میں نے ایک کھجور ہاتھ میں لی۔ پھر میں نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک بار بھوک کی حالت میں تھے۔ ایک انصاری آپ کو اور چند صحابہ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے باغ میں گئے۔ وہاں وہ درخت سے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لائے اور پانی پیش کیا۔ آپ نے کھجور کھا کر پانی پیا۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ بھی ان نعمتوں میں سے ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ تم سے سوال کیا جائے گا۔ (وَلَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ)

میں نے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کھجور کو بس امریکہ کی کھجور سمجھے۔ ایسی حالت میں اس نے اس کھجور کو صرف پیداوار امریکہ کے طور پر پایا، اس نے اسے تخلیق خداوندی کے طور پر نہیں پایا۔ گویا کہ وہ امریکی صنعت کو دیکھ سکا مگر وہ خدائی صنعت کو دیکھنے سے محروم رہا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ: من کان فی هٰذهٖ اعمٰى فهو فی الآخرة اعمٰى (الاسراء ۷۲)

خدا اس دنیا میں اپنی صفات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ آخرت میں وہ اپنی ذات کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جو آدمی صفات کی صورت میں خدا کو نہ دیکھ سکے وہ ذات کی صورت میں بھی خدا کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔ اور بلاشبہ اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں۔

میں نے کہا کہ میکسیکو کا ایک سیاح اسپین گیا۔ وہاں وہ قصر الحمراء دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک اندھا فقیر وہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ سیاح نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس فقیر کو بہت زیادہ دے دو۔

THE WHITE HOUSE

WASHINGTON

December 27, 1993

Dr. Ghulam Nabi Fai
Executive Director
Kashmiri-American Council
Suite 1100
733 15th Street, N.W.
Washington, D.C. 20005

Dear Ghulam:

Thank you so much for your kind words about my recent speech to the United Nations General Assembly.

I share your belief that, in order to face the dilemmas of a post-Cold War global landscape, we all must look closely at our policies with regard to human rights. I am confident that we can bring about changes that are consistent with what the U.N. founders envisioned.

I look forward to working with you and others to help bring peace to Kashmir, and I appreciate your input.

Sincerely,

Bill Clinton

کیوں کہ کسی آدمی کی اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ الحمرا کے سامنے اندھا ہو۔
بلاشبہ یہ محرومی بڑی عجیب ہے کہ آدمی الحمرا جیسے خوبصورت محل کے سامنے کھڑا ہو اور وہ اس کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو۔ مگر اس سے بے شمار گنا زیادہ محرومی وہ ہوگی جب کہ خدا اپنے جمال و کمال کے ساتھ آخرت میں ظہور فرمائے گا مگر حال یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ وہاں کھڑے ہوں گے مگر وہ اپنے اندھے پن کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی سعادت نہیں پائیں گے۔

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی کے ریڈنگ روم میں مختلف زبانوں کے کئی پرچے دیکھے ریاض کے عربی ہفت روزہ المسلمون (۲۴ دسمبر ۱۹۹۳) کے آخری صفحہ پر ایک خبر تھی جس کا عنوان تھا: الآلاف دخلوا الاسلام (ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہو گئے) دکتور صلاح الصاوی (استاذ جامعۃ الازہر) کے حوالے سے ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکی فوجیوں کی پانچ ہزار تعداد اسلام میں داخل ہو گئی۔ یہ خلیج کے بحران کے دوران اس وقت ہوا جبکہ امریکی فوجیوں اور سعودی نوجوانوں کے درمیان اختلاط ہوا:

ان اعداد أكبر تقيل انما ۵۰۰۰ جندی امریکی قد دخلوا الاسلام حينما اتيح لهم الاختلاط بالشباب السعودي.

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں مجھے بہت زیادہ تشویش ہے۔ وہ مظلوم ہیں۔ وہ نصف صدی سے زیادتی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندستان جا کر ان کی خدمت کروں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ وہاں جا کر انھیں یہی سبق دینا چاہتے ہیں کہ تم مظلوم ہو تو آپ خود ان کے اوپر سب سے بڑا ظلم کریں گے۔ کیوں کہ کسی قوم کو مظلوم و مقہور بتانا، اور اس کو شکست کے احساس میں مبتلا کرنا گویا نفسیاتی اعتبار سے اس کو قتل کرنا ہے۔ کسی قوم کو آپ احساس یافت پر کھڑا کر سکتے ہیں، احساس محرومی پر کسی قوم کو کھڑا کرنا ممکن نہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ مسلم ملک ہندستان میں اپنے مسلم بھائیوں کا کوئی خیال نہیں کرتے جیسا کہ انھیں کرنا چاہئے:

Muslim countries do not care about their Indian Muslim brothers as they should.

میں نے کہا کہ اس سے آپ کا مطلب اگر یہ ہے کہ مسلم ممالک ہمارے بارہ میں بیانات دیں اور حکومت ہند سے مطالبات کریں تو ایسا کرنا ہرگز ہندستانی مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا اور ہمارے مسائل مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل خود ہندستانی مسلمانوں کو دانش مندی کے ساتھ حل کرنا ہے۔ باہر سے اس کا کوئی حل امپورٹ نہیں کیا جا سکتا۔

جناب صفی قریشی صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں جب کہ رونالڈ ریگن امریکہ کے پریسیڈنٹ تھے۔ مسٹر کرین (Robert Crane) کو عرب امارات کا سفیر بنایا گیا۔ ان کے کاغذات جب مخصوص کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے دیکھا کہ مذہب کے خانہ میں ان کے فارم میں اسلام لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے دراصل کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا اسلامی نام فاروق عبدالحق تھا۔ کمیٹی کے ارکان کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس وقت کمیٹی کے ایک سینئر ممبر مسٹر ریمزے کلارک (Ramsey Clarke) نے اس تقرر کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ امریکہ مسلم ملک میں ایک مسلم سفیر بھیجے:

It is time that America should send a Muslim Ambassador to a Muslim country.

ڈاکٹر سلمان ندوی (پیدائش ۱۹۳۳) مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے ہیں۔ تقسیم کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ کراچی چلے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے پوچھا کہ آپ کانگرسی ہیں یا مسلم لیگی۔ سید صاحب نے جواب دیا: دماغ سے کانگرسی ہوں مگر دل سے مسلم لیگی ہوں۔ ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ان کے علمی استاد مولانا شبلی نعمانی کا تعلق کانگرس سے تھا، اور ان کے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف تھا۔ اس لئے دل مسلم لیگ کی طرف مائل ہے۔

میرے نزدیک یہ اکابر پرستی ہے۔ اسی اکابر پرستی نے موجودہ زمانہ میں مجتہدانہ طرز فکر کا دروازہ مسلمانوں کے اوپر بند کر دیا۔

ڈاکٹر سلمان ندوی نے بتایا کہ ۱۹۰۶ میں ندوہ (لکھنو) کا دستار بندی کا جلسہ تھا۔ اسی

سال مولانا سید سلیمان ندوی وہاں کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ حاضرین میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ غلام السیدین صاحب نے عین جلسہ میں مولانا شبلی نعمانی سے کہا کہ اگر ندوہ کا کوئی طالب برجستہ عربی میں تقریر کرے تو میں ندوہ کی اہمیت کو مانوں گا، ورنہ نہیں۔

مولانا شبلی نے سید صاحب کو بلایا اور ان کے کان میں پوچھا کہ تم عربی میں تقریر کر سکتے ہو۔ سید صاحب نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے غلام السیدین سے کہا کہ یہ طالب علم عربی میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہے، آپ عنوان بتائیں۔ انھوں نے یہ عنوان دیا کہ ہندستان میں اسلام کی اشاعت کس طرح کی جائے۔ اب سید صاحب کا نام پکارا گیا۔ وہ اسٹیج پر آئے اور برجستہ تقریر کرنا شروع کیا۔ تاہم مولانا شبلی بے چین تھے کہ اگر کہیں یہ صاحب تقریر نہ کر سکے تو ندوہ کی سخت بے عزتی ہوگی۔ اس بے چینی میں وہ ہال کے باہر چلے گئے۔ اور گھبراہٹ کے عالم میں باہر ٹہلتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ہال کے اندر احسنت، مرحبا کا شور بلند ہوا۔ اب مولانا شبلی اندر آئے۔ سید صاحب کی اس کامیابی پر وہ اتنا خوش ہوئے کہ خود اپنا عمامہ اپنے سر سے اتار کر سید صاحب کے سر پر رکھ دیا۔

اسلام کے بارہ میں یہاں میں نے جو کتاب یا مقالہ دیکھا۔ تقریباً سب میں ایک بات مشترک تھی۔ سب میں یہ نظریہ موجود تھا کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی تفریق نہیں۔ مثلاً مسٹر غلام سرور کی کتاب دیکھی اس کا نام تھا:

Islam : beliefs and teachings (1987)

اس کا دسواں باب پولٹیکل سسٹم آف اسلام ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ـــــ مذہب اور سیاست اسلام میں بالکل ایک ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں:

Religion and politics are one and the same in Islam.
They are intertwined. (p. 177)

اسی طرح ڈاکٹر احمد ایچ صقر کا مقالہ آورٹائم (یکم ستمبر ۱۹۹۳) میں پڑھا۔ یہ میگزین کیلی فورنیا سے چھپتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اسلام مغربی مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اس میں مذہب اور اسٹیٹ کا فرق نہیں:

Islam is not a religion as is the case with western religions. It is a total way of life, and has complete systems for mankind. This means that there is no separation between state and religion. (p. 41)

اس موضوع پر ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے دانش ور اس طرح لکھتے ہیں گویا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب ناقص نظام ہیں اور اسلام کامل نظام۔ یہ ایک غیر علمی بات ہے۔ دونوں میں اصل فرق یہ ہے کہ اسلام محفوظ مذہب ہے اور دوسرے مذاہب محرف اور غیر محفوظ۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہاں کے مسلمانوں کے بارہ میں جو معلومات مجھے ہوئی ہے اس سے میں نے پایا کہ یہاں کا جو دینی طبقہ ہے وہ زیادہ تر تشخص (آئیڈنٹٹی) کی بات کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ یہاں کے ہندوؤں سے بات کریں تو وہ بھی تشخص ہی کے مسئلہ میں الجھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس پر غور کرتے ہوئے میں نے سمجھا کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قومی ظاہرہ ہے نہ کہ فی الواقع کوئی دینی ظاہرہ۔ تشخص اصلاً ظاہری ہیئت سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ دینی اعتبار سے ہمارا اصل کنسرن تشخص نہیں ہونا چاہئے بلکہ کردار ہونا چاہئے۔

انھوں نے میری بات سن کر کہا ـــــ آپ موحد قوم کا تقابل مشرک قوم سے کر رہے ہیں۔ یہ کتنا غلط تقابل ہے۔ وغیرہ

میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ اہل علم (intellectuals) ہیں۔ ان کے پاس خوبصورت الفاظ کا وافر ذخیرہ ہوتا ہے اور وہ فیاضانہ طور پر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ ایک کارآمد بات کہیں گے اور وہ ایک خوبصورت لفظی مجموعہ بول کر اس کو رد کر دیں گے۔ آپ مینیمم کی بات کریں گے اور وہ میکسیمم پر تقریر کرنا شروع کر دیں گے۔ آپ نقطۂ آغاز کی بات کریں گے اور وہ نقطۂ اختتام کا مسئلہ چھیڑ دیں گے۔ آپ عملی حل پیش کریں گے اور وہ اس کے مقابلہ میں معیاری حل لا کر بحث شروع کر دیں گے۔ آپ کسی لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کریں گے اور وہ اس لفظ کو دوسرے معنی میں استعمال کر کے اس کو بے قیمت ثابت کر دیں گے۔ آپ ایک سنجیدہ نقطۂ نظر پیش کریں گے اور وہ ایک لطیفہ چھیڑ کر اس کو مذاق میں اڑا دیں گے۔

۲۷ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں خطاب تھا۔ میں نے کہا کہ امریکہ میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان سے گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سب سے بڑا کنسرن آئیڈنٹٹی ہے۔ مگر آئیڈنٹٹی پر زور دینے سے آئیڈنٹٹی قائم نہیں ہو سکتی۔ آدمی کا نیچر یہ ہے کہ وہ اسی چیز کو لیتا ہے جو اس کو برتر دکھائی دے۔ اس لئے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اسلام کی آئیڈیالوجیکل سپیریریٹی کو نئی نسلوں کے دماغ میں اتاریں۔

اس مقصد کے لئے آپ کو اعلیٰ اسلامی لٹریچر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ لٹریچر انگریزی میں موجود نہیں۔ لٹریچر اس طرح نہیں بنتا کہ کسی کو ہائر کرکے آپ کہیں کہ تم "واٹ از اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھ دو۔ لٹریچر ہمیشہ ہسٹاریکل پراسس کے دوران بنتا ہے۔ یہ تاریخی عمل انگریزی زبان میں جاری ہو چکا ہے۔ اسی طرح اردو زبان میں بھی کئی سو سال کے عمل کے دوران کافی لٹریچر تیار ہو چکا ہے۔ اس لئے کم از کم فی الحال آپ کو یا عربی یا اردو زبان میں اپنے بچوں کو سکھانا ہوگا۔ سنجیدہ کوشش اور قربانی کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔

۲۸ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد دوبارہ اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں خطاب ہوا۔ میں نے بعض احادیث کی روشنی میں دینی تقاضوں کی وضاحت کی۔ امریکہ میں قیام کے دوران ہر روز صغیر اسلم صاحب کے مکان پر احادیث مع تشریح ریکارڈ کراتا رہا۔ اس کا انتظام صغیر اسلم صاحب نے کیا تھا۔

برصغیر ہند سے امریکہ جانے والے لوگوں نے وہاں بہت سی چھوٹی بڑی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ انھیں میں سے ایک تنظیم وہ ہے جو امریکن فیڈریشن کہی جاتی ہے :

American Federation of Muslims from India,
29008-W, 8 Mile Road, Farmington, Michigan 48336

اس فیڈریشن کی طرف سے ۲۹ ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲ کو شکاگو میں "تھرڈ انٹرنیشنل کانفرنس" ہوئی۔ اس میں امریکہ کے علاوہ ہندستان سے کئی ہریجن اور مسلمان مقررین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا تھیم یہ تھی :

The Role of Muslims in the socio-economic development of India

کانفرنس کا موضوع بظاہر یہ تھا کہ انڈیا کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مسلمانوں کا رول۔ مگر وہاں جو تقریریں ہوئیں، اس کے لحاظ سے اس کا موضوع ہونا چاہئے تھا ——— ہندستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مسلمانوں کے لئے حصہ داری کی مانگ۔ تقریروں اور رزولیوشن کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندو نازی ازم" ختم کرو۔ مسلمانوں کو ملازمت میں اور تعلیمی داخلہ میں رزرویشن دو۔ ایڈمنسٹریشن میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے بقدر حصہ دو۔ دلت مقررین نے کہا کہ بھارت میں برہمن واد کو ختم کرنے کے لئے دلت اور مسلمانوں کو ایک ہونا چاہئے" وغیرہ

میرے نزدیک اس قسم کی باتیں صرف نادانی کی تیخ پکار ہیں۔ یہ ایک برائی کے جواب میں دوسری برائی کا طوفان کھڑا کرنا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تفریقی دہشت گردی کو ختم کرکے ملکی سطح پر ایکتا لانے کی کوشش کی جائے۔ رعایت اور ریزرویشن کے بجائے محنت اور لیاقت کے ذریعہ آگے بڑھنے کا مزاج بنایا جائے۔ ردعمل والی سوچ کو ختم کرکے مثبت اور تعمیری سوچ پیدا کی جائے۔ عجیب بات ہے کہ جو لوگ امریکہ جاکر وہاں کے نظام سے آخری حد تک موافقت کرکے رہتے ہیں، وہ وہاں سے ہندستانی مسلمانوں کے لئے ٹکراؤ کی پالیسی برآمد کر رہے ہیں۔ اس ردعمل میں بیشتر امریکی مسلمان بتلا ہیں۔ اس قسم کی ردعمل کی روش سطحی لیڈری ہے نہ کہ فی الواقع کوئی رہنمائی۔

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۸ نومبر ۱۹۹۳) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کا عنوان تھا: عندھم کل شئ إلا ... اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہر چیز پائی جاتی ہے سوا خیر کے (فی امریکا یوجد کل شئ إلا الخیر) اور پھر حدیث رسول کو امریکہ پر چسپاں کیا گیا تھا: انا بریٔ من مسلم یقیم بین ظھرانی المشرکین۔

مگر یہ دین کی صحیح تشریح نہیں۔ امریکہ میں بلاشبہ ایک بہت بڑا خیر ہے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں سرخ اونٹ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی دعوت اسلام کا کام کرنا اور خدا کے ان بندوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں داخل کرنا۔

مجھ کو اپنے سفر کے دوران کچھ سفید فام امریکنوں سے بات کرنے کا موقع ملا۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ عام امریکی میں قبولیت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کسی معقول بات کو

ان کا ذہن فوراً جان لیتا ہے۔ سفید فام امریکنوں کے مزاج کے بارہ میں اپنے اس تاثر کا ذکر میں نے جناب صغیر اسلم صاحب سے کیا جو یہاں ۲۵ سال سے رہتے ہیں، انھوں نے میرے احساس کی تصدیق کی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں برابر لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ امریکی روزنامہ وال اسٹریٹ جرنل (۵ اکتوبر ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق، ماہرین مذہب کا خیال ہے کہ اسلام امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والا مذہب ہے:

Many religious experts say Islam is the fastest-growing faith in the United States.

ایسی حالت میں کہنے والوں کو کہنا چاہئے کہ امریکہ میں بہت بڑا خیر موجود ہے۔ وہاں کے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچاؤ اور پھر سرخ اونٹوں کی دولت حاصل کرو۔

ایک ہندستانی مسلمان جو اب امریکہ میں رہتے ہیں، انھوں نے شکایت کی کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے ذمہ دار آپ جیسے لوگ ہیں۔ آپ لوگ خود تو امریکہ میں یک جہتی کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہندستان کے معاملہ میں وہاں کے استحصالی لیڈروں کی مدد کرتے ہیں جو مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کے راستہ پر چلانا چاہتے ہیں۔

پھر میں نے ان کو مقامی اخبار آرنج کاونٹی (Orange County) کا شمارہ ۹ نومبر ۱۹۹۳ دکھایا۔ اس میں ایک مسلم لیڈر شبیر منصوری کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مجھے امریکی مسلمان ہونے پر فخر ہے:

I am proud to be a Muslim American.

میں نے کہا کہ ہندستان کے لیڈر، خواہ باریش ہوں یا بے ریش، کبھی یہ نہیں کہتے کہ مجھے ہندستانی مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ ایسی حالت میں اگر اکثریتی فرقہ اور مسلمانوں کے درمیان معتدل تعلقات نہ پائے جائیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ڈبل اسٹینڈرڈ ہیں۔ آپ لوگ ہندستانی مسلمانوں کے لئے کچھ پسند کرتے ہیں اور خود اپنے لئے کچھ اور پسند کئے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ مشہور ہے، کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کو امریکہ کے ساحل پر پہنچا تھا۔ اس دن اس نے اپنی ڈائری کا جو صفحہ لکھا، اس میں اس نے ۱۳۹ بار سونا کا لفظ استعمال کیا۔ اس وقت کولمبس کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت سونے کی تھی۔ کولمبس کو معلوم نہ تھا کہ چند سو سال بعد امریکہ ایک ایسے فن کا مرکز بننے والا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ جدید ٹکنالوجی ہے۔

دہلی سے ایک انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر شائع ہوتا ہے۔ یہ ریڈئنس کا ہندو ورشن ہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈئنس ہے، اور ریڈئنس مسلمانوں کا آرگنائزر۔ دونوں ہی منفی اصولِ صحافت پر چلائے جا رہے ہیں۔

آرگنائزر کے شمارہ ۵ دسمبر ۱۹۹۳ میں ایک مضمون اتل راوت کے قلم سے چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ——— اجودھیا امریکی پریس میں:

Ayodhya in American Press

امریکی اخباروں میں اجودھیا کے واقعات پر جو کچھ چھپا تھا اس میں انھیں برا بھلا کہتے ہوئے مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا کی خبریں اور خاص طور پر ہندوؤں کی خبریں امریکی پریس میں ہمیشہ غلط طور پر یا غلط رخ سے پیش کی جاتی ہیں:

The news dealing with India in general and Hindus in particular is, more often than not, misrepresented and misinterpreted in American press.

مضمون نگار کو مثلاً یہ شکایت تھی کہ نیویارک ٹائمس نے اپنے شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ میں اجودھیا کے واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے یہ لکھا کہ ہزاروں ہندو انتہا پسندوں نے اجودھیا میں گھس کر ۱۶ ویں صدی کی تعمیر شدہ "مسجد" کو ڈھا دیا۔ نیویارک ٹائمس اجودھیا کے متنازعہ ڈھانچہ کو برابر مسجد بتا رہا تھا:

Consistently the New York Times had been describing the disputed structure as mosque.

ٹھیک یہی ذہن مزید اضافہ کے ساتھ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم دانشوروں میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ نفرت کی باتیں کریں مگر دنیا اس کو محبت کا عنوان دے۔ وہ تشدد کی کارروائی

کریں مگر دنیا اس کو امن کا اقدام بتائے۔ وہ لوگوں کے راستے میں کانٹے بکھیریں مگر دنیا یہ اعلان کرے کہ انھوں نے ہمارے راستہ کو پھولوں سے بھر دیا ہے۔ اور جب دنیا ایسا نہیں کرتی تو وہ پرجوش طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ساری دنیا کا میڈیا مسلم دشمن ہے، وہ گہری سازش کے تحت مسلمانوں کے بارہ میں غلط خبر رسانی (disinformation) کا فعل انجام دے رہا ہے۔

آرنج کاونٹی کی اسلامک سوسائٹی کی مسجد ایک متروکہ چرچ کو خرید کر بنائی گئی ہے۔ اس قسم کے واقعات امریکہ اور یورپ میں عام ہیں۔ متروکہ چرچ کی عمارت کو کہیں مسلمانوں نے خرید کر مسجد بنالی ہے اور کہیں ہندوؤں نے خرید کر اس کو مندر میں تبدیل کرلیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی تصور کے مطابق، چرچ کسی مقام یا عمارت کا نام نہیں ہے۔ چرچ، قدیم لفظ اکلیسیا (ekklesia) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ قدیم یونان میں اکلیسیا اجتماع (اسمبلی) کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ اس کے بعد مسیحیوں نے اس کو مذہبی اجتماع کے معنی میں بولنا شروع کیا۔ اب اکلیسیا یا چرچ ہم معنی طور پر مذہبی اجتماع یا مذہبی ایسوسی ایشن کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی مقام پر مسیحیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے چرچ کی بلڈنگ کا مذہبی استعمال باقی نہ رہے تو اس کی مذہبی حیثیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کو بیچنا ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی خالی گھر کو بیچ دینا۔ تاہم مسیحی حضرات اس کو پسند کرتے ہیں کہ ایک مذہبی عمارت دوبارہ مذہبی عمارت ہی کی حیثیت سے باقی رہے۔ اسی لئے اس قسم کے چرچ نہایت آسانی سے مسجد یا مندر والوں کو حاصل ہو جاتے ہیں۔

لاس اینجلس کے مسٹر عبد الحکیم نے اپنا ایک پیپر (Muslims of India) پڑھنے کو دیا۔ اس کا عنوان یہ تھا کہ ہوشیار دشمن بیوقوف دوست سے اچھا ہے۔ اس کی تشریح میں نیچے لکھا ہوا تھا کہ ہندستان کی مسلم لیڈر شپ بھی جزئی طور پر ذمہ دار ہے:

A smart enemy is better than a foolish friend (Muslim leadership is also partly responsible)

میں نے کہا کہ جزئی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر مسلمانوں کی نا اہل لیڈر شپ ہی ان کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً ڈزرویشن کے دور میں اس نے مسلمانوں کے اندر رزرویشن کا ذہن بنایا۔

موجودہ زمانہ میں صحافت ایک انڈسٹری ہے۔ اس کو جو لوگ چلاتے ہیں وہ اظہار حق کے لئے اس کو نہیں چلاتے بلکہ خالص تجارتی مصلحت کے تحت چلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات ہمیشہ گرماگرم خبروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ عوام ایسی خبروں کو پڑھنے میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان اخبارات میں زیادہ تر انتہاپسند مسلمانوں کی باتیں نمایاں کی جاتی ہیں۔ مثلاً کچھ مسلمانوں نے جب امریکہ کے ٹریڈ سنٹر پر بم مارا تو یہ خبر فوراً تمام اخباروں میں چھپ گئی۔ جب کہ دوسری اچھی خبریں ان اخباروں کے صفحات میں بہت کم جگہ پاتی ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہے کہ جو امریکی اخبار کی خبروں سے اسلام کے بارہ میں واقف ہوتے ہیں وہ اسلام کو ایک دہشت گرد مذہب سمجھتے ہیں، کیوں کہ اسلام کی نسبت سے وہ ہمیشہ اسی قسم کی خبریں اپنے اخبار وں میں دیکھتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم امریکی صحافت کی مذمت کریں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ان مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی جائے جو منفی طرز فکر میں مبتلا ہیں اور متشددانہ قسم کے واقعات برپا کرکے اہل صحافت کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اسلام کی تصویر کو خراب کریں۔

ایک جائزہ کے مطابق، ۴۰ فیصد امریکی اسلام کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے۔ ۳۰ فیصد کا یہ کہنا ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ موافقت کرکے رہ سکتے ہیں۔ ۳۰ فیصد امریکیوں نے واضح طور پر اسلام سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔
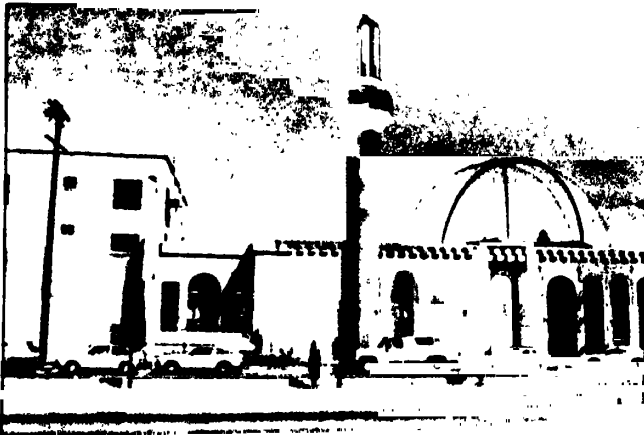
Omar ibn Khattab Mosque, in Los Angeles, America.

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۱۰ جنوری ۱۹۹۴) میں ایک رپورٹ نظر سے گزری۔ یہ ایک پاکستانی نژاد مقیم امریکہ ڈاکٹر مقبول راشد کا انٹرویو تھا جو انھوں نے نوائے وقت کے نمائندہ کو دیا تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ " امریکہ میں نقل مکانی کرنے والے غیر سفید فام باشندوں میں بھارتی نژاد ہندو سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند ہیں۔ بھارتی افراد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ بھارتی نژاد شہری امریکہ میں کلیدی سرکاری عہدوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔ امریکی معیشت کا بھی بہت بڑا حصہ بھارتی نژاد باشندوں کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ میں یہ بھارتی باشندے تعداد، وسائل اور اثر ورسوخ میں پاکستانی مسلمانوں سے بہت آگے ہیں" صفحہ ۳

یہ بات بالکل درست ہے۔ میں نے خود بھی اپنے سفر امریکہ کے دوران اس فرق کا مشاہدہ کیا۔ اب اگر پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کو ملایا جائے تو امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد اور ہندوؤں کی تعداد برابر ہے۔ ہر ایک کی تعداد پانچ اور چھ لاکھ کے درمیان ہے۔ دوسری طرف خود نوائے وقت کے شمارہ ۷ جنوری ۱۹۹۴ میں ایک پاکستانی نژاد امریکی خاتون سائرہ چودھری کا انٹرویو اس کے مخصوص کالم مہمان شہر (گیسٹ ان ٹاؤن) میں چھپا ہے۔ موصوف نے زور دے کر بتایا کہ امریکہ میں کسی قسم کا تعصب یا طرف داری نہیں۔ وہاں ہر شخص کو یکساں طور پر ترقی کے مواقع حاصل ہیں (صفحہ ۳)

مسٹر محمد علی جناح تقسیم کی تائید میں کہتے تھے کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کا تعصب مستقل طور پر مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ بنا رہے گا۔ اب موجودہ انڈیا میں نام نہاد مسلم لیڈروں کے بیان کے مطابق دوبارہ ہندوؤں کا تعصب مسلمانوں کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں مسلمان کیوں ہندوؤں سے پیچھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم جناح سے لے کر جدید جناح تک جن لوگوں نے مسلمانوں میں اس قسم کا ذہن بنایا وہ مسلمانوں کے نادان دوست تھے، اور مشہور مقولہ کے مطابق، نادان دوست دشمن سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

مسٹر ضیغم اسلم صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۸ میں اسلامک سوسائٹی میں عید کے دن تقریر کی۔

تقریباً پانچ ہزار مسلمان تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم کو اس سے محبت کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی اس ملک میں اسلام انشاء اللہ پھیل سکتا ہے:

I am proud to be an American Muslim. This is our country and we must love this country. Only then, Insha Allah, Islam will spread in America.

لوگوں نے ان الفاظ پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ لوگوں نے کہا کہ امریکہ تو ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ پھر ہم اس سے محبت کیسے کر سکتے ہیں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ اگر آپ سچ مچ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو چاہئے کہ امریکہ میں اپنی شہریت کو ختم کرکے یہاں سے واپس چلے جائیں۔ امریکی شہریت کے دستاویز پر دستخط کرنا اور امریکہ کے ساتھ وطنی تعلق قائم نہ کرنا دو متضاد روش ہے۔ یہ دوہرا معیار ہے، اور دوہرے معیار کا آدمی کبھی کسی ملک میں اسلامی دعوت کا کام نہیں کر سکتا۔

صغیر اسلم صاحب کے دادا چودھری محمد عیسیٰ (م ۱۹۴۸) بہت سمجھدار آدمی تھے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ ان کے دادا کہا کرتے تھے کہ دوسروں کی اچھائی اور اپنی برائی کو دیکھو۔ یہ دو لفظ میں نہایت اعلیٰ اصول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف یہی دو لفظ کا اصول لوگ پکڑ لیں تو سارے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ آج ہر طرف جو جھگڑے ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کا مزاج اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنا معاملہ ہو تو وہ صرف اچھائی کو دیکھیں گے اور دوسرے کا معاملہ ہو تو صرف برائی کو۔

موجودہ سفر میں میری ملاقات ایک امریکی مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی آزادی ہے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ پچھلی رات کو ۱۰ بجے میرے لڑکے کے پاس اس کے ساتھی کا ٹیلی فون آیا۔ وہ اس کو ایک پارٹی میں بلا رہا تھا۔ میرے لڑکے نے فوراً گاڑی اٹھائی اور روانہ ہو گیا۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر تفریح کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، وغیرہ۔ یہاں کے نظام کی وجہ سے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا خون کھولتا رہا۔ مگر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بے بسی کے ساتھ اس کو برداشت کروں۔

میں نے کہا کہ آپ ایسا کیجئے کہ ہر سال اپنے بچوں کو مہینہ دو مہینہ کے لئے اپنے سابقہ وطن میں

بھیج دیجئے۔ وہاں وہ اردو سیکھیں گے اور اسلامی ماحول میں رہیں گے۔ اس طرح ان کی اصلاح ہوتی رہے گی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بھی سخت مشکل ہے۔ پچھلے سال میں اپنے بچوں کو لے کر وطن گیا مگر وہاں کے ماحول میں وہ رہ نہیں سکے۔ وہاں کا پانی پی کر ان کا پیٹ خراب ہوگیا۔ وہاں کے بیت الخلا میں انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح کے مختلف مسئلے پیش آئے۔ وہاں جب تک میں تھا ان کو لے کر بس ڈاکٹروں کے یہاں دوڑتا رہا۔

اس قسم کے عجیب عجیب مسائل ہیں جن میں یہاں کے مسلمان مبتلا ہیں۔ ان مسائل کی کم از کم ایک وجہ ان کا مصنوعی معیار زندگی ہے۔ یہاں ہر شخص مصنوعی طور پر اپنا معیار زندگی بڑھا لیتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ طرح طرح کے مصنوعی مسائل میں مبتلا رہتا ہے۔

یہاں آپ کسی سے ملاقات کے لئے جائیں تو وہ ایک شاندار گھر میں آپ کا استقبال کریگا۔ لیکن یہ گھر سودی قرض پر ہوگا۔ یہاں تمام لوگ سودی قرض پر مکان خریدتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے لائف اسٹائل کے مطابق، کوئی آدمی اپنا جو اسٹیٹس سمجھتا ہے، اس سے مطابقت رکھنے والا گھر وہ نقد رقم دے کر خرید نہیں سکتا۔ اس لئے وہ سودی قرض لے کر مکان خریدتا ہے جو بہت آسانی سے اس کو مل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کما کما کر ساری زندگی اس کی قسط مع سود ادا کرتا رہتا ہے۔ اَب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو گھر یا زندگی کا جو ڈھانچہ سارا کا سارا سود کے اوپر بنا ہو اس کے اندر رہنے والے بچوں میں صالح مزاج کیوں کر پرورش پا سکتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہے، وہ اس وقت میری سمجھ میں آیا جب کہ میں نے جانا کہ جناب منیر اسلم صاحب ان انتہائی چند مستثنیات میں سے ہیں جو ایسے گھر میں رہتے ہیں جو انھوں نے نقد ادائیگی کی بنیاد پر حاصل کیا ہے، اس میں سود کی آمیزش شامل نہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ اس طرح کہ اپنے اسٹیٹس کے اعتبار سے انھیں ۲۰ لاکھ ڈالر کے مکان میں رہنا چاہئے تھا مگر وہ صرف دو لاکھ ڈالر قیمت کے مکان میں رہتے ہیں۔

امریکی نظام میں سود سے بچنے کی قیمت یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ جرأت ہو کہ وہ بظاہر کم تر معیار حیات پر اپنے کو راضی کرے۔ وہ اس کی پروا نہ کرے کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا کہیں گے۔ اس کے اندر یہ بلند نگاہی ہو کہ وہ اپنے آپ کو خود اپنی نظر سے دیکھے نہ کہ دوسروں کی نظر سے۔

کچھ لوگ جو انڈیا اور پاکستان سے آئے ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم اپنی اگلی جنریشن کو کھو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے کہ تعرف الأشياء بأضدادها (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اس حیثیت سے غور کیجئے تو یہاں بھی ایک ضد موجود ہے اور ان دونوں کا تقابلی مطالعہ کرکے آپ معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔

یہ ضد آپ لوگ خود ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی اگلی جنریشن کو کھو رہے ہیں۔ مگر آپ لوگ (پچھلی جنریشن) تو پھر بھی ضائع ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اگلی نسل ضائع ہو رہی ہے تو پچھلی نسل کس طرح محفوظ ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کی ضرورت اس لئے ہے کہ آپ محفوظ نسل کے کیس کو سمجھ کر اس کو ضائع ہونے والی نسل پر استعمال کرسکتے ہیں۔

اس بات کو سادہ طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی نسل کی پرورش "اردو کلچر" میں ہوئی تھی اور نئی نسل کی پرورش "انگلش کلچر" میں ہو رہی ہے۔ ہر زبان الگ الگ مذہب اور روایات کی نمائندہ ہوتی ہے۔ انگلش اگر مادی تہذیب میں رچی بسی ہے تو اردو روحانی تہذیب میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اگر آپ اپنی اگلی نسل کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ انتظام کرنا ہوگا کہ ان کی پرورش بھی آپ والے کلچر میں ہو۔ اس کے بغیر اگلی نسلوں کی حفاظت ممکن نہیں۔

۲۸ دسمبر کو کیلی فورنیا کے انگریزی میگزین آور ٹائمس (Our Times) کے اڈیٹر مسٹر تشبیہ سید نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے دانشور یہ کہتے ہیں کہ مسلم ملکوں میں جو لوگ حکومت کے عہدہ پر ہیں وہ سب اسلام کے مخالف ہیں اور مغربی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ نظریہ سید جمال الدین افغانی کے زمانہ سے چل رہا ہے۔ مگر میں اس کو سراسر بے معنی سمجھتا ہوں۔

یہ درست ہے کہ موجودہ مسلم حکمراں کچھ مسلم تنظیموں پر تشدد کر رہے ہیں، مگر اس کی ذمہ داری خود ان مسلم تنظیموں پر ہے۔ یہ لوگ مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اور جب بھی کسی کے اقتدار کے خلاف تحریک چلائی جائے تو وہ یہی کرتا ہے۔ مسلم اداروں میں لوگوں کو چھوٹے چھوٹے اقتدار حاصل ہیں۔ اگر آپ ان کو ان کے مقام سے ہٹانے کی تحریک چلائیں تو وہاں بھی آپ کا وہی انجام ہوگا جس کی شکایت آپ سیاسی حکمرانوں سے کر رہے ہیں۔

ترک کلام

دہلی کے ایک حاجی جناب صلاح الدین صاحب اپنی اہلیہ اختر سلطانہ صاحبہ کے ساتھ حج کے فریضہ سے فارغ ہو کر جون ۱۹۹۴ میں اپنے وطن واپس آئے۔ اس کے بعد انھوں نے بہشتی زیور کا ایک خصوصی نسخہ لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ یہ ایک مفید اصلاحی طریقہ ہے اور بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ہمارے یہاں یہ حال تھا کہ ہر مسلمان کے گھر میں قرآن کے بعد دوسری کتاب جو ضرور موجود رہتی تھی وہ مولانا اشرف علی تھانوی رح کی بہشتی زیور تھی۔ اب نئی نئی چیزوں کے چلن نے اس رواج کو ختم کر دیا ہے۔ اس رواج کا یہ فائدہ تھا کہ گھر کی عورتیں اور بچے شروع ہی سے دین کی ضروری باتیں سنتے اور پڑھتے تھے۔ زندگی کے بارہ میں اسلامی آداب ان کے ذہن میں اس طرح بیٹھ جاتے تھے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کا تصور نہیں کر سکتے۔

بہشتی زیور کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے، اس کے ٹائٹل پر لکھا ہوا ہے —— اس مجموعہ میں مستورات کی تمام ضروریات، عقائد و مسائل، اخلاق و آداب معاشرت اور تربیت اولاد وغیرہ مذکور ہیں۔ ۸۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں یہ تمام باتیں نہایت سادہ زبان میں بتا دی گئی ہیں۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر اس عنوان پر پڑی: "بولنا چھوڑنا" اس عنوان کے نیچے درج تھا:

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کسی مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے بھائی مسلمان کے ساتھ تین دن سے زیادہ بولنا چھوڑ دے اور اسی حالت میں مرجائے تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ (۴۲۸)

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مذکورہ الفاظ ابو داؤد کی روایت میں ہیں۔ آج یہ اخلاقی برائی گھر گھر میں پائی جاتی ہے۔ دو مردوں یا عورتوں کے درمیان کوئی خلاف مزاج بات ہوئی، اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے منھ پھیر لیں گے اور سلام و کلام ترک کر دیں گے۔ یہ فعل نہ صرف غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو عورت یا مرد تین دن گزرنے کے بعد بھی بول چال بند رکھیں اور اسی حال میں ان پر موت آجائے تو سخت اندیشہ ہے کہ مرنے کے بعد وہ حدیث کے مطابق اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں گرا ہوا پائیں گے۔

رواداری کا اصول

جنوری ۱۹۹۵ کی پہلی تاریخ کو تمام اخباروں میں یہ خبر تھی کہ اقوام متحدہ نے ۱۹۹۵ کے سال کو رواداری کا سال (year of tolerance) قرار دینے کا اعلان کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر نیویارک سے جاری ہونے والے اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ اپنے عمل، اپنے عقیدہ اور اپنی رائے میں روادار ہونا وہ سب سے بڑا عامل ہے جس کے ذریعہ پر امن دنیا تعمیر کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ نسلی ٹکراؤ، اقلیتوں کے خلاف امتیاز اور پناہ گزینوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل رواداری ہی ہے۔ نسل پرستی اور مذہبی انتہا پسندی بہت سے ملکوں میں امتیازی سلوک تک پہنچ گئی ہے۔ ان لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے جو مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفوں اور صحافیوں کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں جو اظہار خیال کی آزادی کے حق کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر یہ زبردست چیلنج ہمارے سامنے ہے اور اس کا واحد حل رواداری ہے۔ ناروا داری صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مسائل کو ختم نہیں کرتی۔ ناروا داری اگر زیادہ بڑھ جائے تو وہ عالمی امن کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جائے گی (ہندستان ٹائمس

1995 as year of tolerance

The United Nations has proclaimed 1995 as the Year of Tolerance, saying the ability to be tolerant of the actions, beliefs and opinions of others is a major factor in promoting world peace. Amid the resurgence of ethnic conflicts, discrimination against minorities and xenophobia directed against refugees and asylum-seekers, tolerance is the only way forward, said the statement of the United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation, (UNESCO). It said, racism and religious fanaticism in many countries had led to many forms of discrimination and the intimidation of those who hold contrary views. Violence and intimidation against authors, journalists and others who exercise their freedom of expression, were also on the increase along with political movements which seek to make particular groups responsible for social ills such as crime and unemployment. Intolerance is one of the greatest challenges we face on the threshold to the 21st century, said the UNESCO statement. Intolerance is both an ethnic and a political problem. It is a rejection of the differences between individuals and between cultures. When intolerance becomes organised or institutionalised it destroys democratic principles and poses a threat to world peace.

The Hindustan Times, January 1, 1995.

یکم جنوری ۱۹۹۵)

اقوام متحدہ کا یہ اعلان نہایت صحیح اور بر وقت ہے۔ آج دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی رواداری یا ٹالرنس ہے۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ خواہ کوئی خاندان ہو یا کوئی سماج ہو یا کوئی ملک ہو، ہر جگہ ایک اور دوسرے میں فرق اور اختلاف ضرور پایا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس فرق اور اختلاف کی موجودگی میں اتحاد اور میل ملاپ کس طرح پیدا کیا جائے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کا ماحول اگر بنانا ہے تو اختلافات کو مٹا دینا ہوگا۔ مگر یہ رائے غلط ہے، کیوں کہ وہ قابل عمل نہیں۔ اگر آپ پھول کے ساتھ کانٹے کو پسند نہ کرتے ہوں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کانٹوں کو توڑ کر کانٹوں کا خاتمہ کر دیں۔ کیوں کہ آپ ڈالی کا ایک کانٹا توڑیں گے تو اس کی جگہ دوسرا کانٹا نکل آئے گا۔ حتی کہ اگر آپ تمام پھولوں پر بلڈوزر چلا دیں تب بھی جو نیا درخت اگے گا اس میں دوبارہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ضرور موجود ہوں گے۔

اس دنیا میں کانٹوں کو گوارا کر کے ہی پھول کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اختلافات کو برداشت کر کے ہی پر امن سماج بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد حاصل ہوتا ہے۔ نہ کہ اختلاف کو مٹا کر متحد ہونے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ امن کی زندگی کو حاصل کرنے کا واحد راز ہے، بے امنی کو گوارا کرنا۔

دنیا میں فرق اور اختلاف ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ ایک مثبت خصوصیت ہے اور اس کے بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ باغ حیات کی خوشنمائی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اتحاد کے پھول کے ساتھ اختلاف کا کانٹا بھی پایا جائے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسانوں میں اعلیٰ اخلاقیات کی تربیت ہوتی ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان اگر آپ خوش اخلاق ہوں تو آپ نے محض ابتدائی اخلاق کا ثبوت دیا۔ لیکن اگر آپ ان لوگوں کے درمیان خوش اخلاقی کا رویہ اختیار کریں جو آپ سے الگ خیال رکھتے ہیں یا آپ کے ناقد ہیں تو آپ نے یہ استحقاق حاصل کیا کہ آپ کو اعلیٰ اخلاقی سلوک کا کریڈٹ دیا جائے۔

اسی طرح اگر سماج میں تمام لوگ بالکل ایک رائے کے ہوں۔ ان میں کوئی اختلافی بحث نہ پیدا ہوتی ہو تو ایسا سماج پتھر کے اسٹیچو کا سماج بن جائے گا۔ اس کے درمیان رہنے والوں کی فکری ترقی رک جائے گی۔ فکری ترقی ہمیشہ افکار کے ٹکراؤ کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر جہاں افکار کا ٹکراؤ ہی نہ ہو وہاں فکری ترقی کس طرح ہو سکتی ہے۔

نزاع اور اختلاف کے مقابلہ میں رواداری کا طریقہ اختیار کرنا کوئی انفعالی صفت نہیں۔ یہ عین ایجابی صفت ہے۔ زندگی کی تعمیر میں اختلافات کا نہایت اہم رول ہے۔ اختلافات کے عمل کے دوران ہی اعلیٰ انسانی شخصیت بن کر تیار ہوتی ہے۔ اگر انسانی سماج سے اختلاف کی حالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد اعلیٰ شخصیتوں کا بننا بھی یقینی طور پر رک جائے گا۔

اس دنیا میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس میں ایک صفت ہوتی ہے تو دوسری صفت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک سبب ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فرق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر اجتماعی زندگی کے لئے یہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ کیوں کہ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی کمی کو دوسرا آدمی پورا کرے۔ ایک کی خصوصیت دوسرے کے کام آئے۔ اگر لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے اختلاف کو گوارا کرنے کا مزاج ہو تو یہ اختلاف مجموعی انسانی ترقی کا ایک طاقتور وسیلہ بن جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد جب انڈیا میں پہلی آزاد حکومت بنی تو اس میں دو اہم لیڈر شامل تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ پنڈت نہرو کے اندر مغربیت تھی اور سردار پٹیل کے اندر مشرقیت۔ اس بنا پر دونوں لیڈروں میں اکثر رائے کا اختلاف ہو جاتا تھا۔ مگر یہ اختلاف قوم کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو کی صلاحیت سے سردار پٹیل کی کمی پوری ہوئی، اور سردار پٹیل کی صلاحیت پنڈت نہرو کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

یہ ایک قریبی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائے اور طبیعت کا اختلاف انسانیت کی عمومی ترقی کے لئے کتنا زیادہ ضروری ہے۔

رواداری کی خصلت آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو

غیرضروری چیزیں ضائع کرنے لگے۔ جب آپ کسی دوسرے کی خلاف مزاج بات سے منفی اثر قبول کرلیں۔ تو آپ کا ذہنی اعتدال بگڑ جائے گا۔ اس کے برعکس جب اس طرح کی صورت پیش آنے پر آپ اس کا منفی اثر نہ لیں تو آپ کا ذہنی اعتدال پوری طرح برقرار رہے گا۔ آپ اپنا ایک لمحہ کھوئے بغیر ایک نارمل انسان کی طرح ہمیشہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ رواداری اور تحمل کی پالیسی آپ کی کارکردگی کی عمر کو بڑھاتی ہے اور نارواداری اور عدم تحمل کا رویہ آپ کی کارکردگی کی عمر کو گھٹا دیتا ہے۔

رواداری یا ٹالرنس کوئی مجبورانہ فعل نہیں، وہ زندگی کا ایک مثبت اصول ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی کردار ہے۔ کسی سماج میں روادار انسانوں کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں پھول کا ہونا۔ پھول کے بغیر باغ نہیں، اسی طرح روادار انسانوں کے بغیر ترقی یافتہ سماج نہیں۔

آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ۳ مارچ ۱۹۹۵ کو نشر کیا گیا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۴ کو زی ٹی وی کی ٹیم اسلامی مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ویڈیو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر رزرویشن کے مسئلہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ ریزرویشن کسی بھی کمیونٹی کے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ نہرو گورنمنٹ نے ہندستان کے صنعتی گروپ کو پروٹکشن دیا۔ مگر ملکی صنعت ترقی نہ کر سکی۔ چنانچہ اب حکومت اس پالیسی کو چھوڑ کر کامپٹیشن کی پالیسی اختیار کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو بھی اس فطری حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے محنت کے اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ رزرویشن کی بے فائدہ مانگ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

۲ ۳ - ۶ جنوری ۱۹۹۵ کو گوہاٹی میں ایک نیشنل سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع نارتھ ایسٹ علاقہ کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور موضوع پر اپنا تعمیری نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۳ ۸ جنوری ۱۹۹۵ کو ہیلی روڈ (نئی دہلی) پر تعلیم یافتہ افراد کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ نئے انڈیا کی تعمیر و تشکیل کس طرح کی جائے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اپنے تعمیری خیالات تفصیل کے ساتھ پیش کئے۔ لوگوں نے اتفاق کرتے ہوئے اسی لائن پر کام کرنے کا عزم کیا۔

۴ ہندی روزنامہ جن ستا کے نمائندہ مسٹر شمس طاہر خان اور مسٹر ہریش لاکھیرا نے ۱۹ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تعلیمی پچھڑاپن کا کوئی بھی تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے نااہل لیڈروں پر ہے جنھوں نے مسلمانوں کو غیر ضروری مسائل میں الجھایا اور ان کے اندر تعمیری ذہن نہیں بننے دیا۔

۵ راشٹریہ سہارا (ہندی روزنامہ) کے نمائندہ مسٹر جوہر عبد اللہ اور مسٹر منوج کنک نے

۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کو الکشن میں اپنی پالیسی مقامی حالات کے اعتبار سے بنانا چاہئے۔ انھیں آل انڈیا انتخابی پالیسی نہیں بنانا چاہئے۔

۶ ۔ جناب سید شفیع الدین صاحب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

Respected Maulana Sahab, Assalamu Alaykum. Hope this letter finds you in the best of health. I am sure y ı would have read in the newspapers that the year 1995 has been proclaimed as the year of tolerance by the U.N. When I saw it on the first page of my paper on the very first day of the new year, I was struck by a strange feeling, an illusion, as if on the horizon, from the dizzy height of U.N. headquarter's building, you are waving a huge copy of *Al-Risala* bearing the word "Tolerance" on its cover. Since then I am really a bit uncertain whether this message is proclaimed by the U.N. or it is an echo of your mission coming to the world through the corridors of the greatest international organization! I wish and hope that you would make it the main theme of your writings, specially for English publications, during the current year and unfold the teachings of Islam on the subject of tolerance, avoidance, endurance and patience. This will enlighten people on one hand and probably contribute to your intense cause of *da'wah* as well. Syed Shafiuddin M.A., New Delhi, 5.1.1995

۷ ۔ یو این آئی کے نمائندہ مسٹر اشوک اپا دھیائے نے ۲۲ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملکی مسائل نیز مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اختلاف کے مسئلہ کا حل اختلاف کو مٹانا نہیں ہے بلکہ اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ خواہ ایک فیملی کا مسئلہ ہو یا پورے ملک کا مسئلہ، یہی واحد اصول ہے جس کے ذریعہ پر امن زندگی کی تعمیر کی جاسکتی ہے

۸ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر شیام سندر سنہا نے ۲۶ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے تعلق کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔ اور ہندو مسلم نفرت کو کس طرح ختم کیا جائے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ مسائل بے سمجھی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور سمجھداری کے ذریعہ ان کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

۹ بھارتیہ ودیا بھون کے تحت بمبئی میں ۲۹ ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس

کا موضوع تھا: ملک میں اقدار پر مبنی سماج کی تعمیر۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور صدارتی خطبہ کے تحت اپنے خیالات پیش کئے۔ اس کی روداد انشاءاللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۰ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے سب اڈیٹر مسٹر مہاراج کرشن بھرت نے ۲ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا موضوع یہ تھا کہ "میں مسلمان کیوں ہوں"۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ گیتا کے دو حصے ہیں، ایک اس کی اخلاقی تعلیمات ہیں۔ اس اعتبار سے مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دوسرا حصہ تھیالوجی کا ہے۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ کیوں کہ اس میں وحدت وجود کی تعلیم ہے، جبکہ میں اسلام کے مطابق توحید کو مانتا ہوں۔

۱۱ نوبھارت ٹائمس (ہندی) کے رپورٹر مسٹر گلشن رائے کھتری نے ۳ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اقلیتوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان بہت سے مسائل سے دوچار ہیں۔ مگر یہ تمام مسائل خود مسلمانوں کے نااہل لیڈروں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جس دن مسلمان اپنے نااہل لیڈروں سے چھٹکارا پالیں گے اسی دن ان کے تمام مسائل بھی حل ہوجائیں گے۔

۱۲ پنچایت موومنٹ کے زیر اہتمام ۳ فروری ۱۹۹۵ کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک نیشنل سمینار ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر سمینار میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ خطاب کا خلاصہ یہ تھا کہ محض سسٹم کے بدلنے سے ہمارے حالات نہیں بدل سکتے۔ اصل مسئلہ لوگوں کا ذہن بدلنا ہے۔ اس کے لئے ماس ایجوکیشن کی ضرورت ہے۔ مسٹر جیٹھ ملانی، جنرل اروڑا، فادر گریگوریوز وغیرہ نے بھی تقریریں کیں۔

۱۳ مدراس کے اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ نے اسلام اور عدل اجتماعی (الرسالہ جنوری ۱۹۹۴) کو ٹمل زبان ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے اور بھی کچھ کتابیں ٹمل میں شائع ہوچکی ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۰ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۳

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 □ Annual Subscription Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

جہاد جہد صرف لفظی نہ ہو بلکہ گا) بڑے تو AK-47 ، AK-56
بالو ، Kla ، راکٹ ، دار مجنٹ ، میزائیل ، بم ، بارود ، تلوار سے بھی کام
جیسا کہ کشمیر ، چیچنیا ، افغانستان ، بوسنیا میں ، ہو رہا ہے ۔

رحمت کلچر

جہاد کے لفظی معنی جدوجہد کے ہیں۔ اسلام میں بامقصد کوشش ہے ، اسلام میں لڑکر مرجانا نہیں۔ اسلام آدمی کو ایک تعمیری مشن دیتا ہے۔ اور مشن کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں کا نتیجہ خیز استعمال کرے نہ کہ بے فائدہ طور پر لڑکر اپنا خاتمہ کرلے۔ مکہ میں پیغمبر اسلامؐ اپنے دشمنوں سے لڑکر شہید نہیں ہوگئے بلکہ آپ مکہ چھوڑکر مدینہ چلے گئے تاکہ اپنے ربانی مشن کو جاری رکھنے کا موقع پاسکیں۔

قرآن میں کہیں بھی مطلق طور پر یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ اللہ کے لیے لڑکر مرجاؤ۔ اس کے برعکس یہ فرمایا کہ اللہ کے لیے صبر کرو (ولربک فاصبر) قرآن میں پیغمبر اسلامؐ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے ، قرآن میں کہیں بھی آپ کو سیف اللہ علی العالمین (دنیا والوں کے اوپر اللہ کی تلوار) نہیں فرمایا گیا۔ قرآن میں الصلح خیر کی آیت نازل ہوئی ہے مگر قرآن میں الحرب خیر کے مضمون کی کوئی آیت موجود نہیں۔ قرآن میں ہے کہ انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب (صبر کرنے والے بے حساب اجر پائیں گے) مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ (انما یوفی المقاتلون اجرھم بغیر حساب (جنگ کرنے والے بے حساب اجر پائیں گے)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تتمنوا لقاء العدو واسئالوا اللہ العافیۃ (دشمن سے جنگی مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو ، تم اللہ سے عافیت مانگو) حدیث کے ذخیرہ میں آپ کا کوئی قول اس مضمون کا نہیں کہ علیکم ان تحبوا لقاء العدو واسئالوا اللہ القتال (تم کو چاہیے کہ دشمن سے مڈبھیڑ چاہو اور اللہ سے جنگ کی دعا کرو) مکہ کی مہم میں ایک مسلمان نے کہا کہ الیوم یوم الملحمۃ (آج گھمسان کا دن ہے) آپ نے فرمایا کہ نہیں ، الیوم یوم المرحمۃ (آج رحمت کا دن ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی کلچر رحمت کلچر ہے ، وہ گن کلچر نہیں۔ اسلام انسانوں کے درمیان ہر حال میں معتدل اور پُرامن تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے ، خواہ اس کے لیے فریق ثانی کی یک طرفہ شرطوں پر صلح کرلینا پڑے ، جیسا کہ حدیبیہ کے موقع پر کیا گیا۔ اہل ایمان کا کام نہ سر کاٹنا ہے اور نہ سر کٹوانا۔ اہل ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کے متواضع بندے بن کر رہیں۔ وہ برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کریں۔ وہ اعلیٰ اخلاق کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں معرفت حق کے چشمے جاری کریں۔ وہ خود بھی ربانی انسان بنیں اور دوسروں کو بھی ربانی انسان بنانے میں اپنی ساری طاقت لگادیں۔

آگ ٹھنڈی ہو گئی

جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے کانفرنس ہال میں ۸ فروری ۱۹۹۳ کو ایک سیمینار تھا۔ یہ سیمینار ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا : مذہب اور انسان دوستی۔ اس موقع پر جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں سے ایک ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے بھی تھے۔ ڈاکٹر پانڈے نے اپنی تقریر میں کچھ واقعات سنائے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ بالاگھاٹ (مدھیہ پردیش) میں ۱۹۲۶ میں ہندوؤں کا ایک جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کی قیادت سوامی ستیہ دیو کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بھڑکا کر شہر میں فرقہ وارانہ فساد کریں۔ یہ جلوس قصداً جمعہ کے دن نکالا گیا۔ تقریباً دس ہزار ہندو باجا بجاتے ہوئے اور نعرہ لگاتے ہوئے عین جمعہ کی نماز کے وقت مسجد کے سامنے پہنچے۔ اور وہاں ٹھہر کر شور وغل کرنے لگے۔

کرامت حسین صاحب شہر کے ایک معروف سیاسی کارکن تھے۔ ان کو پہلے سے مذکورہ منصوبہ کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سو ساتھیوں کو لے کر پہلے سے اس مسجد میں آگئے تھے۔ انھوں نے پیشگی طور پر اپنے ہر ساتھی کو پھولوں کا ایک ایک ہار دے دیا تھا۔ جب جلوس مسجد کے سامنے آکر ٹھہر گیا تو انھوں نے عام مسلمانوں سے کہا کہ آپ لوگ بالکل خاموش رہیں۔ اس کے بعد کرامت حسین صاحب سوچے سمجھے نقشہ کے مطابق، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسجد سے نکل کر سڑک پر آئے۔ ان لوگوں نے جلوس سے نہ روٹ بدلنے کی بات کی اور نہ نعرہ بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ جلوس کے سامنے آگئے اور ایک ایک ہندو کو ہار پہنانا شروع کیا۔ اس کے بعد پوری فضا بدل گئی۔ جلوس کے لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ ان کے نعرے اپنے آپ بند ہو گئے۔ جو لوگ مرنے مارنے کے ارادہ سے آئے تھے، وہ مسلمانوں سے گلے ملنے لگے۔ دشمنی کا ماحول اچانک دوستی کے ماحول میں تبدیل ہو گیا۔

ہر انسان انسان ہے۔ کوئی انسان جب کسی دوسرے انسان کا دشمن بنتا ہے تو وہ محض وقتی اشتعال کے تحت ہوتا ہے۔ اگر حکمت کے ساتھ اس وقتی آگ کو ٹھنڈا کر دیا جائے تو اس کے بعد انسان اپنی اصل فطرت پر لوٹ آئے گا۔ اور پھر وہی انسان آپ کا دوست بن جائے گا جو وقتی طور پر بظاہر آپ کا دشمن دکھائی دینے لگا تھا۔

برائی کی قسمیں

عن أبی أمامة، قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: یُطبَع المؤمنُ علی الخلال کلّها إلّا الخیانةَ والکذبَ۔

(رواہ احمد، والبیہقی فی شعب الایمان عن سعد بن ابی وقاص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن میں تمام خصلتیں پائی جا سکتی ہیں، سوا خیانت اور جھوٹ کے۔

انسانی غلطیوں کا سبب عام طور پر دو ہوتا ہے، ایک ہوس، اور دوسرے دنائت۔ ہوس کے تحت ہونے والی غلطی وہ ہے جو کوئی آدمی نفسانی جذبہ سے مغلوب ہو کر کر بیٹھتا ہے۔ دنائت کے تحت کی جانے والی غلطی وہ ہے جو کمینہ صفت ہونے کی بنا پر کسی شخص سے صادر ہوتی ہے۔

حدیث میں جو بات کہی گئی ہے اس کی وجہ یہی فرق ہے۔ کوئی شخص جب کسی دوسری اخلاقی برائی میں ملوث ہوتا ہے، مثلاً غصہ میں کوئی سخت کارروائی کرنا، تو اس کا سبب نفس کی کمزوری ہوتی ہے مخصوص حالات میں آدمی کے اوپر نفس کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وقتی مغلوبیت کے تحت وہ ایک غلط فعل کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ پھر جب نفسانی مغلوبیت ختم ہوتی ہے تو اس کے اوپر شدت سے ندامت کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرنے لگتا ہے کہ میں نے کیوں ایسا کیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مگر خیانت اور کذب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ برائی کی وہ قسم ہے جو کمینہ پن کی بنا پر آدمی سے صادر ہوتی ہے۔ اس کا ارتکاب وہ شخص کرتا ہے جس کی روح گندی ہو گئی ہو۔ اس کا سبب وقتی مغلوبیت نہیں، بلکہ شر پسندی کی مستقل خصلت کی بنا پر آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسا فعل وہ شخص کرتا ہے جس کی روح مسخ ہو گئی ہو۔ اسی لیے وہ خیانت اور جھوٹ جیسی برائی کا مرتکب ہونے کے باوجود مطمئن رہتا ہے۔ اس کو کسی قسم کی بے چینی لاحق نہیں ہوتی اور نہ توبہ اور ندامت کی کیفیت اس کے اندر پیدا ہوتی۔

جو برائی وقتی مغلوبیت کے تحت صادر ہو، اس کے متعلق امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا۔ لیکن جس برائی کا سبب روحانی گندگی ہو اس کے لیے معافی کا کوئی سوال نہیں۔

دین کے بارے میں بھی قرآن و حدیث کا مطالعہ کر لیا کریں۔

ایک تنبیہہ

قرآن میں ہے کہ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ ان کو دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن ان کو سخت عذاب میں ڈال دیا جائے۔ اور اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (البقرہ ۸۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں جب ایک ہی نوعیت کا دو حکم ہو تو خدا پرستوں کو چاہیے کہ وہ دونوں کو لیں۔ ایک ہی نوعیت کے دو حکم میں سے ایک کو لینا اور دوسرے کو نہ لینا تعمیل نہیں ہے بلکہ نافرمانی ہے۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے بھی زیادہ ہے۔ اب اگر کچھ لوگ کعبہ کا تو خوب احترام کریں مگر جب مومن سے معاملہ پڑے تو اس کے ساتھ وہ بے احترامی سے پیش آئیں، ایسے لوگ خدا کے نزدیک مجرم ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے ایک ہی نوعیت کے دو حکموں میں سے ایک حکم کو لیا اور اسی نوعیت کے دوسرے حکم کا انکار کر دیا۔

اسی طرح جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ مسجد پر غاصبانہ قبضہ کی برائی کو جانیں مگر ایک مسلمان کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کی برائی کو نہ جانیں۔ وہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی کو جرم سمجھیں مگر ایک مسلمان کے ساتھ گستاخی کو اپنے لیے جائز ٹھہرالیں۔ ایک غیر مسلم کوئی قومی بے عزتی کی بات کہہ دے تو اس پر بھڑک اٹھیں، لیکن ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بے عزت کرے تو اس کا غلط ہونا انھیں معلوم نہ ہو۔ ایسے تمام لوگ بلاشبہ مجرم ہیں۔ اللہ کے یہاں کوئی بھی چیز انھیں پکڑ سے بچانے والی نہیں۔

دائرۂ اختیار کے اعتبار سے احکام میں ضرور فرق رکھا گیا ہے۔ یعنی جو حکم دائرہ اختیار سے تعلق رکھتا ہے اس پر پکڑ ہے اور جو حکم دائرۂ اختیار سے باہر ہے اس کی پکڑ نہیں۔ مگر خود دائرۂ اختیار کے دو حکم میں سے ایک کو لینا اور دوسرے کو نہ لینا صرف گمراہی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں ہدایت کا راستہ نہیں۔ اس قسم کی دوعملی دنیا میں بھی رسوائی کا سبب ہے اور آخرت میں بھی رسوائی کا سبب۔

پیغمبرانہ اسلوب ۔ جدا مقطع ہے

پیغمبروں کی جو سیرت ہمارے علم میں آتی ہے اس کا ایک پہلو بڑا عجیب ہے ۔ ہر پیغمبر اپنی ابتدائی زندگی میں لوگوں کا محبوب بنا ہوا تھا مگر جب اس نے پیغمبری کا کام شروع کیا تو انہیں لوگوں کے درمیان وہ انتہائی مبغوض شخص بن گیا ۔ لوگ اس کے دشمن ہو گئے ۔ خود پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا ۔ پہلے آپ کی قوم آپ کو الامین کہتی تھی مگر جب آپ نے ان کو حق کا پیغام دینا شروع کیا تو وہ لوگ آپ کی ہلاکت کے درپے ہو گئے ۔

یہ ایک مسلم بات ہے کہ ہر پیغمبر اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مقام پر ہوتا ہے ۔ وہ لوگوں کا خیر خواہ ہوتا ہے ۔ وہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے ۔ وہ لوگوں کے درمیان بے ضرر بن کر رہتا ہے ۔ وہ لوگوں سے کسی چیز کی مانگ نہیں کرتا ۔ اس کا اخلاق اتنا اونچا ہوتا ہے کہ لوگوں کی برائی کا جواب بھی وہ بھلائی کے ساتھ دیتا ہے ۔ اس کا وجود سراپا نورانیت میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے اس کے باوجود جب وہ پیغام رسانی کا کام شروع کرتا ہے تو لوگ نفرت کرنے لگتے ہیں ۔

پیغمبر کے ساتھ یہ معاملہ معروف طور پر صرف "کافروں" کے درمیان نہیں ہوتا ، بلکہ ٹھیک یہی معاملہ خود "مسلمانوں" کے درمیان بھی پیش آتا ہے ۔ حضرت مسیح جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوئے وہ قدیم زمانہ کے مسلمان تھے ۔ مگر انہوں نے حضرت مسیح کے ساتھ بدترین سلوک کیا ۔ آپ کو ذلیل کیا ۔ آپ پر تھوکا ۔ آپ پر مشرکوں کی عدالت میں مقدمہ چلایا ۔ حتی کہ آپ کو قتل کر دینا چاہا ۔

پیغمبروں کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف لوگوں کے غصہ اور دشمنی کا سبب صرف ایک تھا ، اور وہ وہی چیز تھی جس کو موجودہ زمانہ میں تنقید کہا جاتا ہے ۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قوم شروع شروع میں دور نہیں ہوئی تھی ۔ مگر جب آپ نے ان کے معبودوں کا تذکرہ کیا اور ان پر عیب لگایا تو اس کو انہوں نے بہت برا مانا ۔ اسکے بعد وہ آپ کے دشمن ہو گئے ۔

ابن اسحاق نے جس چیز کو عیب لگانا کہا ہے اور جس کو مکہ کے مشرکین سب و شتم کہتے تھے ، وہ آجکل کی زبان میں تنقید تھی ۔ ہر نبی کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مطلوب کی طرف بلاتے ہوئے غیر مطلوب پر تنقید کرتا تھا ۔ یہی تنقیدی اسلوب تھا جس نے لوگوں کو پیغمبروں کا دشمن بنا دیا (۱/۲۷۶)

الرسالہ جون ۱۹۹۵

یا وہ خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے لگے ۔

دعوت اور کردار

غیر مسلم قوموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا مسلمانوں کا ایک لازمی فریضہ ہے۔ جس طرح عمل کے بغیر مومن کا مومن ہونا متحقق نہیں۔ اسی طرح دعوتی ذمہ داری کو ادا کیے بغیر امت کا امتِ محمدی ہونا متحقق نہیں۔ مگر اتنا اہم فریضہ پوری امت میں متروک ہوگیا ہے۔ حقیقی معنوں میں آج کہیں بھی دعوت کا کوئی وجود نہیں۔

اس ناقابل معافی غفلت کی وجہ ایک خود ساختہ مفروضہ ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں میں اسلامی کردار نہیں۔ اور جب مسلمان خود ہی اسلامی کردار سے خالی ہوں تو وہ موثر دعوتی کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔ مگر یہ عذر نظری اور عملی دونوں اعتبار سے بالکل بے بنیاد ہے۔

کوئی بھی آدمی کامل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کوئی آدمی کبھی بھی اپنے آپ کو کامل سمجھ سکتا ہے۔ اس بنا پر داعی کے لیے اگر یہ شرط لگادی جائے تو دعوت کا کام کبھی شروع ہی نہیں ہوگا۔ اسی لیے علماء نے متفقہ طور پر یہ کہا ہے کہ دعوت کے لیے کردار شرط نہیں ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/۸۵) حیاۃ الصحابہ ۳/۲۶۸

عملی اعتبار سے دیکھیے تو دعوت حق کی پوری تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔ تمام کے تمام پیغمبر یقینی طور پر کردار کے اعلیٰ مرتبہ پر تھے، مگر قرآن کے مطابق تمام پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا۔ کسی بھی پیغمبر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ اس کے کردار کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لانے کے لیے ٹوٹ پڑے ہوں (یٰس ۳۰)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی گواہی کے مطابق اخلاق کے انتہائی اعلیٰ مرتبہ پر تھے۔ نبوت سے پہلے ہی آپ کا کردار اتنا مسلّم ہو چکا تھا کہ لوگ آپ کو الامین کہنے لگے تھے۔ مکہ کے لوگوں نے نبوت سے پہلے چالیس سال تک آپ کی باکردار زندگی کو دیکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود مکہ میں آپ کی نہایت سخت مخالفت ہوئی۔ تھوڑے سے افراد کو چھوڑ کر، مکہ کے عام لوگ آپ پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

دوسری طرف مدینہ کے باشندوں نے آپ کا کردار نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ آپ کی بلند اخلاقی کا براہ راست تجربہ کیا تھا۔ اس کے باوجود ہجرت سے پہلے ہی وہاں گھر گھر میں اسلام پھیل گیا۔ مدینہ میں اسلام کی یہ غیر معمولی اشاعت صرف قرآن کے ذریعہ ہوئی۔ دور اول سے لے کر اب تک اسلام قبول کرنے والوں نے زیادہ تر اسلام کے اصولوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے نہ کہ مسلمانوں کے کردار سے متاثر ہو کر۔

ذرائع مواصلات

اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت وہ ہے جس کو ٹیلی فون کہا جاتا ہے۔ یہ حیرت ناک دریافت بولے ہوئے لفظوں کو برقی لہروں میں تبدیل کرتی ہے۔ ان لہروں کو نہایت تیز رفتاری کے ساتھ منزل پر پہنچا کر دوبارہ ان کو اتنی صحت کے ساتھ لفظوں میں تبدیل کرتی ہے کہ آپ صرف آواز سے پہچان لیتے ہیں کہ دوسری طرف کون بول رہا ہے:

This wondrous invention converts spoken words into electrical waves, transmits them along a line and reconverts them into sound so true that there is often no need to ask who is at the other end.

ٹیلی فون کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آپ کرۂ ارض کے کسی بھی حصہ میں رہتے ہوئے اس کے کسی بھی حصہ سے ربط قائم کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ انڈیا میں ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ امریکہ کے صدر مقیم واشنگٹن یا برطانیہ کی ملکہ مقیم لندن سے بات کریں تو آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے دفتر کے ٹیلی فون پر بالترتیب حسب ذیل نمبر دبائیں اور معاً بعد آپ کا ربط مذکورہ شخصیتوں کے دفتر سے قائم ہو جائے گا:

00-1-202-456-1414, 00-44-1-930-4832

پہلا ٹیلی فون ۴ اپریل ۱۸۷۷ کو مساچوسٹس میں چارلس ولیمس (Charles Williams) کے دفتر میں لگایا گیا تھا۔ آج ساری دنیا میں لوگوں کے گھروں اور دفتروں میں سیکڑوں ملین ٹیلی فون لگے ہوئے ہیں۔ جان بروکس (John Brooks) نے اپنی کتاب (Telephone: The First Hundred Years) میں لکھا تھا کہ انسان اپنی چیخ کو چند سو گز فاصلہ تک پہنچا سکتا تھا مگر ٹیلی فون کے ذریعہ وہ اپنی سرگوشی کو بھی ساری دنیا میں پہنچا دیتا ہے:

Man, instead of making himself heard a few hundred yards away with a shout, can make himself heard around the world with a whisper.

ٹیلی فون (اور دوسرے ذرائع مواصلات) اللہ تعالیٰ کی نعمت تھے۔ وہ اس لیے تھے کہ اس کو اللہ کے پیغام کی پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا جائے۔ مگر اس نعمت کو دوسرے مقاصد کے لیے تو خوب استعمال کیا گیا، مگر اللہ کے پیغام کو پھیلانے کے لیے اسے اب تک استعمال نہ کیا جا سکا۔ یہ کفرانِ نعمت کی کیسی عجیب مثال ہے۔

الرسالہ جون ۱۹۹۵ ۱۰

۸۲ سال بعد

سائنس آف لائٹ کے تحت فطرت کا ایک قانون دریافت کیا گیا ہے جس کو قانونِ انعطاف (law of refraction) کہا جاتا ہے۔ یہ قانون آج اسنل کے قانون (Snell's law) کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ ابتداءً اس کو ڈنمارک کے ڈبلو آر اسنل (Willebrord van Roijen Snell) نے دریافت کیا تھا۔ اسنل اس دریافت تک ۱۶۱۷ء میں پہنچ چکا تھا۔ مگر اس کی یہ دریافت غیر مطبوعہ حالت میں باقی رہی۔ یہاں تک کہ ڈچ سائنس داں ہیوجنس (Christian Huygens) کو اس کی خبر ہوئی اور اس نے ۱۷۰۳ میں اپنے ایک مقالہ میں اس کا ذکر کیا۔ اس کے بعد دنیا کو اسنل کی اس دریافت کا علم ہوا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسنل کی سائنسی دریافت ۸۲ سال تک پردۂ خفا میں پڑی رہی۔ لمبی مدت کے بعد جب ایک جوہر شناس نے اس کو پہچانا اور اس کو نمایاں کیا، اس کے بعد لوگ اس کی اہمیت سے واقف ہوئے۔

آخرت کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اللہ کے کتنے مخلص بندے ہیں جو لوگوں کی بھیڑ سے دور ایک نیکی کرتے ہیں جس کا علم انسانوں میں سے کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ کتنے لوگ ہیں جو خیر کے ایک کام میں حصہ لیتے ہیں مگر کسی اخبار میں وہ نمایاں نہیں کیا جاتا۔ کتنے اللہ سے ڈرنے والے ہیں جن کے سینہ میں خوفِ خدا کا بھونچال آتا ہے مگر ظاہر بیں آنکھیں اس کو دیکھ نہیں پاتیں۔ کتنے اللہ کے بندے ہیں جو صرف اللہ کے ڈر سے اپنی زبان کو روک لیتے ہیں جب کہ کسی بھی دوسرے انسان کو اس عمل کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ کتنے نیک نفس ہیں جن کو موقع ملا کہ وہ دوسروں کو اپنی انانیت کا شکار بنائیں مگر اللہ کی پکڑ کا اندیشہ ان کے ہاتھ اور پاؤں کی زنجیر بن گیا۔

اس طرح کے بہت سے سچے انسان ہیں جن کا عملِ خیر دنیا کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ ان کو نہ ان کے قریب کے لوگوں نے پہچانا اور نہ دور کے لوگوں نے۔ مگر یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ قیامت کے دن اللہ عالم الغیب تمام پردے ہٹا دے گا۔ اس کے بعد ہر چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے گی۔ یہ فیصلہ کا وہ دن ہوگا جب کہ کسی کا عمل چھپا نہیں رہے گا۔ کسی نے اگر ذرہ برابر بھی کوئی نیکی کی ہوگی تو وہ روشن سورج کی طرح نمایاں ہو جائے گی اور نیکی کرنے والے کو اس کا انعام مل کر رہے گا۔

الرسالہ جون ۱۹۹۵

تاریخی موڑ پر

امریکہ میں اٹھارویں صدی میں ایک جنگ پیش آئی جس کو وار آف انڈپنڈنس (۸۳-۱۷۷۵) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد امریکہ میں ایسے لیڈر ابھرے جنھوں نے جنگ کے بجائے امن کی حمایت کی۔ انھیں میں سے دوسرا امریکی صدر جان اڈمس ہے جس کو غیر سیاسی سیاست داں (nonpolitical politician) کہا جاتا ہے۔ ۱۷۸۳ میں پیرس معاہدہ کے تحت جب برطانیہ نے اس کو آزادی دے دی تو اس کے بعد امریکہ نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اب سارا زور تعلیم، سائنسی ریسرچ، انڈسٹری، سٹی پلاننگ اور نئی نسل کی کردار سازی پر دیا جانے لگا۔

یہی واقعہ جاپان میں بھی پیش آیا جس کو وہ لوگ عمل معکوس (reverse course) کا نام دیتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ تک جاپان عسکریت کے راستہ پر چل رہا تھا۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے تجربات کے بعد اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اب اس نے جنگ کے طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دیا۔ اس کے بجائے اس نے تعلیم کے میدان میں اپنی تمام توجہ موڑ دی۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کو اپنا نشانہ بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس سال میں تاریخ بدل گئی۔

عمل معکوس کا یہ مرحلہ ہر قوم کے لیے پیش آتا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا نہ کر سکیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امریکہ اور جاپان دونوں اس عمل معکوس کو اختیار کرنے کی مثال ہیں۔ دوسری طرف انڈیا ہے۔ آزادی کے بعد مہاتما گاندھی نے انڈیا کو اسی راستہ پر چلانا چاہا تھا۔ مگر انڈیا عمل معکوس کے اس رخ پر نہ چل سکا، اسی لیے اس کو ترقی بھی حاصل نہ ہو سکی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے بھی اب یہی وقت آگیا ہے۔ وہ لمبی مدت سے اغیار سے شاکی ہو کر ان کے ساتھ بے فائدہ مقابلہ آرائی کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ اس خارجی پالیسی کو ترک کر دیا جائے اور اس کے بجائے داخلی پالیسی اختیار کی جائے۔ یعنی اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرتے ہوئے خود اپنی تعمیر میں ساری توجہ لگا دی جائے۔ مسلمانوں کے مسائل کا یہی واحد حل ہے، اور اسی کو انھیں ہمہ تن اختیار کر لینا ہے۔

ایک اقتباس

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ذوالقعدہ ۱۴۱۳ھ ، مئی ۱۹۹۳) میں ایک مضمون بعنوان الاطفال قلبی شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں اسرائیل کے سابق وزیر جنگ موشے دایان (۱۹۸۱-۱۹۱۵) کا ایک تبصرہ اپنے حریف عربوں کے بارہ میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ عربی حوالہ میں اس طرح ہے :

"يميل العرب الى خداع انفسهم وخداع غيرهم، وهم يقومون بذلك عن غير عمد۔ فهم يميلون دائما الى التحدث عن امجاد الاجداد، عن صلاح الدين، عن معارك حطين واليرموك، وبينما يفعلون ذلك فاننا نبتسم لانهم يرون انفسهم فى مرآة امجاد الماضى، اما نحن فنراهم فى مرآة الحاضر، ليتهم يسألون انفسهم لماذا يتحدثون دائما عن عظماء ماضيهم ولا يجدون فى حاضرهم احدا من العظماء يتحدثون عنه ؟"

عرب اپنے آپ کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اور ایسا وہ کسی قصد و ارادہ کے بغیر کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے اجداد کی بڑائی کا چرچا کرتے ہیں صلاح الدین کا اور حطین اور یرموک کے معرکوں کا۔ اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو ہم ان پر ہنس پڑتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو ماضی کی بڑائی کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور ہم ان کو حال کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ کاش وہ اپنے آپ سے پوچھتے کہ کیوں وہ ہمیشہ اپنے ماضی کے بڑوں کی بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے حال میں کوئی بڑا نہیں پاتے جس کی وہ بات کریں (صفحہ ۳)

یہ معاملہ صرف عربوں کا نہیں، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ آج ہر جگہ کے مسلمان اپنے گزرے ہوئے بڑوں کے تذکرہ پر جی رہے ہیں۔ حالانکہ گزرے ہوئے سورماؤں کے تذکرہ میں جینا اپنے لیے افیون ہے اور اغیار کے لیے مضحکہ کا ایک سامان۔

صحیح اور مفید بات یہ ہے کہ خود اپنا احتساب کیا جائے۔ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معلوم کرکے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ پچھلے بڑوں کا چرچا کر کے خوش ہونا آدمی کو صرف جھوٹے بھرم میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ صرف وقت کا ضیاع ہے نہ کہ وقت کا کوئی استعمال۔

موسٹے دایان کا یہ جملہ بہت بامعنی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اپنی ماضی کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور ہم ان کو ان کے حال کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ اسی بات کو ایک مغربی مبصر نے اس طرح بیان کیا کہ مسلمانوں کا کیس موجودہ زمانہ میں پیرانوئیا (paranoia) کا کیس بن گیا ہے۔

پیرانوئک کیرکٹر وہ ہے جو پدرم سلطان بود کی نفسیات میں جینے لگے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے بارہ میں فخر میں بتلا رہتے ہیں۔ مگر دوسرے لوگوں سے انھیں اس کے خلاف تجربہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگ ان کو ان کے حال کے مطابق دیکھتے ہیں اور ان کے حال کے اعتبار سے ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ نفرت اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگ ہماری حیثیت کے مطابق ہمارا اعتراف نہیں کر رہے ہیں۔

گزرے ہوئے لوگوں کی بڑائی میں جینا، اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف ہلاکت ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس میں بیک وقت دو بڑے نقصانات چھپے ہوئے ہیں۔

ایک یہ ہے کہ جو لوگ اس نفسیات میں بتلا ہوں وہ خود فکری اور خود عملی کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ ان کی سوچ پچھلوں کی سوچ کے دائرہ میں چلتی ہے۔ وہ پچھلے لوگوں کے کارناموں کا مبالغہ آمیز تذکرہ کرنے کو عمل کا قائم مقام سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی خود عمل کرنیوالے نہیں بن سکتے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ دوسرے لوگ جن کے درمیان انھیں جینا ہے، ان کے بارہ میں وہ نہایت خلاف واقعہ رائے قائم کر لیتے ہیں۔ یہ دوسرے لوگ چونکہ انھیں ان کے حال کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ انھیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسروں کا یہ رویہ اگرچہ تمام تر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن بزرگوں کے قصوں میں جینے والے لوگ اس کو اپنے سے کم تر سمجھ لیتے ہیں، اس لیے وہ خلاف واقعہ طور پر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ سب کے سب ان کے دشمن ہیں۔

ایسے لوگ یا تو عمل نہیں کرتے۔ یا اگر وہ عمل کرتے ہیں تو ان کی منصوبہ بندی ہمیشہ اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ سب کے سب ان کے حق میں ظالم اور متعصب ہیں۔ ایسی منصوبہ بندی مبنی بر حقائق نہیں ہوتی، اور جو منصوبہ بندی مبنی بر حقائق نہ ہو، اس کے لیے خدا کی اس محکم دنیا میں کامیاب ہونا بھی مقدر نہیں۔

رسک لیجئے

والٹر رسٹن نے کہا کہ ناکام ہو جانا کوئی جرم نہیں۔ اصل ناکامی یہ ہے کہ آدمی ناکامی سے سبق لینے میں ناکام رہے۔ جم برک جب جانسن اینڈ جانسن کے تجارتی ادارہ میں ایک نئے شعبہ کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا تو اس کے ابتدائی منصوبوں میں سے ایک یہ تھا کہ بچوں کے سینہ کی مالش تیار کرے۔

اس کا تیار کیا ہوا سامان بری طرح ناکام ہو گیا۔ برک کا خیال تھا کہ اس کو ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔ جب اس کو بورڈ کے چیرمین سے ملاقات کے لیے بلایا گیا تو یہ ملاقات اس کے لیے ایک اچنبھے کی ملاقات بن گئی۔ کیا تم ہی وہ شخص ہو جس نے ہمیں اتنی بڑی رقم کا نقصان پہنچایا ہے۔ چیرمین رابرٹ وڈ جانسن نے اس سے سوال کیا۔ اور اس کے بعد کہا۔ بہت اچھا، میں تم کو صرف مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم غلطیاں کر رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم رسک لے رہے ہو، اور ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک تم رسک نہ لو:

Walter Wriston, former chairman of Citicorp, said, "Failure is not a crime. Failure to learn from failure is." When Jim Burke became the head of a new products division at Johnson & Johnson, one of his first projects was the development of a children's chest rub. The product failed miserably, and Burke expected that he would be fired. When he was called in to see the chairman of the board, however, he met a surprising reception. "Are you the one who just cost us all that money?" asked Robert Wood Johnson. "Well, I just want to congratulate you. If you are making mistakes, that means you are taking risks, and we won't grow unless you take risks."

موجودہ دنیا جن قوانین کی بنیاد پر چل رہی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کام کی کامیابی کے لیے جن عوامل کی موافقت درکار ہے وہ پیشگی طور پر کسی کو معلوم نہیں رہتے۔ ایسی حالت میں کسی اقدام کی واحد ممکن صورت یہ ہے کہ آئندہ پیش آنے والی باتوں کے بارہ میں بے خبری کے باوجود اقدام کیا جائے۔ اسی کا نام رسک ہے۔

رسک لینے میں بلاشبہ اندیشے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں رسک لیے بغیر کوئی کام بھی نہیں کیا جا سکتا، اگر رسک نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

صبر کا کرشمہ

۲۴ جولائی ۱۹۹۲ کو میں نے جمعہ کی نماز دہلی کی مسجد سنگ تراشان (پہاڑ گنج) میں پڑھی۔ اس مسجد کے چاروں طرف صد فی صد ہندوؤں کی آبادی ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہ مسجد بند ہو گئی تھی۔ یہاں محلہ کے لوگ کوڑا ڈالا کرتے تھے۔ ۱۹۸۲ میں دہلی کے ایک مسلمان جناب محمود سعید بلالی (پیدائش ۱۹۵۴) کو خیال ہوا کہ اس مسجد کو واگزار کیا جائے۔

انھوں نے کوشش کر کے اس مسجد کو کھلوایا۔ اس کی صفائی اور مرمت کرائی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کو آباد کس طرح کیا جائے، کیوں کہ یہاں قریب میں کوئی مسلمان نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک استاد رکھ کر یہاں ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ دو درجن مسلمان بچے یہاں رہنے اور پڑھنے لگے۔ اس طرح یہاں پنج وقتہ نماز قائم ہو گئی۔

محمود سعید بلالی صاحب (Tel. 3260028) نے اپنے واقف کاروں کے حلقہ میں اس مسجد کے بارہ میں بتایا تو جمعہ کے دن کافی لوگ یہاں آنے لگے۔ یہاں تک کہ مسجد نمازیوں سے بھر جاتی تھی۔ بلالی صاحب نے طلبہ اور نمازیوں کی سہولت کے لیے یہ منصوبہ بنایا کہ صحن کے نصف حصہ میں چھت ڈال کر ایک سائبان بنا دیا جائے۔ انھوں نے کام شروع کرا دیا۔ سانچہ بن گیا اور اس پر چھت کی تعمیر کی جانے لگی۔

یہ ۹ مارچ ۱۹۹۱ کا واقعہ ہے۔ اچانک تقریباً ڈیڑھ سو ہندو جمع ہو گئے جن میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چھت بننے نہیں دیں گے۔ تم اس چھت کو اتارو، ورنہ یہاں خون ہو جائے گا اور تمہاری مسجد بھی باقی نہیں رہے گی۔ ایک طالب علم نے پولس اسٹیشن جا کر انھیں خبر کر دی۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں پولس آگئی۔ ان میں پولیس افسران بھی تھے۔ پولیس نے موقع کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ یہ تعمیر قانون کے دائرہ میں ہو رہی ہے، اس لیے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ پولیس نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ چھت بناؤ، ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔

محمود سعید بلالی نے سوچا کہ اگر میں پولیس کے کہنے سے چھت کا کام جاری رکھوں تو یہ پولیس والے یہاں کب تک میری حفاظت کریں گے، آخر کار تو سابقہ انھیں پڑوس کے ہندوؤں سے رہے گا۔

اور وہ چھت تو کیا، مسجد بھی توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور کوئی انھیں روک نہ سکے گا۔ بلالی صاحب انھیں خیالات میں تھے کہ ہندو مجمع میں سے ایک بوڑھا آدمی آگے آیا۔ اس نے کہا کہ میاں جی، اس وقت یہ لوگ بہت جوش میں ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تم ضد نہ کرو اور اپنی چھت اتار دو۔

بلالی صاحب نے فوراً اس کو استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑے میاں جس طرح تمہارے بڑے ہیں اسی طرح وہ میرے بھی بڑے ہیں۔ میں ان کی بات مانتا ہوں۔ اور اسی وقت اپنے مزدوروں سے کہہ دیا کہ چھت اتار دو چنانچہ چھت اتار دی گئی۔ اس وقت تک اس چھت پر ۲۵ ہزار روپے خرچ ہو چکے تھے۔

اس واقعہ کا علاقہ کے تمام ہندوؤں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ سب کے سب مسجد اور مسجد والوں کے ہمدرد بن گئے۔ اب یہاں لاؤڈ اسپیکر کی اذان کے ساتھ پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔ باقاعدہ جمعہ ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیم کا ایک مدرسہ چل رہا ہے۔ رمضان میں شاندار تراویح ہوتی ہے۔ وغیرہ۔ مگر ہندوؤں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، وہ لوگ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ آپ کی کوئی ضرورت ہو تو ہم کو بتائیے۔ اگر کوئی ہندو آپ کو پریشان کرے تو فوراً ہم کو بتائیے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب یہ خبر پھیلی کہ اجودھیا کی بابری مسجد توڑ دی گئی۔ ساری دہلی میں تناؤ کی صورت پیدا ہو گئی۔ کئی جگہ ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے۔ اس علاقہ میں بھی تناؤ کی حالت تھی جبکہ اس وقت مسجد میں ۲۳ مسلم بچے موجود تھے۔

محمود سعید بلالی صاحب اس وقت جامع مسجد کے علاقہ میں تھے اور کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ مگر پڑوس کے ہندو ان کا بدل بن گئے۔ وہ خود مسجد میں آئے۔ بچوں کو لے جا کر ایک قریبی اسکول میں رکھا۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اور پھر تمام بچوں کو حفاظت کے ساتھ ان کے گھروں تک پہنچایا۔

بلالی صاحب اگر ضد کرتے اور اکڑ دکھاتے تو دوسری طرف بھی ضد اور اکڑ پیدا ہوتی۔ اور پھر فساد برپا ہو جاتا۔ مگر جب انھوں نے نرمی اور تواضع کا انداز اختیار کیا تو دوسری جانب بھی نرمی اور تواضع پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد فساد کا ماحول امن کے ماحول میں تبدیل ہو گیا۔

اصل کمزوری

ایک صاحب نے اپنا ایک ذاتی واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے : غالباً ۱۹۸۲ کی بات ہے ، حاجیوں کا جہاز "اکبر" حج کے بعد حاجیوں کا پہلا قافلہ لے کر بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ میں گودی پر گیا اور حج سے واپس آنے والے ایک ممتاز عالم دین سے لپٹ کر معانقہ کیا۔ پھر ان کے رفیق سفر کی بابت ان سے پوچھا تو حضرت مولانا نے بے رخی کے ساتھ جواب دیا : مجھے کیا معلوم کہاں ہیں ، جہنم میں ہوں گے۔

پھر حاجیوں کی بھیڑ میں مذکورہ رفیق سفر کو بھی تلاش کر لیا جو ایک بڑے تاجر تھے۔ میں نے سلام ومصافحہ کے بعد ان سے پوچھا کہ مولانا کہاں ہیں۔ انھوں نے غصہ میں جواب دیا : میں کیا جانوں، جہنم میں ہوں گے۔ جب یہ سب لوگ آکر صابوصدیق مسافر خانہ میں ٹھہرے تو الگ الگ دونوں سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا کہ سفر میں سامان اٹھانے اور لے جانے پر آپس میں تکرار شروع ہوئی۔ اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں نے ایک دوسرے کو جہنم تک پہنچا دیا۔ (مولانا مختار احمد ندوی، البلاغ ، جون ۱۹۹۳)

بظاہر یہ ایک انوکھا واقعہ ہے۔ مگر میرے تجربہ کے مطابق ، یہی موجودہ مسلمانوں کی عام حالت ہے۔ آج کل کے مسلمان کسی کے ساتھ صرف اس وقت تک اچھے ہیں جب تک کہ اس سے اختلاف نہ پیش آیا ہو۔ اختلاف پیش آتے ہی فی الفور دونوں ایک دوسرے کو ، کم از کم اپنی حد تک ، جہنم رسید کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ مذکورہ قسم کے الفاظ بولیں یا اس سے مختلف کچھ اور الفاظ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ آخری حد تک بے برداشت ہو گئے ہیں، مسلم اور مسلم معاملات میں بھی ، اور ہندو اور مسلم معاملات میں بھی۔ وہ فرقہ وارانہ فسادات جن کی ذمہ داری ہم سرکاری انتظامیہ یا فرقہ پرست جماعتوں پر ڈال کر ہمیشہ مطمئن ہو جاتے ہیں، ان سب کا اصل سبب ہمیشہ مسلمانوں کی بے صبری ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں اگر صبر کی صفت آجائے تو فرقہ وارانہ فسادات کی جڑ کٹ جائے اور باہمی اختلافات کا بھی ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ یہی معاملہ دوسرے تمام مسائل کا بھی ہے۔ یہ بے صبری کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں اور دوبارہ صبر ہی کے ذریعہ انھیں حل کیا جا سکتا ہے۔

مولانا وحید الدین صاحب [illegible]

تباہی کا آغاز

ایوری پیڈیز (Euripides) قدیم ایتھنز کا مشہور المیہ نگار شاعر ہے۔ وہ ۴۸۴ ق م میں پیدا ہوا، اور کم عمری میں ۴۰۶ ق م میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ خدا جس کو تباہ کرنا چاہتا ہے، سب سے پہلے اس کو دیوانہ بنا دیتا ہے :

Whom God wishes to destroy, he first makes mad.

یہ بات نہایت درست ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی شخص یا قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بگڑ جاتی ہے، اور جب سوچنے کی صلاحیت بگڑتی ہے تو اس کے اقدامات بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ غلط اقدامات کرنے لگیں ان کو پھر کوئی چیز تباہی سے نہیں بچا سکتی۔

سوچ سمجھ کا بگڑنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی عقل کی روشنی میں رائے قائم کرنے کے بجائے جذبات کے تحت رائے قائم کرنے لگے۔ وہ اپنی زندگی کا منصوبہ حقائق کی رعایت کرتے ہوئے نہ بنائے بلکہ اپنی آرزوؤں کے زیر اثر بنائے۔ وہ گرد و پیش کے دوسرے لوگوں سے بے خبر ہو جائے اور صرف اپنے آپ میں جینا شروع کر دے۔ وہ تاریخی قوتوں اور مادی اسباب کو نظر انداز کر دے اور محض اپنی خوش خیالیوں کی دنیا میں اپنا محل بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔

یہ دنیا حقائق اور اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں ایک انسان اور دوسرے انسان، اور اسی طرح ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان مقابلہ جاری ہے۔ یہاں برتر ذہن اور برتر لیاقت کا ثبوت دینے کے بعد ہی کسی کو جینے کا حق ملتا ہے۔ یہاں وہی لوگ سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی عقل کو سب سے زیادہ استعمال کریں، جو اپنی عقل سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

کوئی شخص لمبے عرصہ تک عیش و آرام میں رہے تو اس کی عقل مفلوج ہو جاتی ہے۔ کوئی قوم بہت دنوں حاکم بنی رہے تو اس کے بعد اس کی عقلی قوتیں جامد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وقت افراد اور قوموں کے لیے عقلی زوال کا ہوتا ہے، اور عقلی زوال آخر کار عملی زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی عقلی قوتوں کو دوبارہ جگایا جائے تاکہ اس کی روشنی میں وہ اپنا سفر طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔

مواقع کی بربادی

ہندستان کا بٹوارہ دو قومی بنیاد پر ہوا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر پاکستان میں مسلم اکثریت کو غلبہ حاصل ہوا اور وہاں اکثریتی اصول (majorityism) کا غلبہ عمل میں آیا۔ مگر ہندستانی لیڈروں گاندھی اور نہرو وغیرہ نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ انھوں نے منقسم انڈیا میں سیکولرزم کا نظام قائم کیا۔

پاکستان میں اکثریتی نظام کے قیام کے نتیجہ میں وہاں کی ہندو اقلیت کے لیے مسائل پیدا ہوئے مثلاً اپنی امتیازی شناخت کے ساتھ وہاں رہنا ان کے لیے ناممکن ہوگیا۔ مگر پاکستانی ہندوؤں نے ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر غیر نمایاں (inconspicous) بنالیا۔ انھوں نے اپنی ہندویت کو اپنے گھروں تک محدود کر لیا اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم اور تجارت کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ اس طرح وہ ۴۰ سال تک خاموش عمل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اب پاکستان میں ان کے تمام معاملات درست ہو چکے ہیں۔ اب وہاں کا اکثریتی نظام ان کے لیے کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔

اس معاملہ میں انڈیا کی تصویر بالکل مختلف ہے۔ یہاں سیکولر نظام نے مسلمانوں کو وہ مواقع دیے جو ہندوؤں کو پاکستان میں نہیں ملے تھے۔ پاکستان میں اکثریتی نظام کے تحت ہندو وہاں کے قومی دھارے سے جدا کر دیے گئے تھے۔ جب کہ انڈیا میں سیکولر نظام کے تحت مسلمانوں کو یہ موقع مل رہا تھا کہ وہ برابر کے حصہ دار کی طرح یہاں کی قومی زندگی میں شریک ہو سکیں۔

مگر مسلمانوں کے نااہل رہنما اس عمل میں رکاوٹ بن گئے۔ انڈیا میں سیکولر نظام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہاں کوئی آئیڈیل نظام قائم ہو گیا ہے۔ یہ سیکولر نظام اسی دار الامتحان میں قائم ہوا تھا جہاں مختلف اسباب سے ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ موافق پہلوؤں کے ساتھ کچھ ناموافق پہلو بھی ضرور موجود رہیں۔ یہاں مسلمانوں کے رہنماؤں نے نہایت نادان کردار ادا کیا۔ وہ موافق پہلوؤں کو چھوڑ کر صرف ناموافق پہلوؤں کو ان کے سامنے نمایاں کرتے رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انڈیا کے مسلمان مستقل طور پر جھنجلاہٹ اور مایوسی کا شکار رہے۔ اور تقریباً پچاس سال کی مدت ضائع ہو گئی۔ مسلمان جس طرح باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں، اگر وہ اسی طرح انڈیا میں رہتے تو اب تک ان کے تمام مسائل اضافہ کے ساتھ حل ہو چکے ہوتے۔

خدا کا قانون

یہ ایک دکان دار کا قصہ ہے۔ اس کے یہاں گھی کا کاروبار تھا۔ پہلے وہ ایک معمولی خوردہ فروش تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا کاروبار بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ گھی کا ہول سیل بیوپاری بن گیا۔ اس کے یہاں ایک منیم جی (اکاؤنٹنٹ) تھے جو شروع سے ان کے یہاں کام کر رہے تھے۔

منیم جی کا دوپہر کا کھانا روزانہ ان کے گھر سے آیا کرتا تھا۔ ان کا لڑکا روزانہ ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا۔ یہ ٹفن کیریر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ لوگ مذاق میں منیم جی سے کہا کرتے تھے کہ تم اکیلے کھانے والے ہو اور روزانہ دس آدمی کا کھانا گھر سے منگاتے ہو۔ یہ معمول برسوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز ایسا ہوا کہ ان کا لڑکا کھانے کے بعد ٹفن کیریر لے کر واپس جا رہا تھا کہ وہ دکان کی سیڑھی پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ٹفن کیریر بھی گر گیا۔ اور سارے ڈبے کھل گئے۔ معلوم ہوا کہ ان تمام ڈبوں میں گھی بھرا ہوا تھا۔

دکان دار نے یہ منظر دیکھ لیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ منیم جی اتنے بڑے ٹفن کیریر میں کھانا کیوں منگاتے تھے۔ اس کے بعد وہ منیم جی کو لے کر اندر گودام کے کمرے میں گیا۔ اس نے منیم جی سے کہا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ کتنے زیادہ کنستر یہاں میرے گودام میں بھرے ہوئے ہیں۔ تمہارے ساتھ میرا تعلق شروع سے رہا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ۱۵ سال پہلے جب میں نے یہ کاروبار شروع کیا تو میرے پاس پونجی کم تھی۔ میں گھی کا صرف ایک کنستر لا کر اس کو پھٹکر میں بیچتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے میرا کاروبار بڑھا۔ یہاں تک کہ آج میں شہر کا ایک بڑا ہول سیل ڈیلر ہوں۔ اب تم اپنی حالت کا اور میری حالت کا مقابلہ کرو۔ تم برسہا برس سے روزانہ اپنے ٹفن کیریر میں گھی بھر کر یہاں سے لے جا رہے ہو، مگر حال یہ ہے کہ تمہاری جو حالت پہلے تھی وہی حالت آج بھی ہے۔ اور اسی مدت میں مجھ کو خدا نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو کہ لٹنے والا فائدہ میں ہے یا لوٹنے والا۔

دنیا کو بنانے والے نے اس دنیا کو جس ڈھنگ سے بنایا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صرف جائز کمائی کرنے والا ترقی کرے۔ ناجائز کمائی کرنے والا یہاں تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔

رشی کیش کا سفر

ماسکو میں ایک عالمی ادارہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کلچر کے ذریعہ لوگوں کے درمیان امن واتحاد پیدا کیا جائے۔ اس روسی ادارہ کی اسپانسر شپ میں ہندستان کے مشہور مذہبی مقام رشی کیش میں ایک بین اقوامی عالمی کانگرس روحانی اتحاد کے لیے ہوئی۔ اس کا عنوان یہ تھا :

The World Congress of spiritual concord

اس کانگرس کی دعوت پر رشی کیش کا سفر ہوا۔ اور وہاں مختلف پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔

۵ دسمبر ۱۹۹۴ کو صبح ۹ بجے مسٹر ورگھیز (S. Raphael Verghese) کے ساتھ گھر سے روانگی ہوئی۔ نئی دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر صفائی محکمہ کی طرف سے ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ——— آپ کا کوڑا آپ کی ذمہ داری :

Your dirt, your responsibility

میں نے سوچا کہ یہی زندگی کا عام اصول ہے۔ ہر آدمی اپنی سرگرمیوں کے درمیان کچھ "کوڑا" پیدا کرتا ہے۔ قدرت کا قانون ہے کہ وہ اس کی صفائی کو خود اپنی ذمہ داری سمجھے۔ صاف ستھری دنیا بنانے کے لیے اس کے سوا دوسری کوئی بھی ممکن تدبیر نہیں۔

گھر سے بذریعہ کار چل کر پہلے رشین سنٹر آف سائنس اینڈ کلچر پہنچے۔ یہاں دوسرے ساتھیوں کی آمد کے انتظار میں ٹھہرنا تھا۔ اس سنٹر میں ایک بار میں اس وقت آیا تھا جب کہ سوویت یونین ابھی قائم تھا۔ اب آج دوسری بار آنا ہوا جب کہ سوویت یونین ٹوٹ چکا ہے۔ پہلے یہاں زبردست سرگرمی اور چہل پہل نظر آتی تھی۔ سنٹر کی عظیم بلڈنگ اور اس کا وسیع لان بدستور اسی طرح موجود تھا۔ مگر اب یہاں سناٹے کا منظر دکھائی دیا۔ ریسپشن میں ایک مرد اور ایک عورت بالکل خالی اور غیر مصروف حالت میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے ان کے لیے یہاں کوئی کام نہیں۔

بلڈنگ تو پیسہ کے ذریعہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر زندگی کی سرگرمیوں کے لیے تخلیقی انسان درکار ہیں۔ اگر تخلیقی انسان نہ ہوں تو بڑی بڑی بلڈنگیں ہوں گی مگر وہاں موت جیسا سناٹا چھایا ہوا ہوگا۔

یہی آج مسلم دنیا میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ پٹرول کے ظہور کے بعد مسلم دنیا میں پیسہ کی افراط ہو گئی

ہے۔ اس بنا پر آج ہر جگہ اسلام کے نام پر عالی شان بلڈنگیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ مگر اندر جاکر دیکھئے تو بڑی بڑی بلڈنگوں میں کوئی بڑا کام نظر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ کام کرنے کے لیے قابل کار انسانوں کی ضرورت ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں یہ حال ہے کہ تمام قابل کار مسلمان یورپ اور امریکہ کے غیر مسلم اداروں میں جا جاکر بیٹھ گئے ہیں۔ اسلامی اداروں کو صرف کم تر صلاحیت کے افراد ہاتھ آتے ہیں اور کمتر صلاحیت کے لوگ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔

دہلی سے تین بس کی صورت میں ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ بس میں ہر آدمی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ ایک خاتون نے دوسری خاتون سے کہا "سب لوگ کہہ رہے ہیں وہاں تو بہت اچھا مارکیٹ ہے"۔ ایک صاحب اس قانونی سوال پر بات کر رہے تھے کہ انڈیا کے نظام میں پریسیڈنٹ کا اختیار کیا ہے اور پرائم منسٹر کا اختیار کیا۔ تیسرے صاحب اپنے ساتھی سے ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین کے فائدہ اور نقصان پر بحث چھیڑے ہوئے تھے۔ ایک خاتون نے کہا : مجھ کو یہ ناول راستہ میں ختم کر لینا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ سارے لوگ رشی کیش جارہے ہیں تاکہ وہاں "روحانی اتحاد" کی کانگرس میں شرکت کریں۔ وہاں ہر عورت اور مرد کسی نہ کسی طور پر اپنا حصہ ادا کرے گا۔ مگر یہ سب کچھ غالباً پروفیشنل انداز میں ہوگا۔ لوگ عملاً مادیات میں جی رہے ہیں، مگر رسمی طور پر چند دن کے لیے جمع ہو کر وہ روحانی عمل انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کسی انسانی مجموعہ میں حقیقی روحانی انقلاب نہیں آسکتا۔ روحانیت پر اجتماعی کانگرس میں شرکت سے پہلے ہمیں انفرادی سطح پر روحانیت میں جینا ہوگا، اس کے بعد ہی روحانیت کا ماحول دنیا میں آسکتا ہے۔

اس قافلہ میں میرے سوا تقریباً سب کے سب غیر مسلم تھے۔ بیشتر لوگ بیرونی ملکوں کے تھے اور انگریزی بولنے والے تھے۔ ان کا ذوق، ان کا طرز فکر، ان کا ذہنی سانچہ سب کچھ مسلمانوں سے بالکل مختلف تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے علماء اور دانشور صرف مسلمانوں کے درمیان سرگرم رہتے ہیں۔ ان کا تعلق غیر مسلموں سے تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ یہی صورت حال ساری دنیا میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مسلم عالم یا مسلم دانشور اپنی موجودہ لیاقت کے ساتھ اس قابل ہی نہیں کہ وہ غیر مسلموں میں ان کے ذہنی درجہ کے مطابق ان سے بات کر سکے۔ یہ حضرات اگر غیر مسلموں میں آئیں تو وہ اپنے آپ کو تقریباً "گونگا" محسوس کریں گے۔

آج (۵ دسمبر) کے ہندستان ٹائمس میں میرا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا تھا۔ سفر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے اس کو پڑھا تھا۔ چنانچہ اپنے آپ وہ زیر بحث آگیا۔

اس سلسلہ میں ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ اسلام کا اصل کنسرن (concern) پاور نہیں ہے بلکہ فریڈم ہے۔ پولیٹکل ہیڈ خواہ مسٹر اے ہوں یا مسٹر بی، اگر مسلمان کو قول و عمل کی آزادی حاصل ہے تو بس یہ اہل اسلام کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔

پولیٹکل ہیڈ کا تعلق حقیقۃً انتظام یا بندوبست سے ہے۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر اور اسی طرح ہر شعبۂ حیات میں انتظامی بندوبست کے لیے کسی ایک کو ہیڈ بنانا پڑتا ہے۔ یہ ہیڈ ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ہر آدمی ہیڈ بننا چاہے تو لا متناہی جھگڑا اور ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔ اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ حالات جس کو پولیٹکل ہیڈ کا درجہ دے دیں بقیہ لوگ اس کو مان کر اپنے اپنے دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر میں لگ جائیں۔

میں نے کہا کہ تمام مسلم فقہاء اور مسلم علماء اس پر متفق ہیں کہ کسی مسلم حکمراں کا اقتدار جب عملاً قائم ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ حکمراں کو ہٹانے کی کوشش میں مزید خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کی توسیع کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ اسی طرح جب ایک غیر مسلم حکمراں کی حکومت قائم ہو جائے تو اس وقت تک اس کے خلاف بغاوت نہیں کی جائے گی جب تک وہ لوگوں کو قول اور عمل کی آزادی دے رہا ہو۔

دہلی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم یوپی کے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں طرف مختلف مناظر ایک کے بعد ایک گزر رہے تھے۔ دکانیں، مکانات، کارخانے، کھیت، باغات، یہ سب گویا انسانی سرگرمیاں تھیں جو مختلف صورتوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا تو بظاہر مختلف سرگرمیوں کے درمیان ایک ہی داعیہ کام کر رہا تھا، اور وہ اقتصادی انٹرسٹ کا داعیہ تھا۔ ہر آدمی اپنے اقتصادی مفاد میں لگا ہوا تھا، ہر آدمی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اپنی معاشی ضروریات کے لیے دوڑ رہا تھا۔

آج کی دنیا میں لوگ اپنے معاملات میں اتنے زیادہ مصروف ہیں کہ ان کو دنیا کے بارہ میں خود سے معلوم کرنے کا کوئی وقت نہیں۔ لوگ دنیا کے بارہ میں صرف اخباروں کے ذریعہ معلومات

حاصل کرتے ہیں۔ اور اخبارات کا یہ حال ہے کہ ان کو صرف "ہاٹ نیوز" سے دلچسپی ہے۔ انھیں سماج میں پیش آنے والے ہزاروں مثبت واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ کوئی ایک منفی واقعہ پیش آجائے تو اس کو وہ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح آج کا آدمی خود اپنے سماج کے بارہ میں بہت ناقص واقفیت حاصل کر پاتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا بڑا سبب یہی ہے۔ ہندوؤں کو اپنے اخباروں میں اکثر وہی مسلم خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں جو ہاٹ نیوز کے قبیل کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے اخبارات بھی ان کو ہندوؤں کے بارہ میں صرف وہی خبریں بتاتے ہیں جن کو لال رنگ کی خون آلود سرخیوں میں چھاپا جاسکتا ہو۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا میں زرد صحافت پائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ زرد صحافت نہیں بلکہ یہ مجرمانہ صحافت ہے اور اسی صحافت نے دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات کو غیر معتدل بنا رکھا ہے۔

راستہ میں چار ندیاں تھیں جن کے اوپر سے پل کے ذریعہ ہماری بس گزری۔ ندی گویا قدرتی واٹر سپلائی کا نظام ہے جو نامعلوم مدت سے جاری ہے۔ یہ واٹر سپلائی ایک آفاقی نظام کے تحت ممکن ہوتی ہے۔ بارش کے موسم میں جب بارش ہوتی ہے تو وہ وقتی طور پر ندیوں کو بھر دیتی ہے۔ مگر وہ پورے سال کی واٹر سپلائی کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ قدرت کے نظام کے تحت پانی کا ایک حصہ پہاڑوں کے اوپر برف کی صورت میں جم کر ٹھہر جاتا ہے۔ ٹھنڈے موسم میں دریا کے اندر پانی اپنے آپ رہتا ہے۔ گرم موسم میں دریا کا پانی بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس وقت پہاڑ کی برف پگھل کر چشموں کی صورت میں بہنا شروع ہوتی ہے۔ اس طرح ان پہاڑی چشموں کے ذریعہ دوبارہ ہماری دریاؤں میں پانی کی روانی جاری رہتی ہے۔

راستہ میں سڑک کے کنارے چند مسجدیں بھی نظر آئیں۔ مگر یہ مسجدیں زیادہ شاندار نہ تھیں۔ البتہ لاؤڈ اسپیکر ضرور ہر ایک کے اوپر لگا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر مسجدوں کے لیے ایک ضروری جزء سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ۱۹۴۷ سے پہلے جب پہلی بار لاؤڈ اسپیکر مارکیٹ میں آیا تو مسلم علماء کو اسے مسجد میں استعمال کرنے میں سخت تردد تھا۔ حتی کہ بعض علماء نے کہا کہ اس کی آواز مشین کی آواز ہے۔ اس لیے اس کا استعمال مسجد کے اعمال کے لیے جائز نہیں۔

ایک حدیث میں آنے والے فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بتایا گیا ہے کہ مسجدوں میں آوازیں

بلند ہوں گی (رفعت الاصوات فی المساجد) اگر اس حدیث سے لاؤڈ اسپیکر مراد ہو تو لاؤڈ اسپیکر ایک فتنہ ہے نہ کہ کوئی بہت پسندیدہ چیز۔

ہم یوپی کی پُرشور اور گرد آلود سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اعلان ہوا کہ یہ کھتولی ہے۔ یہاں ہم لنچ کے لیے ایک گھنٹہ رکیں گے۔ اس کے بعد ہماری بس سڑک سے مڑکر ایک بہت بڑے احاطہ میں داخل ہوئی۔ یہاں کثیر تعداد میں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

باہر نکل کر دیکھا تو صحرا میں گویا ایک نخلستان کا منظر تھا۔ وسیع وعریض گارڈن کے درمیان ایک خوب صورت اور نئی بلڈنگ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا چیتل گرینڈ :

Cheetal Grand Motels Pvt. Ltd.

یہ ایک جدید طرز کا ریستوراں تھا۔ عمارت، نشست گاہیں، باتھ روم، ہر چیز بالکل نئے انداز پر بنی ہوئی تھی۔ چاروں طرف دور تک سرسبز وشاداب مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ صفائی بھی کامل درجہ میں تھی۔ یہاں قافلہ کے تمام لوگوں نے کھانا کھایا۔ کھانا بھی نہایت صاف ستھرا تھا۔

میں نے وضو کیا اور لان کی گھاس پر ظہر کی نماز ادا کی۔ میں نماز کے لیے کھڑا ہوا تو ایک اور صاحب آکر شریک ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں سوئزر لینڈ سے آیا ہوں۔ میرا موجودہ نام عبد الصمد ہے۔ میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ پھر ایک مسلم صوفی سے متاثر ہو کر میں نے اسلام قبول کر لیا۔ بعد کو ان سے مزید گفتگو نہ ہو سکی۔

میں سمجھا تھا کہ یہ کسی بڑے ہندو کا ریستوراں ہوگا۔ مگر کھانے سے فارغ ہو کر میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک تندرست اور خوش پوشش نوجوان میرے پاس آئے۔ انھوں نے میرا نام پوچھا۔ پھر انھوں نے کہا کہ میرا نام شارق رانا ہے۔ میں اور میرے بھائی واثق نثار اس ریستوراں کے مالک ہیں۔ یہ ریستوراں دہلی۔ مسوری روڈ پر واقع ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ ریستوراں ہندستانی مسلمانوں کے نئے فیصلہ کی علامت ہے۔ ایک عرصہ تک انڈیا کو مسائل کا ملک سمجھنے کے بعد اب یہاں کے مسلمانوں نے جان لیا ہے کہ انڈیا بہترین مواقع کا ملک ہے۔ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اس ملک کے امکانات کو استعمال کر کے آگے بڑھیں گے، یہاں تک کہ ترقی کی آخری منزل تک پہنچ جائیں گے۔

دہلی میں سڑکیں اچھی تھیں۔ مگر یوپی کے علاقہ کی سڑکیں ناہموار معلوم ہوئیں۔ مسلسل گاڑی میں جھٹکے لگتے رہے۔ مجھے سر میں درد اور چکر پیدا ہوگیا جو آخر وقت تک باقی رہا۔ اس کی وجہ سے مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ میں سوچتا رہا کہ یہ سر کا چکر جو بظاہر دکھائی بھی نہیں دیتا، وہ مجھ کو اتنا پریشان کیے ہوئے ہے کہ اس کے ساتھ اگر دنیا کا سب سے اچھا محل مجھے رہنے کے لیے دے دیا جائے تو اس کے اندر مجھے ایک سکنڈ کے لیے بھی خوشی اور سکون نہیں ملے گا۔ صحت و عافیت کی زندگی بھی اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے۔

دہلی سے ہمارا قافلہ تین اسپشل بسوں کے ذریعہ رشی کیش کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر بیرونی ملکوں کے لوگ تھے۔ روس، جرمنی، سوئزرلینڈ، امریکہ وغیرہ سے مختلف مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ دہلی میں جمع ہوئے اور پھر یہاں سے ایک قافلہ کی صورت میں رشی کیش کے لیے روانہ ہوئے۔

رڑکی تک کا سفر اچھا گزرا۔ اس کے بعد سڑک زیادہ اچھی نہ تھی۔ ایک جگہ پل ٹوٹنے کی وجہ سے سواریوں کو سڑک کے نیچے اتار کر کچے راستہ سے گزارا جا رہا تھا۔ ایک جگہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کافی دیر تک رکنا پڑا۔ اس طرح سفر متعب بھی ہوگیا اور طویل بھی۔ زندگی کا آغاز خواہ کتنے ہی ہموار حالات میں شروع کیا جائے، درمیان میں ناموافق حالات کا پیش آنا ضروری ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو وہ اس کو پست ہمتی سے بچانے کا ذریعہ بن جائے۔

ہم لوگ رڑکی میں داخل ہوئے تو گرجا سے ٹن ٹن کی آواز آرہی تھی۔ پہلے میں نے سمجھا کہ یہ ہاتھی کی آواز ہے۔ قریب ہوا تو ایک قدیم چرچ سڑک کے کنارے دکھائی دیا۔ اب میں نے جانا کہ یہ چرچ کے گھنٹے کی آواز ہے۔

دوسرے مذاہب میں عبادت کے وقت کے اعلان کے لیے گھنٹے یا اسی قسم کی کسی اور چیز کا رواج ہے۔ غالباً اسلام واحد مذہب ہے جس میں بامعنی مذہبی کلمات کو دہرا کر عبادت کے وقت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب کا اعلان صرف اعلان ہے۔ جب کہ اسلام نے اعلان کے ساتھ دعوت کا پہلو بھی شامل کر دیا ہے۔

راستہ میں کئی جگہ شوگر مل دکھائی دی۔ اونچی چمنیاں دھواں اڑاتے ہوئے اپنے وجود کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس کے قریب دور تک گنّے سے لدی ہوئی گاڑیاں اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔

گنّا قدرت کی ایک پیداوار ہے۔ اس کے اندر رس بھرا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ چھلکے کی بڑی مقدار بھی اس میں شامل رہتی ہے۔ گنّے کو مشین میں ڈال کر دباتے ہیں۔ اس طرح اس کا رس نکل کر باہر آجاتا ہے۔ اور سوکھا چھلکا الگ ہوجاتا ہے۔ گنّے سے رس لینے کے لیے اس کے اوپر شدید دباؤ کا عمل ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس کا میٹھا رس حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ انسان بظاہر ایک جسمانی وجود ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر غیر معمولی اخلاقی، روحانی اور فکری قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان قوتوں کو ظہور میں لانے کا واحد فطری طریقہ یہ ہے کہ انسان کو دباؤ کے عمل سے گزارا جائے۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں کسی فرد یا کسی قوم کو اگر دباؤ کے حالات پیش آئیں تو یہ اس کے اوپر خدا کی عنایت کا نشان ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اس کو چھلکے کے درجہ سے اٹھا کر رس کے درجہ میں پہنچانا چاہتا ہے۔

رشی کیش کے علاقہ میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ حسب قاعدہ گنگا کا پل بند ہو چکا ہے۔ اب ہم کو دریا کے اس پار ایک ہوٹل میں رات گزارنا ہوگا۔ کل صبح کو پل کھلنے پر گنگا پار کر کے آشرم میں پہنچیں گے جہاں کانگرس کی کارروائیاں ہونے والی ہیں، مگر کچھ لوگ ہمت نہیں ہارے۔ وہ چل کر پل کی اتھارٹی سے ملے۔ اس کو بتایا کہ یہ ایک انٹرنیشنل قافلہ ہے جو روحانی اجتماع کے لیے یہاں آیا ہے۔ وہ لوگ مطمئن ہو گئے اور انھوں نے پل کا گیٹ خصوصی طور پر کھول دیا۔

رشی کیش پہنچنے کے بعد پہلے ہم لوگ ایک بڑے شامیانہ میں لے جائے گئے۔ یہاں فادر گریگوریوز نے وہیل چیر پر بیٹھ کر تمام مہمانوں کا سواگت کیا۔ یہاں تمام لوگ تقریباً ایک گھنٹہ تک ٹھہرے۔ اور آپس میں ملاقاتیں کیں۔

ہمارے قافلہ کے ایک صاحب جرمنی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام ولی (Willy Augustat) تھا۔ وہ انگریزی روانی کے ساتھ بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کانفرنس میں جرمنی سے کئی لوگ آئے ہیں۔ چار تو خود ان کے اپنے گھر کے ہیں (وہ اور ان کی بیوی اور ان کی لڑکی اور ان کا لڑکا) یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ انڈیا پر ایک جرمن حملہ (German invasion) ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں، مگر یہ ایک روحانی حملہ (spiritual invasion) ہے اور سچا روحانی حملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا داخل ہونا۔

ولی آگسڈٹ (Tel. (0) 8106-33903) یورپ میں پیس تھرو کلچر کے پریسیڈنٹ
یں۔ اور نہایت زندہ دل آدمی ہیں۔ وہ اگرچہ روانی کے ساتھ انگریزی بول رہے تھے۔ مگر انھوں نے
ا : مجھے انگریزی نہیں آتی۔ بس کام چلانے کے لیے بول لیتا ہوں۔

ایک سوامی جی نے "حقیقت" کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ ہم میں سے ہر شخص ایک عظیم
ل کا ایک جزء ہے :

Everyone of us is a part of the great whole.

میں نے کہا کہ یہ حقیقت کا وہ بیان ہے جو آریائی مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ مگر سامی مذاہب کا
یان اس سے مختلف ہے۔ سامی مذاہب کے نزدیک ہم اور کائنات کی دوسری تمام چیزیں خالق کی مخلوق
یں نہ کہ خالق کا جزء۔ پہلی تشریح میں خالق ہم سے الگ نہیں ہے، جب کہ دوسری تشریح میں خالق مکمل
لور پر ہم سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔

ایک صاحب سے بات ہوئی۔ وہ مجھ کو جانتے نہیں تھے۔ انھوں نے مذاق کے انداز میں کہا کہ
ہندوازم زیادہ پرانا مذہب ہے اور اسلام کی تمام باتیں ہندوازم میں موجود ہیں۔ پھر آپ لوگ ہندوازم
؛ کیوں نہیں لے لیتے۔ اس طرح آسانی سے ریلجس ہارمنی پیدا کی جا سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ اگر میں اس کو الٹ کر یہ کہوں کہ اسلام زیادہ لیٹسٹ ہے اور مذہب کا ریوائزڈ اڈیشن
ہے، اس لیے دوسرے قدیم مذہب والوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کو اختیار کر لیں۔ اس طرح وہ ناقص کو
چھوڑ کر کامل کو پالیں گے، تو آپ میری اس بات کے جواب میں کیا کہیں گے۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس طرح کی باتیں مختلف لوگوں سے ہوتی رہیں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو ایسی آواز تو
ہت اپیل کرتی ہے جس میں اپنی موجودہ جگہ چھوڑے بغیر کوئی کریڈٹ مل رہا ہو۔ مثلاً موجودہ کانگریس
ں ہر آدمی اپنے مذہب کے ساتھ شریک ہو رہا ہے۔ اپنے مذہب سے ہٹے بغیر اس کو ایک نیا اطمینان
اصل ہو رہا ہے کہ اس نے عالمی روحانی اتحاد کے لیے کام کیا۔ مگر ایک ایسی آواز آدمی کو اپیل نہیں کرتی جس
ں اس کو اپنی موجودہ پوزیشن چھوڑنی پڑے۔

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخر کار رات کو ۹ بجے میں پرمارتھ نکیتن آشرم میں پہنچا جہاں مجھ کو
ٹھہرنا تھا۔ یہ انڈیا کا سب سے بڑا آشرم ہے اور سوامی چدانند اس کے چیرمین ہیں۔ یہاں شام کا کھانا کھایا۔

سوامی جی شریک نہ ہو سکے۔ کیونکہ رات کا کھانا وہ سورج ڈوبنے سے پہلے کھا لیتے ہیں۔ اسی آشرم میں رات کی نماز پڑھی اور پھر اپنے کمرہ میں سونے کے لیے چلا گیا۔

میں جب سوامی جی کے کمرہ میں داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں صرف کپڑے کا ایک بیگ تھا۔ ایک صاحب نے پوچھا: آپ کا اور سامان۔ میں ابھی خاموش تھا کہ سوامی جی جو میرے مزاج کو جانتے تھے، بولے: مولانا جی تو سچے فقیر ہیں۔ ان کو زیادہ سامانوں سے کیا کام۔ بس یہی کپڑے کا بیگ ان کا سامان ہے۔

سوامی جی سے میں نے پوچھا کہ ہندو روایات میں "فقیر" کا کیا مطلب بتایا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: جو فکر کا فاقہ کرے اس کا نام فقیر۔

۵ دسمبر کی شام کو منزل تک پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت نکل گیا۔ سوامی چیدانند کے دفتر میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے سوامی جی سے کہا کہ مجھ کو نماز پڑھنا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنے خاص کمرہ میں ایک نیا کپڑا مصلیٰ کے طور پر بچھایا۔ وہیں میں نے وضو کیا اور ان کے کمرہ میں مغرب اور عشار کی نماز ادا کی۔

میں نے دعا کی کہ خدایا، تو اس ملک پر اور اس ملک کے بسنے والوں پر رحم فرما۔ مسلمانوں نے اس ملک کے باشندوں کے ساتھ یہ نادانی کی کہ انھوں نے ان کو رقیب سمجھا، انھوں نے ان کو مدعو نہیں سمجھا۔ خدایا تو اس ملک کے دونوں فرقوں کے درمیان کشیدگی کا ماحول ختم کر دے تاکہ کھلے ماحول میں تیرا پیغام ایک سے دوسرے کو پہنچنے لگے۔

۶ دسمبر کی صبح ۵ بجے آنکھ کھلی تو آشرم کے معمول کے مطابق، لاؤڈ اسپیکر پر گیتا کے اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ تک ترنم کے ساتھ ایک پنڈت جی اس کو سناتے رہے۔ اس کے بعد ایک اور پنڈت جی نے کٹھن ہندی میں اس کی تشریح پر آدھ گھنٹہ تک تقریر کی۔ تشریح میں انھوں نے خاص طور پر چنتن پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ پرماتما کا کوئی روپ نہیں۔ آخر میں پرارتھنا ہوئی سازپر "دیا کرو بھگوان" دہرایا گیا اور اس طرح کے دوسرے دعائیہ کلمات۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ہندو عقیدہ کے مطابق، دیوی دیوتا پرماتما کی صفات کا مظہر ہیں۔ آدمی انھیں صفات کے ذریعہ پرماتما سے ربط قائم کرتا ہے۔ اسی لیے ہندو سماج میں دیوی دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ مگر ان کے یہاں پرماتما کا کوئی مندر نہیں۔

یہ مجموعی طور پر صبح ایک گھنٹہ کا پروگرام تھا۔ ایک صاحب (مسٹر راجی) ٹارچ لے کر صبح کو کمرہ کمرہ چیک کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں ٹھہرنے والے ہر شخص کے لیے ست سنگ کے اس پروگرام میں شرکت کرنا لازمی ہے۔ ایک صاحب کے الفاظ میں، یہ یہاں کے باسیوں کے لیے اسپریچول ٹیکس ہے۔

سورج طلوع ہونے کے قریب تھا کہ مندروں سے گھنٹہ کی آوازیں آنے لگیں۔ گنگا کا پانی یہاں تیزی سے بہتا ہے۔ اس بنا پر اس کی آواز بھی مسلسل رات اور دن سنائی دیتی ہے۔ صبح کو میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا تو تیز اور ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ یوروپین لوگوں کے لیے اس قسم کی ہوا بہت خوش گوار تھی۔ مگر میرے لیے وہ زیادہ خوش کن ثابت نہ ہو سکی۔ خواہش کے باوجود میں باہر زیادہ دیر تک ٹہل نہ سکا۔

میرے کمرہ کے قریب بلڈنگ کے ایک حصہ میں جلی حرفوں میں بورڈ لگا ہوا تھا: انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم (آفس) یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ یہ ایک جدید طرز کا آشرم ہے۔ آشرم کے چیرمین سوامی چیدانند کا یہ ایک بڑا حوصلہ مندانہ منصوبہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوازم کی انسائیکلوپیڈیا کی ضخیم جلدوں میں تیار کر رہے ہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو جوڑ کر ایک تھنک ٹینک (Think Tank) بھی انھوں نے تشکیل دیا ہے۔

۶ دسمبر کو صبح کا وقت ہے۔ میں آشرم کی ایک چھت پر کھڑا ہوں۔ چاروں طرف اجالا پھیلا ہوا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کی بلندیاں آشرم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ سامنے گنگا پُر شور آواز کے ساتھ بہتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اس کا پاٹ ایک چھوٹی پہاڑی ندی جیسا ہے۔ یہاں وہ اتنی چوڑی نہیں جتنا وہ آگے جا کر ہو جاتی ہے۔ دریا کے کنارے قطار سے کئی مندر بنے ہوئے ہیں۔ پجاری (زیادہ تر عورتیں) آتی ہیں۔ وہ ایک بار گھنٹہ بجا کر اندر جاتی ہیں اور پوجا کی رسم ادا کرتی ہیں۔ یہاں کی ہوا کثافت سے بڑی حد تک خالی ہے۔ اس آشرم کا نام پرمارتھ نکیتن ہے۔ اس میں بیک وقت پانچ ہزار آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ مختلف معیار کے کمرے بڑی تعداد میں بنے ہوئے ہیں۔ گنگا کے عین کنارے یہ آشرم عملاً ایک صحت گاہ بن گیا ہے۔ یہاں ہندو لوگ اس احساس کے ساتھ آتے ہیں کہ برکت بھی حاصل کریں گے اور صحت بھی۔

رشی کیش کے مختلف حصوں میں گھوم کر دیکھا۔ ہر طرف مندر اور اس سے متعلق چیزوں کے مناظر تھے۔ جگہ جگہ کسی دیوی یا دیوتا کا مجسمہ کھڑا ہوا ہے۔ لوگ پرارتھنا اور پوجا میں مصروف نظر آئے۔ مندروں کے

آس پاس دکانوں میں پوجا اور نذر و نیاز کے سامان بک رہے ہیں۔ مثلاً پھول، صندل، موم بتی، جپ مالا، تصویریں، دھارمک کتابیں، وغیرہ وغیرہ۔

ایک ہندو نے مجھ کو مسلمان سمجھ کر کہا۔ ہم میں اور آپ میں کیا فرق ہے۔ ہم لوگ (مندروں میں) کھڑا کرکے پوجتے ہیں اور آپ لوگ (قبروں میں) لٹا کر پوجتے ہیں۔ مندروں کے آس پاس آپ جو چیزیں یہاں دیکھ رہے ہیں وہی سب میں نے آپ کی درگاہوں میں بھی دیکھا ہے۔

رشی کیش کے مناظر کو دیکھنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ ہندو لوگ اتنی زیادہ تعداد میں کیوں درگاہوں میں جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ درگاہوں کے ماحول میں ان کو اسلام کا ہندوائزیشن (Hinduised version) مل جاتا ہے۔ یہاں اسلام ان کو اپنے مذہب جیسا ہی ایک مذہب دکھائی دیتا ہے۔

رشی کیش گنگا کے کنارے بسا ہوا ہے۔ پہاڑ کے اوپر جہاں سے گنگا شروع ہوتی ہے اس کو گنگوتری کہا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر گنگا کو سب سے پہلے جہاں ہموار میدان ملتا ہے وہ یہی رشی کیش ہے۔ گنگوتری کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رشی کیش کی ہے۔ گنگا کو ہندو روایات میں "ماں" کہا گیا ہے۔ سوامی چیدانند نے اس کی تشریح یہ کی کہ ماں ہمیشہ دیتی ہے، وہ کبھی لیتی نہیں۔ اسی طرح گنگا یک طرفہ طور پر دیتی رہتی ہے۔ وہ ہم سے کچھ نہیں لیتی۔ اسی لیے ہندو روایات میں گنگا کو ماں کے روپ میں دیکھا گیا ہے۔

بظاہر یہ ایک خوب صورت توجیہہ ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس دنیا کی ساری ہی چیزیں گنگا کی مانند ہیں۔ گھاس اور ریولی سے لے کر سورج اور چاند تک اس کائنات کی ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ وہ یک طرفہ نفع رسانی کے اصول پر کاربند ہے۔ ایسی حالت میں جو درجہ گنگا کو دیا گیا ہے وہی درجہ عالم طبیعی کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو دیا جانا چاہیے۔

اس قسم کی غیر منطقی توجیہہ کا رواج موجودہ مسلمانوں میں اور دوسرے مذہبی فرقوں میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ہندوؤں میں۔

گنگا ہندستان کا ایک بہت بڑا دریا ہے۔ وہ شمالی ہند سے شروع ہو کر بنگال کے آخر تک بہتا چلا گیا ہے۔ اس کی مجموعی لمبائی ۲۵۰۰ کیلو میٹر ہے۔ ہندو عقیدہ میں اس کو ایک مقدس دریا مانا گیا ہے۔ گنگا کے کنارے آباد شہروں کو ہندو روایات میں خصوصی مذہبی اہمیت حاصل ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مختلف قوموں میں روحوں

کی پرستش کا رواج رہا ہے۔ سورج، چاند، پہاڑ، درخت، دریا، ہر چیز میں ایک ایسی روح کو مانا جاتا ہے جس کے اندر پُر اسرار صفات اور طاقتیں موجود ہیں۔ اسی لیے ان چیزوں کو پوجا جاتا ہے تاکہ ان کے اندر جو روح ہے اس کی برکت حاصل کی جائے۔ اسی عقیدہ کے تحت گنگا کو بھی پوجا جاتا ہے کیونکہ اس میں دیوی کی روح سمائی ہوئی ہے۔

اس قسم کی تفصیلات بتاتے ہوئے برٹانیکا کا مقالہ نگار کہتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی کچھ غیر خدائی چیزوں کی پرستش کا رواج ہے۔ مثلاً ساؤتھ ایشیا کے مسلمان اپنے پیروں کو پوجتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے لیے قرآن میں کوئی سند موجود نہیں :

...a practice for which there is no authority in the Qur'an (17/129)

رشی کیش کی یہ سات روزہ کانگرس ایک روسی تنظیم کے تحت ہوئی۔ اس کا نام ہے ——— امن بذریعہ کلچر کی بین اقوامی جماعت :

The International Association Peace Through Culture.

یہ تنظیم ماسکو میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی نکولائی روِرش (Nikolai K. Roerich) تھے۔ وہ ۱۸۷۴ میں ماسکو میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۷ میں بنگلور میں ان کا انتقال ہوا۔ اس کے موجودہ روسی صدر والنتن سدوروف (Valentin M Sidorov) ہیں۔ اس تنظیم کی پہلی عالمی کانگرس الما اتا (قزاخستان) میں ۱۹۹۲ میں ہوئی تھی۔ دوسری عالمی کانگرس دسمبر ۱۹۹۲ میں رشی کیش میں ہوئی۔ اس کی شاخیں اکثر مغربی ملکوں میں قائم ہیں۔ ان کا خاص پیغام یہ ہے کہ دنیا کا بڑھتا ہوا تشدد روحانی بیماری (spiritual illness) کی بنا پر ہے۔ دنیا کے مسائل کو روحانی طاقت (spiritual energy) کے ذریعہ سے دور کرو۔ اندھیرے کو کوسنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک شمع روشن کر دی جائے :

It is far better to light a lamp than to curse the darkness.

رشی کیش کی یہ کانگرس اصلاً میڈیٹیشن (مراقبہ) کے لیے ہوئی تھی۔ یہاں مختلف مذاہب کے لوگوں نے جمع ہو کر اپنے اپنے مذہبی طریقہ کے مطابق میڈیٹیشن کا مظاہرہ کیا۔ روس سے آئے ہوئے ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلام میں عبادت کا تصور ہے، میڈیٹیشن کا تصور اسلام میں نہیں

ہے۔ صوفیا نے مراقبہ کا طریقہ نکالا۔ مگر وہ ان کی اپنی ایجاد ہے، اسلام میں اس کا ماخذ موجود نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں جب کہ اسلام میں ذکر کی تعلیم ہے۔ اور ذکر میڈیٹیشن یا دھیان ہی کا مسلم طریقہ ہے:

Dhikr is the Muslim form of meditation or *Dhyan*.

میں نے کہا کہ ذکر اور معروف دھیان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ذکر یاد ہے اور دھیان غوطہ خوری۔ ذکر میں بندہ اپنے خدا کو یاد کرتا ہے۔ جب کہ دھیان میں خدا جیسی کوئی شخصیت سامنے نہیں ہوتی۔ دھیان یہ ہے کہ آدمی خود اپنے اندر چھپی ہوئی حقیقت سے اپنے آپ کو مربوط کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ذکر سے آدمی کے اوپر خدا کی عظمت کا تصور قائم ہوتا ہے۔ جب کہ دھیان یا میڈیٹیشن کا آخری نتیجہ ایک موہوم قسم کا روحانی سکون ہے اور بس۔

یورپ سے آنے والے ایک صاحب نے میڈیٹیشن کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ میڈیٹیشن وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں بحث اور استدلال ختم ہو جاتا ہے:

Meditation begins where discussion and ratiocination stop.

میں نے کہا کہ آپ کے اس جملہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جب بحث اور استدلال کام نہ کرے تو مراقبہ شروع کر دو۔ مگر خود اس بات کو ماننے کے لیے بھی بحث واستدلال کی ضرورت ہوگی کہ مراقبہ بھی دریافت حق کا کوئی موثر ذریعہ ہے۔ بحث و استدلال میں ہم معلوم حقائق کی مدد لے کر ایک فکری نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ معلوم حقیقتوں میں غور وفکر کے علاوہ آدمی کے پاس کون سا مزید ذریعہ ہے جو اس کو حقیقت تک رسائی میں مدد کرتا ہے۔ جب تک آپ یہ ثابت نہ کریں کہ یہاں اس قسم کا ایک اور چھپا ہوا ذریعہ موجود ہے اس وقت تک مراقبہ کی معنویت مشتبہ رہے گی۔ یہ اثبات حقیقی دلیل سے ہونا چاہیے نہ کہ مثالوں سے۔

۶ دسمبر کو صبح ۱۰ بجے یہاں کے پرشورام ہال میں کانگرس کا افتتاح ہوا۔ افتتاح کی تقریب میں سب سے پہلے مختلف مذہب کے لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کی مقدس کتابوں سے کچھ اجزاء پڑھ کر سنائے۔ ابتدائی تمہید کے بعد سب سے پہلے سوامی چید انند مائک پر آئے جو ہندو دھرم کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے سنسکرت میں کچھ اشلوک ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائے۔ یہاں ترجمہ کا قاعدہ نہیں تھا،

یلیے انھوں نے ترجمہ نہیں کیا۔

مقرر پروگرام کے مطابق، سوامی چیدانند کے بعد مجھ کو قرآن کا ایک حصہ تلاوت کرنا تھا۔ میرے نام ہوا تو میں مائک پر آیا۔ اس وقت حاضرین میں زیادہ تر بیرونی ملکوں کے لوگ تھے۔ اس لیے ساری انگریزی زبان میں ہورہی تھی۔ چنانچہ میں نے مائک پر آکر پہلے حسب ذیل الفاظ کہے :

The recitation of the Qur'an is a highly professional job. Those pec who recite the Qur'an are called Qaris. I am not a Qari in that se of the word. I am simply a student of the Qur'an. So I will recite so verses from the Qur'an in a very simple and non-professional mann

اس کے بعد میں نے سادہ انداز میں قرآن کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ حاضرین کے چہرہ سے محسوس ہورہا تھا کو بہت دھیان کے ساتھ سن رہے ہیں۔ اور نہایت ادب اور تعظیم کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا دا اپنے صوتی آہنگ میں بھی ایک تاثیر رکھتا ہے، خواہ سننے والا اس کو سمجھ رہا ہو یا نہ سمجھ رہا ہو۔

اس کے بعد اچاریہ منی سوشیل کمار نے جین مذہب کی کتاب سے ایک مختصر حصہ پڑھا۔ اس کے بعد م کی طرف سے ایک مرد اور ایک عورت اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے باجہ کی دھن پر گوربانی کا ایک حصہ ساتھ سنایا۔ اس کے بعد مقامی ویدک ادارہ کے طلبہ کی ایک ٹیم گیروے لباس میں آئی۔ انھوں نے مذہبی گانا گایا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک مختلف شخصیتیں اور جماعتیں اسٹیج پر آتی رہیں اور اپنے مذہب ت پیش کرتی رہیں۔

آخر میں بشپ گریگوریوز نے ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ حقیقت ایک ہے مگر اس کا (manifestation) متعدد ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے موجودہ کانگرس کا تعارف پیش کیا، کہ ہم رشی کیش میں کیوں جمع ہوئے ہیں اور ہمیں کیا کرنا ہے۔ تنظیم کے صدر نے روسی زبان میں تقریر کی جمہ ان کے روسی سکریٹری نے انگریزی میں کیا۔

کانگرس کی کارروائی ۹ دسمبر سے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۳ تک جاری رہی۔ پہلے دن شرکار کا تعارف اور ابتدائی یوں کے علاوہ ہر مذہب کی مقدس کتابوں کی تلاوت کی گئی۔ ۷ دسمبر کو ہر مذہب کے لوگوں نے اپنے یقہ کے مطابق میڈیٹیشن کا مظاہرہ کیا۔ اس میں گیت اور ڈانس بھی شامل تھا۔ ۸ دسمبر کو بھی اسی قسم گرام جاری رہے۔ ۹ دسمبر کو میڈیٹیشن اور یوگا کے علاوہ لوگوں کو گنگا کے کنارے لے جایا گیا۔ ۱۰ دسمبر کو

مذکورہ پروگراموں کے علاوہ روحانی پینٹنگ کے نمونے دکھائے گئے۔ ۱۱ دسمبر کو یوگا وغیرہ کے پروگرام کے ساتھ شرکا نے اپنے اپنے تاثرات مختصر طور پر بیان کیے۔ ۱۲ دسمبر کو مختلف مسدرد کھائے گئے اور الوداعی تقریر ہوئی۔

یہ مختصر طور پر اس کانگرس کی روداد تھی۔ تاہم یہ ایک عملی نوعیت کی کانگرس تھی۔ اس کا اندازہ صرف اس کو دیکھ کر ہوسکتا ہے، کاغذی رپورٹ سے اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس اسپریچول کانگرس میں تقریباً ۲۰۰ آدمی مختلف ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ روس، جرمنی، سوئزرلینڈ، امریکہ، وغیرہ۔ تقریباً نصف تعداد ہندستانی تھی اور نصف تعداد بیرونی۔ سب کے سب پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ان میں سکھ ازم، ہندو ازم، جین ازم، بدھزم، مسیحیت وغیرہ ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ کئی لوگوں سے مذہبی عقائد کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ جو لوگ کسی مذہب میں پیدا ہوئے ہوں ان کو ایک دو ملاقاتوں میں کوئی نئی بات سمجھائی نہیں جاسکتی۔

حدیث میں ہے کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچپن سے ایک خاص ماحول میں رہتے رہتے آدمی کی سوچ کنڈیشنڈ ہو جاتی ہے۔ کسی اور نقطۂ نظر کو وہ پکڑ نہیں پاتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ملنا جلنا ہو۔ مختلف مواقع پر تبادلہ خیال ہوتا رہے۔ اسی کے ساتھ مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری ہو۔ اس طرح لوگوں کے ذہن کھل سکتے ہیں۔ کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو ایک گفتگو یا ایک ملاقات سے پوری بات سمجھ جائیں۔ اور اس کا اعتراف بھی کرلیں۔ مگر ایسے لوگ تاریخ میں بہت کم پائے گئے ہیں۔ زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو کسی نئی بات کو دیر سے ہی سمجھتے ہیں۔

سوامی چدانند رشی کیش کے پرمارتھ نکیتن آشرم کے چیرمین ہیں۔ یہ انڈیا کا سب سے بڑا آشرم ہے۔ اس کی شاخیں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سوامی جی کا آفس جو کئی کشادہ کمروں پر مشتمل ہے، بالکل جدید طرز پر بنا ہوا ہے۔ وہ جہاں بیٹھتے ہیں، وہاں تین ٹیلی فون رکھے ہوئے ہیں جس کی گھنٹی ہر وقت بجتی رہتی ہے ہندستان کے مختلف مضافات سے، اس کے علاوہ یورپ، آسٹریلیا، امریکہ سے ٹیلیفون آتے رہتے ہیں۔ سوامی جی اس بات کی ایک زندہ مثال ہیں کہ موجودہ زمانہ کمیونی کیشن کا زمانہ ہے۔ نیز یہ کہ کس طرح ایک آدمی ایک کمرہ میں بیٹھ کر ساری دنیا سے مربوط رہ سکتا ہے۔ وہ ایک مقام پر بیٹھ کر جدید مواصلاتی ذرائع

ساری دنیا میں اپنی تحریک کو کنٹرول کر سکتا ہے۔

آشرم میں سوامی جی کے دفتر کے سامنے ایک خوب صورت بورڈ لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک عالمی نقشہ ہے جس میں ہر ملک میں ہندوؤں کی تعداد بتائی گئی ہے۔ اس کے اوپر لکھا ہوا ہے ——— تقریباً ایک بلین ہندو کہاں کہاں رہتے ہیں :

Where nearly a billion Hindus live?

یہ خوب صورت بورڈ "ہندوازم ٹوڈے" کی طرف سے سوامی چیدانند کو ۱۹۹۱ میں اس موقع پر دیا گیا جب کہ سناتن دھرم کے لیے ان کی خدمات کی بنا پر ان کو سال کا ہندو (Hindu of the year) ڈکلیر کیا گیا۔

اس بورڈ میں بتایا گیا تھا کہ ہندو عالمی انسانی خاندان کا چھٹا حصہ ہیں۔ انڈیا میں ۹۳ فی صد ہندو ہیں۔ ہندوؤں کی مجموعی عالمی تعداد ۸۱۶ ملین ہے۔ تقریباً ۶۰ ملین ہندو مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔

ہندوازم ٹوڈے ایک ہفت روزہ ہے۔ اس کو ایک امریکی ہندو نکالتے ہیں۔ وہ کئی زبانوں میں چھپتا ہے۔ اس کی اشاعت کئی ملین تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے دفاتر دنیا کے اکثر حصوں میں موجود ہیں۔ اس کا صدر دفتر امریکہ (ہوائی) میں ہے۔

۷ دسمبر ۱۹۹۳ کو صبح سویرے رشی کیش سے دہلی کے لیے واپسی تھی۔ صبح پانچ بجے میں بستر سے اٹھ گیا۔ فجر کی نماز آشرم میں اپنے کمرہ میں پڑھی۔ خیال آیا کہ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے گنگا کے کنارے آباد اس بستی میں خدا کے آگے سجدہ کیا ہو۔ اور یہاں لوگوں کی رحمت اور ہدایت کے لیے دعائیں کی ہوں۔

نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو ست سنگ سے لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والے پروچن کی آوازیں آرہی تھیں۔ بولنے والا "صحبت" کا فلسفہ بتا رہا تھا کہ آپ کو ملنے جلنے میں انتخابی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آپ جس کے ساتھ چاہیں بیٹھیں جس کے ساتھ چاہیں ملنے جلنے لگیں۔ اس نے کہا : جیسا من ہوگا ویسے بچار بنیں گے، جیسا بچار ہوگا ویسا آپ کا جیون بنے گا۔ اپنے من کو ٹھیک کیجیے تاکہ بچار ٹھیک ہوں اور بچار کو ٹھیک کیجیے تاکہ آپ کا جیون سدھرتا چلا جائے۔ آخر میں ہری اوم، ہری اوم کی جاپ پر ست سنگ ختم ہوا۔ یہ ست سنگ یہاں روزانہ کئی بار ہوتا ہے۔ اس کا سلسلہ صبح ۵ بجے شروع ہوتا ہے اور رات کو دیر تک جاری رہتا ہے۔

ہندوؤں نے اس طرح کے آشرم اور ادارے سارے ہندستان میں بے شمار تعداد میں قائم

خدا کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کو منسوب کرنا ... ان پر اللہ کی رحمت

کر رکھے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ نیچر کو مقدس سمجھتے ہیں اس لیے ان کے مذہبی ادارے اکثر کسی پہاڑ یا کسی دریا کے کنارے ہوتے ہیں۔ اپنے عقیدہ کے مطابق، وہ اس کو نیچر کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بنا پر موجودہ زمانہ میں ہندوؤں کے مذہبی اداروں میں فطرت کا حسن شامل ہو گیا ہے۔ بہت سے غیر مذہبی لوگ بھی یہاں فطرت کے ماحول میں کچھ دن گزارنے کے لیے آنا پسند کرتے ہیں*

۷ دسمبر کی صبح کو فجر کی نماز اول وقت پڑھی۔ اس کے بعد سوامی چدانند سے رخصتی ملاقات کرنے کے لیے ان کے دفتر میں گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کانفرنس کے بہت سے مرد اور عورت وہاں چلے آرہے ہیں۔ سوامی جی نے بتایا کہ ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آج آپ جا رہے ہیں تو وہ آپ کے درشن کے لیے اور آپ کا آشیرواد لینے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ یہ زیادہ تر یورپ کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے پہلے سے اس کی بابت معلوم نہ تھا اس لیے کچھ سوچا نہ تھا۔ مگر اس وقت فوری طور پر مجھے بہرحال کچھ بولنا تھا چنانچہ انگریزی میں تقریباً ۱۰ منٹ تک ان کے سامنے خطاب کیا۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ یہاں روحانی اتحاد کے عنوان پر جمع ہوئے ہیں۔ اس نسبت سے چند باتیں میں قرآن کے حوالے سے کہوں گا۔ قرآن میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی صحیح فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف، جھگڑے، غلط فہمیاں یہ سب چیزیں انسانی شخصیت کا اصل حصہ نہیں ہیں، یہ سب اوپری چیزیں ہیں۔ جہالت، حرص، تعصب، کینہ وغیرہ ان کے اسباب ہیں۔ یہ سب چیزیں وقتی طور پر آدمی کی فطرت کو ڈھک لیتی ہیں۔ اگر ان کو ہٹا دیا جائے تو اندر کی یکساں فطرت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روحانی اتحاد تو اپنے آپ سارے انسانوں کے درمیان موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اوپر کے پردوں کو ہٹا دیا جائے۔ پردہ ہٹنے کے بعد جو چیز حاصل ہو گی وہ وہی ہو گا جس کو ہم روحانی اتحاد کہتے ہیں۔

رشی کیش سے دہلی کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ راستہ میں ہمارے ساتھی چائے پینے کے لیے رڑکی میں ٹھہرے۔ ہوٹل کا نام گرین رستوراں تھا۔ میں گاڑی سے باہر آیا۔ میں نے چائے نہیں لی۔ ہندی اخبار امر اجالا کا شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس کی پہلی سرخی یہ تھی: پانچ ٹرینوں میں بم پھٹے۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ۶ دسمبر کو اجودھیا میں بابری مسجد ڈھائے جانے کی پہلی برسی پر دیش کے

* [illegible]

مختلف حصوں میں پانچ اہم اکسپرس ٹرینوں میں رکھے ہوئے بم پھٹے۔ ان سے کئی افراد مر گئے اور بہت سے لوگ زخمی ہو گئے۔ پیٹریٹ (۷ دسمبر) کی سرخی یہ تھی:

Blasts mark demolition anniversary

بم دھماکہ کا یہ واقعہ بیک وقت بزدلی بھی ہے اور فعل حرام بھی۔ جس نے ایسا کیا ہے اس کو اگر کچھ کرنا ہے تو وہ مجرموں کے ساتھ کرے۔ ٹرینوں میں سفر کرنے والے بے قصور مسافروں کو بم کا شکار بنانا تو انسانیت کے خلاف بھی ہے اور مذہب کے خلاف بھی۔
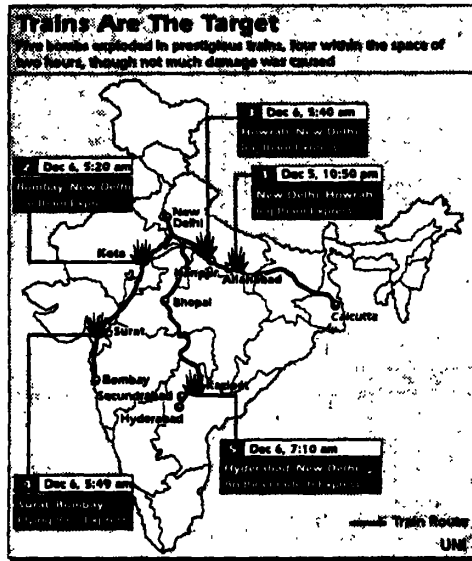
رڑکی میں ہمارے ساتھی رستوراں میں چائے پینے کے لیے ٹھہرے۔ میں نے چائے وغیرہ نہیں لی۔ میں باہر ٹہلتا رہا۔ رڑکی میں مسلمان بھی کافی آباد ہیں۔ اتفاق سے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا الرسالہ پہلے پڑھا کرتا تھا۔ مگر اب میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ میں نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا آپ آج کل جن باتوں کی تبلیغ کر رہے ہیں ان سے مجھے اتفاق نہیں۔

میں نے مزید تفصیل پوچھی تو انھوں نے اخبارات میں چھپنے والے بعض انٹرویو کا حوالہ دیا۔ میں نے کہا کہ رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اسلام کے خلاف ہے۔ اخباری انٹرویو کے متعلق معلوم ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ بات

کو بدل کر اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اس لیے میرے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لیے آپ کو الرسالہ کے مضامین کو بنیاد بنانا چاہیے۔ یا خود میرے لکھے ہوئے مضامین (signed articles) جو کسی اخبار یا میگزین میں چھپیں۔ وہ ایسا کوئی حوالہ نہ بنا سکے۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ تازہ آرگنائزر (۵ دسمبر ۱۹۹۳) میں میرا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس کی سرخی انھوں نے یہ قائم کی ہے کہ —— ہندوازم ہی واحد روادار مذہب ہے :

Hinduism is the only tolerant faith.

حالانکہ میں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہندوازم اور اسلام دونوں میں یکساں طور پر مذہبی رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ جو فرق ہے وہ صرف ریشنیل میں ہے نہ کہ خود رواداری میں۔ ہندوازم تعدد حقیقت کی بنیاد پر رواداری کی تعلیم دیتا ہے، اور اسلام احترام انسانیت کی بنیاد پر۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندوازم میں رواداری کی بنیاد باہمی اعتراف (mutual recognition) پر قائم ہے اور اسلام میں رواداری کی بنیاد باہمی احترام (mutual respect) پر۔

ان کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میں علماء کے اس مسلک پر ہوں جو انھوں نے "رجوع" کے بعد اختیار کیا، آپ لوگ علماء کے اس مسلک پر چلنا چاہتے ہیں جو انھوں نے رجوع سے پہلے اختیار کر رکھا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد پہلے ہمارے علماء نے اٹھائی تھی۔ وہ اس کو تشدد کے اصول پر چلاتے رہے۔ مولانا محمود حسن دیوبندی ساڑھے تین سال کی قید کے بعد ۱۹۲۰ میں مالٹا سے واپس آئے تو اس وقت مہاتما گاندھی عدم تشدد کے اصول پر آزادی کی تحریک شروع کر چکے تھے مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے تمام علماء نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا۔ تقریباً ایک سو سال کے بعد انھوں نے متفقہ طور پر تشدد کے طریقہ کو چھوڑ کر عدم تشدد کے طریقہ کو اختیار کر لیا۔

۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں بھی یہی معاملہ ایک اور صورت میں پیش آیا۔ نئے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو تعصب اور زیادتی کی شکایت ہوئی۔ انھوں نے دوبارہ لفظی جنگ کی صورت میں حقوق طلبی کی جدوجہد شروع کر دی۔ پچاس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ پرشور جدوجہد بے پناہ قربانیوں کے باوجود ناکام

اب سابقہ علماء کی طرح موجودہ علماء اور رہنماؤں کو بھی ایک رجوع کی ضرورت ہے۔ اب تک وہ اپنی تحریک مطالبۂ غیر کی بنیاد پر چلا رہے تھے۔ اب انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تحریک کو تعمیر خویش کی بنیاد پر چلائیں۔ جلسوں اور مظاہروں کی دھوم مچانے کے بجائے وہ صرف داخلی استحکام پر اپنی ساری توجہ لگا دیں۔

رشی کیش سے دہلی تک دو تعلیم یافتہ ہندو میرے ساتھ تھے۔ سوامی وشومترا (۵۰ سال) اور پنڈت راجیو اگنی ہوتری (۲۵ سال) ان لوگوں سے مذہبی موضوعات پر مسلسل باتیں ہوتی رہیں۔

سوامی وشومترا اساو تھ انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے پوری گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے اسلام پر بہت کم چیزیں پڑھی ہیں۔ بنگلور میں ایک مسلمان نے مجھ کو ایک انگریزی کتاب پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس کو میں نے پورا پڑھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میں متاثر تو نہیں ہوا۔ البتہ مجھ کو غصہ بہت آیا۔

یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "رسالہ دینیات" کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سوامی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر کئی صفحات میں اس پر انگریزی میں اپنا تبصرہ لکھ رکھا تھا۔ اس کو انھوں نے اپنے کپڑے کے بیگ سے نکالا۔ اور اس کے مختلف حصے مجھے بتانے شروع کیے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ اپنے مذہب کی بڑائی کو جانتے ہیں مگر وہ دوسروں کے مذہب کی بڑائی کو نہیں جانتے :

People know the greatness of their own religions, they don't know the greatness of other's religions.

میرے پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ اسلام میں پرافٹ ہوتے ہیں اور ہندوازم میں رشی ہوتے ہیں۔ رشیوں کا درجہ پرافٹ سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پرافٹ کی مثال اس شخص کی ہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے ٹاور پر چڑھ کر سمندر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر رشی ٹاور سے سمندر کو دیکھنے کے بعد خود سمندر میں اترے۔ انھوں نے اس کو چکھا اور اس کا تجربہ کیا (they tested and tasted it)

میں نے کہا کہ آپ مثال کی زبان استعمال نہ کریں بلکہ حقیقت کی زبان میں تقابل کریں۔ کیوں کہ نہ تو پیغمبر کسی لائٹ ہاوس پر چڑھے اور نہ رشیوں نے کسی سمندر میں غوطہ لگایا۔ اس طرح کی مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ مثال کا طریقہ استدلال کا سب سے کمزور طریقہ ہے :

Analogy is the weakest form of argument.

ہندو مذہب کوئی مذہب ہی نہیں ہے۔ وہ مختلف ادوات میں [illegible]

مگر وہ بدستور مثال کی زبان میں بولتے رہے۔ میں نے کہا اچھا، اب ...
انھوں نے کہا کہ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلام میں تو صرف ایک پیغمبر نے کہا جو کچھ کہا۔ مگر ویدوں کی فلاسفی سیکڑوں رشیوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ ویدک سسٹم میں ایک کے بعد ایک سیکڑوں رشیوں نے حقیقت کا تجربہ کیا۔ اس طرح اسلام شخص واحد کی معرفت پر بیس کرتا ہے جب کہ ویدک سسٹم انسانوں کے ایک مجموعہ کے عارفانہ تجربات پر مبنی ہے۔

میں نے کہا کہ مسئلہ ایک کا اور کئی کا نہیں ہے بلکہ اصل بات کے استناد (authenticity) کا ہے۔ پیغمبر خدائی الہام کے حوالے سے بولتا ہے۔ اس لیے اس کا کلام مستند ریفرنس پر قائم ہوتا ہے۔ جب کہ رشی اور منی ذاتی تجربہ کے حوالے سے بولتے ہیں۔ اس قسم کے ذاتی تجربات کے سلسلہ میں اصل سوال اس کا استناد ثابت کرنے کا ہے، وہ آپ کس طرح ثابت کریں گے۔

اب سوامی جی نے دوبارہ مثالیں دینا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ رشیوں نے زبردست تپسیا کی۔ وہ دکھ جھیلنے (suffering) کے کورس سے گزرے۔ اس طرح انھوں نے سفرنگ کے راستہ سے معرفت حاصل کی۔ انھوں نے مثال دی کہ آپ کو کھانا بنانا ہے تو آپ یہ کریں گے کہ ایک برتن میں چاول، دال، پانی وغیرہ ڈال کر اس کو تیز آنچ پر پکائیں گے۔ اس طرح آگ پر پک کر وہ آپ کے کھانے کے قابل بن جائے گا۔ اسی طرح آدمی جب تلاش کی آگ میں جلتا ہے تو وہ گیان حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ سفرنگ اور دریافت میں کیا رشتہ ہے۔ آپ کو دونوں کے درمیان منطقی رشتہ بتانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی آپ کی بات ثابت شدہ قرار پائے گی۔ کیوں کہ مثال کسی ثابت شدہ بات کی مزید وضاحت میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ مگر خود اصل بات کو ثابت کرنے کے لیے مثال قطعاً کارآمد نہیں۔

مگر یہ لوگ مثالوں کی زبان میں بولنے کے اتنے زیادہ عادی ہو چکے ہیں کہ وہ سائنٹفک یا منطقی زبان میں اپنی بات پیش کرنا جیسے جانتے ہی نہیں۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اچھا، اب اپنا اگلا پوائنٹ بتائیے۔

انھوں نے کہا کہ ویدک مذہب کی ایک عظیم خصوصیت اس کی لامحدود آزادی ہے۔ آپ آستک ہوں یا ناستک، آپ کنزرویٹو ہوں یا لبرل، آپ مورتی پوجا کو مانیں یا نہ مانیں۔ غرض جو بھی آپ کا

عقیدہ ہو، ہر حال میں آپ ہندوازم کے وسیع دائرہ میں شامل رہتے ہیں۔
میں نے کہا کہ اس کا نام فریڈم نہیں ہے۔ یہ تو ایک قسم کی مذہبی انارکی ہے۔ گیان یا معرفت لازمی طور پر تعین چاہتے ہیں۔ اگر تعین نہ ہو تو گیان اور اگیان میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے گا۔ جس چیز کو آپ فریڈم کہہ رہے ہیں اس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ حقیقت اعلیٰ کو ابھی تک دریافت ہی نہ کر سکے۔ سوامی جی نے دوبارہ اپنی بات کی تائید میں مثالیں پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مجھ کو پھر معافی مانگتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔
آخر میں انھوں نے رسالہ 'دینیات' (انگریزی) سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا جو ان کے نزدیک ان کے نقطۂ نظر کے حق میں ایک حتمی دلیل تھا۔ یہ اقتباس کتاب کے اردو اڈیشن میں "نبوت محمدی کا ثبوت" کے زیر عنوان دیکھا جا سکتا ہے۔
سوامی جی نے کہا کہ دیکھئے، یہاں مصنف خود کہہ رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام ایک اَن پڑھ آدمی تھے۔ وہ جس سماج میں پیدا ہوئے وہاں تعلیم اور تہذیب موجود نہ تھی۔ لوگ وحشیانہ کاموں میں مبتلا تھے۔ جہالت اور لاقانونیت عام تھی۔ پھر ایسے ماحول میں پیدا ہونے والا آدمی کس طرح کوئی اونچا گیان حاصل کر سکتا ہے۔ انھوں نے جوش کے ساتھ کہا کہ ذرا آپ دیکھئے، مصنف کے بیان میں کتنا بڑا تضاد (contradiction) ہے کہ جس آدمی کو وہ خود اَن پڑھ اور وحشی سماج کی پیداوار بتاتے ہیں اسی کو ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کا رافٹ مان رہے ہیں۔
میں نے کہا کہ یہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ مصنف نے مذکورہ باب میں جو بات کہی ہے وہ پیغمبر کے حق میں بطور استدلال ہے اور آپ اس کو اس معنی میں لے رہے ہیں کہ پیغمبر کی شخصیت کس طرح بنی۔ سوامی جی دوبارہ تھوڑی دیر تک انگریزی میں کچھ بات بولے۔ میں نے نرمی سے یاد دلایا کہ سوامی آپ کی یہ بات اصل بحث سے متعلق (relevant) نہیں ہے۔ آخر میں وہ کار کی سیٹ پر پیٹھ ٹیک کر سیدھے بیٹھ گئے اور اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: صبح کے وقت میں زیادہ بولنے کا عادی نہیں ہوں، آج صبح میں نے اشنان بھی نہیں کیا، اس لیے میرے سر میں ہلکا درد بھی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔
پنڈت راجیو اگنی ہوتری نے کہا کہ اسلام کی کوئی وشیش بات بتائیے۔ میں نے قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرو۔ اس کے بعد جو تمہارا دشمن ہے وہ بھی

تمہارا دوست بن جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی آپ کا امکانی دوست ہے۔ نفرت اور دشمنی یہ سب اوپری چیزیں ہیں۔ اوپر سے کوئی غیر انسان دکھائی دے رہا ہو تب بھی اندر سے وہ انسان ہی ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ پہلے زمانہ میں دھرم کا پرچار بہت کم تھا۔ اتنے ست سنگ نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی شانتی تھی۔ اب ہر طرف دھرم کا پرچار ہے۔ ہر جگہ ست سنگ کی دھوم ہے۔ مگر شانتی غائب ہے۔ یہ سوال میں نے کئی لوگوں سے کیا مگر ابھی تک مجھے اتّر نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا اپنا خیال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے مَن میں ایک اتّر ہے، اور وہ یہ کہ پہلے کہنی اور کرنی ایک تھی۔ اب کہنی اور کرنی میں مَت بھید ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آج مذہب کے نام پر بہت سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں مگر یہ ویسی ہی ہیں جیسے دوسری تجارتی سرگرمیاں۔ موجودہ زمانہ کے نئے حالات نے مذہب میں دنیوی انٹرسٹ کا پہلو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ آج مذہب میں پیسہ بھی ہے۔ لیڈری اور عہدہ بھی۔ عزت اور شہرت بھی ہے۔ دنیا کی سیر بھی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مذہب کے نام پر بھی وہی کچھ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے جس کو پہلے زیادہ تر دنیا کے نام پر حاصل کیا جاتا تھا۔

دہلی پہنچ کر ہماری گاڑی پہلے پرمارتھ نکیتن آشرم (گرین پارک) میں رکی۔ یہاں ڈاکٹر کے ایل سیشاگری راؤ عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ امریکہ کے ورجینیا یونی ورسٹی میں تقابلی مذہب کے پروفیسر ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ان سے مفید ملاقات رہی۔ وہ اس سے پہلے میری کئی چیزیں پڑھتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تعجب انگیز خوشی (Pleasant surprise) کا احساس اس پر ہوتا ہے کہ آپ اتنی زیادہ ہوش مندی (sanity) کی بات کرتے ہیں اور پھر بھی آپ اتنے زیادہ پڑھے جاتے ہیں یہ آپ کو زمانہ کے لحاظ سے ایک استثنائی نعمت حاصل ہے۔

آج ہی کے ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر) میں میرا ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا:

Time ripe to end Ayodhya dispute.

انھوں نے اس مضمون کو دیکھا اور میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔ اس پر اور دوسرے موضوعات پر ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں سچا مذہبی آدمی وہ ہے جو سائنس داں ہو، اور سچا سائنس داں وہ ہے جو مذہبی ہو۔ انھوں نے کہا:

A saint cannot be a true saint, if he is not a scientist. A scientist cannot be a true scientist, if he is not a saint.

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے مزید کہا کہ جدید سائنس کی اپنی محدودیتیں ہیں۔ کیوں کہ وہ سائنٹفک طریقہ پر زندگی کے اندرونی حقائق کا پتہ نہیں لگا سکتی :

Modern science has its limitations as it does not pursue inner life with a scientific outlook.

ڈاکٹر سیتا گری راو ورجینیا یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہاں اُن کو ۸۰ ہزار ڈالر سالانہ مل رہے تھے۔ مگر انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم کے لیے انھوں نے یونی ورسٹی کی سروس چھوڑ دی۔ اب وہ رضاکارانہ طور پر انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اس کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ یہ بات مجھے بعد کو سوامی چید انند نے بتائی۔

۷ دسمبر کی سہ پہر کو میں دہلی پہنچا۔ یہاں آج ہی خودکشی کا ایک واقعہ ہوا تھا جس کو ایک صاحب نے مجھے بتایا (اس واقعہ کی تفصیل ٹائمس آف انڈیا ۸ دسمبر ۱۹۹۳ میں دیکھی جا سکتی ہے)

ڈاکٹر دھریندر کانت داس (Dhirendra Kanta Das) انڈین آرمی میں میجر جنرل کی پوزیشن پر تھے۔ وہ میڈیکل شعبہ (Armed Forces Medical Services) کے ڈائرکٹریٹ میں اڈیشنل ڈائرکٹر جنرل تھے۔ سینیریٹی کے اعتبار سے ان کو اب پروموشن ملنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ ڈائرکٹر کے عہدہ پر پہنچ جاتے مگر ان کے نیچے کے ایک افسر ایس جی نیوگی نے حکومت سے پروموشن آرڈر حاصل کر لیا۔ وہ ان کو سپرسیڈ کر کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر داس اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ اپنے دھولا کنواں کے مکان میں باتھ روم کے اندر ایک رسی کے پھندے سے لٹک گئے اور اس طرح خودکشی کر لی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۷ سال تھی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ کو وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔

ڈاکٹر داس نہایت صحت مند تھے۔ ان کے دو بچوں میں سے ایک لڑکا ایم ڈی کر چکا تھا۔ وہ ریٹائر ہو کر دہلی میں ایک اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ مادی اعتبار سے ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے کیوں خودکشی کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پروموشن کے معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ ایک خیالی بات ان کے لیے تمام حقیقی باتوں سے زیادہ اہم ہو گئی۔

وہ اتنا زیادہ نروس ہوئے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو مار ڈالا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ کسی چیز کو وقار کا مسئلہ بنانا سراسر ہلاکت ہے، فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی۔ آدمی پر لازم ہے کہ جو چیز جس درجہ کی ہے اس کو اسی درجہ میں رکھے۔ کسی چیز کو اس کے واقعی درجہ سے بڑھانے ہی کا یہ مہلک نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ چیز وقار کا سوال بن جاتی ہے۔ اگر چیزوں کو ان کے واقعی درجہ میں رکھا جائے تو کبھی وہ وقار کا سوال نہ بنے جو افراد اور قوموں کو خودکشی کے مرحلہ تک پہنچا دیتا ہے۔

رشی کیش میں چند دن گزار کر میں دہلی واپس پہنچا تو خیال آیا کہ رشی کیش ہندستان کا روحانی مرکز ہے اور دہلی ہندستان کا سیاسی مرکز۔ رشی کیش میں ہر طرف روحانی سکون کا ماحول تھا، دہلی میں ہر طرف سیاسی اضطراب کا ماحول۔ ملک میں یہ دونوں دھارے اسی طرح الگ الگ بہہ رہے ہیں جس طرح پریاگ (الٰہ آباد) میں گنگا اور جمنا کا پانی الگ الگ بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

آج ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہ دونوں انسانی دھارے ایک دوسرے میں مل جائیں، روحانیت میں سیاسی آفاقیت پیدا کی جائے اور سیاست کو روحانی غسل دے دیا جائے۔ دو دھاروں کے اسی ملاپ میں ہندستان کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۱

۱۔ انگریزی اخبار نیشن اینڈ دی ورلڈ (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اصغر علی نے ۱۰ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر الرسالہ مشن سے تھا۔ انٹرویو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

۲۔ انگریزی اخبار اکنامک ٹائمس کے نمائندہ مسٹر سنیل رمن نے ۱۲ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد پیدا ہونے والے ملکی حالات سے تھا۔

۳۔ ہندی روزنامہ نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر سدانند پانڈے نے ۱۲ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ دیش کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ کو تعمیری سوچ بنایا جائے اور الگاؤ واد کو ختم کر کے بھائی چارہ اور ایکتا کا مزاج پیدا کیا جائے۔

۴۔ کستوربا گرام (اندور) میں ۲۹۔۳۰ مئی ۱۹۹۳ کو ایک آل انڈیا سمیلن ہوا۔ اس کا موضوع چیتنا ابھیان تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کیے۔ اس سفر کی تفصیلی روداد انشاء اللہ آئندہ شائع کی جائے گی۔

۵۔ ہندی اخبار چوتھا سنسار (اندور) نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اس کے شمارہ ۳۰ مئی ۱۹۹۳ میں نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر موجودہ حالات اور مسلم مسائل سے تھا۔

۶۔ سکندر آباد (یوپی) میں مولانا آزاد ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تحت ۳۰ مئی ۱۹۹۳ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا ہندستانی مسلمان اور پریس (Indian Muslims and the Press) پروگرام کے مطابق، صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر کی نوٹ ایڈریس پیش کرنا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ شرکت نہ کر سکے۔ تاہم اس موضوع پر ان کا لکھا ہوا مقالہ پڑھا گیا۔ یہ مقالہ اردو میں قومی آواز (۲۱ جون ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ کئی انگریزی اخباروں میں چھپ چکا ہے۔

۷۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر یکم جون ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا "فلسفۂ قربانی"۔ اس میں بتایا گیا کہ قربانی کے عمل میں جانور کا ذبیحہ ایک علامتی قربانی ہے۔ اس عمل کا اصل مطلوب یہ ہے کہ آدمی کے اندر نفسیاتی قربانی کی صلاحیت پیدا ہو۔

۸۔ ۸ جون ۱۹۹۲ کو راشٹریہ سہارا (انگلش میگزین) کے نمائندہ مسٹر پردیپ ماتھر نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم پرسنل لا، کامن سول کوڈ اور تطلیق ثلاثہ کے مسائل سے تھا۔

۹۔ اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی (لکھنؤ) کے سالانہ پروگرام (رحلۃ سنویۃ) کے تحت مختلف دینی مدرسوں کے ۲۵ طلبہ ۲۸ جون ۱۹۹۲ کو اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے مرکز کے شعبوں کو دیکھا۔ نماز مغرب کے بعد ان کا اجتماع ہوا۔ سوال و جواب کی صورت میں صدر اسلامی مرکز سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ اس میں مختلف دینی، علمی اور ملی سوالات زیر بحث آئے۔

۱۰۔ انگریزی اخبار پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۲ جولائی کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو پانیر کے شمارہ ۴ جولائی ۱۹۹۲ میں چھپا ہے۔ سوالات کا تعلق الرسالہ مشن، ملکی حالات، ملی مسائل وغیرہ سے تھا۔

۱۱۔ دہلی کے ہندی ہفت روزہ نئی زمین کے نمائندہ مسٹر کرمانی نے ۳ جولائی ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر نکاح و طلاق کے شرعی مسئلہ سے تھا۔ تطلیقات ثلاثہ کے سلسلہ میں فقہاء کا مسلک کیا ہے، اس کی تفصیل بتائی گئی۔

۱۲۔ فرنچ نیوز ایجنسی (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر انیل پنا (Anil Penna) نے ۴ جولائی ۱۹۹۲ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ طلاق کا شرعی طریقہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں حنفی مسلک اور غیر حنفی مسلک کی وضاحت کی گئی۔

۱۳۔ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپرس کے نمائندہ مسٹر گنیش نے ۵ جولائی ۱۹۹۲ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ شریعت اسلامی میں

طلاق کا طریقہ کیا ہے اور تین طلاق کے بارہ میں فقہاء کے درمیان کس قسم کے اختلافات ہیں۔

۱۴- انڈیا ٹوڈے (ہندی) کے سب ایڈیٹر مسٹر سنجے چوہان نے ۱۰ جولائی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر "تین طلاق" کے مسئلہ سے تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف فقہی مکاتب فکر کی رائے کی وضاحت کی گئی۔

۱۵- ایرانی نیوز ایجنسی (IRNA) کے نمائندہ مسٹر محمد سعید عالم نے ۲۱ جولائی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بوسنیا ہرزیگو وینا کے موجودہ مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو اپنی تحریک مقامی عیسائیوں کو ساتھ لے کر چلانا چاہیے تھا۔ اگر وہ اس حکمت کو ملحوظ رکھتے تو یقیناً وہ کامیاب رہتے۔

۱۶- دہلی کی مسجد سنگ تراشان (پہاڑ گنج) میں ۲۲ جولائی ۱۹۹۴ کو بعد نماز جمعہ ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تاجر حضرات اور اسکول اور کالج سے تعلق رکھنے والے حضرات اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے مفصل تقریر کی۔ اس میں بتایا کہ اس وقت امت میں ہر قسم کی دینی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر ایک اہم اسلامی تعلیم حذف ہو گئی ہے اور وہ صبر ہے۔ اس کی وجہ سے ہر محاذ پر ناکامی ہو رہی ہے۔

۱۷- مشہور انگریزی صحافی گری لال جین کا انتقال ۱۹ جولائی ۱۹۹۴ کو ہوا۔ ان کی یاد میں ۲۴ جولائی کو کٹھی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہوئے۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بھی شرکت کی اور گری لال جین اور ملک کی انگریزی صحافت کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۸- مسز مایارام (Shail Mayaram) جے پور کے انسٹی ٹیوٹ آف ڈولپمنٹ اسٹڈیز میں اسوسی ایٹ فیلو ہیں۔ وہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کے بارہ میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ یکم اگست ۱۹۹۴ کو انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

• الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینہ) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	5 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	0 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر، اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۴

فہرست صفحہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 ☐ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

چپ رہنا

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور آخرت کی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ تم میں سے جو شخص کچھ پوچھنا چاہے وہ پوچھے، میں اس کا جواب دوں گا۔ مگر یہ سن کر لوگوں کا حال یہ ہوا کہ شدت احساس سے وہ رونے لگے (فاکثر الناس فی البکاء) فتح الباری ۲/۲۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عرب میں نفاق اور ارتداد پھیل گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ جس شخص کی وجہ سے مسلمانوں کو خدا کی نصرت ملتی تھی، وہ شخص دنیا سے چلا گیا۔ بہت سے قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نازک حالت میں خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں صحابہ کو جمع کیا اور حالات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب یہ تقریر کی تو لوگوں کا حال یہ ہوا کہ وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئے (فاطرقوا طویلاً) حیات الصحابہ ۱/۴۲۲

اس طرح کے واقعات جو کتابوں میں آئے ہیں وہ صحابۂ کرام کا مزاج بتاتے ہیں۔ صحابہ آج کل کے لوگوں کی طرح بڑھ بڑھ کر بولتے نہیں تھے۔ بلکہ اکثر حالات میں وہ چپ رہنا پسند کرتے تھے۔

چپ رہنا بے عملی نہیں، وہ سراپا عمل ہے۔ ایسے مواقع پر جو آدمی چپ ہو جائے وہ دراصل سوچ رہا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر غور کر رہا ہے۔ وہ انسان سے بات کرنے کے بجائے اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے دعاؤں میں مشغول ہے۔ چپ رہنا آدمی کے سنجیدہ ہونے کی علامت ہے، اور بولنا اکثر اوقات آدمی کی بے حسی اور غیر ذمہ داری کی علامت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ مگر صحابہ پوچھنے کے بجائے رونے لگے۔ اللہ سے ڈرنے والے انسان کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں پر ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں معلوم باتوں کی ذمہ داری ہی اب تک ادا نہ کر سکا۔ پھر میں اور باتیں پوچھوں تو کس لیے پوچھوں۔ یہ احساس احتساب اس پر خاموشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ بے محابا ہو کر بولنے لگے۔

قرآن سے تعلق

امام شافعی (۱۵۰ - ۲۰۴ھ) کو اصول فقہ کا موسس کہا جاتا ہے۔ علم وفضل کے علاوہ دینداری اور تقویٰ میں بھی وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ان کے بارہ میں ہے کہ — میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام سے اس درجہ قوی ہو جتنی اپنے زمانہ میں امام شافعی کی تھی۔

امام شافعی کی عمر ابھی دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے قرآن کا حفظ مکمل کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تین دن میں قرآن کی ایک تلاوت مکمل کر لیتے تھے۔ ان کو قرآن سے بہت تعلق تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ہر مسئلہ کی اصل قرآن سے معلوم ہو جائے۔

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امت کا اجماع دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام شافعی کو یہ تلاش ہوئی کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ قرآن کو بار بار پڑھتے اور کوئی ایسی آیت تلاش کرتے جس سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہو سکے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کوشش میں امام موصوف نے ۳۰۱ بار پورے قرآن کو پڑھ ڈالا۔ بالآخر انھوں نے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کر لی۔ ایک روز وہ تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۵ پر پہنچے تو اچانک ان پر منکشف ہوا کہ اس آیت میں اجماع کے حجت ہونے کی شرعی دلیل موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ چلا تو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو ہم کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام شافعی نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہاں سبیل المومنین سے وہی چیز مراد ہے جس کو ہم اجماع امت کہتے ہیں۔

دور اول کے اہل ایمان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ کو قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواہ اس کی خاطر انھیں سینکڑوں بار پورا قرآن پڑھنا پڑے۔ ان کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ کسی چیز کے بارہ میں قرآن کا حکم دریافت نہ کر لیں۔ مگر اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کا استعمال ان کے یہاں یا تو برکت کے لئے ہوتا ہے یا صرف تلاوت کے لئے۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمدؐ قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھا گئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسكت والامام يخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولتا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community
come from breaking the rule of silence.

عقیدہ اور استدلال

مانچسٹر کالج، آکسفورڈ (انگلینڈ) سے ایک جرنل نکلتا ہے۔ اس کا نام فیتھ اینڈ ریزن (Faith and Reason) ہے۔ اس کے شمارہ نمبر ۴ ۱۳ (۱۹۹۲) میں ڈاکٹر پال بیڈھم (Paul Badham) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ ایمان اور عقلیت کے درمیان تعلق:

The Relationship between Faith and Reason

پروفیسر بیڈھم نے اپنا یہ مقالہ نومبر ۱۹۹۱ میں ماسکو کی ایک فلسفیانہ کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ ان کی بابت مذکورہ جرنل میں یہ الفاظ درج ہیں:

Paul Badham is Professor of Theology and Religious Studies at St. David's College, Lampeter, in the University of Wales. His paper in this issue was presented to a Conference of the Institute of Philosophy of the Russian Academy of Sciences in Moscow in November, 1991.

اس مقالہ کا مکمل اردو ترجمہ اسلام اور عصر جدید (نئی دہلی) کے شمارہ اپریل ۱۹۹۲ میں چھپ چکا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید جمال الدین صاحب کے قلم سے ہے۔ میرے سامنے اصل انگریزی جرنل کا مذکورہ شمارہ ہے۔

پروفیسر بیڈھم کا یہ مقالہ اپنے موضوع پر ایک فکر انگیز مقالہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تاہم پروفیسر موصوف نے بعض باتیں ایسی کہی ہیں جن سے راقم الحروف کو اتفاق نہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں یہ لکھا ہے کہ فلسفیانہ قطعیت (philosophical certainty) کو مذہبی ایقان (religious certitude) کے ساتھ گڈ مڈ نہیں کرنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ایمان کو کبھی بھی سائنسی علم والی قطعیت کے درجہ پر نہیں رکھا جا سکتا:

As a philosopher of religion I feel compelled to acknowledge that faith could never be placed on the same level of certainty as scientific knowledge. (p. 6)

درجہ میں سائنسی نظریات کو مانا جاتا ہے۔ کم از کم بیسویں صدی میں اب دونوں کے درمیان کوئی حقیقی فرق نہیں۔

اصل یہ ہے کہ علم حقائق دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جس کو برٹرینڈ رسل نے چیزوں کا علم (knowledge of things) کہا ہے اور دوسرا وہ جس کو وہ حقیقتوں کا علم (knowledge of truths) کہتا ہے۔ یہ دوگانہ تقسیم مذہب میں بھی ہے اور سائنس میں بھی۔ مثلاً جو علماء سائنس حیاتیاتی ارتقا کو سائنسی حقیقت کہتے ہیں ان کے نزدیک اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے مختلف انواع (species) کے جسمانی مظاہر کا معاملہ۔ اور دوسرا ہے وہ قانونِ ارتقا جو انواع کی تبدیلیوں کے درمیان مخفی طور پر جاری رہتا ہے۔

ایک ارتقائی عالم جب انواع حیات کے جسمانی مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے تو گویا کہ وہ "اشیاء" کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب وہ ارتقائی قانون کا مطالعہ کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے موضوع کے اس پہلو کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے جس کو اوپر کی تقسیم میں "حقیقت" کہا گیا ہے۔

ہر ارتقائی عالم جانتا ہے کہ دونوں پہلوؤں کے درمیان نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں جہاں تک اشیاء یا شواہد ارتقاء کے مطالعہ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں براہ راست دلائل قابل حصول ہیں۔ مثال کے طور پر متحجرات (fossils) جو کھدائی کے ذریعہ زمین کی تہوں سے کثرت سے برآمد کئے گئے ہیں، ان کا مطالعہ مشاہداتی سطح پر ممکن ہے۔

اس کے برعکس حقائق یا قانون ارتقاء کے معاملہ میں موضوعی شواہد نہ ہونے کی وجہ سے اس پر براہ راست استدلال ممکن نہیں۔ مثلاً ارتقائی عمل کے دوران اشکال میں اچانک تبدیلیوں (mutations) کا نظریہ، جو تمام تر قیاسات پر مبنی ہے نہ کہ براہ راست مشاہدات پر۔ اس دوسرے معاملہ میں خارجی تغیر تو دکھائی دیتا ہے، مگر قانونِ تغیر بالکل نظر نہیں آتا۔ اس لئے ہر عالم ارتقاء موضوع کے اس دوسرے پہلو میں بالواسطہ استدلال سے کام لیتا ہے جس کو علم منطق میں استنباطی استدلال (inferential argument) کہا جاتا ہے۔

تبدیلی کا یہ نظریہ ارتقاء کی بنیاد ہے۔ تاہم اس معاملہ کے دو حصے ہیں۔ اس کا ایک جزء مشاہدہ

میں آتا ہے۔ مگر اس کا دوسرا جزء مکمل طور پر ناقابل مشاھدہ ہے۔ وہ صرف استنباط کے اصول سے کام لے کر فلسفۂ ارتقا میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ ایک عام واقعہ ہے کہ انسان یا جانور سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ سب ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے۔ ان میں مختلف اعتبار سے کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس حیاتیاتی مظہر کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ رحم مادر میں بچہ کے جینز کے اندر اچانک طور پر خود بخود تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں (spontaneous changes)۔ یہی تبدیلیاں ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونے والے بچوں میں فرق کا سبب ہیں۔

اولاد میں ایک دوسرے کے درمیان یہ فرق ایک مشاہداتی واقعہ ہے۔ مگر اس کے بعد اس مشاہدہ کی بنیاد پر جو ارتقائی فلسفہ بنایا گیا ہے وہ خود مکمل طور پر ناقابل مشاہدہ ہے اور صرف قیاسی استنباط کے ذریعہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ گویا انشیاء ارتقا قابل مشاہدہ ہیں اور حقائق ارتقاء ناقابل مشاہدہ۔

یہاں ارتقائی عالم یہ کرتا ہے کہ ایک سرے پر وہ ایک بکری کو رکھتا ہے اور دوسرے سرے پر ایک زرافہ کو۔ اس کے بعد وہ فاسل کے کچھ درمیانی نمونوں کو لے کر یہ نظریہ بناتا ہے کہ ابتدائی بکری کے کئی بچوں میں سے ایک بچہ کی گردن اتفاقاً کچھ لمبی تھی۔ اس کے بعد اس لمبی گردن والی بکری کی اولاد ہوئی تو اس میں گردن کی یہ لمبائی کچھ اور بڑھ گئی۔ اسی طرح کروڑوں سال کے دوران گردن کی یہ لمبائی نسل در نسل جمع ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ابتدائی بکری کی اگلی اولاد آخر کار زرافہ جیسا جانور بن گئی۔ اسی نظریہ کے تحت چارلس ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع میں لکھا ہے کہ مجھ کو یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ایک معمولی کھر دار چوپایہ زرافہ جیسے جانور میں تبدیل ہو سکتا ہے:

...it seems to me almost certain that an ordinary hoofed quadruped might be converted into a giraffe. (p. 169)

اس معاملہ میں بکری کی اولاد میں فرق ہونا بذات خود ایک معلوم واقعہ ہے۔ مگر اس فرق کا کروروں سال تک نسل در نسل جمع ہوتے ہوئے اس کا زرافہ بن جانا، مکمل طور پر ناقابل مشاہدہ اور ناقابل تجربہ ہے۔ وہ صرف مشاہدہ کی بنیاد پر استنباط کے ذریعہ اخذ کیا گیا ہے۔ نہ کہ براہ راست طور پر خود مشاہدہ کے ذریعہ۔

ٹھیک یہی معاملہ مذہب کے موضوع کا بھی ہے۔ مذہب کے مطالعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ

آپ اس کی تاریخ، اس کی شخصیات، اس کے احکام اور اس کے رسوم ورواج کا مطالعہ کریں۔ یہ مذکورہ تقسیم کے مطابق گویا اشیاء مذہب کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس پہلو سے مذہب میں بھی موضوعی معلومات دستیاب ہیں۔ اس لئے یہاں مذہب کا مطالعہ بھی ٹھیک اسی طرح براہ راست شواہد کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے جس طرح حیاتیاتی ارتقاء کے حصہ اول میں کیا جاتا ہے۔

مذہب کے مطالعہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو عام طور پر غیبیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ عقائد ہیں جو ہماری محسوس دنیا سے ماورا ہیں۔ یعنی خدا اور فرشتوں کا وجود، وحی کی حقیقت، جنت اور دوزخ کا عقیدہ وغیرہ۔ مذہب کے اس دوسرے پہلو میں براہ راست شواہد موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اس اعتبار سے مذہب کا مطالعہ اس منطقی اصول کی روشنی میں کیا جائے گا جس کو شواہد کی بنیاد پر استنباط کہا جاتا ہے۔ یعنی وہی منطقی اصول جس کو علماء ارتقاء اپنے نظریہ کے دوسرے پہلو کے مطالعہ میں استعمال کرتے ہیں۔

اس تجزیہ کی روشنی میں دیکھئے تو مذہب اور سائنس دونوں کا معاملہ بالکل یکساں ہے۔ دونوں ہی میں دو الگ الگ حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جو علمی قطعیت (scientific certainty) پر قائم ہے اور جس میں براہ راست استدلال ممکن ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو علمی استنباط (scientific inference) پر مبنی ہے اور جس کو ثابت کرنے کے لئے صرف بالواسطہ استدلال کا اصول استعمال کیا جاتا ہے۔ اس علمی تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

پروفیسر بیڈہم کا غیر ضروری احساس کمتری اس لئے ہے کہ وہ مذکورہ فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو گڈ مڈ کر رہے ہیں۔ اور غیر صحیح تقابل کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ سائنس کے پہلے جزء کا مقابلہ مذہب کے دوسرے جزء سے کر رہے ہیں اور مذہب کے دوسرے جزء کو سائنس کے پہلے جزء کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ اس غیر صحیح تقابل نے وہ صورت پیدا کی ہے جو ان کے مقالہ میں نظر آتی ہے۔

اگر پروفیسر موصوف سائنس کے پہلے جزء کا مقابلہ مذہب کے پہلے جزء سے کریں اور اسی طرح سائنس کے دوسرے جزء کو مذہب کے دوسرے جزء کی روشنی میں دیکھیں تو ان کا احساس کمتری ختم ہو جائے۔ وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ خالص اصولی اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ

سائنس کے دونوں اجزاء میں دو الگ الگ طرز استدلال استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنس کے پہلے جزء میں جو استدلال مستعمل ہے وہ مذہب کے بھی پہلے جزء میں قابل حصول ہے۔ اسی طرح سائنس کے دوسرے جزء میں جو استدلال استعمال ہوتا ہے وہی مذہب کے دوسرے جزء میں بھی عین ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف برٹرینڈرسل جیسے شخص نے کیا ہے جو فلسفۂ الحاد کا امام سمجھا جاتا ہے۔ برٹرینڈرسل کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے میں عیسائی کیوں نہیں :

Why I am not a Christian

اس کتاب کے آغاز میں برٹرینڈرسل نے اس پر بحث کی ہے کہ معقول استدلال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب بدھ ازم، ہندوازم، مسیحیت اور اسلام غلط اور بے حقیقت ہیں منطقی طور پر ان کی معقولیت کو ثابت کرنا ممکن نہیں۔ جو لوگ مذہب کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ اس کو اپنی قومی روایات کے زور پر اختیار کئے ہوئے ہیں نہ کہ دلائل کے زور پر۔

تاہم برٹرینڈرسل نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل مذہب کے دلائل میں سے ایک دلیل ایسی ہے جو خالص منطقی یا غیر علمی نہیں۔ میری مراد اس چیز سے ہے جس کو نظم سے استدلال کہا جاتا ہے۔ تاہم اس دلیل کو ڈارون نے رد کر دیا ہے:

There is one of these arguments which is not purely logical. I mean the argument from design. This argument, however, was destroyed by Darwin.

برٹرینڈرسل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے وجود پر اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں جب نظم ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک ناظم ہو۔ یعنی جب ڈیزائن ہے تو ڈیزائنر کا ہونا بھی لازم ہے۔ برٹرینڈرسل اعتراف کرتا ہے کہ یہ طریق استدلال اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی طرز استدلال ہے جس کو سائنسی نظریات کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم اس اعتراف کے باوجود برٹرینڈرسل یہ کہہ کر اس کو قبول نہیں کرتا کہ ڈارونزم نے اس کو رد کر دیا ہے۔

مگر یہ سراسر ایک بے بنیاد بات ہے۔ کیوں کہ ڈارون کے نظریہ کا تعلق خالق (creator) کے وجود سے نہیں ہے بلکہ خالق کی تخلیق (creation) کے عمل سے ہے۔ ڈارونزم کا خلاصہ یہ ہے کہ مختلف انواع جو دنیا میں دکھائی دیتی ہیں وہ الگ الگ تخلیق نہیں کی گئی ہیں بلکہ ایک ہی نوع لمبے ارتقائی عمل

کے درمیان مختلف انواع میں تبدیل ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کا کوئی تعلق خدا کے وجود یا عدم وجود سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق عملِ تخلیق سے ہے نہ کہ کارسازِ تخلیق سے۔ یعنی پہلے اگر یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ہر ہر نوع کو الگ الگ پیدا کیا ہے تو اس کو ماننے کی صورت میں اب یہ عقیدہ ہو جائے گا کہ خدا نے ایک ابتدائی نوع ایسی پیدا کی جس کے اندر امکانی طور پر بے شمار انواع میں تقسیم ہونے کی صلاحیت تھی۔ اور پھر اس نے اس کے موافق کائنات میں ایک نہایت محکم فطری پراسس جاری کر دیا۔ اس طرح لمبے پراسس کے دوران ابتدائی نوع اپنے امکانات (potential) کو ظاہر کرتی ہوئی بے شمار انواع میں تبدیل ہوگئی۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ نظریۂ ارتقار ذات خداوندی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس بات کا مطالعہ ہے کہ خدا نے اپنی قدرت کو کس طرح عالم کائنات میں ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ خود ڈاروِن نے اپنی مشہور کتاب اصل الانواع (Origin of Species) کے آخر میں یہ الفاظ درج کئے ہیں۔

زندگی کے اس نقطۂ نظر میں بڑی عظمت ہے کہ اپنی مختلف طاقتوں کے ساتھ ابتداءً خالق نے زندگی کو ایک یا کئی شکلوں میں وجود دیا۔ اور اس اثنا میں جب کہ یہ سیارہ کشش ثقل کے مقرر قانون کے تحت گردش کر رہا تھا، اتنے زیادہ سادہ آغاز سے لاتعداد انتہائی خوبصورت اور عجیب صورتیں بن کر تیار ہوگئیں:

> There is grandeur in this view of life, with its several powers, having been originally breathed by the Creator into a few forms or into one; and that, whilst this planet has gone cycling on according to the fixed law of gravity, from so simple a beginning endless forms most beautiful and most wonderful have been, and are being evolved. (p. 408)

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں جو نئے عالمی حقائق دریافت ہوئے ہیں انھوں نے منطق کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے۔ اب مذہبی استدلال اور علمی استدلال (scientific argument) کا وہ فرق ختم ہو چکا ہے جو بیسویں صدی سے پہلے خلاف واقعہ طور پر فرض کر لیا گیا تھا۔ اب استدلال کے اعتبار سے سائنس کا معاملہ بھی ٹھیک اسی مقام پر پہنچ چکا ہے جو پہلے صرف مذہب کے لئے سمجھا جاتا تھا۔

نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) نے خصوصی طور پر نظام شمسی کا مطالعہ کیا۔ اس نے سورج کے گرد سیاروں

کی گردش کے قوانین معلوم کئے۔ اس کا یہ مطالعہ زیادہ تر آسمانی اجرام (astronomical bodies) تک محدود تھا۔ اس کو دوسرے لفظوں میں عالم کبیر (macro-world) کا مطالعہ کہہ سکتے ہیں۔ عالم کبیر میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ چیزوں کو دیکھا اور ناپا اور تولا جاسکے۔ اس بنا پر فوری تاثر کے تحت بہت سے لوگوں کا یہ ذہن بن گیا کہ حقیقت قابل مشاهده ہے اور صحیح اور جائز استدلال وہی ہے جو مشاهداتی دلائل پر مبنی ہو۔ اسی تصور کے تحت وہ فلسفہ بنا جس کو عام طور پر پازیٹیوزم (positivism) کہا جاتا ہے۔

مگر بیسویں صدی کے ربع اول میں وہ حقائق دریافت ہوئے جنھوں نے مذکورہ ابتدائی نظریات کا جڑ سے خاتمہ کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم ظاہر کے اندر زیادہ بڑے پیمانے پر ایک عالم غیر ظاہر موجود ہے۔ اس عالم غیر ظاہر کو سمجھنا یا اس پر دلیل قائم کرنا صرف بالواسطہ انداز میں ممکن ہے۔ یعنی کسی چیز کے اثرات (effects) کو دیکھ کر اس چیز کی موجودگی کا علم حاصل کرنا۔

اس انکشاف نے سارے معاملہ کو بدل دیا۔ انسانی علم کی رسائی جب تک عالم کبیر تک محدود تھی وہ مذکورہ غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ مگر جب انسانی علم کی رسائی عالم صغیر (micro-world) تک پہنچ گئی تو علمی صورت حال اپنے آپ بدل گئی۔

اب معلوم ہوا کہ براہ راست استدلال کا میدان بہت محدود ہے۔ نئے حقائق جو انسان کے علم میں آرہے تھے وہ اتنے لطیف تھے کہ صرف استنباطی یا بالواسطہ استدلال ہی وہاں قابل عمل نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر جرمن سائنس داں رانٹجن (Whilhelm Conrad Rontgen) نے ۱۸۹۵ میں ایک تجربہ کے دوران پایا کہ اس کے سامنے کے شیشہ پر کچھ اثر (effect) ظاہر ہو رہا ہے جب کہ اس کے تجربہ اور اس شیشہ کے درمیان کوئی معلوم رشتہ موجود نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک نا قابل مشاہدہ شعاع (invisible radiation) ہے جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ اس کی نامعلوم نوعیت (unknown nature) کی بنا پر رانٹجن نے اس کا نام اکسرے (X-rays) رکھ دیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (19/1058)

بیسویں صدی میں اکسریز جیسی بہت سی چیزیں دریافت ہوئیں جو براہ راست انسانی مشاہدہ میں نہیں آرہی تھیں۔ تاہم ان کے اثرات جو علم میں آئے ان کی بنا پر ان کے وجود سے انکار کرنا بھی ممکن

۔ان جدید تحقیقات کے نتیجہ میں جس طرح علم کے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں ہوئیں، اسی طرح
نے علم منطق میں بھی تبدیلیاں کیں۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ استنباطی استدلال کو بھی ایک معقول استدلالی معیار کے طور پر تسلیم کر لیا
۔کیوں کہ اس کے بغیر اکسریز کی تشریح نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بغیر ایٹم کے سائنسی ڈھانچہ کو
ممکن نہ تھا۔ اس کے بغیر ڈارک میٹر کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں معیار استدلال میں اس توسیع کے بعد دینی معتقدات پر استدلال اتنا ہی
نول (valid) بن گیا جتنا کہ سائنسی نظریات پر استدلال۔ جس استنباطی منطق سے سائنس کے
یہ دریافت شدہ نظریات ثابت کئے جا رہے تھے، عین اسی استنباطی منطق سے دینی عقائد بھی پوری
ح ثابت ہو رہے تھے۔ اس کے بعد وہ استدلالی فرق ختم ہو گیا جو پہلے دونوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔

ایک سوال کا جواب

مقالہ نگار نے آخر میں لکھا ہے کہ میں ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ بہت سے ممتاز اور فکرمند ارباب علم
ں جو اس کو ناممکن پاتے ہیں کہ وہ میرے مذہبی عقائد سے اتفاق کریں، اگرچہ وہ اس موضوع کو انتہائی
بیدگی اور توجہ کے ساتھ لے رہے ہوتے ہیں۔ اور میں اس بات کا اقرار کروں گا کہ دنیا میں اتنی زیادہ
.ائیاں اور اتنی زیادہ مصیبتیں اس عقیدہ کے خلاف شہادت دیتی ہیں کہ یہاں کوئی قادر مطلق خدا
ہے جو اپنی مخلوقات سے محبت کرتا ہے:

> And I have to acknowledge that the existence of so much evil and suffering in the world counts against any vision of an all-powerful and loving God. (p. 7)

میں کہوں گا کہ برائی ایک اضافی لفظ ہے۔ کوئی بظاہر برائی صرف اس وقت برائی ہے جب کہ اس کی
ذجیہ نہ کی جا سکتی ہو۔ ڈاکٹر ایک مریض کے جسم پر نشتر چلاتا ہے۔ جج ایک مجرم کو سولی پر چڑھانے کا حکم
افذ کرتا ہے۔ بظاہر یہ ایک ظلم ہے۔ مگر ہم اس کو برا نہیں کہتے۔ کیوں۔ صرف اس لئے کہ ہمارے پاس ڈاکٹر
ور جج کے فعل کی معقول توجیہ موجود ہے۔ یہی معاملہ اس برائی کا ہے جس کی طرف مقالہ نگار نے اشارہ کیا۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہاں جو برائی ہے وہ صرف انسانی معاشرہ میں ہے، ساری کائنات میں نہیں
ہے۔ انسان کی محدود دنیا کو چھوڑ کر جو وسیع کائنات ہے، وہ انتہائی معیاری ہے۔ وہ مکمل طور پر نقص اور

خرابی سے پاک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا میں کیوں برائی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کو جاننا ہوگا۔ خدا کا تخلیقی منصوبہ ہی وہ واحد کسوٹی ہے جس پر جانچ کر اس کی نوعیت کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں انسان کو آزمائش (ٹسٹ) کے لئے رکھا گیا ہے۔ اسی آزمائش کے ریکارڈ کے مطابق ہر آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آزمائش کی اس مصلحت ہی کی بنا پر آدمی کو یہاں آزادی دی گئی ہے۔ اگر آدمی کو آزادی نہ دی جائے تو آزمائش کی بات بالکل بے معنی ہو جائے گی۔

مذکورہ برائی دراصل اسی آزادی کی قیمت ہے۔ خدا ان انسانوں کا انتخاب کرنا چاہتا ہے جو آزادی پانے کے باوجود بااصول اور پابند زندگی (disciplined life) گزاریں۔ ایسے انسانوں کے انتخاب کے لئے بہر حال آزادی کا ماحول بنانا ہوگا۔ اگرچہ آزادی کے اس ماحول کی بنا پر کچھ لوگ ظلم بھی کریں گے۔ مگر یہ ایک ناگزیر قیمت ہے جس کو دئے بغیر وہ تخلیقی منصوبہ مکمل نہیں ہو سکتا جس سے بہتر تخلیقی منصوبہ اس دنیا کے لئے قابل تصور نہیں۔

موجودہ دنیا صرف اس وقت بے معنی دکھائی دیتی ہے جب کہ اس کو آخرت کے بغیر ایک مستقل دنیا کے طور پر دیکھا جائے۔ مگر جب ہم موجودہ دنیا کو آخرت کی دنیا سے ملا کر دیکھتے ہیں تو سارا معاملہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اب وہ انتہائی بامعنی بھی ہو جاتی ہے اور انتہائی قابل قدر بھی۔

اعلان

۱۔ اگست ۱۹۹۵ کا الرسالہ "سفرنامۂ اسپین" پر مشتمل ہوگا۔ یہ سو صفحہ کا ہوگا اور اس کی قیمت فی شمارہ دس روپے ہوگی۔

۲۔ ستمبر ۱۹۹۵ کے شمارہ میں ان شاء اللہ ایک مفصل مضمون یکساں سول کوڈ کے بارہ میں شامل ہوگا۔

روحانیت کا مسئلہ

روحانیت (اسپریچولزم یا مسٹسزم) کا تصور ہزاروں سال سے دنیا میں موجود رہا ہے۔ اس کے تحت مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ان مکاتب فکر کا تفصیلی جائزہ یہاں نہیں لیا جاسکتا۔ تاہم اختصار کے ساتھ ان کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ اسلام کا تصور روحانیت اس کے بالمقابل واضح ہو کر سامنے آسکے۔

اس سلسلہ میں تین بنیادی تصورات یہاں قابل ذکر ہیں۔ پہلا تصور وہ ہے جس کے مطابق روحانیت نام ہے خود اپنی اندرونی شخصیت سے ربط قائم کرنے کا۔ اس نظریہ کا کہنا ہے کہ انسان کا اندرونی وجود ایک پراسرار سمندر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم عام حالات میں وہ انسان کے لئے غیر دریافت شدہ ہوتا ہے۔ سمندر کے آئس برگ کی طرح، اس وجود کا تھوڑا سا حصہ شعور کے دائرہ میں ہوتا ہے اور اس کا زیادہ حصہ لاشعور کے دائرہ میں۔ روحانیت کا مدعا یہ ہے کہ اپنے شعور کو خود اپنے لاشعور سے مربوط کیا جائے۔ ایسا کرنے سے آدمی کو ذہنی یا روحانی ارتقاء کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہنی وجود کو شعوری طور پر مکمل کرتا ہے۔

اس نظریہ میں ایک جزئی صداقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے اپنے وجود کے امکانات اس سے زیادہ ہیں جتنا کہ عام حالت میں شعور کے ادراک میں ہوتے ہیں۔ تاہم یہ انسان کی اصل تلاش (quest) کا جواب نہیں۔ انسان اپنے شعور اور لاشعور سمیت بہر حال ایک محدود مخلوق ہے۔ اور محدود کو پانا انسان کی تلاش کا مطلوبہ جواب نہیں ہوسکتا۔

انسان کی تلاش، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، اپنی تکمیل کی تلاش ہے نہ کہ محض اپنی دریافت کی تلاش۔ انسان اپنی فطرت کی بنا پر محدودیت پر قانع نہیں ہوسکتا۔ انسان ہر اعتبار سے ایک محدود ہستی ہے۔ اب وہ لامحدود کو پانا چاہتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی محدودیت کی تلافی کرسکے۔

مذکورہ نظریہ کے تحت ساری کوشش کے بعد بھی آخر کار جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ کہ محدود دوبارہ محدود کو پالے۔ محدود کا محدود کو پانا انسان کی تلاش کا حقیقی جواب نہیں

اس لئے وہ اس کو مطمئن کرنے والا بھی نہیں۔

یہ مسئلہ اصولی طور پر ادراکِ حقیقت کا مسئلہ ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف ادراکِ ذات کا مسئلہ۔ انسان اگر خود کامل حقیقت ہوتا تو وہ کبھی تلاش کی نفسیات کا حامل نہ ہوتا۔ تلاش کی نفسیات خود انسان کے لاشعور کا حصہ ہے۔ پھر اگر لاشعور کوئی کامل وجود ہے تو وہ ہمیشہ تلاش کی نفسیات میں کیوں مبتلا رہتا ہے۔ جب کہ تلاش کی نفسیات متلاشی کے ناقص ہونے کی علامت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر خود کامل وجود ہوتا تو وہ کبھی تلاش کی فطرت لے کر پیدا نہ ہوتا۔ تمام انسان کا تلاش کی فطرت کے ساتھ پیدا ہونا اس بات کا ایک داخلی ثبوت ہے کہ انسان اپنی ذات میں کوئی کامل وجود نہیں۔ وہ یقینی طور پر ایک غیر کامل وجود ہے۔ اور یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان کی روحانی تلاش کا نشانہ اس کی اپنی ذات نہیں ہو سکتا۔

روحانیت کا دوسرا نظریہ، بنیادی طور پر، وہ ہے جو فلسفۂ وحدت الوجود (monism) کے تحت پیدا ہوا۔ وحدت الوجود کا نظریہ، تفصیلات سے قطع نظر، یہ ہے کہ تمام موجودات ایک ہی اصل کے مختلف مظاہر ہیں۔ انسان اور جو کچھ انسان کے ماوراء ہے، سب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ عالم موجودات وحدت کا ظہور ہے نہ کہ تعدد کا ظہور۔ ایک فلسفی نے ہمہ اوست کے اس نظریہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

> The knower and the known are one. God and I, we are one in knowledge, and there is no distinction between us. (12/787)

اس نظریہ کے مطابق روحانیت کا مطلب، سادہ طور پر، یہ ہے کہ جزء اپنے کل کو جاننا چاہے تاکہ آخر کار وہ اس کو دریافت کر کے اس میں شامل ہو جائے۔

روحانیت کا یہ دوسرا نظریہ علمی طور پر ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ اگر چہ فلسفہ اور مذہب دونوں حلقوں میں یہ نظریہ بہت زیادہ مقبول رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص یا کوئی بھی مکتب فکر ایسا نہیں جس نے اس نظریہ کے حق میں کوئی واقعی دلیل دی ہو۔

روحانیت کی تلاش کو جزء کی طرف سے کل کی تلاش بتانا موجودہ صورت میں قابل غور نہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ انسان کی نوعیت فی الواقع یہی ہے

کہ وہ ایک حقیقتِ کلی کا جزء (انش) ہے۔ جب خود یہ ابتدائی بات ثابت نہ ہوئی ہو تو اس کی بنیاد پر روحانیت کی فلسفیانہ تعبیر کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے۔

ہمہ اوست کے حق میں اب تک جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں وہ یا تو صرف لفظی بیان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا اگر کسی نے کوئی دلیل دینے کی کوشش کی ہے تو وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے صرف تمثیل ہے۔ "دنیا کی تمام چیزیں ایک حقیقت کلی کا مختلف ظہور ہیں" محض ایک لفظی بیان ہے، اور کسی کا لفظی بیان کبھی دلیل کا بدل نہیں ہو سکتا۔

تمثیلی دلیل کے طور پر کہا جاتا ہے کہ سمندر سے ایک قطرہ اگر نکال لیا جائے تو وہ قطرہ بھی اپنی نوعیت میں چھوٹا سمندر ہوگا۔ اسی طرح انسان حقیقت کے وسیع سمندر کا ایک چھوٹا سا قطرہ ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے اور کوئی مثال کبھی کسی حقیقت کو ثابت نہیں کرتی۔ کسی ثابت شدہ حقیقت کی مزید تفہیم کے لئے ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ مگر خود حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے مثال دینا سراسر غیر علمی اور غیر منطقی ہے۔

"ہمہ اوست" کے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے دو میں سے ایک دلیل لازمی طور پر ضروری ہے۔ یا تو سائنسی تحقیق سے اس کا ثبوت فراہم ہوا ہو۔ یا یہ کہ الہامی مذہب میں حقیقی طور پر اس کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ مگر یہ نظریہ نہ تو سائنس سے ثابت ہوتا اور نہ الہامی مذہب میں اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل پائی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں جو مدرسۂ فکر روحانی تلاش کو ہمہ اوست کی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے وہ بلاشبہ ایک بے بنیاد زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ کیوں کہ اس نظریہ کی پشت پر نہ علم انسانی کی تصدیق موجود ہے اور نہ وحی الٰہی کی تصدیق۔

روحانی تلاش کا مطلب، اسلامی نقطۂ نظر سے، یہ ہے کہ بندہ اپنے خدا سے مربوط ہونا چاہے۔ وہ صلۃ العبد بربہ کے مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسلامی روحانیت دراصل خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی معرفت سے کسی انسان کو قلب و دماغ کی سطح پر جو چیز حاصل ہوتی ہے اسی کو اسلامی روحانیت کہا جاتا ہے۔

یہاں دوبارہ اسلامی روحانیت کے دو مدرسۂ فکر بن گئے ہیں۔ ایک کو قرآنی مدرسۂ فکر کہا

جا سکتا ہے اور دوسرا وہ جو عام طور پر تصوف کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تصوف کی بہت سی شاخیں اور بہت سی شکلیں ہیں۔ اس اختلاف و تنوع کو کسی واحد اصول کی صورت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم تصوف اپنے آخری تجزیہ میں جس چیز کا نام ہے وہ بنیادی طور پر دو ہیں ـــــ ایک، شیخ طریقت، دوسرے اوراد و وظائف۔ یہ دونوں چیزیں مکمل طور پر بدعت ہیں۔ کیوں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں پائی نہیں جاتی تھی۔

روحانی ترقی کے لئے شیخ کو ذریعہ بتانا یقینی طور پر کہنوت (گروڈم) کو اسلام میں داخل کرنا ہے۔ جب کہ کہنوت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو اس لئے آیا ہے کہ وہ کہنوت کی نفی کرے۔ قدیم زمانہ میں تمام مذاہب نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی پیشواؤں کو بطور واسطہ بٹھا رکھا تھا۔ اسلام نے اس درمیانی واسطہ کو ختم کیا اور اعلان کیا کہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ مگر اسلام کے ظہور کے تین سو سال بعد سابقہ جاہلی تصور کو مقدس بنا کر اسلام میں داخل کر دیا گیا۔ اس قسم کا کوئی تصور روحانی ترقی میں رکاوٹ ہے نہ کہ مددگار۔

اسی طرح اوراد و وظائف کا وہ سارا سلسلہ بدعت ہے جس کو صوفیا نے بعد کے زمانہ میں اختیار کیا۔ جو طریقہ پیغمبر خدا نے نہ سکھایا ہو وہ کبھی معرفت الٰہی کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہر نیا طریقہ معرفت الٰہی میں رکاوٹ تو بن سکتا ہے مگر وہ اس کے لئے زینہ کا کام نہیں دے سکتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اوراد و وظائف کے مروجہ طریقے سنت رسول سے ثابت نہیں۔

مزید یہ کہ یہ تمام اوراد و وظائف جسمانی عمل ہیں اور جسمانی ورزش کبھی روحانی ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ جسمانی عمل جسم کے اندر کوئی صفت پیدا کر سکتا ہے۔ مگر جسمانی عمل سے روحانی صفت پیدا ہونا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کے وجود کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کا ایک ظاہری جسم ہے جو مختلف قسم کی مادی ضرورتیں رکھتا ہے۔ ان مادی چیزوں کی فراہمی کے بغیر مادی جسم کا بقا ممکن نہیں۔ مثلاً کھانا، پانی، کپڑا، مکان وغیرہ۔ انسانی شخصیت کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس کے

رہ ایک غیر مرئی ہستی موجود ہے جس کو روح کہا جاتا ہے۔ اس روح کی بھی کچھ ضرورتیں ہیں۔ مگر یہ ضرورتیں مادی نوعیت کی نہیں ہیں۔ وہ تمام تر غیر مادی نوعیت کی ہیں۔ روح اپنی ذات میں ایک معنوی وجود ہے، اس لئے اس کی ضرورتیں بھی معنوی نوعیت کی چیزوں ہی سے پوری ہو سکتی ہیں۔

اس تقسیم کے مطابق، انسان چوں کہ دوہرا شخصیت کا مالک ہے، اس لئے انسان کو زندہ رہنے کے لئے دو قسم کے رزق کی مسلسل فراہمی درکار ہے۔ ایک وہ جس کو رزق جسمانی کہا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کو رزق روحانی کہہ سکتے ہیں۔ رزق جسمانی کے حصول کا مرکز قرآن کے مطابق، موجودہ زمین ہے (ابراہیم ۳۲) اور رزق روحانی کے حصول کا مرکز ذات خداوندی ہے۔ اسی لئے قرآن میں اس دوسرے رزق کو رزق رب (طٰہٰ ۱۳۱) یا رزق حسن (ہود ۸۸) کہا گیا ہے۔

رزق روحانی در اصل خارجی سرچشمہ رزق سے اتصال کا نتیجہ ہے۔ یہ مقصد تمام تر ذہنی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس ذہنی عمل کو قرآن میں تذکر اور تفکر کہا گیا ہے۔ آدمی جب اپنے ذہن کو عالم خارجی سے ہٹا کر عالم باطنی کی طرف لے جاتا ہے، جب وہ اشیاء کے مادی پہلو سے اوپر اٹھ کر ان کے معنوی پہلو پر اپنی سوچ کو مرتکز کرتا ہے تو اس وقت انسان ایک نئی دنیا سے متعارف ہوتا ہے۔ وہ نئی لطیف تر حقیقتوں کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی معرفت کو بڑھاتا ہے اور اس طرح اس کو وہ رزق عطا کرتا ہے جس کے اوپر وہ جی سکے۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو کسی حد پر ٹھہرنا نہیں جانتا۔ حد پر ٹھہرنا آدمی کے لئے ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔ کسی آدمی کا حد پر ٹھہر جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ رزق روحانی سے محروم ہو گیا۔ کیوں کہ جس آدمی کو رزق روحانی سے حصہ مل رہا ہو، اس کا فکری ارتقاء مسلسل جاری رہے گا۔

۲۸ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ یہاں میری تقریر ہوئی۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوا۔

میں نے کہا کہ اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اکثر مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس دنیا میں ہمیشہ مسائل رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ امریکہ چھوڑ کر مکہ مدینہ چلے جائیں تو وہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ مسائل موجود ہیں۔ اس لئے اصل مسئلہ مسئلہ کا ہونا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسئلہ کا سامنا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہ ہو۔ آپ کو چاہئے کہ مسئلہ کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے اس کے بارہ میں سوچیں اور اپنے جوابی عمل کا نقشہ بنائیں۔

آرنج کاونٹی رجسٹر (۳۰ دسمبر) میں رائٹر کے حوالے سے ایک خبر تھی۔ اس نے سرخ خیل (افغانستان) سے یہ رپورٹ بھیجی تھی کہ تغب وادی میں حریف افغانی گروہوں کے درمیان سخت لڑائیاں (fierce battles) جاری ہیں۔ یہ علاقہ کابل کے مشرق میں واقع ہے۔ ان لڑائیوں کے نتیجہ میں دس ہزار سے زیادہ افغانی اپنے وطن کو چھوڑ کر بھاگے ہیں۔ ریڈ کراس نے ان کے قیام کا انتظام عارضی کیمپوں میں کیا ہے۔ یہ لڑائی دو مہینہ سے جاری ہے۔ اس خبر کی سرخی یہ تھی :

10,000 flee fierce Afghan factional strife.

سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد افغانی اس طرح کیوں آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی ہی ان کا طریق زندگی ہے۔ گن کلچر کے سوا کسی اور کلچر کو وہ جانتے ہی نہیں۔ افغانیوں کی اصل ضرورت ہتھیاروں کی سپلائی نہیں ہے۔ ان کی اصل ضرورت یہ ہے کہ ان کو تعمیری سوچ دی جائے۔ ان کو تعلیم کی طرف موڑا جائے۔ ان کو بتایا جائے کہ عزت اور ترقی کا راز گولی میں نہیں ہے بلکہ علم میں ہے۔

ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ دور اول کے مسلمانوں کے لئے ہر طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ آج وہ شکایت کرتے ہیں کہ ہر طرف کے دروازے ان کے لئے بند ہیں۔ پہلے ہر جگہ ان کو حمایت مل رہی تھی، آج ہر جگہ ان کو مخالفت سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ اس کی وجہ دونوں زمانوں کے مسلمانوں کا ذہنی فرق ہے۔ دور اول کے مسلمان دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہتے تھے کہ ہر انسان مسٹر پنچر ہے۔ آج کے مسلمانوں کا ذہن اس کے

برعکس یہ ہے کہ ہر انسان مسٹر دشمن ہے۔ اس تصور نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سلوک دوسرے لوگوں سے غیر اسلامی بنا دیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے تمام معاملات بگڑ کر رہ گئے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا: آپ ایڈجسٹمنٹ کا جو نظریہ پیش کرتے ہیں اس کو انڈیا میں کتنے لوگ مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا ہی میں نہیں ساری دنیا کے تمام مسلمان میرے ہم خیال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ ذاتی مسائل میں ہر آدمی ایڈجسٹمنٹ ہی کے اصول پر زندگی گزار رہا ہے۔ حتی کہ آپ خود بھی۔ کوئی آدمی اگر ایڈجسٹمنٹ نہ کرے تو زندگی گزارنا ہی اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ ڈبل اسٹنڈرڈ بنے ہوئے ہیں۔ ذاتی معاملات میں وہ ایڈجسٹمنٹ کے اصول پر چلتے ہیں اور جب ملت کے موضوع پر لکھنا یا بولنا ہو تو وہ فوراً ٹکراؤ کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ایک بار میں صنیر اسلم صاحب کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ قرآن ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن فہمی کی کنجی کیا ہے۔ اس کی ایک ہی کنجی ہے اور وہ ہے ابن تیمیہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنا کہ یامعلّم ابراھیم علّمنی میں نے کہا کہ قرآن واحد کتاب ہے جس کے مصنف سے آپ ہر وقت کنسلٹ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ مصنف قرآن کے ساتھ آپ کے ربط کا یقینی ذریعہ یہی دعا ہے۔

۲۹ دسمبر کی شام کو مسٹر صنیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے کچھ احادیث کا درس دیا۔ ان احادیث کا تعلق اسلام کی روح اور اس کی بنیادی اسپرٹ سے تھا۔ ڈاکٹر سلمان ندوی بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ انھوں نے ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں کے دینی حالات بتائے جو بہت سبق آموز تھے۔

آخر میں سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ غیر قوموں کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ مسلم امت کی بڑی مایوس کن تصویر ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ ظلم کو میں چیلنج کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس لئے جس چیز سے لوگ مایوسی کا تاثر لے رہے ہیں اس میں مجھے امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف مصیبتوں کو اس طرح بھیج دیتا ہے جیسے ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔ میں مسلمانوں کے موجودہ معاملہ کو اسی حدیث کے ذیل میں شمار کرتا ہوں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور آرنلڈ ٹوائن بی نے اس کو بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ وہی قوم ترقی کرتی ہے جو دباؤ کے حالات سے دوچار ہو۔ دباؤ کے حالات ہمیشہ قوموں کو ابھارنے کا سبب بنتے ہیں۔ جیسے کہ صلیبی جنگوں میں مسیحی قوموں کی شکست نے انھیں دوبارہ زیادہ طاقت ور بنا کر اٹھایا۔ یہی معاملہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ یہ چیلنج انشاء اللہ مسلمانوں کے لئے احیاء نو کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

اس اجتماع میں خواتین اور بچے بھی شریک تھے۔ ان کی طرف سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ ایک بچے نے انگریزی میں یہ سوال لکھ کر دیا:

Why did the Kuffar not like Prophet Muhammad?

میں نے کہا کہ اس لئے کہ پیغمبر اسلام ان کی خواہش کے خلاف بولتے تھے۔ آج بھی کسی کے خلاف بولا جائے تو وہ بھی آپ کا اسی طرح مخالف ہو جائے گا جس طرح وہ لوگ مخالف بن گئے۔

امریکہ کی تاریخ کے بارہ میں ایک کتاب دیکھی۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ میں چھپی تھی اور وہ ۹۵۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کا نام تھا:

The Story of America, by John A. Garraty.

اس کو پڑھتے ہوئے ایک مقام پر نظر سے گزرا کہ ۵ اکتوبر ۱۹۷۳ کو جب کہ یہودیوں کا مقدس دن تھا، مصر اور شام نے دوبارہ اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اسی دوران اوپیک نے جو عربوں کے کنٹرول میں تھی، امریکہ، جاپان، مغربی یورپ کو اس انتقام میں تیل کی سپلائی بند کر دی کہ انھوں نے اسرائیل کی مدد کی تھی۔ اس کا اثر امریکی صارفین پر نہایت گہرا پڑا۔ گیسولین پر راشن لگ گیا۔ سارے امریکہ میں گیس پمپ پر کار کی لمبی لمبی لائن لگنے لگی۔ عربوں کے پیدا کردہ تیل کے اس بحران نے امریکیوں کو بتایا کہ یہ پابندی جاری رہی تو بیشتر عوام کی اقتصادیات اور طرز زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی:

This Arab oil crisis caused Americans to realize that an extended ban would threaten the economy and life style of most people. (p. 863)

قدیم زمانہ میں افسانوی شہزادہ کی جان کسی طوطے میں ہوتی تھی جو کسی دور کے مقام پر رکھا ہوا تھا۔ ترقی یافتہ امریکہ کی جان دوبارہ عربوں کی سرزمین میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ قدیم شہزادہ کے طوطے کا پنجرہ اس کے اپنے قبضہ میں نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج کے امریکہ نے عرب ورلڈ کو پوری طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔

میں ایک مسلم لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ سامنے کی میز پر مختلف قسم کے پرچے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو یہاں کے مسلمان نکالتے ہیں۔ کچھ ٹائٹل یہ ہیں:

Muslim World Monitor
American Muslim
Bosnia News Letter
The Minaret
The Pakistan Link
Muslim Journal

اس قسم کے بہت سے پرچے تھے۔ مگر ان کے مندرجات میں احتجاجی پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً یہ کہ کلنٹن نے واشنگٹن میں سلمان رشدی سے ملاقات کرکے اسلام اور مسلمانوں کی انسلٹ کی ہے۔ مغرب کی تخریبی پالیسیوں کا نشانہ یہ ہے کہ اسلامی احیا کی تحریکوں کو کچل دیا جائے، وغیرہ:

Clinton's insult to Islam.

West's disruptive policies aimed at undermining the revival of Islam

میز پر جتنے بھی مسلم پرچے تھے سب میں احتجاجی پہلو غالب تھا۔ اگر ان سب کا مشترک نام پروٹسٹ رکھ دیا جائے تو وہ غلط نہ ہوگا۔ انھیں کے درمیان ایک اور ہفت روزہ تھا۔ اس کا نام تھا ـــــ (L.A. India Journal) یہ ہفت روزہ ایک ہندو تنظیم نکالتی ہے۔ اس کا انداز بڑی حد تک مختلف تھا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ میں ہندوؤں کے پرچے زیادہ معیاری اور زیادہ کامیاب ہیں۔ عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بھی ہندو اور مسلمان کا فرق باقی ہے۔ حالاں کہ تعداد کے اعتبار سے دونوں تقریباً یکساں ہیں۔ یعنی ہر ایک چھ ملین۔

۲۹ دسمبر کی شام کو جناب عبد اللطیف صاحب کے مکان پر کھانا تھا۔ یہاں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جناب عبد الوہاب صاحب نے انڈسٹری کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔ ایک

بات انھوں نے یہ بتائی کہ جاپان امریکہ سے بہت بڑی مقدار میں لوہے کے ٹکڑے (scraps)
خریدتا ہے۔ یہ ٹکڑے بڑے بڑے جہازوں میں لد کر یہاں سے جاپان جاتے ہیں۔ ان جہازوں پر
کارخانے بھی لگے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمندر کے اندر دوران سفر ہی میں ان ٹکڑوں کو چادریں تبدیل
کرلیا جاتا ہے۔ اس سے انھیں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سفر کا وقت مزید استعمال ہو جاتا ہے
دوسرے یہ کہ اس قسم کی چادروں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ ان کو
سمندر میں مفت کا پانی وافر مقدار میں مل جاتا ہے جس سے وہ بنی ہوئی انتہائی گرم چادروں کو
ٹھنڈا کرسکیں۔ یہ ہے ایک کام کے دوران دوسرا کام کرنا۔

یہاں جو لوگ تھے ان میں سے ایک مسٹر شبیر دادابھائی تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ آج کل
مسلمانوں کے خلاف ہر جگہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کو فنا کرنے کی تدبیر کی جا رہی ہے
مسٹر دادابھائی نے کہا: پھر ہم نے کیا گھاس کھا رکھی ہے۔ آخر ہماری سمجھ کہاں چلی گئی ہے۔ وہ اکسپلائٹ
کرنا چاہتے ہیں تو ہم اکسپلائٹ کیوں ہو جاتے ہیں۔ وہ سازش کرتے ہیں تو ہم ان کی سازش کا شکار کیوں
ہوتے ہیں۔

مسٹر اعظم سجاد قریشی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مینجمنٹ کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جدید
مینجمنٹ میں لگاتار ترقی (continuous improvement) کا اصول ہے۔ جاپان کی ترقی اسی
اصول کو اختیار کرکے ہو رہی ہے۔ وہ لوگ مسلسل سوچتے رہتے ہیں کہ مزید ہم کیا نئی بات نکالیں
ہم اور کون سی بہتری پیدا کریں۔ اس طرح ان کا نظام برابر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

لگاتار ترقی کا یہی اصول دین میں بھی ہے۔ مومن کا ایمان ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ ا
اللہ کے ذکر، قرآن وحدیث کے مطالعہ، کائنات خداوندی میں غور وفکر سے ربانی غذائیں لے
برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اضافہ کا یہ عمل مومن کی شخصیت میں موت کے آخری لمحہ تک جاری رہتا ہے

ایک موقع پر میں نے بخاری کی یہ حدیث سنائی کہ ایک دیہاتی شخص مدینہ آیا۔ اس نے مسجد
نبوی میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔ ا
پیشاب کی جگہ پر پانی لے کر بہادو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے اٹھا
گئے ہو، مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں اٹھائے گئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں اگر کوئی شخص پیشاب کر دے یا اور کوئی گندگی ڈال دے۔ مثلاً وہ خنزیر کو مسجد میں ڈال دے۔ یا ہولی کا رنگ پھینک دے تو ایسی حالت میں مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس کو مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ وہ اس کو مسجد کی صفائی کا مسئلہ بنائیں۔ اس طرح کے کسی واقعہ کو اگر مسجد کی بے حرمتی کا سوال بنا دیا جائے تو اس سے فساد برپا ہوتا ہے اور اگر اس کو مسجد کی صفائی کا سوال بنا یا جائے تو ایک ڈول پانی پر معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ ایک صورت میں خون بہائے جاتے ہیں اور دوسری صورت میں پانی کو بہانا کافی ہوجاتا ہے۔

آسانی پیدا کرنے والے اور مشکل پیدا کرنے والے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو وہ اس کو گھٹانے والے بنیں، وہ اس کو بڑھانے والے نہ بنیں۔ یہ بھی ایک سنت رسول ہے۔ آجکل اگر کسی سے پوچھیں کہ سنت کیا ہے تو وہ کہے گا داڑھی میں خضاب لگانا، سر پر عمامہ باندھنا۔ مسواک کرنا وغیرہ۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ بھی ایک عظیم سنت ہے کہ کوئی شخص اگر مسجد جیسی مقدس جگہ پر گندگی ڈال دے تو آپ مشتعل نہ ہوں۔ آپ معاملہ کو مزید نہ بڑھائیں۔ بلکہ جس مقام پر مسئلہ پیدا ہوا ہے وہیں دھوکر اسے ختم کر دیں۔

امریکی مسلمانوں کی ایک تنظیم کے ایک عہدیدار نے اپنے یہاں کا چھپا ہوا پمفلٹ مجھے دیا یہ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں تھا۔ اس میں بابری مسجد کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The Babari Masjid at Ayodhya was demolished on December 6, 1992 by a frenzied mob of thousands of militant Hindus.

یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں نے مختلف الفاظ میں یہی بات لکھ رکھی ہے۔ مگر اس کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ۶ دسمبر کے واقعہ کو جس طرح انھوں نے لکھا ہے اسی طرح خدا کے فرشتوں نے بھی اس کو یقینی طور پر لکھ رکھا ہے۔ اور مسلم دانشوروں کی اس تحریر کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ فرشتوں کے اندراج کے مطابق ہو۔ مجھے سخت شبہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ فرشتوں کے رجسٹر میں غالباً اس واقعہ کی بابت برعکس طور پر یہ الفاظ لکھے گئے ہوں گے:

Incompentent Muslim leaders of India turned Hindus into a frenzied mob and they demolished the Babari Masjid at Ayodhya on December 6, 1992.

سان فرانسسکو سے ڈاکٹر منظور غوری نے ٹیلیفون کیا اور اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کے مطابق ۳۱ دسمبر کو ایک ملکی سفر ہوا۔ صبح کو جناب یونس سیجی کے ساتھ گارڈن گروو سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ یونس سیجی صاحب گجراتی ہیں۔ حسب عادت راستہ میں ان سے سوال کر کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ ہر آدمی سے اس کے میدان کی بات کرتا ہوں۔ اور اس طرح معلومات میں اضافہ کرتا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ گجرات میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ دینداری ہے۔ انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بتائی کہ گجراتی لوگ علما کرام سے بہت زیادہ عقیدت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بچپن سے بتایا جاتا ہے کہ علما کرام وارث انبیاء ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ گجراتیوں کے جو ادارے ہیں، ان میں آپس میں جھگڑا بہت کم ہوتا ہے۔ مقابلۃً ان میں زیادہ اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں بھی گجراتیوں کا مزاج ہی اس کا سبب ہے۔ گجراتیوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ادارہ میں ۵۰۰ روپیہ دے کر الگ ہو جائے گا۔ مگر وہ پانچ پیسہ خود اس سے لینے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس طرح بات کرتے ہوئے مقامی ایرپورٹ پہنچا۔ یہ ایرپورٹ چھوٹا مگر نہایت منظم تھا۔ امریکن ایرلائنز کی فلائٹ ۱۲۱۲ کے ذریعہ سین جوزے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک گھنٹہ کی پرواز تھی۔

جہاز کے اندر امریکن ایرلائنز کا میگزین (American Way) دیکھا۔ اس میں ایک امریکی سائنس داں (Hans Christian Von Baeyer) کی کتاب (The Fermi Solution) کا ایک باب نقل کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ ناقابل مشاہدہ مادہ (invisible material) پر مشتمل ہے۔ اس کو عام طور پر تاریک مادہ (dark matter) کہا جاتا ہے۔ اس کو براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کو بالواسطہ دیکھنے کا ایک طریقہ موجود ہے:

but there is an indirect way of detecting it.

یہ بالواسطہ طریقہ یہ ہے کہ ان ناقابل مشاہدہ اجرام سماوی کا رنگ اسپکٹرم پر بدلتا ہوا دکھائی

دیتا ہے:

their colors shift toward the red end of the spectrum. (p. 44)

سائنس چار سو سال سے پر اسراریت کی کہر کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو کہ تاریک ادوار میں د
کو گھیرے ہوئی تھی۔ اس کوشش میں سائنس نے نہ صرف علم کے کچھ جزیروں کو دریافت کیا ہے بلکہ بے
کے وسیع سمندر سے بھی آدمی کو واقف کرایا ہے:

Science, in clearing away the fog of myth and mysticism that shrouded the world in the Dark Ages, has exposed not only sharply delineated islands of knowledge but also boundless seas of ignorance. (p. 47)

۲۹ دسمبر کی سہ پہر کو جہاز سین جوزے ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ڈاکٹر جہاں گیر عالم موجود
ان کے ساتھ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ پورا علاقہ نہایت صاف ستھرا ہے، اس کو عام طور
(Bay Area) کہا جاتا ہے۔ پہلے ہم لوگ پالو آلٹو (Palo Alto) گئے۔ یہاں جناب منظور غوری صا
کے مکان پر کچھ دیر قیام رہا۔ پالو آلٹو عالمی تجارت کا مرکز ہے اور بہت زیادہ مہنگا علاقہ ہے۔

منظور غوری صاحب علی گڑھ سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں
گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ نے ہجرت سے اپنا مسئلہ حل کیا ہے۔ ہمیں بھی ہجرت ہی
اپنا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔ اگرچہ دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آپ لوگوں نے ایک مقام سے دو
مقام کی طرف ہجرت کی ہے۔ ہم کو ایک طریق کار سے دوسرے طریق کار کی طرف ہجرت کرنا ہوگا۔ا
تک ہندستانی مسلمان احتجاجی طریق کار پر چل رہے تھے، اب انھیں صابرانہ طریق کار اختیار کرنا ہے

۲۹ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ منظور غوری صاحب کے ساتھ فری مانٹ (Fremont) گیا۔ وہاں
زیر تعمیر مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد ایک مکان خرید کر بنائی جا رہی ہے۔ یہاں مختلف لوگو
سے انفرادی انداز میں گفتگو ہوئی۔ منظور غوری صاحب ہندستان کے مسلمانوں میں تعلیم کو
کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک کالج چلانے کے لئے دس ہائی اسکول چاہئے۔ ایک ہا
اسکول کے لئے پانچ ایلیمنٹری ایجوکیشن کا ادارہ چاہئے۔ نیچے کی تعلیم جب تک مضبوط نہیں ہوگی اوپر کی تع
مضبوط نہیں ہو سکتی۔ پہلے تو ہم نے یونیورسٹی بنائی تھی۔ اب ہمارا فوکس یہ ہونا چاہئے کہ ایلیمنٹر
اسکول بنائیں۔ وہ ہندستان کے دیہات دیہات میں تعلیم کو پھیلانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر

Muslim Community Association

(Santa Clara, CA)

Invites you to a talk by

Maulana Waheed-ud-Deen Khan

President, Islamic Center, New Delhi, India

Leading Muslim Intellectual and Author of Many Books including the Famous "Ilm Jadeed ka Challenge"

Titled

The Modernists' Attack on Islam: Historical Prospective and Response

Place: Masjid Annoor, Santa Clara
Time: 7:45PM (after salat Al-Isha)
Date: Friday, December 30, 1993

تعاون دینے کے لئے تیار رہیں۔

۳۱ دسمبر کو پالو آلٹو (Palo Alto) میں ڈاکٹر مرغوب احمد قریشی (پیدائش ۱۹۳۱) سے ملاقات ہو
۱۹۹۱ میں انھوں نے ایک مسلم تحقیقی ادارہ (Muslim think tank) بنایا ہے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہو
انھوں نے اپنا کچھ لٹریچر بھی پڑھنے کے لئے دیا۔

ان کا خیال ہے کہ مغربی قوموں کا عالمی غلبہ اس طرح ممکن ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے اعلیٰ دما
کا تھنک ٹینک بنایا۔ یہ لوگ عالمی ریسرچ کے ذریعہ اسٹریٹجی طے کرتے ہیں۔ ان پر عمل کر کے کہیں جگ
کرائی جاتی ہے۔ کہیں کسی کو گرایا اور کسی کو اٹھایا جاتا ہے۔ میڈیا کے ذریعہ لوگوں کے دماغوں
قبضہ کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ ڈاکٹر قریشی اور ان کے ساتھیوں نے ریسرچ کر کے مسلم امت کے
ایک طریق کار طے کیا ہے۔ یہ طریق کار اسی مغربی نمونہ پر ہے۔ مثلاً مختلف مغربی ملکوں میں لابی گرو
بنانا، ناٹو کی مانند مسلم ملکوں کا مشترک دفاعی ٹاسک فورس تیار کرنا، مسلمانوں کا آزاد سنٹ
بینک بنانا، مسلم ملکوں کے درمیان کامن مارکٹ اور کامن کرنسی قائم کرنا، مسلم ملکوں کے باہمی تعاون
ملٹری ہارڈ ویر تیار کرنا تاکہ مستحکم دفاع کیا جا سکے۔ مسلم دنیا کے نزاعات کے تصفیہ کے لئے ا
انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس وضع کرنا۔

Will Muslims, living in the United States, Europe and the rest of the world, be facing economic and political crisis in the next 10-15 years and what resources they must develop to meet those crisis? Some potential policy options regarding these questions and above scenarios which the scholars may consider are:

1. The formation of strong lobby groups in the United States, U.K., France, Germany, and Russia to influence the media and counter the influence of anti-Islam lobbies.

2. The formation of a collective defensive task force by Muslim countries similar to NATO.

3. The formation of a central independent Muslim bank for international settlements for banking transactions between Muslim countries similar to the Bank for International Settlements (BIS) in Switzerland.

3. The formation of an independent organization of Muslim countries similar to the General Agreement on Trade and Tariffs (GATT), as a preamble to establish: (a) a Muslim Common Market with preferential treatment or free flow of goods between the Muslim world, (b) common currency or a monetary unit.

4. The establishment of an international court of justice for the Muslim world to settle inter-country disputes.

5. Forging close collaboration between relatively advanced Muslim countries to develop and manufacture military hardware for the collective defense of the Muslim world as well as to provide a balance of power between future power blocks.

مذکورہ مسلم تھنک ٹینک نے اپنا یہ نقشۂ عمل مغربی قوموں کا مطالعہ کرکے انھیں کے نمونہ پر تیار کیا ہے۔ مگر موجودہ حالات میں یہ نہ صرف ناممکن ہے، بلکہ وہ مسلم مسائل کا حل بھی نہیں۔ مسلمانوں کے لئے صرف دو نکاتی پروگرام یہ ہے کہ داخلی اعتبار سے تعلیم اور خارجی اعتبار سے دعوت۔ یہ پروگرام پوری طرح قابل عمل ہے اور وہی سنت رسول کے مطابق ہے۔ پروگرام کسی خیالی نقشہ کا نام نہیں حقیقی پروگرام وہ ہے جس کو زیر عمل لانا فوری طور پر ممکن ہو اور نتائج کے اعتبار سے وہ دور رس ثابت ہونے والا ہو۔

واپسی میں جہاز کے اندر امریکن ایرلائنز کا میگزین امریکن وے (یکم جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس میں مضامین کم اور اشتہارات زیادہ تھے۔ امریکہ میں گفت وشنید (negotiating programs) کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بڑے بڑے ادارے صرف اس کام کے لئے قائم ہیں اور ضرورتمند لوگ بڑی بڑی قیمت دے کر ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک بڑی امریکی کمپنی کا اشتہار میگزین میں چھپا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ گفت وشنید آپ کا سب سے زیادہ طاقت ور تجارتی آلہ (business tool) ہے۔ مؤثر بات چیت (effective negotiating) کی تفصیلات دیتے ہوئے اس میں درج تھا کہ:

> In business, you don't get what you deserve,
> you get what you negotiate.

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زندگی کا بھی ہے۔ ایک آدمی امکانی طور پر ایک چیز کا مستحق ہوسکتا ہے۔ مگر امکانی استحقاق کو واقعہ بنانے کے لئے اپنی قوت کلام کو پرامن طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کی صورت میں آدمی کو بہت بڑی طاقت دیدی ہے۔ مگر نادان آدمی معنوی حقیقتوں سے بے خبر ہونے کی بنا پر گولی کو سب سے بڑی چیز سمجھ لیتا ہے۔

بے ایریا سے واپس ہوکر دوبارہ میں آرنج کاونٹی آگیا۔ یہاں روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (یکم جنوری ۱۹۹۴) میں ایڈورڈ گارگن (Edward A. Gargan) کے قلم سے ایک رپورٹ چھپی تھی اس کا عنوان تھا:

In India, good dowry is key to a decent marriage.

اس میں بتایا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی نے آزادی سے پہلے جہیز کی رسم کی سخت مذمت کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جو آدمی جہیز طلب کرے اس کو برادری سے خارج کر دیا جانا چاہئے۔ اس کے بعد جب ہندستان آزاد ہوا تو نئی ہندستانی گورنمنٹ نے ممانعت جہیز کا قانون (Dowry Prohibition Act) پاس کیا۔ لیکن آج بھی اضافہ کے ساتھ جہیز کا مذموم طریقہ رائج ہے۔ امیر اور غریب، منسٹر اور کلرک، قانون داں اور انجنیئر تک ہر ایک اس رسم میں مبتلا ہے۔

یہاں ایک صاحب نے بڑے جوش سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندستان میں آپ لوگوں کو قانون دانوں کا ایک بورڈ بنانا چاہئے جس کا کام لیگل فائٹنگ ہو۔ وہ مسلمانوں کے خلاف قوانین کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرے اور مسلم موافق قوانین پارلیمنٹ سے بنوائے۔ میں نے ان کو مذکورہ اخباری رپورٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ جہیز کو مہاتما گاندھی نے کنڈم کیا۔ تمام اخباروں نے اس کے خلاف آرٹیکل شائع کئے۔ اور اس کے خلاف باقاعدہ ایک قانون بھی بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود ہندستانی سماج سے ایک فیصد بھی جہیز ختم نہ ہو سکا۔ پھر آپ کس بنا پر یقین کرتے ہیں کہ دفعات کے ذریعہ ہندستانی مسلمانوں کا تحفظ ہو جائے گا۔

کیلی فورنیا سے نکلنے والے مسلم میگزین (Our Times) کے شمارہ یکم ستمبر ۱۹۹۳ میں مرکزی وزیر مسٹر اندر کمار گجرال کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں مسٹر گجرال کے اس قول کو سرخی بنایا گیا تھا کہ انڈیا دنیا میں دوسرا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے:

India is the 2nd largest Islamic country in the world.

اس کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ میں تقسیم کی تیادتی حماقت کے باوجود انڈیا میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہمارے لئے ایک عظیم امکان تھا۔ مگر بدقسمتی سے تقسیم کے بعد دوبارہ نااہل مسلم قائدین کی فوج اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے امکانات کو استعمال کرنے کے بجائے مسلمانوں کو صرف مسائل میں الجھا دیا۔ اگر یہ دوسری نادانی نہ کی گئی ہوتی تو اب تک انڈیا کے مسلمان پرنمبر ایک ملک کی حیثیت حاصل کر چکے ہوتے۔ مگر قائدین کی ناقابل بیان حماقتوں کے نتیجہ میں انڈیا کے مسلمان صرف ایک غیر اہم اقلیت بن کر رہ گئے۔

نیویارک کے مسلم اخبار منارہ (The Minaret) کے شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ میں بتایا گیا تھا کہ کراچی میں تعلیم کے موضوع پر ایک سمینار ہوا۔ اس میں پاکستان کی ایجوکیشن منسٹری کی طرف سے ایک پیپر پیش کیا گیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کم تعلیم والے ۱۲۱ ملکوں میں پاکستان ۱۱۱ ویں نمبر پر ہے:

Pakistan occupies 111th position among 121 countries with the lowest literacy rates.

پاکستان بننے کے بعد وہاں درجنوں 'مفکرین اسلام' اٹھے جن کا نعرہ تھا پاکستان میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ تاکہ خلافت ارضی اور قیادت عالم کا مقام پاکستان کو مل سکے۔ یہ سراسر ایک لغو نعرہ تھا۔ اور اس کی لغویت کا ثبوت یہ ہے کہ پچاس سالہ ہنگامہ آرائی کے باوجود اس کا کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان تمام اشخاص کے کرنے کا واحد کام یہ تھا کہ وہ پاکستان کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرتے۔ اگر یہ تمام لوگ تعلیم کے میدان میں محنت کرتے تو آج یقینی طور پر پاکستان صد فی صد تعلیم یافتہ ہو چکا ہوتا اور اس کے بعد اس کے لئے ہر مقصد کو حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔

یکم جنوری ۱۹۹۴ کی شام کو یہاں کچھ کشمیری لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کس لئے امریکہ کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کشمیری اشو کو انٹرنیشنلائز کرنے کے امریکہ آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ مومن ایک بل سے دوبارہ ڈسا نہیں جاتا، اور آپ لوگ بار بار کے ناکام تجربہ کے باوجود پھر اسی بل پر اپنا ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کا کیا مطلب۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات کبھی انٹرنیشنلائزیشن سے حل نہیں ہوتے۔ سلطان ٹیپو نے دو سو سال پہلے انگریزی استعمار کے مسئلہ کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ پھر علما نے ریشمی رومال تحریک کی صورت میں آزادئ ہند کے مسئلہ کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ پھر مسلمانوں نے فلسطین اور بوسنیا کے مسائل کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح بابری مسجد کے مقامی اشو کو نیشنلائز اور پھر انٹرنیشنلائز کیا گیا مگر بابری مسجد کو بچایا نہ جا سکا۔ پھر اب آپ کس بنا پر اس قسم کی تدبیر کے ذریعہ کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے کہا کہ کشمیر میں آپ اپنے ناپختہ نوجوانوں کو ایک ریگولر آرمی سے لڑوا رہے ہیں۔

آخر اس نامساوی ٹکراؤ سے آپ کس طرح فتح کی امید قائم کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ
نہیں معلوم کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ لڑا دے مولے کو شہباز سے۔ میں نے کہا کہ اقبال تو ایک
شاعر تھے۔ اور قرآن کے مطابق، شاعر کبھی ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ چنانچہ جس اق
نے لڑا دے مولے کو شہباز سے کہا تھا، اسی اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ جنگ بدر میں صرف ۳۱۳ مسلمان تھے او
ایک ہزار طاقت ور فوج پر غالب آئے۔ میں نے کہا کہ جنگ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے پیشگ
یقین دہانی کرائی تھی کہ اس میں فرشتے مدد کے لئے اتارے جائیں گے اور وہ مسلمانوں کے
کامیابی کی ضمانت ہوں گے۔ کیا آپ لوگوں کے پاس بھی اس قسم کی کوئی وحی آئی ہے۔ ظاہر
ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر انھوں نے کہا کہ جواہر لال نہرو کی یقین دہانی اور اقوام متحدہ کا رزولیوشن ریفرنڈم
حق میں موجود ہے۔ پھر انڈیا کیوں نہیں اس مسئلہ پر ریفرنڈم کرواتا۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ
محض ایک پرنسپل کی بات ہے اور متشددانہ جنگ میں لفظی پرنسپل کا حوالہ کوئی قیمت نہیں
پرنسپل پرامن لڑائی میں طاقت کا کام کر سکتا ہے مگر متشددانہ لڑائی میں وہ ہرگز کسی کے لئے
طاقت نہیں۔

انھوں نے کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انڈیا ہمارے اوپر کتنا زیادہ ظلم کر رہا ہے۔ اس نے
عزت داروں کو بے عزت کیا۔ اس نے کشمیری سماج کو تباہ کر دیا۔ میں نے کہا کہ قرآن میں حکم
دشمنی میں بے انصاف نہ بن جاؤ بلکہ ہمیشہ انصاف کی بات کہو۔ آپ جس ظلم کا حوالہ دے رہے
وہ ۱۹۸۹ کے بعد پیش آیا ہے جب کہ آپ نے سری نگر کی سرکاری عمارتوں پر بم مارا اور اس
تشدد اور جوابی تشدد کی سیاست کشمیر میں چلائی۔ ۱۹۸۹ سے پہلے انڈیا کی فوج کشمیر
اس نے کبھی بھی کشمیری آبادیوں پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ قرآن میں ملکہ سبا کے قصہ کے ذیل میں
ہے کہ جب تم بادشاہوں کے خلاف جنگی اقدام کروگے تو وہ تمہاری بستیوں میں داخل ہوکر
کریں گے اور عزت داروں کو بے عزت کریں گے۔ اس لئے تم بادشاہوں کے خلاف اس قسم

کرنے سے پرہیز کرو۔ جب آپ نے تشدد دانہ اقدام کر دیا تو اس کے بعد آپ کو اس شکایت کا حق باقی نہیں رہتا کہ فریق ثانی آپ کے خلاف تشدد کی کارروائی کر رہا ہے۔

پھر انھوں نے افغانستان کی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ افغانی مجاہدین ایک سپر پاور سے لڑے اور کامیاب ہوئے۔ اسی طرح کشمیری مجاہدین بھی اپنی لڑائی میں کامیاب رہیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ افغانستان کی جنگ میں ایک اور سپر پاور کھلم کھلا پوری طرح افغانیوں کے ساتھ تھا۔ آپ کی موجودہ جنگ میں کس پاور یا سپر پاور کی حمایت اس طرح آپ کو حاصل ہے۔ وہ کسی بھی ملک کا نام نہ لے سکے

پھر انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انڈیا کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔ انڈیا کی اقتصادی کمزوری ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ انڈیا کی اقتصادی طاقت تباہ ہوگی اور وہ کشمیر کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ یہ معاملہ دونوں فریقوں کے ساتھ ہے۔ اور اس میں اصل فیصلہ کن چیز وقت ہے۔ آپ اور انڈیا میں سے جس فریق کی اقتصادی طاقت پہلے ٹوٹے گی وہ دوسرے فریق کی جیت کا باعث بنے گی۔ ایسی حالت میں آپ کے پاس کون سی مزید دلیل ہے جس کی بنا پر آپ یہ یقین کر رہے ہیں کہ انڈیا کی اقتصادی حالت آپ سے پہلے تباہ ہو جائے گی۔ اس کا بھی ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نام نہاد لیڈر شپ کتنا زیادہ بے شعور ہے۔ پچھلے دو سو سال سے ایک ہی نادانی مسلمانوں کے درمیان جاری ہے۔ کچھ نااہل افراد پرجوش طور پر قیادت کے میدان میں کود پڑتے ہیں، حالاں کہ بے شعوری کے سوا ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ افراد صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔ خود ساختہ قائدین کے اس پورے گروہ پر انگریزی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ نادان لوگ وہاں گھس پڑتے ہیں جہاں فرشتے بھی قدم رکھنے سے ڈرتے ہیں:

Fools rush in where angels fear to tread.

ٹائم میگزین (۱۰ جنوری ۱۹۹۴) ۳ جنوری کی ڈاک میں ملا۔ اس سے پہلے اس کے ۲۰ دسمبر ۹۳ کے شمارہ کی کور اسٹوری امریکہ میں بڑھتے ہوئے تشدد کے بارہ میں تھی۔ موجودہ شمارہ میں اس

سے متعلق قارئین کے خطوط شائع ہوئے تھے۔ ان خطوط میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہر دن تش
کے واقعات ہو رہے ہیں۔ امریکی دستور کی مشہور دوسری ترمیم (second amendment)
نے ہتھیار رکھنے کو ایک امریکی کا شہری حق قرار دیدیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں ایجوکیشن یا جا
حاصل کرنے سے بھی زیادہ آسان گن حاصل کرنا ہو گیا ہے۔ حتی کہ مسٹر مارک جیرو
(Mark Jerol) کے الفاظ میں، امریکہ کے گن پرابلم کی وجہ سے ہم ایک زندہ جہنم (living hell)
طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک جرمن قاری (Elke Zschaebitz) نے لکھا تھا کہ امریکی دنیا کی وا
قوم ہیں جو محفوظ زندگی سے بھی زیادہ گن رکھنے کے حق کی حمایت کرتے ہیں :

Americans are the only people who support the right to own a gun rather than the right to walk safely along the street or to feel secure in their homes. (p. 6)

سان ڈیگو کے (Ray R. Dunakin III) نے لکھا تھا کہ امریکہ میں سنگین جرائم کی موجو
کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مجرم کو سزا نہیں ملتی۔ ہم کو آج گن کنٹرول کی ضرورت نہیں بلکہ کرائم کنٹرول
ضرورت ہے :

Criminals who commit serious crimes are given light sentences and turned back onto the streets to rob or kill again and again. We don't need gun control, we need crime control.

ایک فلسطینی نوجوان سے اسلامک سوسائٹی (آرینج کاونٹی) میں ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے
انھوں نے فرائڈے رپورٹ (The Friday Report) کے تین شمارے برائے مطالعہ دئے۔
دارلکہ ڈینور (Denver) کی طرف سے ہر ماہ "اسلامک نیوز لیٹر" کے طور پر شائع ہوتا ہے
(Tel. 303-6912201)

اس نیوز لیٹر کے شمارہ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۳ (جمادی الاول ۱۴۱۴ھ) کے اڈیٹوریل میں فلسطی
کے حالیہ معاہدہ کو غیر نمائندہ افراد کی طرف سے فلسطین کی فروخت (sale) قرار دیا گیا تھا۔ ایک
صفوفت اوی کا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ فتاوی اہل السنۃ والجماعۃ کے علما کی طرف سے
دئے گئے ہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک غیر اسلامی ملک میں ایک مسجد بیچ کر دو
زیادہ بڑی جگہ خریدی جائے۔ اس کے جواب میں بتایا گیا تھا کہ بیچنا اور جگہ کا بدلنا دونوں جائز

Q. Is it permissible to sell a mosque in a non-Islamic country in order to buy a bigger one?

A. If the mosque is ruined or not big enough and they have to demolish or sell it, it is permissible to sell it and to buy or build another one or transfer it to another place for the interest of the Muslims. (p. 3)

اس کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کا فتویٰ اگر انڈیا کا کوئی عالم دے تو شاید فوراً ہی دوسرا جوابی فتویٰ شائع ہو گا جس میں اعلان کیا جائے گا کہ جس شخص نے ایسا فتویٰ دیا ہے وہ مباح الدم ہے، اس کو ذلت کے ساتھ قتل کر دینا چاہئے۔ مگر امریکہ میں یہ فتویٰ چھپ رہا ہے اور انٹرنیشنل سیرت کانفرنس میں وہ تقسیم کیا جا رہا ہے مگر کوئی اس کے خلاف احتجاج کرنے والا نہیں۔ ہندستان اور امریکہ کا یہی فرق ہے جس نے ایک ملک کو مسلمانوں کے لئے فساد کا ملک بنا دیا ہے اور دوسرے کو امن کا ملک۔

۳ جنوری کی شام کو مجھے جناب صفی قریشی صاحب کے یہاں جانا تھا۔ صغیر اسلم صاحب کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستہ میں ہم لوگ ایک خاص مقام سے گزرے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ پہلے ہم لوگ یہاں رہتے تھے۔ یہاں ان کے پاس چھ ہزار مربع فٹ کا مکان تھا۔ خوبصورت پارک کے کنارے کا یہ مکان بہت وسیع اور بہت شاندار تھا۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے اس کو چھوڑ کر مسجد کے قریب چھوٹا مکان لے لیا۔ یہ دوسرا مکان دو ہزار مربع فٹ کا ہے۔ علاقہ کے لحاظ سے بھی پہلا مکان نہایت اہم علاقہ میں تھا۔ جب کہ موجودہ مکان دوسرے درجہ کے علاقہ میں ہے۔ جب انھوں نے یہ مکان بدلا تو اکثر لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اتنا اچھا مکان چھوڑ کر معمولی مکان میں آگئے۔

یہاں ہر آدمی بچوں کے بگڑنے کی شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ شکایت میرے نزدیک بے معنی ہے۔ اس لئے کہ اس معاملہ کا تعلق بچوں سے زیادہ ان کے بڑوں سے ہے۔ بڑے لوگ اپنے چاہنے کی قیمت ادا نہیں کرتے اسی لئے وہ اپنے بچوں کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ اگر آپ اپنے بچوں کو آخرت پسند بنانا چاہتے ہیں تو اپنے گھر کے ماحول کو دنیوی شان و شوکت سے پاک کرنا ہوگا۔ اس کے بجائے اپنے آپ کو مسجد والے ماحول سے قریب کرنا ہوگا۔

یہی معاملہ پوری ملت کا ہے۔ لوگ جو کچھ چاہتے ہیں، اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوب چیز بھی ان کو نہیں ملتی۔ مثلاً ہر آدمی اتحاد کی بات کرتا ہے مگر وہ اختلاف اور شکایت کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں، حالاں کہ یہی اتحاد کی واحد قیمت ہے۔ لوگ دعوت کی بات کرتے ہیں، مگر وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں پر صبر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالاں کہ مدعو کی زیادتیوں پر صبر کئے بغیر دعوت کا عمل ممکن ہی نہیں۔ لوگ ملت کی تعلیم و ترقی کی بات کرتے ہیں مگر وہ نزاعات کو اوائڈ کرنے کے لئے تیار نہیں، حالاں کہ تعلیم و ترقی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نزاعات کو ہر حال میں اوائڈ کیا جائے۔

۳ جنوری کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں فیکس پر ایک خط آیا۔ یہ خط لیز برگ (Leesburg) سے آیا تھا جو امریکہ کے ایسٹ کوسٹ میں واقع ہے۔ اس پر مز انڈا ڈی ہایوز (Inda de Hoyos) کا دستخط تھا۔ انھوں نے دعوت دی تھی کہ میں امریکہ سے رخصت ہونے سے پہلے ان کے ادارہ میں آؤں۔ تاہم وقت کم ہونے کی وجہ سے میں سفر کا پروگرام نہ بنا سکا۔ (Tel. 03-882-4771)

مذکورہ خاتون ایک امریکی ادارہ کے ایشیائی شعبہ کی صدر ہیں۔ اس ادارہ کا نظریہ یہ ہے کہ اضافہ آبادی کے بارہ میں مالتھس کا نظریہ غلط تھا۔ زمین میں زندگی کے ذرائع اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں مصنوعی طور پر آبادی پر کنٹرول کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف وسائل ارض کو درست طور پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن (صفحہ ۲۳ - ۲۶) کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ وہ ان کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ میں ان کے ادارہ میں آؤں اور وہاں اس موضوع پر مزید لکچر دوں۔ مگر ان کا پیغام مجھے دیر سے ملا اس لئے میں وہاں کا پروگرام نہ بنا سکا:

Inda de Hoyos, 62 Sycolin Road, Leesburg, Va 22075
Tel. 703-777-9451, 03-882-4771. Fax 703-771-9492

۳ جنوری کی شام کو اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے کچھ احادیث کی روشنی میں دین کی تفہیم کی۔ ان حدیثوں کا تعلق دین کی اسپرٹ سے تھا۔

۴ جنوری کی شام کو جناب جاوید نواز صاحب کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ یہاں میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر کی۔ اس میں بتایا کہ ہمیشہ مسائل کے ساتھ مواقع موجود رہتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ مسائل کو نظر انداز کریں اور مواقع کو استعمال کریں۔

آخر میں سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ امریکہ میں مسلم نسلوں کے (assimilation) کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ چھ ملین مسلمانوں کے درمیان یہاں چھوٹی بڑی ڈیڑھ ہزار مسجدیں ہیں۔ ان مسجدوں میں خاص طور پر جمعہ کے دن معقول تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اجتماع عبادت سے زیادہ سوشلائزنگ کے لئے ہوتا ہے۔ ترکی اور سوویت یونین میں مسلمانوں نے اپنا تشخص نہیں کھویا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں چیلنج تھا۔ چیلنج ہمیشہ مقاومت (resistance) پیدا کرتا ہے اور وہ زندگی کی ضمانت بن جاتا ہے۔ امریکہ میں یہ چیلنج نہیں اس لئے یہاں مسلمانوں کے لئے جذب ہو جانے کا خطرہ نظر آتا ہے۔

تاہم ایک پر امید علامت یہ ہے کہ خبروں کے مطابق، امریکی حکومت اسلام کو مغربی تہذیب کے دشمن کے طور پر پروجیکٹ کر رہی ہے۔ اگر فی الواقع یہ امریکی ایڈمنسٹریشن کا سوچا سمجھا فیصلہ ہو تو یہ چیز مسلمانوں کی بقاء کی ضامن بن جائے گی۔ کیوں کہ اس کے بعد یہاں بھی چیلنج اور اس کے جواب میں مقاومت کا ماحول بن جائے گا جو اسلامی تشخص کے بقاء کی ضمانت ہوگا۔

ہندستان کے جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے نام پر بہت سی چھوٹی بڑی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ تنظیمی اعتبار سے یہ سب الگ الگ ہیں۔ مگر طرز فکر کے اعتبار سے سب کی سب یکساں ہیں۔ ہر گروہ ہندستانی مسلمانوں کا تعارف مظلوم فرقہ (oppressed community) کی حیثیت سے کراتا ہے اور ہندوؤں کا تعارف جنگجو ہندو (Hindu militants) کی حیثیت سے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان بھی ویسا ہی ایک ملک ہے جیسا کہ امریکہ۔ ہندستان میں نہ مسلمان مظلوم ہے اور نہ ہندو ظالم۔ جو بگاڑ وہاں آپ دیکھتے ہیں

اس کے اصل ذمہ دار نااہل مسلم لیڈر ہیں۔ ان کے نکمے لیڈروں نے پچھلے سو سال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر ایک دوسرے سے متصادم رکھا ہے۔ آپ لوگوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس قسم کے نکمے لیڈر آپ کے یہاں نہیں اٹھے یا آپ لوگوں نے انھیں اٹھنے نہیں دیا۔ اگر امریکہ میں اسلام کے نام پر وہی ہنگامے جاری ہو جاتے جو برصغیر ہند میں جاری کئے گئے تو امریکہ بھی آپ کے لئے ویسا ہی ہوتا جیسا کہ آپ انڈیا کو سمجھتے ہیں۔

امریکہ میں دو ہفتہ تک رہا۔ اس مدت میں وہاں کبھی بجلی فیل نہیں ہوئی۔ ٹیلی فون کبھی ڈیڈ نہیں ہوا۔ کبھی سڑکوں پر ہارن کی آواز نہیں آئی۔ کبھی مجھے لاؤڈ اسپیکر کا شور سننے پر مجبور نہیں ہونا پڑا۔ فٹ پاتھ پر کہیں خوانچہ فروش نظر نہیں آئے۔ کہیں کوئی گداگر دکھائی نہیں دیا۔ بے شمار گاڑیوں کے باوجود سڑکوں پر پولیوشن بہت کم تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا کوئی وجود نہ تھا۔ غرض زندگی ہر اعتبار سے پر راحت تھی۔ گھر، سڑک، بازار، دفاتر، ہر جگہ صفائی اور باقاعدگی نظر آتی تھی۔

اس کے بعد جب سفر سے واپس آیا اور دہلی میں داخل ہوا تو یہاں ہر چیز بالکل مختلف تھی۔ وہاں اگر ہر چیز اعلیٰ تھی تو یہاں ہر چیز ادنیٰ نظر آئی۔ تاہم میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے ہندستان چھوڑ دینا چاہئے اور امریکہ میں جا کر رہنا چاہئے۔ امریکہ بلاشبہ ہندستان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کے باوجود میں ہندستان کو اور صرف ہندستان کو پسند کرتا ہوں۔ کیوں کہ ہندستان میرا وطن ہے۔ میری تمنا ہے کہ میرا ملک بھی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح اعلیٰ ترقی کرے۔

دوسروں کی ترقی میں جینا مجھے اپنی غیرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ میں خود اپنے وطن کی ترقی میں جینا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اپنی عمر میں ایک ترقی یافتہ ہندستان نہ ملے تو یہ احساس بھی میرے اطمینان کے لئے کافی ہے کہ ہندستان کے مستقبل کی تعمیر میں کچھ اینٹیں میں نے بھی اپنے کمزور ہاتھوں سے رکھی تھیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۴ کو واپسی کا دن تھا۔ گارڈن گروو سے لاس اینجلیز کے لئے جناب عبدالحمید تیمی اور جناب حبیب الدین ملک کے ساتھ روانگی ہوئی۔ حبیب الدین ملک صاحب کا تعلق

پشاور سے ہے۔ انھوں نے افغانستان کی جنگ میں عملی حصہ لیا ہے۔ وہ اس زمانہ میں افغانستان گئے تھے جب کہ روسی فوجیں واپس جا چکی تھیں مگر ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت ابھی باقی تھی۔ انھوں نے کہا کہ میرا یہ ارمان رہ گیا کہ اس جہاد میں مجھے کوئی زخم لگتا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

میں نے پوچھا کہ اب تو افغانستان سے روس واپس جا چکا ہے۔ اب سب کے سب افغانی لوگ وہاں ہیں۔ حتی کہ حکمتیار اور برہان الدین دونوں مجاہدین کے سردار تھے۔ پھر یہ باہمی لڑائی کیوں ابھی جاری ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ اقتدار۔ لیکن اگر یہ اقتدار کی جنگ ہے تو اس سے پہلے وہاں جہاد کی جنگ نہ تھی۔ اور اگر وہ جہاد کی جنگ تھی تو اب اقتدار کی جنگ نہ ہونا چاہئے۔

ہوائی اڈہ تک ایک گھنٹہ کا سفر "فری وے" کے ذریعہ طے ہوا۔ کہیں بھی ریڈ لائٹ نہیں آئی اور نہ گاڑی روکنے کی ضرورت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فری وے کی سڑکوں پر کراسنگ نہیں ہوتی۔ جہاں کہیں کراسنگ ہوتی ہے وہاں اوور برج بنا دیا جاتا ہے تاکہ گاڑیاں اوپر سے گزر سکیں۔ ایئر پورٹ کے پاس پہنچے تو سڑک کے اوپر رن وے بنا ہوا تھا۔ اوپر سے جہاز دوڑ رہا تھا اور نیچے سے کار۔

لاس اینجلیز سے سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۰۷ کے ذریعہ سفر ہوا۔ مقامی وقت کے لحاظ سے رات کو ۹ بجے جہاز یہاں سے روانہ ہوا۔ ۹۵۶۰ کیلومیٹر کی نان اسٹاپ پرواز تھی، ۳۳۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا یہ جہاز ساڑھے دس گھنٹہ میں زیورک پہنچا۔ اس وقت زیورک میں شام کے ساڑھے چار بجے کا وقت تھا اور جنوری ۱۹۹۴ کی ۶ تاریخ۔ یہ سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ مگر نیند اللہ تعالٰی کی بہت بڑی نعمت ہے۔ راستہ میں بار بار گہری نیند آتی رہی اور یہ سفر بآسانی طے ہو گیا۔

راستہ میں سوئس ایئر کا فلائٹ میگزین سوئس ایئر گزٹ (جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس کا ایک مضمون اس موضوع پر تھا کہ آسمان نیلا کیوں ہے (why is the sky blue) اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات درج تھیں۔ زمین سے ہم سورج اور آسمان کو گیسوں کی ۵۰ کیلومیٹر موٹی چادر (thick sheet) کے واسطہ سے دیکھتے ہیں جس کو فضا (atmosphere) کہا جاتا ہے۔

آسمان میں جو رنگ ہم دیکھتے ہیں وہ اسی فضا کے اوپر سورج کی روشنی کے فزیکل ری ایکشن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں لارڈ ریلے (Lord Rayleigh) نے اس کی تحقیق کی۔ ان کی تشریح نے بتایا کہ آسمان کا نیلا پن ہر ایک گرام ہوا میں کئی بلین ایٹم کا نتیجہ ہوتا ہے:

> His explanation showed that the blueness of the sky implies many billion atoms in every gram of air. If air had no atomic structure, the sky would not scatter light. (p. 31)

مضمون میں مزید بتایا گیا تھا کہ ہماری کہکشاں (Milky Way) میں ایک سو بلین ستارے ہیں۔ مزید یہ کہ اس طرح کی تقریباً ایک سو بلین کہکشائیں وسیع کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات کی یہ وسعت کتنی زیادہ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اتنا زیادہ عظیم اس لئے بنایا تاکہ انسان خالق کائنات کی لامتناہی عظمت کا تصور کر سکے۔

۶ جنوری کی شام کو زیورک پہنچا۔ یہاں مجھے اگلے جہاز کے لئے تقریباً ڈیڑھ دن ٹھہرنا تھا۔ یہاں ویزا لینا تھا۔ اس کے بعد سوئس ایئرویز کی طرف سے ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا جاتا۔ زیورک کا ایئرپورٹ بہت بڑا ہے اور ادھر سے اُدھر جانا، اس کاونٹر سے اُس کاونٹر پر کھڑا ہونا میرے بس میں نہیں۔ میں نے ایئرپورٹ کے ایک نوجوان مسٹر اوور ایگیٹر (Ouver Aegeter) سے کہا۔ انھوں نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ لیا۔ سارے کام خود ہی کرائے۔ اس کے بعد ایئرپورٹ کے اندر چلنے والی مخصوص کھلی کار میں بٹھا کر وہاں پہنچا دیا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔

ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ میری کمپلینٹ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں میں آپ کی تعریف کرنے کے لئے آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کاغذ پر اپنا پورا نام لکھ کر دیا۔

زیورک ایئرپورٹ پر اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ کیپٹن پی کے سنگھل تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 5592315) اور انڈین لائنز میں پائلٹ ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں حسب عادت ہوابازی کے متعلق سوالات کرتا اور وہ ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پرواز کے دوران کسی پائلٹ کے لئے سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال کون سی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا — جب آپ کو رن وے نہ ملے لینڈ

کرنے کے لئے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار ان کے ساتھ ایسا ہوا کہ جس ہوائی اڈہ پر انھیں اترنا تھا وہاں سخت فاگ تھا۔ اس لئے وہ وہاں اپنا جہاز اتار نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے آس پاس کے کئی مقامات سے بذریعہ وائرلیس ربطہ قائم کیا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ ایرپورٹ کے اوپر گھیرا گھر چھایا ہوا ہے۔ اس کے بعد بمبئی جاکر انھوں نے اپنا جہاز اتارا۔ خوش قسمتی سے انھوں نے زیادہ پٹرول لے لیا تھا ورنہ بمبئی پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔

زندگی میں بھی اس طرح کے نازک لمحات آتے ہیں جب کہ مطلوب منزل کی طرف بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس وقت آدمی کے اندر اتنی بصیرت ہونی چاہئے کہ وہ یہ جان سکے کہ دوسرے کون سے مقامات ہیں جس طرف وہ اپنے سفر کے رخ کو موڑ سکتا ہے۔

زیورک سے بہت سی تاریخی داستانیں وابستہ ہیں۔ آئن سٹین کے سوانح نگار رونالڈ کلارک (Ronal W. Clark) نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ میں زیورک یونیورسٹی میں نظریاتی طبیعیات (theoretical physics) کے شعبہ میں ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ آئن سٹین اس کے لئے امیدوار تھا۔ لیکن بورڈ آف ایجوکیشن نے بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے آئن سٹین کو نہیں لیا۔ اس کے بجائے انھوں نے فریڈرش ایڈلر (Friedrich Adler) کا تقرر کر دیا۔

مگر نوجوان ایڈلر ایک انوکھا آدمی تھا جس میں علمی دیانت داری غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی، بعد کو جب اسے معلوم ہوا کہ اگر وہ اس پوسٹ پر نہ ہوتا اور اس کی پیش کش آئن سٹین کو کی جاتی تو وہ اس کو قبول کر لیتا۔ اس نے کہا کہ محض سیاسی اسباب سے ہمیں ایسا موقع کھونا نہیں چاہئے جب کہ ہم ایک ایسے شخص کو پا سکتے ہیں جو یونیورسٹی کے معیار کو بہت زیادہ بڑھا دینے والا ہے۔ اس نے بورڈ آف ایجوکیشن کو اپنا استعفا بھیجتے ہوئے لکھا کہ اگر یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹی کے لئے آئن سٹین جیسے لائق شخص کو پا سکتے ہیں تو اس پوسٹ پر میرے جیسے ایک آدمی کو رکھنا بالکل لغو ہوگا۔

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہوں گا کہ طبیعیاتی عالم کی حیثیت سے میرا اور آئن سٹین کا کچھ بھی مقابلہ نہیں:

would be absurd to appoint me. I must quite frankly say that my ability as a research physicist does not bear even the slightest comparison to Einstein's. (p. 165).

واضح ہو کہ یہ بات ۱۹۰۸ کی ہے جب کہ آئن سٹین کو ابھی عظمت کا مقام نہیں ملا تھا۔ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اس کو عالمی شہرت حاصل ہوئی جب کہ اس کے نظریہ اضافیت کو سائنس دانوں نے قبول کر لیا۔ اس کے دو سال بعد اس کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

زیورک ایئرپورٹ پر ایک مسافر سے لے کر ریڈرس ڈائجسٹ (دسمبر ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون شراب نوشی کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا کہ شراب پی کر گاڑی چلانا قتل کا لائسنس:

Drunk driving : a license to kill

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ کی سڑکوں پر ہر ۳۰ منٹ میں ایک مرنے والا وہ ہوتا ہے جس کا تعلق شراب نوشی سے متعلق ایکسیڈنٹ سے ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے واقعات درج کئے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ شراب پی کر گاڑی چلانے والا جب کسی کی موت کا سبب بنتا ہے اور اس پر کیس چلایا جاتا ہے تو یا تو وہ بچ جاتا ہے یا معمولی سزا پر چھوٹ جاتا ہے:

How long must it be — and how many must die — before we make the punishment fit the crime? (p. 132)

موجودہ زمانہ میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو نام نہاد جدید تعزیرات (modern penology) کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کا قانون سزا وحشیانہ ہے۔ دوسری طرف انسانی فطرت جدید نظریہ سزا کے خلاف احتجاج کر رہی ہے کہ اس نے مجرموں کے حق میں نرم رویہ اختیار کرکے جرائم کو اتنا زیادہ بڑھا دیا ہے کہ اب پورا انسانی سماج اس کی زد میں ہے۔

۷ جنوری کو زیورک سے دہلی کے لئے سوئس ایئر کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف اخبار اور رسالے کا مطالعہ جاری رہا۔ سوئس ایئر کی فلائٹ میگزین میں ایک مضمون خلا کے بارہ میں تھا۔ اس میں بہت سی سائنسی معلومات درج تھیں۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ زمین سے جب ہم آسمان کو دیکھتے ہیں تو ہمارا یہ مشاہدہ براہ راست نہیں ہوتا بلکہ ۵۰ کیلومیٹر موٹی چادر درمیان میں حائل ہوتی ہے جو مختلف قسم کی گیسوں سے بھری ہوئی ہے۔ آسمان کا نیلا رنگ جو ہم زمین سے دیکھتے ہیں وہ اسی درمیانی چادر میں ہونے والے طبیعیاتی ردعمل (physical reaction) کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آسمان کا نیلا پن ہر ایک گرام ہوا میں اربوں ایٹم کی موجودگی کا نتیجہ ہے:

The blueness of the sky implies many billion atoms in every gram of air.

رنگ کی مختلف قسموں میں سے آسمان کے لئے نیلے رنگ کا انتخاب ایک اعلیٰ ذہانت کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ اس سے بہتر کوئی رنگ تصور میں نہیں آتا۔ اسی طرح زمین پر سبزہ کے لئے ہرے رنگ کا انتخاب آخری اعلیٰ انتخاب ہے۔ اگر آدمی صرف ان دو رنگوں پر غور کرے تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اس کائنات کے پیچھے ایک خدائی ذہن کارفرما ہے۔ کیوں کہ ایک برتر خدائی ذہن کے بغیر اس قسم کا آخری بہتر انتخاب ممکن ہی نہیں۔

۷ جنوری ۱۹۹۴ کی دوپہر کو سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۹۴ کے ذریعہ میں زیورک سے دہلی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاز روانہ ہوا تو کیپٹن کی طرف سے اعلان ہوا کہ آپ جس جہاز پر سوار ہیں وہ انتہائی ترقی یافتہ مواصلاتی نظام سے لیس ہے۔ آپ جہاز کے اندر سے کسی بھی وقت کسی بھی مقام کے لئے ٹیلیفون کر سکتے ہیں۔

راستہ میں انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون (۷ جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ امریکی صدر بل کلنٹن کی والدہ کیلی (Virginia Kelley) کا ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تین نکاح کئے۔ پہلے شوہر کا انتقال کار ایکسیڈنٹ میں ہوگیا۔ یہ حادثہ مستقبل کے صدر امریکہ کی پیدائش سے چار ماہ پہلے پیش آیا:

He died in a car accident about four months before the future president was born

جہاز دلی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہندستانی وقت کے لحاظ سے رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔

اس وقت ایک تجربہ گزرا ۔ اس کے بعد میں نے کہا —— اس دنیا میں انسان کے لئے قابل حصول لذت صرف ایک ہے ۔ وہ ہے اللہ کی یاد میں رونا ۔ اللہ کی یاد میں رونا انسانی روح کے لئے لذیذ اس لئے ہے کہ وہ خدائے کامل سے قربت کا لمحہ ہوتا ہے ۔ اس کے سوا جن چیزوں کو انسان لذت سمجھے ہوئے ہے وہ فریب لذت ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں لذت ۔

رات کو ۱۲ بجکر دس منٹ پر جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا ۔ شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے ہم جنوری کی آٹھویں تاریخ میں داخل ہو چکے تھے ۔ اسی طرح ایک دن ختم ہو کر دوسرا دن آتا رہے گا ۔ یہاں تک کہ وہ آخری دن آجائے گا جب کہ انسان محدود دنیا سے نکل کر ابدی دنیا میں داخل ہو جائے گا ۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۲

۱۔ ٹائمس آف انڈیا کے نمایندہ مسٹر سجاد حسن نے ۱۶ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسلمان ملک کی مین اسٹریم سے الگ کیوں ہیں۔ کہا گیا کہ یہ بات صرف جزئی طور پر درست ہے۔ روز مرہ کی زندگی میں مسلمان ہر جگہ برادر وطن کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ وہ مین اسٹریم سے کلی معنوں میں الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ البتہ مسلمانوں کے اخباری لیڈر اپنے بے بنیاد بیانات کے ذریعہ غلط طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ مسلمان دوسروں سے بالکل الگ ہیں۔

۲۔ الرسالہ مشن شروع سے اس پر زور دیتا رہا ہے کہ مسلمان سیاست کے بجائے تعلیم کے میدان میں اپنی کوشش صرف کریں۔ اس سلسلہ میں خدا کے فضل سے کئی جگہ ہمارے ساتھی قابل قدر کام کر رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک جموں کا علاقہ ہے۔ جموں میں جناب فاروق مضطر صاحب، جناب خورشید بسمل صاحب، مولانا لال الدین صاحب وغیرہ تعلیم کے میدان میں نہایت مفید کام کر رہے ہیں۔ اسی انداز پر ہر جگہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ ہفت روزہ نئی دنیا کے نمایندہ مسٹر جمال فہمی نے ۱۹ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر مسجد کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسجد با جماعت نماز کا مرکز ہے۔ یہ باجماعت نماز ایک عالم کی امامت میں ادا کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد اس بات کی تربیت ہے کہ مسلمان علماء دین کی سربراہی کے تحت متحد ہو کر زندگی گزاریں۔

۴۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا روزہ اور جمعہ کی اہمیت۔

۵۔ فرانس کی ایک خاتون اسکالر امیلی بلوم (Ms Amelie Blom) ۲۴ فروری ۱۹۹۵ کو اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ پیرس کے ادارہ سنٹر آف انٹرنیشنل اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے تحت پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہی ہیں۔ ان کی ریسرچ کا تعلق اس مسئلہ سے تھا کہ سلمان رشدی کی کتاب سیٹنک ورسز کا ری ایکشن انڈیا اور برطانیہ

میں کیا ہوا۔ اور اس کا اسلامی حکم کیا ہے۔ اس معاملہ میں انھیں تفصیل کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۶۔ فرنچ نیوز ایجنسی کے نئی دہلی کے نمایندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۲ مارچ ۱۹۹۵ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ وشو ہندو پریشد بنارس کی گیان واپی مسجد کو توڑنا چاہتی ہے۔ بتایا گیا کہ مسجد کا ٹوٹنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ مسلمان بھڑک کر انھیں اس کا موقع دیں۔ اگر مسلمان صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کریں تو وشو ہندو پریشد کبھی بھی اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوگی۔ ۲۷ فروری کو مسلمانوں نے اس پالیسی پر عمل پر کیا۔ چنانچہ ہر قسم کی سازش کے باوجود مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

۷۔ ہندی روزنامہ جن ستا کے نمایندہ مسٹر صفدر رضوی نے ۲۵ فروری ۱۹۹۵ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بنارس اور متھرا کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ۱۹۹۱ میں عبادت گاہوں کے تحفظ کا جو ایکٹ پاس ہوا ہے اسی کو تمام فریقوں کو مان لیا جائے۔ اس کو نہ ماننا ملک میں لاقانونیت اور نراج لانے کے ہم معنی ہے۔

۸۔ ڈاکٹر نگیندر سنگھ، ڈائرکٹر انڈو یوروپین جین ریسرچ فاؤنڈیشن (نئی دہلی) اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مغربی مصنفین عام طور پر یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمان میں فرق نہیں کرتے۔ وہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً آج کل جگہ جگہ اسلام کے نام پر گن کلچر چلایا جارہا ہے وہ محض کچھ مسلم لیڈروں کی سیاست ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

۹۔ مسٹر جمال صفی (فری لانس جرنلسٹ) نے ۱۴ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق پاکستان میں بڑھتے ہوئے مذہبی تشدد سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پاکستان اس نظریہ کے تحت قائم کیا گیا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ مگر پاکستان کے تجربہ نے ثابت کیا کہ اختلاف زندگی کا حصہ ہے، اور وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس لیے کامیاب زندگی کا حل صرف ایک ہے ——— اختلاف کے باوجود

ایک دوسرے کا احترام کرنا اور اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے مل جل کر رہنا۔

۱۰۔ اُردو ویکلی راشٹریہ سہارا کے سینیر سب ایڈیٹر مسٹر اسد رضا نے ۱۹ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس وقت پاکستان میں جو باہمی لڑائیاں ہو رہی ہیں اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستان کے بانیوں پر ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو عدم رواداری کا سبق دیا۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے پر تیار نہیں ہوئے۔ یہی مزاج وہاں کام کر رہا ہے۔ پہلے وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں بے برداشت ہوئے تھے، اب وہ خود مسلمانوں کے مقابلہ میں بے برداشت ہو رہے ہیں۔ اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں برداشت اور رواداری کا مزاج پیدا کیا جائے۔

۱۱۔ ایشین نیوز انٹرنیشنل (ٹی وی) کی ویڈیو ٹیم ۲۱ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کی انتخابی پالیسی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ایک سے غصہ ہو کر دوسرے کو ووٹ دینا یہ کوئی پالیسی نہیں ہے۔ الکشن میں منفی جذبات سے اوپر اٹھ کر ووٹ دینا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ کسی پارٹی کا انتخاب کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس نے ہماری خواہشوں کو پورا کیا یا پورا نہیں کیا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ حالات کے تحت وہ جو کچھ کر سکتی تھی اس کو کیا یا نہیں کیا۔

۱۲۔ انگلش میگزین انڈیا ٹوڈے کی پرنسپل کرسپانڈنٹ مسز شیفالی ریکھی نے ۲۱ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع "مسلمانوں کی مذہبی رسوم" تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ انڈیا کے مسلمانوں میں بہت سی رسمیں ہندوؤں کے اثر سے آئی ہیں۔ ہندوؤں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ اپنے سابق مزاج کے تحت ہندو رسموں کو اسلامی صورت دے کر منانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسمیں صرف برصغیر ہند کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ عرب ملکوں میں یہ رسمیں سرے سے موجود نہیں ہیں۔

۱۳۔ غالب اکیڈمی (نظام الدین بستی) میں ۲۲ مارچ ۱۹۹۵ کو "عید ہولی ملن" کے نام سے ایک جلسہ ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں "مہمان خصوصی" کی حیثیت سے شرکت کی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ اکثر غلط فہمیاں محض دوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

سفرنامۂ اسپین

اسپین کی مشہور الکلا یونی ورسٹی (University of Alcala) کے ریکٹر ڈاکٹر گالا
(Mankel Gala) کے دستخط سے ان کا خط مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۹۴ ملا۔ اس میں مجھے میڈرڈ کی تین روزہ
نفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ انٹرنیشنل کانفرنس ۲۸۔ ۳۰ نومبر ۱۹۹۴ کو تین سامی مذاہب
یہودیت، عیسائیت، اسلام) کے اشتراک سے ہوئی۔ یہ امن عالم کے بارے میں تھی اور اس کا
موضوع تھا :

Three Religions: A commitment for peace

دعوت نامہ میں مجھے خصوصی مہمان (special guest) کے طور پر مذکورہ کانفرنس میں شرکت کی
دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق اسپین کا سفر ہوا۔

اس سفر کا پہلا سبق آموز تجربہ اس وقت ہوا جب کہ مجھے اس کا "کوپن" ملا۔ ہوائی سفر کا روایتی طریقہ
ہے کہ آدمی متعلقہ ایر کمپنی سے ٹکٹ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد ایر پورٹ پر اسے بورڈنگ کارڈ دیا
ہے۔ اس بار پی ٹی اے کی بنیاد پر ایر فرانس سے ہمیں جو چیز دی گئی وہ معروف ٹکٹ نہ تھا۔ بلکہ چار
ن جو گویا ٹکٹ بھی تھا اور بورڈنگ کارڈ بھی۔ مغربی ممالک اسی طرح اپنی ترقی کا سفر مسلسل جاری رکھتے
۔ مگر ہندستان جیسے ملکوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

۲۷ نومبر کی صبح کو گھر سے ایر پورٹ جانے کے لیے نکلا تو سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑک پر
ب معمول گاڑیاں دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔ قدیم زمانہ کے ایک شاعر نے کہا تھا :

ہوئی صبح اور ادھر ہم کان پر رکھ کر قلم نکلے

دہ زمانہ کا آدمی شاید کہے گا کہ صبح ہوئی اور ہم اپنی گاڑی لے کر روانہ ہوئے۔ مشینی انقلاب نے
جدید میں جو فرق کیا ہے اس کی یہ ایک علامتی مثال ہے۔

دہلی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر داخل ہوا تو اندر کا وسیع ہال پلاسٹک کے بڑے بڑے
ں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک پر لکھا ہوا تھا، باکو (Baku) یہ سب ایر ٹرانسپورٹ کے ذریعہ روس
جارہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام بنڈل پہلے ہوئے لباس اور گرم کپڑے سے بھرے

ہوئے ہیں۔ روس سے ہندستان جنگی ہتھیار خرید رہا ہے۔ مگر ضرورت کی چیزوں کے لیے خود روس مجبور ہے کہ وہ ان کو ہندستان اور دوسرے ملکوں سے خریدے۔ اشتراکی نظام کی یہ غیر متوازن ترقی بھی کیسی عجیب ہے۔

انتظار گاہ کے اندر دیوار پر دو شیروں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ شیر لکڑی کاٹ کر اور اس پر قدرتی رنگ دے کر بنائے گئے تھے۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ دو شیر کھڑے ہوئے ہیں۔ شیر فطرت کا ایک عجیب مظہر ہے۔ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہوتا ہے۔ مگر ماہرین کا کہنا ہے کہ شیر سب سے زیادہ غیر جنگجو جانور ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہونے کے ساتھ اعراض کا بادشاہ بھی ہے۔

ایر پورٹ کی انتظار گاہ میں تھا کہ قریب کی خالی کرسیوں پر کچھ نوجوان مرد اور عورت آکر بیٹھ گئے۔ یہ سب مغربی سیاح تھے اور انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میرا رخ الٹی طرف تھا مگر قریب ہونے کی وجہ سے ان کی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ تم نے دہلی میں کیا کیا دیکھا۔ بتانے والے نے جن چیزوں کے نام بتائے ان میں سے ایک "جامع مسجد" بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ دہلی کی تاریخی جامع مسجد کو دیکھنے کے لیے ہر روز ملکی اور غیر ملکی لوگ کثرت سے آتے ہیں۔ گویا مدعو خود داعی کے پاس آرہا ہے۔ دور جدید میں سیاحت کے فروغ کی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے۔ جامع مسجد کے ساتھ اگر ایک دعوتی شعبہ ہوتا تو اس کے ذریعہ ملک میں اور ملک کے باہر زبردست دعوتی کام ہو سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بے فائدہ سیاسی شغف نے تمام دعوتی امکانات کو برباد کر رکھا ہے۔

دہلی سے ایر فرانس کی فلائٹ نمبر ۱۷۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایر فرانس کی فلائٹ میگزین اٹلس (atlas) دیکھا۔ مگر اس میں یا فیشن والی چیزوں کے اشتہار تھے یا سیاحوں کی دل چسپی کی باتیں تھیں۔ کوئی خاص مضمون قابل ذکر نہیں ملا۔

ڈیڑھ سو صفحہ کے اس خوب صورت میگزین میں ایک سادہ شیٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ برائے تجاویز (suggestions) تھی۔ اس میں آٹھ زبانوں میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ پرواز کے دوران یا گراؤنڈ پر ہماری سروس کے بارہ میں آپ جو بھی تبصرے (comments) لکھنا چاہیں بلا تردد لکھ کر ہمیں یا دستی

طور پر دے دیں یا بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ آٹھویں نمبر پر عربی عبارت تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

الرجاء تزويدنا بملاحظاتكم على خدمتنا على الأرض واثناء السفر وان تدونوا كذلك مقترحاتكم على هذه البطاقة ثم ارسالها بالبريد أو تسليمها الى طاقم الطائرة. شكرا.

الخطوط الجوية الفرنسية.

ہوائی کمپنی ایک تجارتی ادارہ ہے۔ تاجر اپنے بارہ میں لوگوں کا تبصرہ جاننے کا حریص ہوتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کر کے اپنی تجارت کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنائے۔ اسی طرح داعی بھی مدعو کی ہر بات کو نہایت دھیان کے ساتھ سنتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح اس کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مدعو کے مزاج کو سمجھ کر اپنی دعوت کو اس کے لیے زیادہ موثر اور قابل قبول بنا سکے۔

ہوائی جہاز کی سواری مجھ کو ایک خدائی نشانی نظر آتی ہے۔ ہوائی جہاز کی ایک عجیب صفت یہ ہے کہ وہ انسان کی اُس کمزوری (vulnerability) کو ممثل کرتا ہے جو زمین کے اوپر اسے حاصل ہے۔ زمین فٹ بال کی مانند ایک بڑا سا گولا ہے جو خلا میں تیز رفتاری کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ خلا میں گردش کرتے ہوئے اس کرہ پر انسان آباد ہے۔ زمین کی اس مسلسل خلائی پرواز میں اگر ذرا سا بھی خلل پڑ جائے تو ایک لمحہ میں پوری انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔

کرۂ زمین پر اپنی اس غیر محفوظیت کو انسان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا، اس لیے وہ اس کو محسوس بھی نہیں کر پاتا۔ ہوائی جہاز آدمی کی اسی غیر محفوظ حالت کا محدود سطح پر ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ ہوائی جہاز انسان کی حیثیتِ عجز کی گویا ایک مشینی یاددہانی ہے۔

اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے کہ آدمی اس سے روحانی تجربہ حاصل کرے۔ مگر یہ روحانی تجربہ صرف اس کے حصہ میں آتا ہے جو میٹر میں نان میٹر کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

راستہ میں وال اسٹریٹ جرنل (بروسیلز) کا شمارہ ۲۵-۲۶ نومبر ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں سب کی سب تجارتی نوعیت کی خبریں تھیں۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ترکی کپڑے کے اکسپورٹ میں فرانس اور اٹلی کے بعد یورپ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ پچھلے سال اس نے چار بلین ڈالر سے زیادہ کے کپڑے اکسپورٹ کیے۔ مگر اب مقابلہ کی وجہ سے ترکی کی یہ صنعت زوال کی طرف جا رہی ہے۔ ایک ترک اکسپورٹر نے کہا : Ours could soon be a dying industry. (p. 4)

ایرہوسٹس مشروبات کی گاڑی لے آئی۔ میرے قریب کی سیٹ پر جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے وہسکی مانگی۔ میں نے آرنج جوس کے لیے کہا۔ میز پر جب دونوں گلاس رکھے گئے تو میں نے دیکھا کہ دونوں مشروب کا رنگ بالکل یکساں ہے۔ اگرچہ ایک شراب تھی اور دوسرا خالص آرنج کا رس۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا میں چیزیں مشابہ انداز میں پیدا کی گئی ہیں۔ حتی کہ حق جس طرح عمدہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے، اسی طرح باطل بھی خوب صورت الفاظ میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ مشابہت برائے امتحان ہے، اس لیے آدمی کو موجودہ دنیا میں بے حد چوکنا ہو کر رہنا ہے۔ ورنہ وہ ایک مشروب کو فروٹ جوس سمجھ کر پینے لگے گا۔ حالاں کہ بعد کا انجام بتائے گا کہ وہ پھل کے رس کے رنگ میں شراب تھی جس کو وہ نادانی اور بے شعوری کے تحت پی گیا۔

جس ہم سفر نے شراب لی تھی، ان سے بات کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ شراب پینے سے آپ کو کیا فائدہ ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ کیوں شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تناؤ دور کرنے (relaxation) کے لیے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے۔ مگر وہ کئی گھریلو مسائل سے دوچار ہیں، اب تک انھوں نے شادی بھی نہیں کی۔ اس لیے ذہن پر مستقل بوجھ رہتا ہے اس بوجھ کو اتارنے کے لیے وہ شراب پیتے ہیں۔ اکثر شراب نوشوں کا یہی حال ہے۔

اس جہاز میں مدراس کے ایک ہندستانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ میکانیکل انجینیر ہیں اور ان کا نام آر وجے کمار ہے۔ وہ ایک شپنگ کمپنی (اینگلو ایسٹرن شپ مینجمنٹ لمیٹڈ) میں ملازم ہیں۔ وہ پانچ سال سے سمندری جہاز میں کام کرتے ہیں۔ گفت گو کے دوران میں نے پوچھا کہ سمندر میں جب طوفان آتا ہے تو اس وقت آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم انتظار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نیچر کے خلاف نہیں جا سکتے :

We are supposed to wait. Because we cannot go against the nature.

انتظار بے عملی نہیں، اس دنیا میں انتظار بھی ایک عملی پالیسی ہے۔ مذکورہ مسافر کو میں نے ایک حدیث سنائی۔ اس حدیث کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں : افضل العبادة انتظار الفرج (کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے)

ساڑھے نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز فرانس کی راجدھانی پیرس میں اتر گیا۔ پیرس کا

ہوائی اڈہ غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ وہ خود ایک شہر ہے۔ میں یہاں کئی بار آچکا ہوں۔ مگر اب تک اس کا جغرافیہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کاؤنٹر پر ایک خاتون ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے میرے حلیہ سے سمجھا کہ میں بھی ایک ہندستانی ہوں۔ انھوں نے میرا ٹکٹ کمپوٹر پر چیک کرنے کے بعد کہا: پتاجی، آپ کی فلائٹ "ٹرمنل ون" سے ہے۔ وہاں تک آپ کو بس سے جانا ہوگا۔ آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ میں ابھی آپ کو لے جاکر بس پر سوار کرادیتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہوائی کمپنی کی بس میں تھا۔ یہ بس پیرس کے مختلف حصوں سے گزرتی رہی یہاں تک کہ اس نے مجھے ٹرمنل ون پر پہنچادیا۔

یہاں ایرپورٹ پر مجھے باتھ روم جانا تھا۔ میں اتفاق سے معذوروں کے باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس کے اندر ہر قسم کی سہولتیں موجود تھیں۔ حتی کہ اس کے اندر انٹرکام بھی لگا ہوا تھا۔ تاکہ معذور شخص کو کوئی مشکل پیش آجائے تو فوراً وہ انٹرکام پر بتاکر اپنی مدد کے لیے ایرپورٹ کے آدمی کو بلاسکے۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں بھی ایک معذور ہوں۔ دنیا میں معذور شخص کو خصوصی رعایت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ کاش آخرت میں بھی مجھ کو معذور قرار دے کر میرے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کیا جائے۔

فرانس میں تقریباً ۱۵۰۰ چھوٹی بڑی مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد کے بارہ میں قطعی اعداد و شمار حاصل نہیں۔ تاہم عام اندازہ یہ ہے کہ یہاں پانچ ملین مسلمان آباد ہیں۔ فرانسیسی مسلمانوں میں زیادہ تر مراکو، الجزائر اور تونس وغیرہ سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ فرانس میں مسلمانوں کی تقریباً نوتے تنظیمیں پائی جاتی ہیں۔ حال میں ان کا ایک وفاق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۹۰ میں پیرس میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: الحریات وحقوق الانسان فی الاسلام۔

فرانس کی آبادی میں تقریباً ۸۰ فی صد کیتھولک عیسائی ہیں۔ پندرہ فی صد مسلمان ہیں۔ اور پانچ فی صد میں پروٹسٹنٹ اور یہودی ہیں۔ آپ فرانس کے کسی بھی حصہ میں جائیں، آپ کی ملاقات کسی نہ کسی مسلمان سے ہوجائے گی۔ خواہ وہ ایرپورٹ ہو یا کوئی کھیت۔

پیرس کے ایرپورٹ پر ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ انگریزی جانتے تھے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ فرانس ہمیشہ "اسلام دشمنی" میں امریکہ اور مغربی ملکوں کے

ساتھ رہا ہے۔ لیکن آج اسی ملک میں زبردست اسلامی لہر آئی ہوئی ہے :

But now a severe Islamic wave is sweeping the same nation.

مگر سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ "اسلامی لہر" کا یہ نظریہ زیادہ تر خوش فہمی پر مبنی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فرانس کے چالیس ہزار مسلم نوجوان مکمل طور پر اسلام کے زیر اثر ہیں۔ مگر جب میں نے مزید سوالات کیے تو معلوم ہوا کہ یہ وہی نوجوان ہیں جو بے روزگاری کا شکار ہیں یا اس احساس میں مبتلا ہیں کہ فرانس کی سوسائٹی میں انھیں باعزت مقام نہیں ملا۔ دوسرے لفظوں میں اس اسلامی لہر کے پیچھے اصل محرک مادی محرومی کا احساس ہے نہ کہ آخرت کی جواب دہی کا احساس۔ یہ اسلام کا اکسپلائٹیشن ہے۔ اور اسلام کے اس قومی اکسپلائٹیشن کا یہ الٹا نتیجہ نکلا ہے کہ، مذکورہ فرانسیسی مسلمان کے اعتراف کے مطابق یہاں کی رائے عامہ شدت سے مسلمانوں کے خلاف ہوگئی ہے :

Public opinion is extremely against Muslims.

ان انتہا پسند مسلمانوں نے اسلام کی نمائندگی اس طرح کی ہے کہ فرانسیسیوں کو نظر آتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ان کے سسٹم سے ٹکراتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے بہت سی غیر ضروری رکاوٹیں یہاں کے مسلمانوں کو پیش آرہی ہیں۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسک (Chartes Pasqua) نے شہر لیان (Lyon) کی مسجد کے افتتاح کے وقت اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں فرانس میں صرف اسلام نہیں چاہیے بلکہ ہمیں وہ اسلام چاہیے جو فرانس کا اسلام ہو :

We would not have just an Islam in France. There must be an Islam of France.

فرانس کے مسلمانوں میں بہت تھوڑی تعداد کو چھوڑ کر سب کے سب نارتھ افریقہ کے مہاجرین ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں فرانس نے ۱۸۳۰ میں الجیریا کو فتح کیا، ۱۹۰۹ میں اس نے افریقی صحارا کے بڑے حصہ پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ تیونس کو اس نے ۱۸۸۱ میں فتح کیا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ میں مراکو کو اپنی سیاسی ماتحتی میں لے لیا۔ اس وقت اسپین کو بھی مراکو کا ایک حصہ دے دیا گیا تھا۔ نارتھ افریقہ کے علاقہ پر اسی قبضہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں میں آمد و رفت بڑھی۔ اور بڑی تعداد میں افریقہ کے مسلمان اپنے ملکوں سے نکل کر فرانس میں روزگار کے لیے آگئے۔ ان لوگوں نے فرانس کو سستا مزدور فراہم کیا جس کی اس

وقت فرانس کو سخت ضرورت تھی۔

اب یہی لوگ فرانس کے شہری بن کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس طرح حالات نے مسلمانوں کو اپنے مدعو کے ملک میں پہنچا دیا تھا۔ اگر وہ معاشی حصول کے بعد صرف دعوت کو اپنا نشانہ بناتے تو یہاں ان کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ اس کی ایک انفرادی مثال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہیں۔ انھوں نے صرف علمی اور دعوتی دائرہ تک اپنے کو محدود رکھا۔ چنانچہ وہ فرانس میں ایک مقبول شخصیت بن گئے۔ مگر نام نہاد اسلام پسندوں نے کلچرل تشخص اور قومی حقوق کے نام پر فرانسیسیوں سے زور آزمائی شروع کر دی۔

اس غلط پالیسی کا یہ نتیجہ تو نہیں نکلا کہ فرانس میں ان مسلمانوں کے قومی مطالبات پورے ہو جائیں۔ البتہ یہ احتجاجی سیاست فرانس میں ان کے خلاف نفرت اور غصہ کی فصل اگا رہی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں دعوت کے مواقع برباد ہو رہے ہیں۔

پیرس میں ایک لڑکی ملی۔ اس نے اپنا نام شاذیہ بتایا۔ نام سے اس کی شخصیت واضح نہیں ہو رہی تھی۔ مزید دریافت پر معلوم ہوا کہ اس کا باپ ایک مصری مسلمان ہے۔ اس نے یہاں ایک عیسائی خاتون سے شادی کی۔ اس خاتون نے اپنا مذہب نہیں بدلا، اس کے بعد ان کے یہاں مذکورہ لڑکی (شاذیہ) پیدا ہوئی۔ ایک عرصہ بعد مصری مسلمان اور اس کی عیسائی بیوی میں اختلاف ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اب یہ عورت اپنی لڑکی کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہے۔

گفت گو سے میں نے اندازہ کیا کہ اصل مسئلہ غالباً یہ تھا کہ شاذیہ کا بوائے فرینڈ گھر میں آتا تھا۔ وہ ڈرنک بھی کرنے لگی۔ ان باتوں پر اس کی ماں کو اعتراض نہیں تھا۔ مگر مصری مسلمان سخت اعتراض کرتا تھا۔ فرانس چونکہ ایک مسیحی ملک ہے، بیوی کا پلہ بھاری ثابت ہوا۔ آخر کار مصری مسلمان کی مرضی کے علی الرغم اس نے طلاق لے لی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان کس قسم کے نازک مسائل سے دوچار ہیں۔

فرانس کے مسلمانوں میں محدود تعداد نومسلموں کی ہے۔ تاہم یہ نومسلم مسلمانوں کی کسی تبلیغ سے اسلام کی طرف راغب نہیں ہوئے ہیں بلکہ زیادہ تر اپنے ذاتی مطالعہ سے اسلام کی طرف آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دور جدید کے "حنفاء" کہا جا سکتا ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر حق کی طلب موجود

ہے۔ تاہم بعض افراد کے اندر یہ طلب زیادہ طاقت ور صورت میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنی روحانی طلب کا جواب پاکر اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

ایک نومسلم خاتون (مسز زرینہ) نے ایک بڑا عجیب واقعہ بتایا۔ حال میں ایک فرانسیسی عیسائی نے اسلام قبول کیا ہے۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ صرف اسلامی لٹریچر سے آشنا ہوا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد اس کا ربط مسلمانوں سے ہوا۔ اس نے بعد کو اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں اسلام سے اس وقت واقف ہوا جب کہ میری ملاقات ابھی کسی ایک مسلمان سے بھی نہیں ہوئی تھی :

> **Thank God I was introduced to Islam before I was introduced to a single Muslim.**

فرانس میں بڑی تعداد میں مستشرق پیدا ہوئے۔ انھوں نے عربی زبان سیکھی اور اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ عام طور پر ہمارے یہاں استشراق کو اسلام کے خلاف ایک مغربی سازش سمجھا جاتا ہے مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر ایسا کرتے ہیں کہ کسی کے یہاں اگر کوئی چیز خلافِ مزاج یا خلافِ حق دیکھتے ہیں تو بس اسی کو جنرلائز کرنے لگتے ہیں۔ وہ آدمی کی تمام مثبت باتوں کو بھلا کر چند اختلافی باتوں ہی کو اس کی کُل بات قرار دے دیتے ہیں۔

مستشرقین میں بہت سے ایسے افراد ہیں جنھوں نے اسلام کے گہرے مطالعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ انھیں میں سے ایک فرانس کا مستشرق اتین دینیہ (Etienne Dinet) ہے۔ وہ ۱۸۶۱ء میں پیرس میں پیدا ہوا، اور ۱۹۲۹ء میں پیرس ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ۱۹۲۷ میں الجزائر میں اسلام قبول کر لیا۔ اس کے قبولِ اسلام کی تقریب میں عرب علماء کی بڑی تعداد شریک تھی۔ اس نے اپنا اسلامی نام ناصر الدین رکھا۔ اس کی اسلام پر کئی اعلیٰ تصنیفات ہیں۔ ان میں سے ایک فرانسیسی زبان میں لکھی ہوئی سیرتؐ (Mohamet) ہے۔ اس کی مختلف اسلامی کتابوں میں سے ایک کتاب عربی میں اشعۃ من نور الاسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق، اس کی تدفین الجزائر کے ایک گاؤں بوسعادہ میں ہوئی۔

دکتور محمود المقداد کی کتاب تاریخ الدراسات العربیۃ فی فرنسا ۱۹۹۲ میں کویت سے

چھپی ہے۔ ۔۔۳۰ صفحہ کی یہ کتاب فرانس میں عربی مطالعات کے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو یہ فرانسیسیوں کے لیے عربی زبان اور عربی علوم کے مطالعہ کا نہایت طاقت ور محرک بن گیا۔ اس کے بعد فرانس میں بڑے بڑے مستعرب (مستشرق) پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک اہم شخصیت ہنری ماسیہ (H. Masse) کی ہے جس نے خاص اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا ہے (صفحہ ۲۲۹)

عرب دنیا میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کے بعد فرانس نے عربوں کو فرانسیسی بنانے (فرنسۃ الشعب العربی) کی مہم چلائی تھی، مگر سیاسی اور فوجی بالادستی کے باوجود فرانس ناکام رہا۔ فرنسۃ الشعب العربی کی مہم عملاً اسلمۃ الشعب الفرنسی کے ہم معنی بن گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظریہ کی طاقت ہر دوسری طاقت سے زیادہ عظیم ہے۔

بنگلہ دیش کی مصنفہ تسلیمہ نسرین، جو اپنے وطن سے بھاگ کر سویڈن میں مقیم ہے، آجکل فرانس کے دس روزہ دورہ پر ہے۔ اس کو فرانس بلا کر انسانی حقوق کی مجاہدہ کا انعام دیا گیا ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۹۴ کو موصوفہ سے فرانس کے صدر متراں (Francois Mitterrand) نے ریلیزی پیلس میں ملاقات کی۔ تسلیمہ نسرین نے صدر فرانس کو بتایا کہ کس طرح وہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر انتہا پسند مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہو رہی ہے۔ ۲۰ منٹ کی یہ ملاقات خود پریسیڈنٹ متراں کی درخواست پر ہوئی۔ کیونکہ صدر موصوف یہ چاہتے تھے کہ وہ فرانس کی طرف سے موصوفہ کی قدر دانی کا اظہار کریں۔

نام نہاد مسلم دانشور اس واقعہ پر صدر فرانس کو برا کہیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اعراض کے اشو کو ہنگامہ آرائی کا اشو بنایا۔ اور اس طرح انتہائی غیر ضروری طور پر تسلیمہ نسرین کو ہیرو کا درجہ دے دیا۔

کسی طالب علم سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ غیر کمیونسٹوں کو رائٹسٹ اور کمیونسٹوں کو لفٹسٹ کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ذہانت کے زور پر جواب دیا ——— اس لیے کہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ وہ کبھی رائٹ (درست) نہیں ہوتے :

Because, the events in communist countries have proved that they might not be right.

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اصطلاح فرانس میں بنی۔ فرانسیسی ریولیوشن کے زمانہ میں نیشنل اسمبلی میں دو بڑے سیاسی گروپ تھے۔ کنزرویٹو گروپ بادشاہ کی حمایت کرتا تھا۔ اور ریڈیکل گروپ سسٹم میں ڈرامٹک تبدیلیوں کی مانگ کر رہا تھا۔ اسمبلی ہال میں ان کی نشستیں اس طرح تھیں کہ کنسرویٹو (شاہ پسند) ممبران اسپیکر کے دائیں طرف بیٹھتے تھے۔ اور انقلاب پسند اسپیکر کے بائیں طرف۔ اس وقت سے سیاسی اصطلاح میں انقلابی تبدیلی (radical change) چاہنے والوں کو لفٹسٹ کہا جانے لگا۔

پیرس آج کل ایک نئی تحریک کا مرکز بن رہا ہے جس کو اٹلانٹا پلس (Atlanta Plus) کہا جاتا ہے۔ ان کی مانگ ہے کہ ۱۹۹۶ میں اٹلانٹا میں ہونے والے اولمپک گیم میں عورتوں کو بھی برابر کی حیثیت سے شریک کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۲ میں بارسلونہ (اسپین) میں جو اولمپک کھیل ہوئے تھے، اس موقع پر یہ طے کیا گیا تھا کہ کھیلوں میں جنسی امتیاز کا خاتمہ کیا جائے۔ مگر ۴۴ مسلم ملک ابھی تک اس کے لیے راضی نہیں ہوئے ہیں۔ تحریک کی ایک پُرجوش حامی خاتون نے کہا کہ جنسی امتیاز بھی نسلی امتیاز ہی کی مانند ہے:

Sex discrimination is analogous to the racial discrimination.

میں نے ایک خاتون سے کہا کہ کیا آپ پسند کریں گی کہ اگلے اولمپک میں فرانس کی ایک خاتون افریقہ کے ایک مرد باکسر کا مقابلہ کرے۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ خود آپ کی اسکیم کے مطابق، عورتوں کو عورتوں کے مقابلہ میں کھیلنا ہے نہ کہ مردوں کے مقابلہ میں۔ یہ تو خود ایک جنسی امتیاز ہے، پھر آپ اس کو جنسی برابری کا نام کیوں دیتی ہیں۔

پیرس میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہاں سے میڈرڈ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر آئبیرین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۳۴۴۵ کے ذریعہ طے ہوا۔ مقامی وقت کے لحاظ سے ۲۷ نومبر کی شام کو ساڑھے سات بجے جہاز روانہ ہوا۔ یہ ڈیڑھ گھنٹہ کا ایک خوش گوار سفر تھا۔ ہوائی جہاز آگے کی طرف جا رہا تھا اور میرا ذہن پیچھے کی طرف مڑ کر "فرانس میں اسلام" اور "اسپین میں اسلام" کی تاریخ کے صفحات الٹنے میں مصروف تھا۔

راستہ میں اسپینی ایرلائنز (Iberia) کی فلائٹ میگزین رونڈا ایبریا کا شمارہ نومبر ۱۹۹۴ دیکھا۔ ۱۳۰ صفحہ کا یہ میگزین زیادہ تر سیاحوں کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ لمبا

مضمون غرناطہ کے بارہ میں تھا۔ رنگین تصویروں کے ساتھ یہ مضمون میگزین کے ۱۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بیک وقت اسپینی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا۔ اہل اسپین نے ایک عرصہ تک مسلم دور کو نظر انداز کیا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ اسپین کی مسلم یادگاروں کی اہمیت ان کے لیے مزید اضافہ کے ساتھ وہی ہے جو ہندستان میں تاج محل کی ہے۔ چنانچہ مضمون کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا تھا ——— غرناطہ، جنت کی دوبارہ یافت :

Granada, paradise regained

یہ مضمون یہاں سے شروع کیا گیا تھا کہ یہ عمارتیں اور یہ باغات اس لیے بنائے گئے تھے کہ ہم اپنے تصور کی جنت کا ایک پیشگی نظارہ کر سکیں۔ یہاں زمینی ماحول کو ہماری تصوراتی جنت میں ڈھالا گیا تھا۔ اندلس کا مسلم غرناطہ زمین پر جنت بنانے کی ایسی ہی ایک مثال ہے۔

مضمون کی اگلی سطروں میں بتایا گیا تھا کہ ان مسلم بادشاہوں کو ان کے علامتی شہر غرناطہ سے اور ان کی بنائی ہوئی جنتِ عدن سے نکالے جانے کے پانچ سو سال بعد اب کچھ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی کھوئی ہوئی جنت کو دوبارہ حاصل کر سکیں :

Now, five hundred years after they were expelled from Granada, their private Eden and their most emblematic city, there are some who are trying to regain that lost paradise of theirs. (p. 62)

اسپین میں داخل ہونے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ یہاں مسلمان آزاد ہیں، اور یہاں اسلام کی سرگرمیاں جاری ہیں تو میں نے کہا : ہندستان میں کچھ نادان لوگ یہ کہتے رہتے ہیں کہ انتہا پسند ہندو انڈیا کو دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ان کو زمانہ کے فرق کا علم نہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ پہلا اسپین بنانے کی کوشش ابھی کامیاب بھی نہیں ہوئی تھی کہ زمانہ نے عالمی حالات کو بدل کر "اسپین سازی" جیسے منصوبہ کا امکان ہی ختم کر دیا۔

اسپینی ایرلائنز کی اس فلائٹ میگزین (Ronda Iberia) میں اسپین کے مسلم عہد کا نہایت شاندار باتصویر تعارف کرایا گیا تھا۔ اس کو سیاحوں کے لیے اسپین کے سب سے زیادہ پُرکشش مقام کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس ذیل میں اعتراف کیا گیا تھا کہ مسلم دور کے اسپین میں موجودہ اسپین سے بہتر حالات تھے۔ مزید یہ کہ الاندلس (مسلم اسپین) کی وراثت کبھی اسپین سے ختم نہیں ہوئی

اور نہ وہ کبھی ملک بدر کی گئی۔ وہ مختلف صورتوں میں یہاں باقی رہی (اصل عبارت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)

میڈرڈ ایرپورٹ پر زیادہ وقت نہیں لگا۔ کانفرنس کی طرف سے دو خواتین موجود تھیں۔ انھوں نے ایک گاڑی میرے حوالے کی جس نے مجھے ہوٹل ایورو بلڈنگ (Hotel Eurobuilding) پہنچا دیا۔ جہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۶۶۴ میں تھا۔

ہماری گاڑی جب میڈرڈ کی سڑکوں سے گزر رہی تھی تو اس کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میڈرڈ مغربی یورپ کے بڑے شہروں کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں اسپین نے مغربی یورپ کو سائنسی ترقی کا راستہ دکھایا تھا۔ مگر آخری مرحلہ میں اسپین پیچھے اور مغربی یورپ آگے ہوگیا۔ اس کی وجہ یہاں کے مذہبی طبقہ کا غلط کردار ہے۔ انھوں نے اسپین کے مسلمانوں کے ترقیاتی پہلو کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ وہ غیر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس پہلو کو لے کر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف خوب نفرت پھیلائی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے علم کے خلاف بھی۔ اس منفی روش نے اسپین میں علمی ترقی کے عمل کو کئی سو سال پیچھے کر دیا۔

انگریز مؤرخ لین پول (Lane-Pool) نے موجودہ صدی کے آغاز میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام اسپین کے مسلمان (Moors in Spain) تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے اسپینی مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ پھر اس نے لکھا ہے کہ اسپین کی مسلم حکومت کا خاتمہ اور وہاں سے جبراً مسلمانوں کو نکالنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسپین دوبارہ اسی غیر ترقی یافتہ حالت کی طرف لوٹ گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ مسلمان اسپین سے نکال دیے گئے۔ کچھ دیر کے لیے مسیحی اسپین چمکا تھا

The people of today's Granada have now come up with an all-embracing scheme aimed at directing people's attention to the past which still surrounds them in the present, helping them in this way to retrieve it. The project, christened The Legacy of Al Andalus, is all set to become a reality next year, and its tempting selection of special tours, designed to rescue the history that lies down half-forgotten byways, is guaranteed to lure travellers on a fascinating journey through the past of these lands, back to times when there were better dreams than there are now: dreams of openness and pluralism. The legacy of Al Andalus never died, and was never conquered or expelled. It left with us its architecture, its monuments, its customs, its speech, its food, its sciences, its odours and its poems. The Granada of the Nasrids, the city of bliss in the midst of the convulsions of the Middle Ages, now wants to raise its head. (*Rondaiberia*, November 1994, page 64)

جس طرح چاند غیر کی روشنی سے چمک اٹھتا ہے۔ پھر گرہن آگیا۔ اور اسی تاریکی میں اسپین اب تک پڑا ہوا ہے :

The Moors were banished, for a while Christian Spain shone, like the moon, with a borrowed light, then came the eclipse, and in that darkness Spain has grovelled ever since. (p. 280)

مسلم اسپین کا تعارف سب سے پہلے مجھے مسدس حالی کے ذریعہ ہوا۔ اس میں اسپین کے مسلم عہد کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ مگر وہ سلبی نوعیت کا تھا۔ مثلاً مسدس کے ایک بند کا دو مصرعہ اس طرح تھا :

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے　　وہ اجڑا ہوا کرّوفر جا کے دیکھے

اس کے بعد میں نے عربی یا اُردو میں جتنے تذکرے پڑھے وہ تقریباً سب کے سب مرثیہ خوانی کے انداز میں تھے۔ مثلاً اقبال نے مسلم نوجوان کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ " وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا " اقبال احمد سہیل کی ایک نظم میں میں نے اس قسم کے اشعار پڑھے :

ہمیں چھائے ہوئے تھے شرق سے تا غرب دنیا میں　　موافق جن دنوں تھی گردش دور زماں ہم سے

مسلم دانشور اور مسلم ادیب اس قسم کی مرثیہ خوانی میں کیوں مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ بہت بعد کو مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب کہ اسلام کے وسیع مطالعہ کے بعد میں نے دوبارہ اسلام کو دریافت کیا۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اسلام کی عظمت کو الحمرا اور لال قلعہ کی سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی عظمت کے سوا کسی اور عظمت کی انھیں خبر نہیں۔ اگر وہ صاحب بصیرت ہوتے تو وہ جانتے کہ اسلام کی نظریاتی عظمت تمام عظمتوں سے زیادہ بڑی ہے۔ مزید یہ کہ یہ نظریاتی عظمت اس وقت بھی پوری طرح باقی رہتی ہے جب کہ در و دیوار کی عظمتیں کھنڈر ہو کر گزری ہوئی تاریخ کا حصہ بن چکی ہوں۔

۲۸ نومبر کی صبح کو اٹھا تو یہ سوچ کر عجیب احساس ہوا کہ کل میں ہندستان میں سو کر اٹھا تھا۔ آج میں سو کر اٹھا ہوں تو میں ہزاروں میل دور اسپین میں ہوں۔ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی۔ نماز میں جب میں قرآن کے ایک حصہ کی تلاوت کر رہا تھا تو غیر معمولی طور پر میری آواز اونچی ہو گئی۔ یہ احساس کہ آپ ایک نئی جگہ اللہ کا نام بلند کر رہے ہیں، آپ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ آپ

زیادہ بڑھی ہوئی کیفیت کے ساتھ ذکر اور عبادت کا فعل انجام دینے لگتے ہیں۔

اسپین کے وقت میں اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس وقت جب کہ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ یہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں جب کہ اس وقت انڈیا کی گھڑیوں کی سوئی صبح چار بجے کا وقت بتا رہی ہے۔ وقت کے اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوا کہ میں ۲۷ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوا، اور اسی دن شام کو میڈرڈ پہنچ گیا۔ اگر مشارق و مغارب میں فرق نہ ہوتا اور دونوں ملکوں کی گھڑی ایک ہی ہوتی تو ۲۷ نومبر کو روانہ ہونے کے بعد جب میں یہاں پہنچتا اس وقت کلنڈر میں ۲۸ نومبر کی تاریخ شروع ہو چکی ہوتی۔

۲۷ نومبر کی شام کو جب میں کمپیوٹر کارڈ کے ذریعہ تالا کھول کر اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں کمرہ بہت شاندار نظر آیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ میڈرڈ کا ایک ممتاز ہوٹل ہے۔ لیکن اگلے دن میری نظر میں اس کی جاذبیت ختم ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ یہاں ٹھہرنے کا شوق کرنے کے بجائے اب واپسی کے دن گننے لگا۔ یہی دنیا کی تمام بظاہر عمدہ چیزوں کا حال ہے۔ دنیا کی ہر چیز ملنے کے پہلے دن اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگلے ہی دن وہ ایک معمولی چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ دور سے دیکھنے والے جس زندگی کو عیش کی زندگی سمجھتے ہیں وہ خود صاحب عیش کے لیے صرف بورڈم کے ہم معنی ہوتی۔ یہ صرف جنّت کی خصوصیت ہے کہ اس کی جاذبیت کبھی ختم نہ ہوگی۔ بلکہ ہر دن اس کی لذت بڑھتی ہی جائے گی۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے عمل میں لذت رکھ دی ہے اور آخرت میں عمل کے انجام میں۔

شیخ اسحاق ادریس سکوتہ کا تعلق سوڈان سے ہے۔ صبح کے ناشتہ پر ملاقات ہوئی تو ان سے میں نے مہدی سوڈانی (۱۸۸۵-۱۸۴۴ء) کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ سمجھدار آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ خود یہ بھی ایک کم عقلی کی بات ہے کہ کوئی آدمی مہدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ مگر لوگوں کی ایک بھیڑ ان کے گرد اکٹھا ہو گئی۔ انھوں نے ایسے اقدام کیے جن کو صرف ناپختہ اقدام ہی کہا جا سکتا ہے۔ شیخ سکوتہ نے جواب دیا: کان یری رسول اللہ کثیراً۔ ولکن مشیئۃ اللہ فوق ذلک۔ یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بہت زیادہ دیکھتے تھے۔ مگر اللہ کی مشیئت اس سے اوپر ہے۔

خواب میں کسی کو دیکھنا یہ ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کی بنا پر مہدویت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس طرح کے خواب کی بنیاد پر کوئی قومی یا اجتماعی پالیسی بنائی جا سکتی۔ قومی یا ملی پالیسی

کی بنیاد شوریٰ پر ہے۔ اس طرح کے نازک معاملات میں اہل علم کے مشورہ سے جو بات طے ہوگی وہ قابل عمل ہوگی نہ کہ کسی کا یہ کہنا کہ میں نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ یہ بھی کس قدر عجیب بات ہے کہ مہدی سوڈانی پر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تقریباً ۲۲ سطر کا مضمون ہے اور خلیفہ دوم عمر بن خطاب پر صرف ۹ سطر کا مضمون۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، وہ کرکے دکھا جانے کی چیز ہے۔ مگر یہ بات بھی صحیح نہیں۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یاب۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی بڑا سیاسی یا قومی کارنامہ کرے جس کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مہدی کی اصل صرف یہ ہے کہ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی حقیقت گم ہو چکی ہوگی، وہ اسلام کی معرفت حاصل کرے گا۔ گویا مہدی اصلاً ہدایت کو پانے والا ہوگا نہ کہ ہدایت کا خارجی نظام قائم کرنے والا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کا مہدی ہونا یہ اللہ کے علم کی بات ہے، اس کا یقینی علم نہ خود مہدی کو ہوگا اور نہ اس کے معاصر لوگوں کو۔ کیوں کہ ہدایت یاب کون ہے، اس کا تعلق تمام تر علم الٰہی سے ہے۔

۲۹ نومبر کو دوپہر کے کھانے کی میز پر قاہرہ کے دکتور جمعہ (مصری بولی میں گمعہ) بھی موجود تھے۔ گفتگو کے دوران گائے (بقرہ) کا ذکر آگیا۔ انھوں نے فوراً سورہ البقرہ کی آیتوں کی تلاوت شروع کردی۔ سب لوگ خاموش ہو کر سننے لگے۔

مصری قاریوں کی قرأت تو مجھ کو پسند نہیں لیکن مصری علماء کی قرأت مجھ کو بہت پسند ہے۔ میں نہایت شوق کے ساتھ اس کو سنتا رہا۔ عام قاری جس طرح اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ تو مجھے بالکل غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ صحابہ اس طرح قرآن کو پڑھتے ہوں گے۔ لیکن عرب علماء خاص طور پر حجاز کے علماء کی قرأت مجھے وجدانی طور پر صحابہ کے انداز قرأت کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔ اس کو سن کر تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے زمانہ کا فاصلہ ختم ہو گیا ہے اور ہم ایک زندہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ صحابہ کی تلاوت قرآن کو دوبارہ سن رہے ہیں۔

ایک مجلس میں کچھ عرب حضرات تھے۔ ایک صاحب نے اسپین میں مسلم سلطنت کے آخری زمانہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اندلس کے آخری مسلم سلطان ابوعبداللہ نے جب الحمراء کی کنجیاں عیسائی حکمراں

کے حوالے کردیں اور وہ روتا ہوا غرناطہ سے نکلا تو اس کی ماں نے اس کی توبیخ کی اور کہا: ابک کمثل النساء ملکا مضاعا لم تحافظ علیہ کمثل الرجال (اس کھوئے ہوئے ملک پر عورتوں کی طرح روؤ جس کو تم مردوں کی طرح نہ بچا سکے)

میں نے کہا کہ ابوعبداللہ کی ماں کا یہ جملہ بہت زیادہ رائج ہے مگر وہ حقیقت حال کی صحیح ترجمانی نہیں۔ کیوں کہ ابوعبداللہ اور اس کی فوجیں آخری دور میں بھی نہایت بہادری کے ساتھ لڑ رہی تھیں۔ مگر کوئی سلطان ایک فوج سے لڑ سکتا ہے وہ حقائق سے نہیں لڑ سکتا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ خود مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے، پھر وہ کیسے کامیاب ہوتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ابوعبداللہ نے نہایت بہادرانہ مقابلہ کرکے عیسائی فوج کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ مگر اس کے بعد ابوعبداللہ کا چچا الزغل عیسائیوں کے ساتھ مل کر اس کا داخلی دشمن بن گیا۔ اس طرح فتح دوبارہ شکست میں تبدیل ہوگئی۔

تاہم الزغل کو اس بے وفائی کا کوئی معاوضہ مسیحی حکمرانوں کی طرف سے نہیں ملا۔ سلطنت غرناطہ پر اپنے قبضہ کی تکمیل کے فوراً بعد انھوں نے الزغل کو اسپین سے نکال دیا۔ وہ الجزائر میں تلمسان کے مقام پر چلا گیا اور وہاں گم نامی کی حالت میں مرگیا۔ جو آدمی اپنوں سے بے وفائی کرے اس کو یہ امید نہیں رکھنا چاہیے کہ غیروں کی طرف سے اس کو وفاداری کا انعام دیا جائے گا۔

اسپین کی مسلم سلطنت اپنے آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قصر الحمراء تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اسی طرح جیسے کہ ہندستان کی مغل سلطنت اپنے آخری مرحلہ میں دہلی کے لال قلعہ تک محدود ہوگئی تھی۔ مگر آخری مسلم حکمراں ابوعبداللہ کے فوجی سردار موسیٰ بن ابی الغازان نہایت بہادر تھا۔ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ اپنی موت تک بہادری کے ساتھ لڑتا رہا۔

تاہم حقیقت سے لڑنا زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے ۳ جنوری ۱۴۹۲ء کو عیسائی حکمراں کے ساتھ صلح کرلی اور غرناطہ کو اس کے لیے خالی کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی عمومی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اس پکڑ دھکڑ میں شدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلیفہ کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود مسلمانوں نے ابھی اس کو قبول نہیں کیا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں بار بار انھوں نے بغاوت کا جھنڈا اٹھایا۔ مگر انھیں بری طرح شکست ہوئی اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر جنگ بندی قبول کرلی کہ وہ اسپین کو

چھوڑ کر مراکو، ترکی اور مصر چلے جائیں گے۔

تاتاری سردار ہلاکو خاں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کی مسلم سلطنت کا خاتمہ کیا تھا۔ اسپینی بادشاہ فرڈیننڈ دوم نے ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی مسلم سلطنت کو آخری طور پر ختم کر دیا۔ ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: یہ اسلام دشمنوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔

میں نے کہا کہ اگر بغداد کی عباسی سلطنت کا خاتمہ اسلام دشمنوں کی سازش کی بنا پر ہوا تو اس کے صرف پچاس سال بعد انھیں دشمنوں کا خاندان اسلام بن جانا کس سازش کا نتیجہ تھا۔ میں نے کہا کہ سازش کے تصور کے تحت مسلم تاریخ کی توجیہہ کرنا مسلم قوم کو مقہور اور غیر مسلم قوم کو قاہر کے مقام پر بٹھانا ہے۔ اس طرح کا تصورِ تاریخ سراسر قرآن کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ امتِ محمدی کا مستقبل تمام تر دعوت کے اوپر منحصر ہے۔ مسلمانوں کے لیے مقدر ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کو ادا کرکے اٹھیں گے اور دعوت الی اللہ سے کوتاہی کرکے گریں گے۔ بغداد اور غرناطہ کی سلطنت کے زمانہ میں مسلمانوں نے علمی اور مادی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی۔ مگر یہ ترقیاں ان کے لیے حفاظت کا ذریعہ نہ بن سکیں۔

تاہم خود اسی المیہ میں یہ سبق بھی موجود ہے کہ عباسی خلافت کے خاتمہ کے بعد جب مسلمانوں کے پاس سیاسی اور فوجی طاقت نہ رہی تو انھوں نے اسلام کی دعوتی طاقت کو استعمال کیا۔ اور اس کے بعد تاریخ نے دیکھا کہ جہاں بظاہر کھنڈر تھا وہاں ایک شاندار قلعہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاریخ کا یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے ایک ابدی نشانِ راہ ہے۔

ایک عرب دوست نے مجھے ایک کتاب ہدیہ میں پیش کی۔ ۱۶۰ صفحہ کی یہ کتاب ۱۹۹۳ میں مکتبہ اشبیلیہ (الریاض) سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف عبدالرحمٰن عبدالوہاب ہیں اور اس کا نام ہے: تصفیۃ الوجود الاسلامی۔ یعنی اسلامی وجود کا خاتمہ۔ کتاب کے ایک حصہ میں بڑے جذباتی انداز میں سقوط غرناطہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے:

ھاھی الاندلس ضاعت واصبحت ذکری نبکی علی اطلالھا ونبکی تخاذل المسلمین وتقصیرھم فیھا (صفحہ ۱۰)	یہ ہے وہ اندلس جو کھو یا گیا اور محض ایک ایسی یاد بن کر رہ گیا جس کے کھنڈروں پر ہم روتے ہیں۔ اور جس کی حفاظت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی کوتاہی اور دستبرداری پر آنسو بہاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی مرثیہ خوانی اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام امید اور اعتماد کا دین ہے۔ اسلام عسر میں یسر کا راز بتاتا ہے۔ اسلام کے لیے خدا نے حفاظت و نصرت کا ابدی وعدہ کیا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم منفی پہلو میں بھی مثبت پہلو دریافت کریں۔ خود میڈرڈ کی موجودہ کانفرنس اس بات کی ایک علامت ہے کہ اسپین کے تاریخی کھنڈروں سے دوبارہ اسلام کا ایک نیا مستقبل پیدا ہو رہا ہے۔

کانفرنس کے شرکا کو میڈرڈ شہر کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن کانفرنس کے اجلاس الکلا یونیورسٹی میں ہوئے جو شہر سے ۳۰ کیلومیٹر دور ہے۔ لوگ روزانہ صبح کو سواریوں کے ذریعہ یونی ورسٹی لے جائے جاتے۔ دن کے کھانے کا انتظام وہیں یونی ورسٹی کے اندر ہوتا۔ شام کا کھانا اکثر کسی اور مقام پر کسی بڑے آدمی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس طرح صبح کو نکلنے کے بعد دوبارہ رات کو ہوٹل میں واپسی ہوتی۔

۲۸ نومبر کو صبح نو بجے ہم سب لوگ قافلہ کی صورت میں الکلا یونی ورسٹی لے جائے گئے۔ یہ یونیورسٹی شہر سے دور ایک تاریخی ٹاون میں ہے۔ شہر اور اس کے بیرونی علاقہ کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم لوگ پتھر کی بنی ہوئی ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے اترے۔ اسی قدیم محل نما عمارت میں الکلا یونی ورسٹی قائم کی گئی ہے۔ اسی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام یہ کانفرنس ہو رہی ہے۔ کانفرنس کے اجلاس روزانہ اسی یونی ورسٹی کے مختلف ہال میں ہوں گے۔

میڈرڈ اسپین کی راجدھانی ہے۔ جب میں میڈرڈ کے مختلف حصوں سے گزرتا تھا تو بار بار مجھے یہ خیال آتا تھا کہ یہاں کی تمام چیزیں بظاہر یورپ کے انداز پر بنائی گئی ہیں۔ مگر وہ یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ شہروں کے معیار سے کم ہیں۔

یونی ورسٹی کے بڑے ہال میں افتتاحی اجلاس ہوا۔ بتایا گیا کہ اس کانفرنس کا مقصد تینوں مذہبوں (یہودیت، عیسائیت، اسلام) میں تعلقات کو بہتر بنانا ہے۔ اظہار خیال کی زبان اسپینی، انگریزی، فرانسیسی اور عربی تھی۔ ہیڈ فون کے ذریعہ ہر آدمی اپنی مطلوب زبان میں مقرر کی بات کو سن سکتا تھا۔

میڈرڈ کے میئر نے تقریر کی تو پہلے کہا سلام، شولوم۔ پھر انھوں نے اپنی تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ قدیم اسپین میں تینوں مذہب کے لوگوں نے مل کر ایک تاریخ بنائی تھی۔ اب پھر ضرورت ہے کہ تینوں مذہب کے لوگ مل کر یہاں نئی دنیا کی تعمیر کریں۔

ایک اسرائیلی مقرر نے کہا کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان اقتصادی تعاون (economic cooperation) ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کے نام کو ہائی جیک کرے :

No one has right to highjack the name of God.

رات کو دوبارہ ہم لوگ اپنے ہوٹل میں واپس پہنچا دیے گئے۔

۲۸ نومبر کو افتتاحی اجلاس میں میڈرڈ کے میئر کے علاوہ ایک اسپینی یہودی اور ایک اسپینی عیسائی کی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے جن کا نام مسٹر تمارال بتایا گیا تھا۔ ان کے چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ اور بظاہر نہایت سنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد اسپینی زبان میں اپنی تقریر کی۔

ان کی شخصیت کے بارہ میں مجھے تجسس تھا۔ بعد کو ملا تو پتہ چلا کہ وہ ایک اسپینی مسلمان ہیں۔ وہ تھوڑی عربی اور تھوڑی انگریزی جانتے تھے اس لیے ان سے گفتگو ممکن ہوسکی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا اصل خاندانی نام فضل اللہ ہے موجودہ نام ان کے اصل عربی نام کا اسپینی ترجمہ ہے۔ انھوں نے اپنا مکمل پتہ دیا جو اس طرح ہے :

Julio Torralbo Tamaral, Psicologia Clinia Escolar
Collegiado N. 1911 CPM, Madrid
(Tel. 96-5141433)

غرناطہ کی مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد جب اسپینی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور ان کو یہاں سے نکالا جانے لگا تو بہت سے لوگوں نے اپنے نام بدل لیے۔ تاکہ وہ یہاں رہ سکیں۔ اس طرح کے بہت سے خاندان ابھی تک اسپین میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اس لیے ایسے مسلمان اب چھپ کر نہیں رہتے۔ بلکہ وہ اعلان کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال خود فضل اللہ صاحب ہیں۔ موجودہ کانفرنس جو ایک حکومتی ادارہ کی طرف سے کی گئی تھی، اس میں ان کو اسلام کے اسپینی نمایندہ کی حیثیت سے بولنے کا موقع دیا گیا۔

کانفرنس کے موقع پر میں نے انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا : امن اسلام میں (Peace in Islam) اس کو انشاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کردیا جائے گا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اسلام امن کا مذہب

ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام میں جنگ صرف ناگزیر دفاع کے لیے جائز ہے، کسی اور مقصد کے لیے اسلام میں جنگ کی اجازت نہیں۔

اس پیپر کے علاوہ مختلف مواقع پر میں نے اسلام کے امن اور رحمت اور انسانیت کے تصور کی وضاحت کی۔ اس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ میڈرڈ کے اسپینی اخبار الکلا (Diario De Alcala) کا شمارہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۴ کانفرنس نمبر کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے نمایاں انداز میں صفحہ اول پر میری تنہا تصویر شائع کی۔ اخبار کا یہ شمارہ مجھے یروشلم کے آوی شاکیت (Avi Shoket) نے لاکر دیا تھا۔ یہ اور اس سلسلہ کے بعض دوسرے اسپینی اخبار اسلامی مرکز کے دفتر میں بطور ریکارڈ موجود ہیں۔

۲۹ نومبر کو میں نے اپنا جو پیپر پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ لوگوں نے نہایت دل چسپی کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے اس کی کاپیاں مانگیں۔ ایک خاتون ورکر نے مجھ سے میرا نسخہ لیا اور یونی ورسٹی کے دفتر میں جاکر اس کی کئی فوٹو کاپی نکلوائی اور لوگوں کے درمیان تقسیم کردی۔

۲۸ نومبر کی شام کو اجلاس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد تمام شرکا یونی ورسٹی سے واپس ہوکر اپنے ہوٹل کے کمروں میں آگئے۔ اس کے بعد ۹ بجے رات کو دوبارہ کھانے کے لیے روانگی ہوئی۔ اس کا انتظام اسپین کے ایک وزیر کی طرف سے ایک خصوصی گارڈن میں کیا گیا تھا۔ یہاں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد واپسی ہوئی تو گاڑی میں ایک صاحب کا ساتھ ہوگیا۔ انھوں نے اپنا نام خواکین لومبا بتایا۔ وہ سرقسطہ (اسپین) کی یونی ورسٹی میں مسلم فلاسفی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مشہور مسلم فلسفی ابن باجہ کے ہم وطن ہیں اور انھوں نے ابن باجہ پر ریسرچ کرکے ایک کتاب شائع کی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے شعبہ میں کتنے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً دو سو طلبہ ہیں۔ انھوں نے اپنا نام عربی میں لکھ کر مجھے دیا۔ ان کا پورا نام اور پتہ یہ ہے :

Joaqvin Lomba, Professor of Muslim Philosophy
University of Zaragoza
50005-Zaragoza, Spain.

خواکین لومبا ابن باجہ کی بہت تعریف کرتے رہے۔ ابن باجہ (Avempace) اسپین کے شہر سرقسطہ (Zaragoza) میں ۱۰۹۵ء میں پیدا ہوا، اور مراکو کے شہر فاس میں ۱۱۳۹ء میں اس کی وفات

ہوئی، وہ ابن طفیل اور ابن رشد کی طرح ایک عظیم فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اگر چہ کچھ لوگ اس کو ملحد قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر خواکین لومبا اسی شہر سرقسطہ میں پیدا ہوئے۔

پروفیسر خواکین لومبا عربی بھی جانتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی کے بعد اسلامی فلسفہ کی ترقی رک گئی۔ اس کے بعد کوئی بڑا مسلم فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ اس کا سبب آخر کیا ہے۔

میں نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہ دور میں تبدیلی کا معاملہ ہے۔ قدیم معنی میں جس چیز کو اسلامی فلسفہ کہا جاتا ہے، اس کی تشکیل اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دنیا میں یونان کی قیاسی منطق کا غلبہ تھا۔ مسلم فلسفیوں نے اس میں مہارت پیدا کی اور اس کی بنیاد پر اپنا فلسفہ مرتب کیا۔ مگر سائنسی انقلاب کے بعد یہ منطق ختم ہوگئی۔ اب سائنسی منطق کا دور آگیا۔ مگر مسلم ذہن سائنسی منطق میں مہارت نہ پیدا کر سکا اس لیے وہ جدید علم کی بنیاد پر اسلامی فلسفہ (جدید علم کلام) بھی تشکیل نہ دے سکے۔

میں نے کہا کہ دور اول میں جب مسلمانوں کا مقابلہ یونانی منطق سے پیش آیا تو وہ فاتح کی نفسیات میں جی رہے تھے۔ انھوں نے بڑھ کر یونانی منطق کو سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس طرح وہ اس قابل ہو گئے کہ یونانی منطق کو اسلامائز کریں اور اس کی بنیاد پر ایک طاقت ور علم کلام پیدا کر سکیں۔

مگر موجودہ دور میں جب سائنسی منطق کا زمانہ آیا تو مسلمان دوسری قوموں کے مقابلہ میں مفتوح اور مغلوب بن چکے تھے۔ چنانچہ ان میں اقدام کے بجائے تحفظ کا مزاج پیدا ہو گیا تھا۔ اس شکست خوردہ نفسیات کی بنا پر مسلم دانشور نئے علوم کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے، وہ آگے بڑھ کر ان سے واقف ہونے اور ان کو استعمال کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔

ایک مسلم اسکالر نے کہا کہ مسلم دور میں قرطبہ کی لائبریری میں چار لاکھ (400,000) کتابیں تھیں۔ جب کہ اس وقت سارے یورپ کی تمام لائبریریوں میں بھی اتنی کتابیں موجود نہیں تھیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ باتیں صرف جھوٹا فخر پیدا کرتی ہے۔ آج ضرورت یہ ہے کہ مسلمان وقت کو سمجھیں اور اپنے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے محنت کریں۔ ہمیں ماضی کے علمی کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے کہ ہم محنت کرکے آج کے علم انسانی

میں اضافہ کریں۔

اسرائیل سے بہت سے یہودی نیز عیسائی افراد یہاں آئے تھے۔ ان لوگوں سے میں معلوماتی انداز کی گفتگو کرتا رہا۔ ان میں ایک آوی شاکیت (Avi Shoket) تھے۔ ان کا تعلق فارین افیرس سے ہے۔ ان سے فلسطین کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ جب میں ان سے فلسطینیوں کے حق میں اپنے دلائل دے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہر دلیل کے جواب میں ایک متوازی دلیل ان کے پاس موجود ہے۔ میں نے سوچا کہ جب دونوں فریق یکساں طور پر اپنے آپ کو برحق سمجھ رہے ہوں تو آخر یہ مسئلہ کیوں کر حل ہو سکتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ یاسر عرفات اور حکومت اسرائیل کے درمیان حال میں جو معاہدۂ امن ہوا ہے اس کے بارہ میں اسرائیل کی اکثریت کی سوچ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں کی اکثریت خوف (fear) میں مبتلا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہم فلسطینیوں کو خاموش مدد پہنچا رہے ہیں۔ ہم نے مختلف حکومتوں کو ابھارا ہے کہ وہ فلسطینیوں کو مالی مدد دیں۔ حتی کہ ہم بالواسطہ ذرائع سے کام لے کر خود بھی فلسطینیوں کو مالی مدد دے رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسا ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ فلسطینی جب تک معاشی اعتبار سے مطمئن نہ ہوں، اس علاقہ میں امن کا قیام ممکن نہیں ہوگا۔

نادان آدمی اپنے حریف کو مار کر اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنے حریف کو خاموش کر کے اس کے اوپر فتح حاصل کر لیتا ہے۔

آوی شاکیت اسرائیلی حکومت میں اعلیٰ افسر ہیں۔ وہ شستہ انگریزی بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل عالمی برادری میں تنہائی (isolation) میں پڑ گیا تھا۔ اس تنہائی کا پہلا فائدہ ہم نے یہ اٹھایا کہ ہم یکسو ہو کر اپنی داخلی ترقی میں لگ گئے۔ مثلاً ہم نے اپنی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے پر اپنی توجہ لگا دی۔ اس خاموش جد و جہد کے نتیجہ میں ہم نے جو ترقی کی اس نے اب ہم کو اس پوزیشن تک پہنچا دیا ہے کہ ہم دنیا کی قوموں سے تعاون کر کے انھیں بہت کچھ دے سکیں۔

بنجر زمین کو کار آمد بنانے کے لیے ہمارے جو تجربات ہیں ان کی بنیاد پر ہمارے یہاں ایک مستقل شعبہ (Arid Zone Institute) قائم ہے۔ اس شعبہ کے تحت ہم مختلف ملکوں کو اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ انھیں ملکوں میں سے ایک آپ کا ملک انڈیا بھی ہے۔ انڈیا میں گجرات اور راجستھان میں ہمارے

تعاون کے تحت کئی پروجکٹ چل رہے ہیں۔

یہاں یہودی اہل علم بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ ان کی فکری سطح عام لوگوں سے اونچی ہے۔ یہی احساس مجھے ان کے بارہ میں پہلے بھی کئی بار ہوا ہے۔ شیخ ادریس سکوتہ سے میں نے کہا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودی زیادہ ذکی ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے تجربہ میں ایسا ہی پایا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک امت کی مانند رہتے ہیں۔ ان کا ایک آدمی دوسرے کے لیے اضافہ علم کا سبب بنتا ہے (لانهم امة واحدة ، يعلّم بعضهم بعضا)

یہ ایک فطری حقیقت ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے : المومن كثير باخيه۔ یعنی مومن اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کثیر ہو جاتا ہے۔ جس انسانی گروہ میں اجتماعی اوصاف نہ پائے جائیں، ان میں کا ہر شخص تنہا ہو جائے گا۔ اور جس انسانی گروہ میں اجتماعی اوصاف موجود ہوں، اس کا ہر فرد دوسروں کے لیے طاقت بنے گا اور خود دوسروں سے طاقت لیتا رہے گا۔

اسرائیل سے آئے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت کئی مسلم ملکوں میں عورت حکمراں ہے ——— ترکی، بنگلہ دیش اور پاکستان۔ روایتی اسلام میں تو عورت کی حکمرانی جائز نہیں۔ پھر یہ نیا ظاہرہ کیا اسلام میں ریفارمیشن کی علامت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال کروں گا۔ آپ کے یہاں مسز گولڈا میر حکومت کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچیں۔ ان کے دور حکومت کے بارہ میں آپ کا تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت جذباتی تھیں۔ اگر وہ حقیقت پسند ہوتیں تو فلسطینیوں سے آج امن کا جو معاہدہ ہوا ہے وہ گولڈا میر کے زمانہ میں ہی ہو گیا ہوتا، جب کہ انور سادات زندہ تھے۔ اس طرح ہم بہت سے جانی اور مالی نقصان سے بچ جاتے۔

میں نے کہا کہ خود آپ کے تجربہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو سیاسی حکمراں بنانا مفید نہیں۔ گویا کہ صحیح فطری اصول یہی ہے کہ عورت کو اقتدار اعلیٰ کے مقام پر نہ بٹھایا جائے۔ پھر جب یہ ایک صحیح فطری اصول ہے تو اس میں تبدیلی یا ریفارم کی کیا ضرورت ہے۔ اور جہاں تک بعض ملکوں میں عورت کو حکمراں بنانے کا سوال ہے تو یہ اتفاقی نوعیت کے بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے

ہے نہ کہ اسلام میں کسی ریفارمیشن کی تحریک کی وجہ سے۔

اسپین کی کانفرنس میں جو یہودی علما رآئے تھے ان میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ وہ پرجوش طور پر اسپین کی ماضی کی ترقیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کا راز مجھے کسی قدر بعد کو سمجھ میں آیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ماضی میں اسپین کی ترقیوں کو یہودی تاریخ کے خانہ میں درج کر دیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اُس زمانہ میں سیاسی اقتدار اگرچہ مسلمانوں کے پاس تھا۔ مگر ترقیاتی کام زیادہ تر یہودی افراد نے انجام دیا۔ یہ یہودی اس زمانہ میں ایڈوائزر، اکسپرٹ اور ماہرین فن کی صورت میں کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ابن میمون (Maimonide) اور ابن جیبرول (Gabriel) وغیرہ۔ اس لیے یہ تاریخ اگر سیاسی اعتبار سے عرب تاریخ کا حصہ ہے تو عین اسی وقت وہ علمی اعتبار سے یہودی تاریخ کا حصہ ہے۔

اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ ابن رشد کو بھی وہ یہودی عالم بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم سلطان منصور اسی لیے ابن رشد سے ناراض ہو گیا تھا اور اس کو قرطبہ سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد ابن رشد جاکر اسپین کے ایک گاؤں الیسانہ میں رہنے لگا جہاں کی آبادی میں بیشتر تعداد یہودیوں کی تھی۔ اس لیے ابن رشد یہودی تھا (فھو اِذن یھودی) چنانچہ یروشلم کی ہیبرو یونی ورسٹی میں مطالعاتِ رشدی کے نام سے ایک مستقل مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کے تحت ابن رشد کی کتابیں عبرانی اور انگریزی زبان میں شائع کی جا رہی ہیں۔

میں نے کہا کہ اسپین کے ترقیاتی عمل میں خواہ کچھ یہودی افراد شریک ہوں۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ ترقیاتی عمل اسلام کے فکری انقلاب کے تحت وجود میں آیا۔ اسلام نے اس دور کے توہماتی ذہن کو اگر نہ توڑا ہوتا تو سرے سے کوئی ترقیاتی عمل ہی ظہور میں نہ آتا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین میں بہت سے اہل علم اٹھے جنھوں نے زور و شور کے ساتھ یہ بات کہی کہ مسلم عہد کے اسپین کو نظر انداز کر کے ہم نے خود اپنا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ یہ عہد پوری اسپینی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار عہد تھا۔ مزید یہ کہ اسپین کی یہی وہ علمی ترقیاں تھیں جنھوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بنیاد فراہم کی۔ اس تاریخ کو لینے کی صورت میں ہم جدید تہذیب کے معمار قرار پاتے ہیں۔ اور اس تاریخ کو چھوڑ دینے کی صورت میں ہمارے پاس کوئی چیز نہیں رہتی جس کو ہم

فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس قسم کے اسپینی اہل علم کی فہرست بہت لمبی ہے مثال کے طور پر ڈاکٹر گائینگوس، ڈاکٹر امریکو کاسترو، ڈاکٹر بدرو مارتینیز مونتابث وغیرہ۔

اسپین کے لوگوں کی اس کوشش کو عرب دانش وروں نے اَسبنۃ التاریخ الاسلامی فی الاندلس کا نام دیا ہے۔ یعنی اندلس کی اسلامی تاریخ کو اسپینی بنانا۔ مگر خود اسپینی اس کو اپنے بھولے ہوئے ماضی کی طرف واپسی قرار دیتے ہیں۔

۲۸ نومبر کی صبح کو میں ہوٹل میں ناشتہ کی میز پر تھا۔ اچانک کسی نے میرے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو شیخ اسحاق ادریس سکوتہ (۷۵ سال) تھے۔ وہ ایک سوڈانی عالم ہیں اور آج کل رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ میں مقیم ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے پوچھا کہ شیخ حسن البنا تو ابتدا میں ایک مذہبی واعظ تھے اور اس اعتبار سے وہ ایک اچھا کام کر رہے تھے۔ پھر وہ غیر ضروری طور پر سیاست اور انتخابات میں کیوں کود پڑے۔ آخر انھوں نے اس بات کو کیوں نہیں جانا کہ سیاست میں داخل ہو کر وہ صرف بگاڑ میں اضافہ کریں گے، حالات کے اعتبار سے یہ ناممکن ہے کہ اس طرح وہ ملک میں کوئی مثبت سیاسی نتیجہ پیدا کر سکیں۔

شیخ سکوتہ نے جواب دیا کہ وہ ایک صوفی آدمی تھے۔ وہ سیاست نہیں جانتے تھے۔ مگر ان کے وعظوں اور تقریروں سے جب مسلمانوں کی بھیڑ ان کے گرد اکٹھا ہونے لگی تو کچھ لوگوں نے انھیں استعمال کیا (کان الشیخ حسن البنا رحمہ اللہ لیس عارفا للسیاسۃ بل کان رجلاً صوفیاً، استعملہ الذین أرادوا الحکم من خلالہ)

انھوں نے مزید کہا کہ سلفی رجحان رکھنے والے نوجوان یہ چاہتے تھے کہ اپنے انتہا پسندانہ خیالات کی تائید کے لیے وقت کی کسی مشہور و مقبول شخصیت کو اپنے نمایندہ یا ترجمان کے طور پر پیش کریں۔ اس کے لیے وہ محمد عبدہ اور رشید رضا وغیرہ کو استعمال کرنے میں ناکام رہے۔ یہاں تک کہ حسن البنا ظاہر ہوئے جو بیک وقت اہل سنت والجماعت سے بھی تعلق رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ متصوفانہ حلقوں سے بھی ان کے گہرے روابط تھے۔ چنانچہ انتہا پسند نوجوانوں کے مذکورہ طبقہ نے ان کی طرف توجہ کی اور وہ ان کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

کچھ عرب حضرات کی ایک مجلس میں یہ ذکر تھا کہ مسلمان ساری دنیا میں غیر مسلموں کے عدوان کا شکار کیوں

ہیں۔ ان لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اسپین میں مسلم اقتدار کے خاتمہ سے لے کر اب تک جتنے مصائب پیش آرہے ہیں وہ سب اعداء اسلام کی عالمی سازشوں (مؤامرات) کا نتیجہ ہیں۔ اعداء اسلام متحد ہوکر اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں، صدیوں سے پیش آنے والے تمام الم ناک واقعات اسی سازش کے مختلف مظاہر ہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کے پاس ان مخالفانہ واقعات کی توجیہہ کے لیے ایک ہی لفظ ہے، اور وہ مؤامرات اعداء ہے۔ مگر یہ توجیہہ کتاب اللہ کی نفی کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں بار بار مختلف الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ اہل اسلام کا ولی وکارساز ہے۔ دنیا میں ان کے معاملہ کو خدا نے اتنا زیادہ مستحکم کر دیا ہے کہ اب انھیں انسانوں سے نہیں ڈرنا ہے بلکہ صرف خدا سے ڈرنا ہے۔ مگر آپ لوگ اور مسلم دنیا کے دوسرے علماء جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاملاتِ دنیا کی باگ ڈور تمام تر صرف اعداء اسلام کے ہاتھ میں ہے، اور خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ تاریخ کا یہ تصور سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں انسان ایک دوسرے کے عدو (دشمن) رہیں گے۔ یہاں عداوت سے مراد تحدی ہے۔ یعنی انسان ایک دوسرے کے لیے چیلنج بنیں گے۔ تحدیات (چیلنج) کے زینوں کو طے کرتی ہوئی انسانی تاریخ اپنا ترقی کا سفر کرے گی۔ دنیا میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو آپ فطرت کے اسی قانون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

میں نے کہا کہ مخالفانہ واقعات کے وجود سے مجھے انکار نہیں۔ مگر آپ کو چاہیے کہ ان واقعات کی توجیہہ آپ مؤامرات کے تصور سے نہ کریں بلکہ تحدیات کے تصور سے کریں۔ یہ تحدیات کسی مفروضہ دشمنِ اسلام کی گھڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خود خالق کائنات کا مقرر کردہ نظام ہی ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم ان تحدیات کا سامنا کریں۔ فریاد اور احتجاج سے ہمیں کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔

۲۸ نومبر کی شام کو کھانے کی میز پر ایک اسپینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ برشلونہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Migule De Quadras Sans
Ronda General Thitre, 165-6
08022 Barcelona, Spain. (Tel. 34-3-4174160)

انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ہندستان کے مختلف شہروں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے ہندو سادھوؤں اور سنتوں اور ہندوؤں کی مذہبی تنظیموں کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا کہ میں سمجھا کہ شاید وہ ہندو یا بدھسٹ ہیں۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک عیسائی ہیں۔ البتہ ہندو فلسفہ سے انھیں دل چسپی ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ ہندستان بھی گئے۔

اسی میز پر ایک اور شخص بالکل عربوں کی طرح عربی زبان بول رہے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی مسلمان ہیں۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہ عیسائی تھے۔ اس طرح کے ہزاروں عیسائی مختلف مذاہب کے قریبی مطالعہ کے لیے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر مذہب کی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ حتی کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کلچرل طور پر ان سے مماثلت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسلمانوں میں ایسی لگن والے لوگ نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کا مذہب ان کے لیے دنیوی انٹرسٹ بن چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہی چیز آخرت کے انٹرسٹ کی خاطر ہو سکتی تھی۔ مگر آخرت کے انٹرسٹ میں لوگوں کے لیے اتنی کشش نہیں کہ وہ اس درجہ لگن کے ساتھ اس کے لیے کام کر سکیں۔

ایک عرب عالم نے اپنی تقریر میں شام و فلسطین کے تاریخی مقامات کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا : ھذہ الاماکن ملیئۃ بالرموز المقدسۃ۔ عام اُردو داں اس جملہ کو سنے تو شاید وہ سمجھے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اسرار سے بھرے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ مقامات مقدس نشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رمز (جمع رموز) کا لفظ عربی میں علامت یا نشانی کے لیے ہے۔ مگر اُردو میں اس کو راز کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ایک ہی لفظ عربی میں کچھ معنی میں ہے اور اردو میں کچھ معنی میں۔ زبانوں میں اس طرح کی توسیع عام ہے۔ ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں کبھی سابق مفہوم ہی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی بدلے ہوئے مفہوم میں۔

ایک مسیحی مقرر نے کہا کہ ہمارے اندر سلف کرٹسزم کی جرأت ہونی چاہیے۔ لوگ سلف کرٹسزم سے اس لیے گھبراتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم اپنی نفی کرنے لگیں گے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ہم کو غیر یہودی اور غیر اسلامی اور غیر مسیحی بننا پڑے گا۔ تب صحیح ڈائیلاگ ہوگا :

If you want to start real dialogue, first you have to dejudise yourself, de Islamise yourself, de Chrischianise yourself.

میں نے کہا کہ کمرشیلزم تو ٹھیک ہے۔ مگر ریل ڈائیلاگ کی یہ شرط صحیح نہیں کہ ہر آدمی پہلے اپنی حیثیت کا خاتمہ کرے۔ اس کی صحیح شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ذوق ہو۔ وہ کھلے ذہن کے ساتھ ایک دوسرے کی بات کو سنے اور تعصب کے بجائے دلائل کی بنیاد پر اپنے رویہ کا فیصلہ کرے۔

اس کانفرنس میں بہت سے عرب شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک، نومولود حکومت فلسطین کے سفیر نبیل معروف بھی تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ پوری امت کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم امت کی طرف سے مدد کے منتظر ہیں (نحن منتظرو الغيث من الامة) میں نے ان کا پتہ لکھتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ اپنی حکومت کو دولت فلسطینیہ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، ہم اس وقت اسی کے راستہ میں ہیں (نحن على الطريق)

وہ یہاں کی تقریروں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اس یہودی عالم کی تقریر سے بھی خوش نہیں تھے جس نے کہا تھا کہ عرب اور اسرائیل کے درمیان اقتصادی تعاون (economic cooperation) کا بہت وسیع میدان ہے اور دونوں کو سیاسی ٹکراؤ کو چھوڑ کر اقتصادی ترقی کے مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

اجلاس کے ختم پر ہم لوگ باہر نکلے تو ایک آدمی شیخ ادریس سکوتہ سے بہت تپاک کے ساتھ ملا۔ دونوں بہت زیادہ بے تکلفی سے عربی میں بات کرنے لگے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی عرب مسلمان ہیں۔ اتنے میں ایک اخبار کا رپورٹر آگیا۔ اس نے ہم تینوں کا تعارف جاننا چاہا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ صاحب اسرائیل کے ایک یہودی تھے۔

یہاں یہودی بڑی تعداد میں آئے تھے۔ یہودی آج کل بڑے پیمانہ پر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہودیوں اور مسلمانوں کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ دونوں اپنے اپنے لیے ہوئے پر مطمئن ہو کر باہم اچھے تعلقات قائم کرلیں۔ مگر مجھ کو یہاں آئے ہوئے مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں ملا جو دل سے اس نظریہ کا حامی ہو۔

دکتورہ بنت الشاطی مصر کی مشہور خاتون ادیب ہیں۔ وہ بھی اس کانفرنس میں آئی تھیں میں نے دیکھا کہ وہ سراپا احتجاج بنی ہوئی ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے پرجوش انداز میں کہا کہ یہ ڈائیلاگ نہیں ہے، یہ سب کلنٹن کے اشارہ پر ہو رہا ہے۔ امریکہ نے ہم لوگوں کو مفلس بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس پر بھی احتجاج کیا کہ تقریریں زیادہ ہو رہی ہیں مگر مناقشہ کا وقت کم دیا جا رہا ہے (تمر جلسة بعد جلسة بدون مناقشة، ما هذا)

وہ کبھی عربی میں بولتی تھیں اور کبھی انگریزی میں۔ ایک بار انھوں نے امریکہ کے خلاف جذباتی انداز میں بولتے ہوئے کہا کہ ہم غلام ہیں، ہم امریکہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے :

We are slave, we can't live without America.

میں نے کہا کہ خاتون محترم، اگر صورت حال بالفرض وہی ہے جو آپ بتاتی ہیں تب بھی یہاں لفظی احتجاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنی کمیوں کو دور کرنا ہے، اس کے بعد ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دوسری قوموں کی زیادتی سے محفوظ رہ سکیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اسلام میں جن باتوں کی تعلیم دی گئی ہے ان میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو توبہ کہا جاتا ہے۔ یعنی غلطی کرنے کے بعد دوبارہ درست طریقہ کی طرف واپس آنا۔ یہ توبہ اسلامی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے۔ جس آدمی کے اندر توبہ کا مزاج نہ ہو وہ کبھی ایمان واسلام میں ترقی نہیں کر سکتا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح کا معاملہ توبہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے (القصص ۶۷) توبہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ جو آدمی غلطی کرنے کے بعد سچی توبہ کرے اور اس کی شرطوں کو پورا کرے تو اس نے توبہ سے پہلے جو برائی کی تھی اس کو بھی بھلائی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے (الفرقان ۷۰)

میں نے کہا کہ مسلمان توبہ کے اس حکم کو چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو جانتے ہیں مگر وہ بڑے بڑے معاملات میں اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں جس سب سے بڑی غلطی میں مبتلا ہیں وہ دوسری قوموں سے ٹکراؤ کی پالیسی ہے۔ یہ ٹکراؤ اللہ کی نظر میں جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ٹکراؤ سے یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ اس ٹکراؤ سے مسلمانوں کو نہیں ملا۔

غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے لیے مدعو قوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قوموں کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ انھیں خدا کی تعلیمات سے باخبر کیا جائے۔ ہر قسم کے بہترین ذرائع کو استعمال کر کے ان لوگوں تک دین حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ پیغام رسانی کے اس عمل کو معتدل انداز میں جاری رکھنے کے لیے یہ بھی مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ ان قوموں کی زیادتی کو برداشت کریں، وہ ان کی اشتعال انگیزی کے باوجود ان کے خیر خواہ بنے رہیں۔

مگر مسلم لیڈروں نے غیر مسلم قوموں کی بعض زیادتیوں پر بے برداشت ہوکر ان کے خلاف ٹکراؤ شروع کر رکھا ہے۔ اس ٹکراؤ کو وہ بطور خود جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاد نہیں ہے بلکہ سرکشی ہے۔ مسلم لیڈروں کو اس سرکشی سے توبہ کرنا ہے۔ انھیں ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر نرمی اور محبت کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یہ توبہ ہے اور وہ مسلم لیڈروں کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے۔ اگر انھوں نے یہ توبہ نہ کی اور مدعو قوموں سے موجودہ ٹکراؤ کی پالیسی کو انھوں نے جاری رکھا تو یقینی طور پر وہ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بن کر رہ جائیں گے۔ اور ذلت اور ناکامی کے سوا کچھ بھی انھیں حاصل نہ ہوگا۔

حسب معمول ۲۹ نومبر کی صبح کو تمام لوگ گاڑیوں کے ذریعہ ہوٹل سے یونی ورسٹی لے جائے گئے۔ راستہ میں مختلف قسم کے اسپینی مناظر سامنے آتے رہے۔ یہ علاقہ پہلے مسلم اسپین میں شامل تھا جس کو اب ایبریا (Iberia) کہا جاتا ہے۔

یونی ورسٹی میں ایک صاحب پرتپاک طور پر ملے۔ انھوں نے کہا السلام علیکم۔ وہ عربی زبان میں بول رہے تھے۔ انھوں نے اپنا نام فادر چیری بیکر بتایا۔ ان کے چہرہ پر مسلمانوں جیسی سفید داڑھی تھی۔ وہ فرانس میں پیدا ہوئے۔ عرصہ سے وہ الجیریا میں مشنری کے طور پر کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ الجزائر کے مستقبل کے بارہ میں آپ کا اندازہ کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں جواب دیا کہ امن ابھی قریب نظر نہیں آتا :

Peace is not very near.

ایک یہودی جن کا نام موریس رومانی بتایا گیا تھا۔ انھوں نے صبح کے اجلاس میں بولتے ہوئے کہا کہ اسپین کی قدیم تاریخ مسلم۔ کرسچین۔ یہودی کے کوآرڈی نیشن کی شاندار مثال ہے۔ اسی کوآرڈی نیشن نے اسپین کا گولڈن ایج پیدا کیا تھا۔ اس زمانہ میں عربی زبان کا عام رواج تھا۔ اس زمانہ میں کرسچین، یہودی اور مسلمان آزادانہ طور پر آپس میں عربی میں بات کرتے تھے۔ اب ہم کو دوبارہ اسی کوآرڈی نیشن کی ضرورت ہے۔

۲۹ نومبر کی شام کو آخری اجلاس تھا۔ اس میں اسپین کے کنگ اور کوئن دونوں شریک ہوئے۔ ہال کے اندر دونوں بالکل سادہ انداز میں داخل ہوئے۔ دونوں معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر ان کے لیے کوئی خصوصی کرسی بھی نہیں رکھی گئی۔ میری نشست ان کے بہت قریب تھی، اس لیے

میں دونوں کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ دونوں اتنے زیادہ سادہ اور متواضع معلوم ہو رہے تھے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس ملک کے بادشاہ ہیں۔

کنگ نے اپنی اسپینی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ ٹالرنس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں یہودی آئے۔ عیسائی آئے۔ مسلمان آئے۔ سب مل جل کر ٹالرنس کے ساتھ یہاں رہے، سب نے ملک کی ترقی میں حصہ لیا۔ یہی ماحول ہم کو نئے اسپین میں بنانا ہے۔ یہی ہمارے لیے ترقی کا واحد راستہ ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارے ملک میں ہر مذہب کو یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ ہر مذہب کو اپنے اپنے دائرہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔

شاہ اسپین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس ملک کی جدید تاریخ میں افغانستان جیسے مسلم ملکوں کے لیے ایک بڑی سبق آموز مثال ہے۔ جنرل فرینکو (Francisco Franco) نے فوجی بغاوت کر کے یہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ۱۹۳۶ میں اسپین کے مطلق حکمراں بن گئے۔ لیکن بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر ۱۹۷۳ میں انھوں نے وزیر اعظم کے عہدہ سے استعفا دے دیا۔

جنرل فرینکو کا ایک بیٹا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے بیٹے کے بجائے جان کارلوز (Juan Carlos) کو ۱۹۶۹ میں اپنا جانشین مقرر کر دیا جو قدیم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے مطابق، ۲۰ نومبر ۱۹۷۵ کو جب جنرل فرینکو کی موت ہوئی تو فوراً ہی جان کارلوز اسپین کے کنگ بن گئے (17/442-43)

افغانستان میں روسی فوج کی واپسی (۱۹۸۹) یا ڈاکٹر نجیب اللہ خاں کے خاتمہ (۱۹۹۲) کے بعد اگر ایسا ہوتا کہ افغانی لیڈر ظاہر شاہ کو روم سے واپس بلا کر انھیں دوبارہ علامتی بادشاہ کے طور پر کابل کے شاہی محل میں رکھ دیتے اور ان کے رسمی اقتدار کے تحت الکشن کر کے حکومت بناتے تو یہ افغانستان کے حق میں بے حد مفید ہوتا۔ اس کے بعد فوراً افغانستان کو اتحاد اور سیاسی استحکام حاصل ہو جاتا اور افغانیوں کی طاقت جو برسوں سے باہمی جنگ میں برباد ہو رہی ہے وہ محفوظ رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی میں استعمال ہونے لگتی، جیسا کہ آج اسپین میں ہے۔

جنرل فرانکو اگرچہ ایک ڈکٹیٹر آدمی تھا۔ مگر آخر عمر میں وہ معتدل ہو گیا تھا۔ اس نے حکومت کی پوری پالیسی میں سختی کے بجائے نرمی کا انداز اختیار کیا۔ استعماری دور کی باقیات کے طور پر افریقہ کے کئی علاقے اسپین کے قبضہ میں تھے۔ اسپین کی نئی حکومتی پالیسی کے تحت ان کو آزاد کر دیا گیا۔ افریقہ کے اسپینی صحارا

کو مراکو اور موریطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ مراکو کے بعض ساحلی علاقے اسپین کے قبضہ میں تھے۔ مثلاً
افنی (Ifni) اور سبتہ (Ceuta) ۔ ۱۹۷۰ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ
کے تحت افنی مراکو کو مل گیا اور سبطہ بدستور اسپین کے پاس باقی رہا (12/444)

یہاں جنرل فرانکو (۱۹۷۵-۱۸۹۲) کی پانچ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ نوجوانی کی عمر سے لے
کر بڑھاپے کی عمر تک کی ہیں۔ یہ تصویریں بڑی عبرت ناک ہیں۔ یہ بتاتی ہیں کہ کس طرح آدمی طاقت سے
آغاز کر کے آخرکار ضعف کی حالت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ تصویریں گویا قرآن کی اس آیت کی زندہ
تفسیر ہیں کہ ——— اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا۔ پھر ناتوانی کے بعد قوت دی۔ پھر قوت کے
بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علیم و قدیر ہے (الروم ۵۴)

میڈرڈ کی کانفرنس میں میری ملاقات سبتہ کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کا نام محمد علی البطولی (۴۱ سال)
تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اسپین اور مراکو کے درمیان مذکورہ معاہدہ کے بعد اسپین میں مسلمانوں کے حالات
بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اب یہاں تعصب کے بجائے رواداری آگئی ہے۔ ممکن ہے کہ اندر اندر کچھ تعصب
موجود ہو، مگر ظاہری طور پر ہم لوگوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی مشکل کا سامنا پیش نہیں آرہا ہے۔
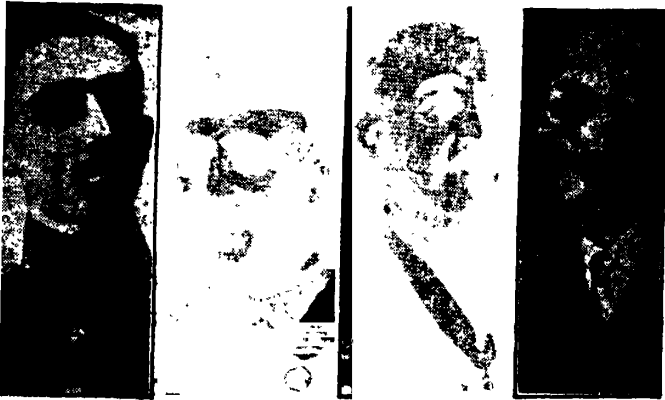
Generalissimo Francisco Franco in uniforms he wore as a cadet at infantry school at Toledo, Spain, around 1910, as a general in 1937 during the Spanish civil war, as head of Falange Party in 1945 and in 1962 when he celebrated his 70th birthday. He died in 1975.

گویا سبتہ پر جزئی مخاصمت کرنے کی بنا پر پورے ملک اسپین میں مسلمانوں کو کلی مواقع حاصل ہو گئے۔

محمد علی البطلولی نے ۲۹ نومبر کی ملاقات میں بتایا کہ وہ سبتہ میں پیدا ہوئے۔ وہ یہاں تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے عربی میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۹۲ میں اسپین کی مسلم تنظیموں اور حکومت اسپین کے درمیان معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت اسپینی حکومت نے دینِ اسلام کو ملک کا ایک مذہب تسلیم کر لیا (تم الاعتراف بالدین الاسلامی من طرف الحکومۃ الاسبانیۃ بعد توقیع اتفاقیۃ بین اللجنۃ الاسلامیۃ الاسبانیۃ والحکومۃ)

انھوں نے بتایا کہ اس وقت اسپین میں پانچ لاکھ (500,000) مسلمان موجود ہیں۔ سبتہ میں مسلمانوں کی تعداد پچیس ہزار ہے اور ملیلہ میں ۲۵ ہزار۔ سبتہ میں سولہ مسجدیں ہیں۔ اسپینی زبان پر ابھی تک عربی کے اثرات ہیں۔ عربی کے بہت سے الفاظ اسپینی زبان میں پائے جاتے ہیں مثلاً القنطرہ (Alcantara) القلعہ (Alcala) وغیرہ۔

سبتہ اور جبل الطارق کے درمیان صرف ۲۳ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ پرتگالیوں نے سبتہ پر ۱۴۱۵ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کئی بار سبتہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ ۱۴۸۰ء میں اسپین نے پرتگالیوں کو شکست دے کر سبتہ اور بعض دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے سبتہ اور ملیلہ اسپین کے قبضہ میں ہے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے سبتہ اور ملیلہ کا ذکر کیا۔ دوسرے نے کہا کہ ہمارا ان سے کیا تعلق، وہ دونوں تو اسپین کے شہر ہیں (ماشاننا بھما، انھما مدینتان اسبانیتان) پہلے نے کہا کہ یہ کیسی عجیب بے خبری ہے کہ عرب یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ دونوں مراکو کے ساحلی شہر ہیں۔ انھوں نے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ یہ صرف مراکو کی نہیں بلکہ تمام دول عربیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ انھیں واپس لے۔ مگر یہ نہایت عجیب بات ہے کہ عربوں کی تمام چوٹی کانفرنسوں نے سبتہ اور ملیلہ پر کبھی سرے سے بحث ہی نہ کی (من الغریب ان کافۃ مؤتمرات القمۃ العربیۃ لم تتحدث مطلقا عن سبتۃ وملیلۃ)

میں نے کہا کہ اگر عرب سلطنتوں نے اس مسئلہ پر کوئی اقدام نہیں کیا تو آپ نے خود ہی ان کی آزادی کے لیے اقدام کر دیا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص ایک ملک سے کیوں کر لڑ سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی سوال عرب سلطنتوں کی راہ میں بھی حائل ہے۔ کیوں کہ اگر انھوں نے اس موضوع پر کوئی اقدام کیا تو پورا

یوسپ اور اقوام متحدہ ان کے مقابل میں آجائیں گے، اس معاملہ میں جو عذر آپ کے لیے ہے وہی عذر ان کے لیے بھی ہے۔

جس طرح اسپین کے مقابلہ میں مراکو کے لیے سبتہ کا مسئلہ ہے، اسی طرح خود اسپین کے لیے برطانیہ کے مقابلہ میں جبرالٹر کا مسئلہ ہے۔ جبرالٹر جغرافی طور پر اسپین کا حصہ ہے، مگر ابھی تک اس کے اوپر برطانیہ کا قبضہ باقی ہے۔

(المجلۃ (جدہ) کے شمارہ ۱۳-۱۹ نومبر ۱۹۹۴ (۱۰-۱۶ جمادی الآخرۃ ۱۴۱۵ھ) میں مراکو کے الملک الحسن الثانی کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس سلسلہ میں مجلہ کے رئیس التحریر عبد الرحمٰن حمد الراشد نے ان سے ملاقات کی تھی۔ شاہ حسن نے عرب لیگ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

کیا ہم عرب لیگ کو قبر میں دفن کر دیں۔ اور اس کا جنازہ کس طرح نکلے گا۔ شاہ نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم صرف میثاق کی تبدیلی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم نئی عرب لیگ کے بارہ میں سوچیں۔ کیوں۔ اس لیے کہ عرب لیگ اب تک عرب۔ اسرائیل اختلاف کی بنا پر قائم تھی۔ یہی اختلاف اس کو غذا پہنچاتا تھا اور اس کو آکسیجن دیتا تھا۔ اور جب بھی وہ کمزور ہوتا تھا تو وہ اس کو طاقت کا انجکشن دیتا تھا۔ آج یہ عرب۔ اسرائیلی اختلاف کمزور ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے چاہا تو وہ ختم ہونے والا ہے۔ اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اس گھر سے وابستہ رہیں جس کو ہم عرب لیگ کہتے ہیں۔ تاکہ ہماری اجتماعیت قائم ہو سکے۔ شاہ نے اختصار کے ساتھ اس کو اس طرح کہا: ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم عرب لیگ کے لیے ایک نئے فکر کو ظہور میں لائیں:

هل سنقبر الجامعة العربية وكيف ستكون جنازتها؟ سأل الملك نفسه وأجاب بنفسه قائلاً: "اقول يجب ان لا نكتفي بتغيير الميثاق، يجب ان نفكر في جامعة عربية جديدة، لماذا؟ لان الجامعة العربية الى حد الآن كانت موجودة بسبب الخلاف العربي – الاسرائيلي، وكان ذلك الخلاف يغذيها ويعطيها الاوكسجين ويعطيها حقناً كلما ضعفت. اليوم هذا الخلاف اصبح يضعف ريثما ينتهي ان شاء الله... علينا اذن ان نبقى متشبثين بهذا البيت الذي نسميه الجامعة العربية ليجمع شملنا".

قالها باختصار، "علينا ان نبلور فكرة جديدة للجامعة"

ایک صاحب سے اس کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ عرب لیگ کی حیثیت صرف ایک رسمی مجلس کی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کسی موثر اتحاد کی۔ پھر جن عرب ملکوں کا حال یہ ہو کہ عرب لیگ جیسا رسمی اتحاد قائم کرنے کے لیے بھی انھیں ایک بیرونی قومی خطرہ کی ضرورت ہو، ان سے کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اسپین کے مقابلہ میں کوئی بڑا اور فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔

میرے کمرہ میں ایک اچھا ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ مگر اپنے مزاج کے مطابق، میں نے کبھی اس کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ۲۹ نومبر کی صبح کو وقت جاننے کے لیے اس کو کھولا تو اسپینی زبان میں خبریں آرہی تھیں۔ خبریں تو سمجھ میں نہ آئیں۔ البتہ یہ سنا کہ اناؤنسر بار بار "مسلمان" کا لفظ بول رہا ہے۔ اناؤنسر نے بوسنیا کے بارہ میں کوئی خبر بتائی۔ اسی کے دوران اس نے غالباً بوسنیا کے کسی مسلم لیڈر کا ایک قول انگریزی میں نقل کیا۔ کہنے والے نے کہا تھا کہ بوسنیا کی صورت حال کے لیے میں اقوام متحدہ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ وہ ضروری کارروائی کرنے میں ناکام رہی :

I blame the U.N. for the Bosnian situation. It failed to act.

یہ یقینی طور پر نادانی کا ایک جملہ تھا۔ اقوام متحدہ نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ قومی نزاعات پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے، بلکہ صرف پرامن دائرہ میں رہتے ہوئے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا حال یہ ہے کہ پہلے وہ اقوام متحدہ کے اصول کی خلاف ورزی کر کے گن اٹھائیں گے اور جب اس کا الٹا انجام سامنے آئے گا تو اقوام متحدہ سے امید کریں گے کہ وہ آئے اور ان کی مرضی کے مطابق ان کے مسئلہ کو حل کر دے۔

۲۹ نومبر کو صبح ۷ بجے میرے کمرہ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو تکرار کے ساتھ یہ آواز آنے لگی کہ صباح الخیر، یہ بیدار کرنے کی کال ہے :

Good morning. This is a wake-up call.

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے حشر کا لمحہ آگیا ہے اور موت کی نیند سونے والی روحوں کو پکارا جا رہا ہے کہ اٹھ جاؤ۔ اب آخری فیصلہ کا وقت آگیا۔ یہ وقت آج علامتی صورت میں آیا ہے، مگر کل وہ حقیقی صورت میں آئے گا۔ عقل مند وہ ہے جو کل ہونے والے اعلان کو آج کی آواز میں سن لے۔

کھانے کی میز پر دو مصری نوجوان آگئے۔ ایک کا نام عبدالمقصود تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈیوزبری

(انگلینڈ) میں تبلیغی جماعت کا اجتماع تھا۔ اس میں وہ بھی جزئی طور پر شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں ہر ملک کے مسلمان آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف السلام علیکم، السلام علیکم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہی منظر تھا جس کو قرآن میں اِلّا قیلاً سلاما سلاما (الواقعہ ۲۶) کہا گیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں نے آخری تقریر سنی، بہترین تقریر تھی۔ ایسی تقریر میں نے مصر میں کبھی نہیں سنی (کلام جمیل، لم اسمع مثلہ فی مصر)

کھانے کی میز پر قاہرہ کے ڈکتور جمعہ بھی موجود تھے۔ وہ فقہ کے استاد ہیں۔ ایک مقامی مسلمان نے ان سے سوال کیا کہ اس ملک میں حلال گوشت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پھر ہم لوگ کیا کریں۔ ڈکتور جمعہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو دیکھو۔ یہ گوشت نہیں کھاتے۔ وہ غیر لحمی غذا پر گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی صحت بہترین ہے۔ گوشت کے بغیر آدمی مر نہیں جاتا۔

گوشت کے بارہ میں میرا یہ ذوق اختیاری نہیں ہے۔ میری والدہ کہتی تھیں کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا اس وقت بھی میرا یہ حال تھا کہ اگر وہ انڈا یا مچھلی یا گوشت میرے منہ میں ڈالتی تھیں تو میں نکال دیتا تھا، اور اس کو کھاتا نہیں تھا۔ گویا میں پیدائشی طور پر "سبزی خور" ہوں۔ میں نے ڈکتور جمعہ کی بات کی تکمیل کرتے ہوئے کہا: میں بائی برتھ ویجیٹیرین ہوں، آپ حالات کے تقاضے کے تحت بائی چوائس ویجیٹیرن بن جائیے۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ جو عرب خود اپنے وطن میں کوئی بڑا علمی کارنامہ نہیں کر سکے تھے انھوں نے اسپین میں کیسے اتنا بڑا علمی کارنامہ انجام دیا کہ وہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد بن گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا جواب ایک مستشرق نے یہ دیا ہے کہ عرب ایک ایسے ملک میں تھے جہاں دریاؤں کی روانی نہ تھی۔ وہاں سرسبز مناظر موجود نہ تھے۔ اس کے بجائے وہاں خشک پہاڑ اور تپتے ہوئے ریگستانوں کا ماحول تھا۔ اس کے بعد یہ عرب اپنے وطن سے نکل کر جب اسپین میں پہنچے تو یہاں قدرتی مناظر تھے۔ فطرت کا حسن تھا، نشاط انگیز آب و ہوا تھی۔ اس نے عربوں کے اندر ولولۂ کار اور جوش عمل ابھار دیا۔ ماحول کے اثر سے ان کی فطری صلاحیتیں جاگ اٹھیں۔

میں نے کہا کہ یہاں دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان نشاط انگیز مناظر نے خود اسپینیوں کے اندر یہی ولولہ کیوں نہیں ابھارا۔ اس فرق پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ولولۂ کار کو ابھارنے والی اصل چیز تبدیلی (change) ہے۔ عربوں کے لیے صحرا سے نکل کر چمنستان میں جانا تبدیلی کا ایک

ہیجان خیز معاملہ تھا۔ اس تجربہ نے ان کی شخصیت کو جگا دیا۔ مگر یہی عرب جب اسپین کے محل اور باغات کے عادی ہوگئے تو دوبارہ ان کی صلاحیتیں سو گئیں۔ علم کے قافلہ کو مزید آگے لے جانے کا کام مغربی یورپ نے کیا جس کو دو سو سالہ کروسیڈ کی ہار نے تبدیلی کے زلزلہ خیز تجربہ سے دوچار کر دیا تھا۔

ایک اسپینی اسکالر نے کہا کہ مسلمانوں نے جب ہمارے ملک پر حملہ کیا تو انھوں نے ہماری دولت کو لوٹا، یہاں کے باشندوں کو لونڈی اور غلام بنایا۔ کیا آپ کا اسلام اسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسپین میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک طبقہ اسی انداز میں سوچتا ہے۔

جہاں تک اسپین میں مسلمانوں کی فوجی کارروائی کا تعلق ہے، اس کا معقول جواز موجود ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانہ میں وِسی گوتھ کا آخری بادشاہ وٹیزا (Witiza) اسپین کا حکمراں تھا۔ اس کا زمانۂ حکومت ۷۰۰ سے ۷۱۰ تک ہے۔ پادریوں نے وٹیزا کے خلاف سازش کرکے اس کو تخت سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ ایک فوجی سردار لذریق (Roderick) کو اسپین کے تخت پر بٹھا دیا۔ وٹیزا چونکہ لذریق کو غاصب سمجھتا تھا۔ اس نے اس سے انتقام لینے کے لیے مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کی دعوت دی۔ اس حملہ میں سبتہ (Ceuta) کے ناراض اسپینی حاکم (Count of Ceuta) نے بھی مدد کی جس کا نام جولین (Julian) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جولین نے طارق کو چار بڑی کشتیاں دی تھیں جن کے ذریعہ طارق نے اپنے لشکر کو اسپین کے ساحل پر اتارا تھا۔

مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ اپنی طرف سے شروع نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ خود اسپین کے وِسی گوتھ کی دعوت پر تھا:

The Muslim invasion of Spain was the result of Visigoth invitation rather than Muslim initiative. (17/414)

مگر اسی کے ساتھ خود مسلم مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نُصیر نے جب اسپین میں فتوحات کیں تو وہاں انھوں نے بے شمار مقدار میں سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہر اور دوسرے اموال کو لوٹا اور کثیر تعداد میں عورتوں اور لڑکوں کو لونڈی اور غلام بنایا (۸۳)۔ وہ ایک ایک شہر کو فتح کرتے رہے اور لونڈی اور غلام اور مال غنیمت اتنی زیادہ مقدار میں لے کر لوٹے جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا (لا تحصی ولا تعد کثرۃ) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۹/۸۶

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے اس طرح اسپین میں مال غنیمت لوٹنا اور لونڈی اور غلام بنانا صحیح نہ تھا کیوں کہ مال غنیمت کا اسلامی قانون اس جنگ کے لیے ہے جو کسی قوم نے یک طرفہ جارحیت کرکے مسلمانوں کے خلاف چھیڑی ہو۔ مگر اسپین کے لوگ اس معنی میں جارح نہ تھے۔ اس لیے فتح کے بعد ان کے اموال کو لوٹنا اور ان کو لونڈی اور غلام بنانا صحیح نہیں ہو سکتا۔ مزید یہ کہ مال غنیمت کا قانون بھی صرف میدان جنگ کے لیے ہے نہ کہ عام آبادی کے لیے۔

ایک اور صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ طارق بن زیاد یا بابر کے معاملہ کو عام طور پر اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "طارق کا حملہ اسپین پر" یا "بابر کا حملہ ہندستان پر"۔ مگر یہ درست نہیں۔ یہ شاہی دور کے واقعہ کو جمہوری دور کی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ آج قومی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ آج ایک قوم یا ملک کا حملہ دوسری قوم یا ملک پر ہوتا ہے۔ مگر شاہی دور میں ایسا نہ تھا۔ اس زمانہ میں جو سیاسی ٹکراؤ پیش آتا تھا وہ ایک بادشاہ کا دوسرے بادشاہ سے ہوتا تھا نہ کہ ایک قوم کا دوسری قوم سے۔

اسپین میں طارق بن زیاد کے داخلہ کو اسی زمانی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ مزید یہ کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ معروف معنوں میں کوئی جارحانہ داخلہ نہ تھا بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ سابق حکمراں کے ظلم سے لوگ تنگ آ گئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے سابق حکمراں کے خلاف نئے حکمراں کو دعوت دی اور اس کا استقبال کیا۔

۲۹ نومبر کو میڈرڈ کے اخبار (Puerta de Madrid) کی خاتون نمائندہ لوئیلا (Leòilla) نے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام کی تعلیمات فطرت پر مبنی ہیں۔ اور فطرت ہمیشہ امن کو پسند کرتی ہے۔ اس لیے اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں۔

اسی طرح ایک اور اسپینی اخبار (La Libre Belgique) کی خاتون نمائندہ پاسکل بورگا (Pascale Bourgaux) نے اپنے اخبار کے لیے انٹرویو لیا۔ ان کو میں نے اپنے پیپر "پیس ان اسلام" کی ایک کاپی دی۔ ان کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ قسم کی کانفرنس کو صرف اس کے تین روزہ اجلاس کی روشنی میں نہیں جانچنا چاہیے بلکہ اس کو ایک عمل (Process) کے روپ

میں دیکھنا چاہیے۔ اسی وقت اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان سے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری آئے تھے۔ وہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (اسلام آباد) کے ڈائرکٹر ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پاکستان میں ایک بڑی تباہ کن سیاسی روایت جاری ہوگئی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو پارٹی الکشن میں ہارتی ہے وہ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتی۔ پولنگ بوتھ پر ناکامی کے بعد وہ دوبارہ سڑک کی سیاست پر آجاتی ہے۔ وہ جلسہ جلوس، حتیٰ کہ توڑ پھوڑ کے ہنگامے جاری کرکے چاہتی ہے کہ جیتی ہوئی پارٹی کو میعاد سے پہلے اقتدار سے بے دخل کردے۔ یہ سیاست نہیں ہے بلکہ سیاست کے نام پر دادا گیری ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق، اس غلط سیاسی روایت کو پاکستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے شروع کیا۔ ان کو محمد ایوب خاں کے مقابلہ میں واضح انتخابی شکست ہوئی۔ مگر انھوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ایوب خاں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے دوبارہ نئے عنوان سے احتجاج اور ہنگامہ آرائی کی مہم شروع کردی۔ اس کے بعد پاکستان میں یہی سیاسی روایت عام طور پر چل پڑی۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے بطور واقعہ اس کو مانتے ہوئے کہا کہ اس کی جڑ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں سیاست ہی سب کچھ بن گئی ہے۔ سیاست کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے موجودہ زمانہ میں ہر جگہ اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری الہ آباد میں ۱۹۳۲ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ پھر باہر جا کر انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک جملہ میں آپ کا مشورہ کیا ہے۔ انھوں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر جواب دیا: انھیں چاہیے کہ عقل سے کام لیں۔

پاکستان کے جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے نومبر ۱۹۸۹ میں اسپین کا سفر کیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور پاکستانی مسلمان جناب سعید احمد صاحب بھی تھے۔ انھوں نے اپنا سفر نامہ "اندلس میں چند روز" کے نام سے شائع کیا ہے۔ سفر کے آخری مرحلہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب اندلس کے ماضی وحال کے تصورات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک مرحلہ پر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا: کیا کبھی مسلمان اس خطہ کو دوبارہ ایمان سے منور کرسکیں گے۔ میں نے عرض کیا: اِس وقت تو مسلمان اپنے موجودہ خطوں کو ٹھیک سے سنبھال لیں اولاً

اس بات کا انتظام کرلیں تو بہت ہے کہ وہاں اندلس کی تاریخ نہ دہرائی جائے"۔

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ہندستان میں کچھ مسلم رہنما یہ انکشاف کررہے ہیں کہ یہاں اندلس کی تاریخ کو دہرانے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ مگر میں اس وقت پاکستان کے رہنما بھی یہی اندیشہ محسوس کررہے ہیں کہ پاکستان کہیں دوسرا اندلس نہ بن جائے۔ کیسا عجیب ہے یہ انجام جو سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت کی ہنگامہ خیز سیاست کے بعد برصغیر ہند کے مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مسلم اسپین کے اثرات مختلف اعتبار سے ہندستان تک بھی پہنچے تھے۔ کینن ای سیل (Canon E. Sell) نے اپنی کتاب اسلام کے مذہبی سلسلے (The Religious Orders of Islam) میں لکھا ہے کہ قلندریہ سلسلہ کے بانی بوعلی قلندر (علی ابو یوسف قلندر) اسپین سے ہندستان آئے تھے۔ وہ مسلم اسپین میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے وہ دمشق گئے۔ پھر وہ ایران پہنچے۔ آخر میں وہ ہندستان آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔ ۱۳۲۳ ء میں پانی پت میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ ایک خانہ بدوش صوفی سلسلہ تھا۔ وہ کماتے نہیں تھے بلکہ لوگوں کے عطیات پر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہوتی تھی۔ اقبال نے اس شعر میں غالباً انہیں کی طرف اشارہ ہے :

قلندر جز دو حرفِ لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

میں ۲۷ نومبر ۱۹۹۴ کو اسپین پہنچا تھا۔ ۲۸ - ۲۹ نومبر کو وہاں تین مذاہب کی انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ اس کے بعد ۳۰ نومبر کا دن خالی تھا۔ یہ دن صرف ملاقاتوں اور معلومات اور مشاہدات کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے اس موقع کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔ اس طرح جو باتیں دیکھیں یا جانیں ان کا مختصر تذکرہ اگلے صفحات میں کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۰ کے لگ بھگ زمانہ میں میں نے الطاف حسین حالی کی منظوم کتاب مسدس پڑھی تھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں حالی نے اسپین کی عظمتِ رفتہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار سادگی بیان اور تاثیر کی عجیب مثال ہیں۔ اس کا ایک شعر یہ ہے :

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے   مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کے ۵۵ سال بعد مجھے اسپین جانے کا موقع ملے گا اور وہاں میں براہِ راست طور پر قرطبہ کی سرزمین کو دیکھوں گا۔

قرطبہ (Cordoba) اسپین کا ایک قدیم شہر ہے۔ مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں اس کو فتح کیا اور ۷۵۶ء میں اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس کے بعد سے گیارھویں صدی عیسوی تک وہ مسلم اسپین کی راجدھانی بنا رہا۔ دسویں صدی میں وہ یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا اور اس کی حیثیت عالمی کلچرل سنٹر کی ہوگئی۔ ۱۲۳۶ء میں وہ مسیحی اسپین کا حصہ بن گیا۔

قرطبہ میں بہت سی مسلم یادگاریں ہیں۔ "مسجد قرطبہ" کو اس کی پرعظمت تعمیر کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ابتداءً اس کو خلیفہ عبد الرحمٰن نے بنوایا۔ بعد کے سلاطین مزید اس کی تکمیل کرتے رہے۔ یہ مسجد بارہ ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں ہے۔ یعنی اس کی لمبائی ۷۴۰ قدم ہے اور اس کی چوڑائی ۴۴۰ قدم۔ اس میں ۸۰۰ ستون ہیں اس کا ایک حصہ چرچ بنا دیا گیا ہے جس کو ملا کر بارہ سو ستون ہو جاتے ہیں۔ ستونوں کی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بے شمار کھجوروں کے درخت کے اوپر ایک وسیع اور منقش چھت کھڑی ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال کی زبان پر یہ شعر آگیا تھا :

تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

مسجد قرطبہ پر اقبال کی نظم صاحب "نقوش اقبال" کے الفاظ میں " ان کے واحد شاہکار کا حکم رکھتی ہے (۱۸۱) اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بیکراں جذبات اور حسن کی یکتائی کا معائنہ کیا۔ اس منظر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دیے جس کے نتیجہ میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم مسجد قرطبہ والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں" (۱۶۸)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کی عظیم تر نشانیاں جن کو قرآن میں "آلاء اللہ" کہا گیا ہے۔ وہ اقبال کے نازک جذبات کے تار کو چھیڑنے میں ناکام رہیں۔ البتہ مسجد قرطبہ کے در و دیوار کو دیکھنا ان کے جذبات کے تاروں کو چھیڑنے کا سبب بن گیا۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما اُمِرتُ بتشييد المساجد (مجھ کو بلند و بالا مسجدیں بنانے کا حکم نہیں دیا گیا) اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد عبد اللہ بن عباس نے کہا : لَتُزَخرِفُنَّها كما زخرفت اليهود والنصارى (تم بھی مسجدوں کو اسی طرح مزین کروگے جس طرح یہود و نصاری نے مزین کیا)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ (مسجدوں کی تعمیر پر) ایک دوسرے سے فخر کریں (لا تقوم الساعة حتى

حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کے اندر بصیرت و معرفت موجود ہو تو زمین پر کھڑا ہوا ایک خدائی درخت اس سے زیادہ وجد کی کیفیت پیدا کر دینے والا ہے جتنا کہ کوئی انسانی عمارت۔

آبنائے جبرالٹر شرق اور غرب کا سب سے قریبی نقطۂ اتصال ہے۔ چنانچہ اسلام اولاً یہیں سے مغربی دنیا میں داخل ہوا۔ اس راستہ سے مسلمانوں کا پہلا قافلہ ۲۷ھ میں اندلس (اسپین) پہنچا۔ یہ حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس پہلے مسلم دستہ کے سربراہ عبد اللہ بن نافع الفہری تھے۔

اس کے بعد دوسرا قابل ذکر مسلم دستہ ۹۱ھ میں اسپین میں داخل ہوا۔ یہ موسی بن نصیر کے ماتحت سردار طریف تھے جو پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین کے ساحل پر اترے۔ یہ کوئی فوجی مہم نہیں تھی بلکہ وہ صرف دریافت حال کے لیے اسپین کے علاقہ میں بھیجی گئی تھی۔

اس کے اگلے سال ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی مہم روانہ ہوئی۔ ابتداءً اس کے ساتھ سات ہزار آدمیوں کا لشکر تھا۔ انھوں نے اس وقت کے اسپینی حکمراں لذریق (Roderick) کی فوجوں کو ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو شکست دے کر اسپین میں پہلی مسلم سلطنت قائم کی۔ یہ اسپین کی مسلم سلطنت کا ابتدائی دور تھا جس کو عرب امراء کا عہد (۷۱۱ء تا ۷۵۶ء) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد عباسیوں کی داروگیر سے بھاگ کر ایک اموی شہزادہ عبد الرحمٰن الداخل اسپین پہنچا۔ اس نے مقامی امراء کو شکست دے کر ۷۵۶ء میں امیر اندلس ہونے کا اعلان کیا اور اسپین (اندلس) میں باقاعدہ اموی خلافت قائم کی۔

مسلسل باہمی اختلاف اور ٹکراؤ کے باوجود اس زمانہ میں مسلمانوں نے اسپین کو بہت ترقی دی۔ یہاں تک کہ ترقیاتی قوتوں پر اختلافی قوتیں غالب آگئیں۔ ۱۰۲۳ء کے بعد وہ دور شروع ہوا جس کو ملوک الطوائف کا دور کہا جاتا ہے۔ اب ہر علاقہ کے سرداروں نے خود مختاری کا اعلان کر کے اندلس میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ یہاں تک کہ ان کی ۲۰ مختلف حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے عیسائیوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

طارق بن زیاد کے اسپین میں داخلہ کے بعد مسیحی فوج سے اس کا فیصلہ کن مقابلہ وادی لکہ میں ہوا تھا۔ اس وقت طارق کے ساتھ (مزید کمک کو شامل کرتے ہوئے) بارہ ہزار آدمیوں کا لشکر تھا اور مسیحی

فوج کی تعداد ستر ہزار سے زیادہ تھی۔ اس موقع پر طارق نے پرجوش تقریر کی جو تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ اس کی تقریر کا ایک جملہ یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا تمہارے لیے ممکن ہے اگر تم اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دو (انّ انتهاز الفرصة فيه لممكن ان سمحتم لانفسكم بالموت)

ایک عرب اسکالر نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں میں یہ اسپرٹ موجود نہیں، اسی لیے وہ ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آپ موت کے منہ میں کود پڑیں تو آپ غالب آ جائیں گے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار مسلمان موت کے منہ میں کودے ہیں ——— ۱۸۵۷ میں ہندستانی علماء شاملی کے میدان میں موت کے منہ میں کود پڑے۔ سید احمد شہید بریلوی کا قافلہ بالاکوٹ میں موت کے منہ میں کود پڑا۔ اسی طرح فلسطین، کشمیر، چیچنیا، بوسنیا وغیرہ میں مسلمان موت کے منہ میں کودے ہوئے ہیں۔ مگر ان تمام اقدامات میں تباہی کے سوا کچھ اور مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ اس طرح کے مقابلوں میں کامیابی کے لیے موت کے منہ میں کودنا صرف ایک جزئی عامل ہوتا ہے نہ کہ کلی عامل۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے پورے ملک اسپین پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ مثلاً ریاض کے مجلہ الفیصل شعبان ۱۴۱۵ (جنوری ۱۹۹۵) میں شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں طارق بن زیاد المغرب کے راستے سے اسپین میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ عربوں اور بربروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی فوج تھی۔ چار سال کی جنگی سرگرمیوں کے بعد اسلامی لشکر نے پورے اسپین پر غلبہ حاصل کر لیا (۔۔۔ الی ان سیطرت الجیوش الاسلامیة علی کل اسبانیا) صفحہ ۵،

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمان غالب آ گئے تھے تاہم ملک کا ایک حصہ پھر بھی عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ ۹۱۰ء میں مسلمان اپنی آخری حد پر پہنچ چکے تھے۔ مگر اس وقت بھی اسپین کے مغربی حصہ میں مسیحی ریاستیں قائم تھیں۔ مسیحیوں کا زیر قبضہ علاقہ پورے ملک کے رقبہ کا تقریباً چوتھائی حصہ تھا۔ مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقہ کو اندلس کہا جاتا ہے (17/415)

اسپین (اندلس) کے مسلم عہد کی آبادی کے بارہ میں حتمی اعداد و شمار حاصل نہیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے داخلہ کے وقت اسپین کے باشندوں کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ (4,000;000) تھی۔ اس کے بعد جو عرب ہجرت کر کے وہاں گئے ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ بارسلونہ

یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر جان جینز (Juan Vernet Gines) نے لکھا ہے کہ قبضہ کی ابتدائی صدیوں میں قبول اسلام کی لہر کی وجہ سے مسلم آبادی برابر بڑھتی رہی۔ اس نے اسپین کے عیسائیوں کی تعداد میں نمایاں کمی کر دی :

> The Muslim masses continued to increase during the early centuries of the occupation, because of the wave of conversions that markedly reduced the number of Christians. (17/419)

توالد و تناسل یا قبول اسلام کے ذریعہ اسپین کی آبادی میں جو اضافہ ہوا، اس کی مجموعی تعداد قطعی طور پر معلوم نہیں۔ تاہم دسویں صدی کے آخر میں مسلم اسپین کے سات بڑے شہروں (قرطبہ، طلیطلہ، الیریا، غرناطہ، سرقسطہ، بلنسیہ، مالقہ) میں آبادی کا جو اندازہ کیا گیا ہے، وہ مجموعی طور پر تین لاکھ ستاسی ہزار (387,000) ہوتا ہے۔

مسلم اسپین سیاسی اعتبار سے کسی ایک وحدت کا نام نہیں تھا۔ اس کے تین بڑے دور ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں جبرالٹر کے راستہ سے داخل ہو کر اسپین (اندلس) میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ پہلی اسپینی حکومت بغداد کی خلافت عباسی کے تحت تھی۔ اس حکومت کا پہلا امیر عبدالعزیز بن موسیٰ تھا۔ اس نے اشبیلیہ کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ دوسرے امیر ایوب بن حبیب نے قرطبہ کو راجدھانی بنایا۔

اس کے بعد اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل عباسیوں کی دار و گیر سے بھاگ کر اسپین پہنچا۔ اس نے یہاں اپنی ایک فوج بنائی۔ اس نے عباسیوں کی ماتحت حکومت کو ختم کر کے باقاعدہ طور پر آزاد اموی حکومت قائم کی جس کی راجدھانی قرطبہ تھی۔ یہ حکومت ۷۵۶ء سے لے کر ۱۰۳۱ء تک باقی رہی۔

اس کے بعد تیسرا دور آیا جب کہ اندلس میں طوائف الملوکی آگئی۔ ہر علاقہ کے امیر نے مرکز سے بغاوت کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس طرح اندلس میں تقریباً بیس حکومتیں بن گئیں۔ ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو عیسائی ایک ایک کر کے ختم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں غرناطہ کی محدود حکومت اسی طرح باقی رہ گئی جس طرح انیسویں کے وسط میں دہلی میں مغل بادشاہ کی حکومت باقی رہی تھی۔ یہ آخری حکومت بھی ۱۴۹۲ء میں عیسائیوں کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔

مسلم اسپین میں جب سیاسی انتشار کی حالت پیدا ہوئی تو اس کو وقتی طور پر افریقہ کے حکمراں

یوسف بن تاشفین نے ختم کیا تھا۔ وہ ۱۰۸۶ء میں اسپین میں داخل ہوا۔ اس نے عیسائی حکمراں الفانسو ششم (Alfanso VI) کو شکست دی۔ باغی مسلم امراء کو زیر کیا۔ اس طرح اسپین میں ایک نیا مسلم دور شروع ہوا جو ۱۲۶۹ء تک چلا۔

تاہم یہاں کے مسلمان باہمی اختلافات کے نتیجہ میں مسلسل اندرونی اور بیرونی زیادتیوں کا شکار رہے۔ آخری دور میں مسلم اسپین کی علامت سلطنت غرناطہ (۱۴۹۲-۱۲۳۲ء) تھی۔ اس کے حکمرانوں نے وَلا غالبَ اِلاّ اللہ کو اپنا شعار بنایا۔ وہ اپنی عمارتوں وغیرہ پر کثرت سے اس لفظ کو تحریر کرتے تھے۔ یہ گویا اسلامی مزاج کا ایک اظہار ہے۔ مسلمان خواہ کسی بھی حالت میں ہوں، وہ ہمیشہ خدا ہی کو اپنا بڑا بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف غیر حاکمانہ حیثیت میں بلکہ حاکمانہ حیثیت میں بھی خدا ہی کو غالب و قاہر سمجھتے ہیں۔ کبھی اور کسی حال میں یہ حقیقت ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی۔

میڈرڈ میں ایک عرب مسلمان سے اس موضوع گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگوں نے اسپین سے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کو اسپین سے اسلام کے خاتمہ کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالاں کہ بطور واقعہ یہ درست نہ تھا۔ اگر لوگ تلك الایام نداولها بین الناس کے ذہن سے سوچتے تو وہ اسپین میں سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے باوجود اسلام کے دینی وجود کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ مگر کئی صدیاں صرف فریاد و ماتم میں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ خود تاریخ کی طاقتوں نے ظاہر ہو کر اسپین میں اسلام کے احیاء نو کا کام شروع کر دیا۔

نئے تقاضوں کے تحت اسپین میں مستقل طور پر ایک عمل جاری ہو گیا ہے جس کو عرب دانش ور اَسبنة التاریخ الاسلامی فی الاندلس کہتے ہیں۔ یعنی اندلس کی اسلامی تاریخ کو اسپینی بنانا۔

اس نئے رجحان کے تحت اسپین میں بہت سے کام کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً قرطبہ میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں کئی سڑکوں پر مسلم شخصیتوں کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً شارع ابن رشد، شارع ابن الولید، شارع المنصور، شارع الزہراوی، وغیرہ۔ اسی طرح آپ قرطبہ جائیں تو وہاں کی سڑکوں کے کنارے آپ دیکھیں گے کہ عرب دور کے اہل علم کے مجسمے جگہ جگہ نصب کیے گئے ہیں۔ مثلاً ابن رشد جن کا مجسمہ ۱۹۶۷ء میں لگایا گیا۔ علی بن حزم کا مجسمہ ۱۹۶۲ء میں، حکیم العیون محمد بن قسوم کا مجسمہ ۱۹۶۵ء میں، اور اسی طرح دوسرے بہت سے مجسمے۔ حتیٰ کہ غرناطہ کے قریب ایک ساحلی مقام المونیکر (Almunecar) پر عبد الرحمٰن الداخل کا بہت بڑا مجسمہ لگایا گیا

ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سمندری سفر طے کر کے اموی شہزادہ عبد الرحمٰن اسپین کی سرزمین پر اترا تھا۔ یہ مجسمہ پانچ میٹر بلند ایک چوٹی کے اوپر ہے۔ وہ اپنی تلوار پر ٹیک لگائے ہوئے فاتحانہ انداز میں کھڑا ہوا ہے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات جدید اسپین میں ہو رہے ہیں جس کا ذکر اس مختصر سفرنامہ میں ممکن نہیں۔ ۱۹۸۹ میں قرطبہ میں ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی۔ اس میں اسپین کے علاوہ بیرونی ملکوں کے ۱۵۰ علماء شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع "اندلس میں اسلام" تھا۔ اس میں نہایت کھل کر اس موضوع پر تقریریں اور مباحثے ہوئے۔ عام طور پر اسپینی پریس نے اس کا خیرمقدم کیا تھا۔ ایک انتہا پسند اسپینی مجلہ کامبیو نے اپنے شمارہ ۹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک رپورٹ شائع کی۔ اس کا عنوان تھا ——— اسلام ہمارے ملک میں داخل ہوتا ہے :

El Islam Nos Penetra (Cambio)

ایک عرب عالم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مسیحیوں کی دشمنی اور ظلم و زیادتی کے باوجود خدا کے فضل سے اسلام سرزمین اسپین میں بخیر و عافیت موجود ہے (رغم کل ھذا الحقد الصلیبی و رغم التنکیل فلا یزال الاسلام بخیر فی ارض الاندلس)

ایک اسپینی مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تاریخ کے بارہ میں کسی ایک کتاب کو پڑھ کر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ تاریخ بظاہر واقعات کا ریکارڈ ہے۔ مگر تقریباً تمام تاریخی کتابیں اپنے اپنے ذوق کے مطابق منتخب واقعات کا ریکارڈ کرتی ہیں۔

مثلاً اسپین کے بارہ میں مسلمانوں نے جو تاریخیں لکھی ہیں ان کا انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کی صرف اچھی باتوں کو لیا گیا ہے، اور مسیحیوں کی زیادہ تر بری باتوں کو۔ اسی طرح مسیحی حضرات نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں مسیحیوں کی اچھی باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی صرف بری باتوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین کی قدیم تاریخ کے بارہ میں مروجہ کتابوں کو پڑھ کر صحیح ذہن نہیں بنتا۔ مسلمان اور مسیحی دونوں زیادہ تر اپنے اپنے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں اس لیے قدیم اسپینی تاریخ کی صحیح تصویر نہ مسلمانوں کے ذہن میں ہے اور نہ مسیحیوں کے ذہن میں۔ اِلا ماشاء اللہ

عرب جنرل طارق بن زیاد سات ہزار کی فوج کے ساتھ ۷۱۱ء میں اسپین میں داخل ہوا تھا۔ وہ خشکی کے راستہ سے مراکو کے ساحل پر پہنچا۔ پھر سمندری پٹی کو پار کر کے اس مقام پر اترا جس کو

جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ اس نے شاہ لذریق (شاہ اسپین) کو شکست دے کر قرطبہ اور دوسرے شہروں کو فتح کیا۔

طارق نے اپنا یہ سفر گھوڑوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کیا تھا اور اس کو اس سفر میں مہینوں لگ گئے۔ میں ۲۰ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوا اور اسی دن اسپین کی سرزمین پر پہنچ گیا۔ یہ فرق ٹکنکل ترقی کا کرشمہ ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان حیوانی حرکت کی رفتار سے سفر کرتا تھا۔ آج کا سفر اس رفتار کے ذریعہ طے ہوتا ہے جس کو مشینی حرکت (Powe.ed motion) کہا جاتا ہے۔

مشینی حرکت پہلے دخانی انجن کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پھر پٹرول سے چلنے والی کاریں بنائی گئیں۔ اب انسان ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ ہوائی جہاز بھی اچانک نہیں بن گیا۔ بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ موجودہ ترقی یافتہ صورت تک پہنچا ہے۔

اسپین میں مسلمان صرف سیاسی فاتح کی حیثیت سے نہیں آئے بلکہ وہاں وہ تعمیر نو کے نقیب بن کر داخل ہوئے۔ اسپین کے شہروں (بلنسیہ، قرطبہ، طلیطلہ، غرناطہ) میں انھوں نے بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جہاں
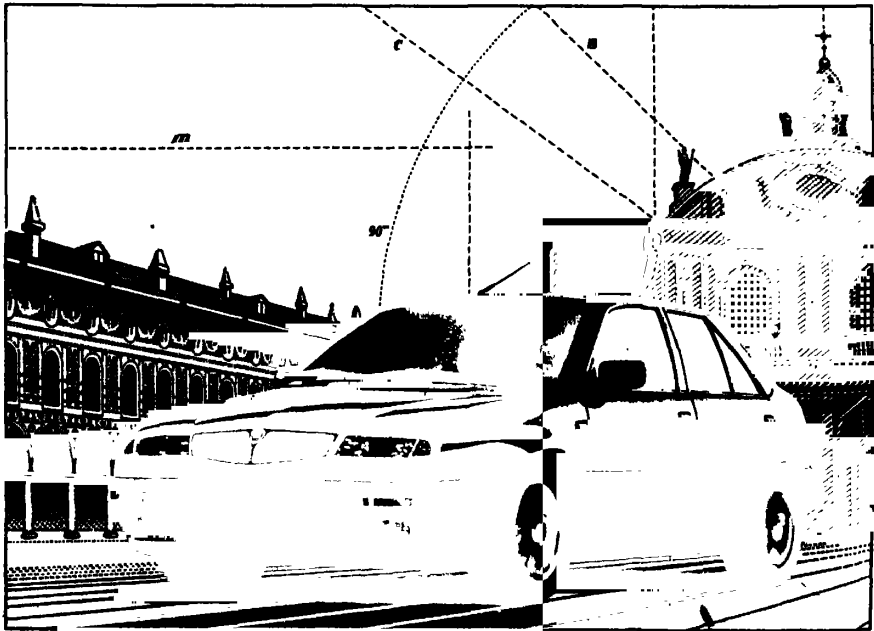
اسپین کے علاوہ دوسرے یورپی ملکوں کے طلبہ آکر علم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے اسپین کی زرخیز زمین میں ہر قسم کی زراعت اور صنعت قائم کرکے اس کو قابل استعمال بنایا۔ انھوں نے اسپین کی آبادیوں کو زیادہ بہتر شہری انتظام دیا۔

مسلمانوں نے اپنے دور حکومت (۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء) میں یہاں کی زندگی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ آج تک اس کے اثرات ختم نہ ہوسکے۔ مثلاً اسپینی اور پرتگالی زبان میں چار ہزار ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی اصل عربی ہے۔ اسپینی ڈکشنری اور پرتگالی ڈکشنری میں یہ الفاظ باقاعدہ طور پر داخل کرلیے گئے ہیں۔ یہاں کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی جدید کاروں کے پیچھے جگہ جگہ مسلم طرز تعمیر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ وغیرہ

طارق بن زیاد (فاتح اسپین) موسیٰ بن نُصیر کا ماتحت اور ان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابن کثیر نے الذھبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ طارق بن زیاد طنجہ (افریقہ) کا امیر تھا۔ وہ وہاں موسیٰ بن نُصیر کے نائب کے طور پر تھا۔ پھر جزیرۂ خضراء کے مسیحی حاکم نے اس سے اپنے دشمن کے خلاف مدد مانگی۔ اس کے بعد طارق سبتہ کے راستہ سے اندلس میں داخل ہوا۔ اس نے فرنگیوں کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھایا۔ اور اندلس میں داخل ہوکر قرطبہ کو فتح کیا اور اس کے بادشاہ کو قتل کردیا۔ پھر اس نے موسیٰ بن نُصیر کو فتح کی خبر بھیجی :

فحسده موسى على الانفراد بهذا الفتح۔	طارق بن زیاد کے تنہا فاتح بننے پر موسیٰ بن نُصیر نے
وكتب الى الوليد يبشره بالفتح وينسبه	اس سے حسد کیا اور خلیفہ ولید کو فتح کی خوش خبری بھیجتے
الى نفسه۔ (البدایہ والنهایہ ۹/۸۳)	ہوئے اس فتح کو اپنی طرف منسوب کیا۔

مگر اس طرح کے فیصلے تاریخ کرتی ہے نہ کہ کسی کے لکھے ہوئے یا بولے ہوئے الفاظ۔ چنانچہ موسیٰ بن نُصیر کی اس تحریر کے باوجود تاریخ میں طارق بن زیاد ہی کو فاتح اسپین لکھا گیا اور اسپین کے ساحل پر وہ جس پہاڑی کے پاس اترا تھا وہ پہاڑی اسی کی طرف منسوب ہوکر جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوئی :

Its name is derived from the Arabic jabal Tariq (Mt. Tarik), honouring Tariq ibn Ziyad, who captured the peninsula in AD 711. (8/156)

۷۱۱ء میں اسپینی پہاڑی کا نام ایک مسلمان طارق بن زیاد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کے ۱۱۴۰ سال بعد ہندستان کے پہاڑ کا نام ایورسٹ انگریز کے نام پر رکھا گیا جس کا نام سرجان ایورسٹ تھا۔ وہ انڈیا

میں تیرہ سال تک سرویر جنرل رہا۔ اسی نے پہلی بار ۱۸۵۲ میں یہ دریافت کیا کہ ایورسٹ سطح زمین پر سب سے اونچی چوٹی ہے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ دونوں واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کے مقابلہ میں آٹھویں صدی کے مسلمانوں میں کیا فرق تھا۔ پہلے زمانہ کے مسلمان اعلیٰ عزم و حوصلہ کے مالک تھے۔ اس لیے ان کا نام پہاڑوں کی چوٹیوں پر لکھا گیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں دوسری قومیں عزم و حوصلہ میں آگے بڑھ گئیں، اس لیے اب ان کا نام پہاڑوں کی چوٹیوں پر لکھا جانے لگا۔ یہ انسانی اوصاف میں فرق کا معاملہ ہے نہ کہ کسی تعصب اور سازش کا معاملہ۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) تک یورپ کے چھوٹے بڑے آٹھ سامراجی ممالک دنیا پر اپنا تسلط قائم کیے ہوئے تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بھونچال نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ تھے ——— برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم، اٹلی، پرتگال اور اسپین۔

امریکہ کو دریافت کرنے والا کرسٹوفر کولمبس اٹلی میں پیدا ہوا۔ مگر اس کی وفات اسپین میں ہوئی۔ کولمبس کو اپنی سمندری مہم میں اسپین کی کوئن ازابیلا (Isabella I) سے خصوصی مدد ملی جس نے اس مہم کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ (9/907, 10/691)

واشنگٹن کی نیشنل گیلری آف آرٹ میں لکڑی کے تختہ پر پینٹنگ کے ذریعہ کولمبس کی مہم کا نقشہ آرٹسٹ کے تخیل کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کی تصویر ذیل میں درج ہے۔

امریکہ کے جنوب مشرقی علاقہ میں ایک ریاست ٹینیسی (Tennessee) ہے، ۱۹۶۵ء میں سولھویں

نیشنل گیلری آف آرٹ واشنگٹن میں لکڑی کے تختے پر پینٹنگ کے ذریعے کولمبس کی مہم جوئی کا منظر
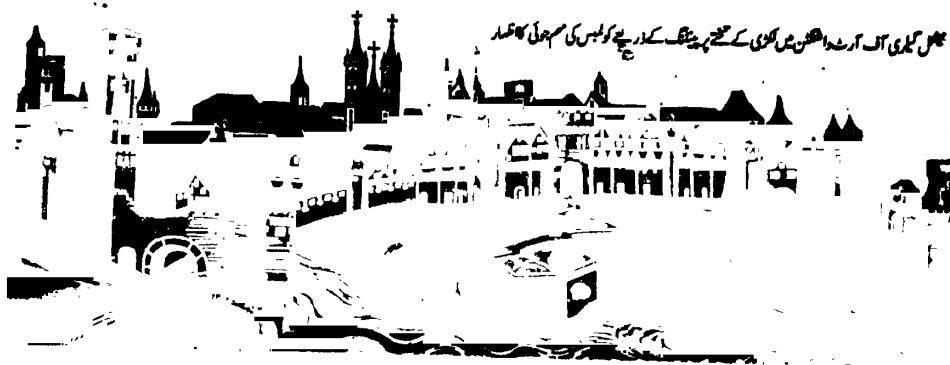
اسٹیٹ کی حیثیت سے یونین اسے میں شامل کی گئی۔ اس ریاست کے پہاڑی علاقہ میں ایک قوم بستی ہے جس کو میلنجین (Melungeon) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ سیاہ فام ہوتے ہیں۔ ان کی موجودہ تعداد ایک ملین سے زیادہ ہے۔ ان کا بھی ایک آدمی کانفرنس میں شریک تھا۔

شکاگو میں ۲ - ۵ ستمبر ۹۴ ۱۹کو چار مسلم تنظیموں کا ایک مشترک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً سولہ ہزار ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ اس میں ایک ڈاکٹر کینڈی (Dr. N. Brent Kennedy) تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میں نے اپنے آبا و اجداد اور میلنجین لوگوں کے بارہ میں ریسرچ کی ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے آبا و اجداد اسپینی مسلمان (Spanish Muslims) تھے۔ جو دارو گیر (Persecution) کے زمانہ میں وہاں سے بھاگ کر امریکہ آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اپنی قوم کی اس تاریخ پر ایک فلم بنا رہا ہوں۔

اسپین میں جو مسلمان داخل ہوئے وہ محض لینے والے بن کر وہاں نہیں گئے بلکہ دینے والے بن کر گئے۔ یہ عرب اس وقت ایک تازہ دم قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے صحرائی دنیا سے نکل کر ایک سرسبز و شاداب دنیا کو دریافت کیا تھا۔ اس دریافت نے ان کے اندر نیا ولولہ پیدا کیا۔ اسپین جیسے زرخیز ملک میں ان کو ہر قسم کے مواقع ملے۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک کی امکانیات کو استعمال کر کے اس کو وقت کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ اس کی تفصیل بہت سی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ صرف ایک کتاب پڑھنا چاہیں وہ درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کریں :

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*

برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب (*A History of Western Philosophy*) میں لکھا ہے کہ اسپین میں عرب اقتصادیات کی ایک بہترین خصوصیت ان کی زراعت تھی۔ خاص طور پر آبپاشی کا ماہرانہ استعمال جس کو انھوں نے کم پانی کے علاقہ میں رہ کر سیکھا تھا۔ آج بھی اسپینی زراعت عربوں کے آبپاشی نظام سے فائدہ اٹھا رہی ہے :

> One of the best features of the Arab economy was agriculture, particularly the skilful use of irrigation, which they learnt from living where water is scarce. To this day Spanish agriculture profits by Arab irrigation works. (p. 416)

یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ ان مسلمانوں نے عرب کے ریگستانوں میں آبپاشی کا نیا نظام سیکھا تھا۔

اصل یہ ہے کہ وہ زندگی کے عزائم سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جو قوم زندگی کے عزائم سے بھری ہوئی ہو وہ اسی طرح بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی ہے۔

جے ایم رابرٹس ایک منصف مزاج مورخ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ۱۰۵۰ صفحہ کی کتاب دنیا کی تاریخ ہے:

J.M. Roberts, *The Pelican History of the World*

اس کتاب میں مصنف نے کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ عربی اسپین (Arab Spain) ہی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا سبب تھا۔ حتی کہ انڈیا، چین اور یونان کی علمی وراثت بھی اسپینی مسلمانوں ہی کے ذریعہ یورپ تک پہنچی۔ اسطرلاب ابتدائی طور پر اگرچہ ایک یونانی ایجاد تھی۔ لیکن یہ عرب ہی تھے جو اس کو مغرب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ جب چاسر (Chaucer) نے اسطرلاب کے استعمال پر اپنا رسالہ لکھا تو اس نے ایک عرب رسالہ کو بطور ماڈل اپنے سامنے رکھا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرون وسطی میں یورپ کسی بھی دوسری تہذیب کا اتنا احسان مند نہیں جتنا کہ اسلام کا:

To no other civilization did Europe owe so much in the Middle Ages as to Islam. (p. 511)

ایک صاحب کو عالمی نقشہ دکھاتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کو دیکھئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یورپ اسپین کے مقام پر آگے بڑھ کر افریقہ کی مسلم دنیا سے مل رہا ہے۔ یہ ملاقات عملاً پیش آئی۔ مگر وہ زیادہ تر سیاسی اور علمی سطح پر باقی رہی۔ دعوت کی سطح پر دونوں کے درمیان زیادہ تعلق قائم نہ ہو سکا۔

چودھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان یورپ میں ترقی کا وہ واقعہ ہوا جس کو نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ مغربی مورخین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ یونانی اور رومی تہذیب کا احیار تھا۔ جو پہلے اٹلی میں ہوا، اور پھر دوسرے یورپی ملکوں تک پہنچا۔ مگر یہاں ایک درمیانی کڑی کو حذف کر دیا گیا ہے، اور وہ اسپین ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسپین میں قدیم تہذیبی سرمایہ کو لے کر اس میں اضافے کیے۔ اس طرح اسپین میں ایک اعلیٰ تہذیب وجود میں آئی۔ پھر یہ تہذیب اٹلی میں داخل ہو کر بقیہ یورپی ملکوں تک پہنچی۔

ترقی کے اس عمل میں اسپین کی کڑی حذف ہونے کی ذمہ داری خود اسپین پر ہے۔ پندرھویں صدی میں اسپینیوں نے مسیحی چرچ کے زیر اثر یہ مجنونانہ کام کیا کہ علم وفن کے مسلم ماہرین کو ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ مسلمان ہی اس تہذیبی عمل کو اسپین میں جاری کیے ہوئے تھے۔ اس لیے اس جبری انخلا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کی کڑی ٹوٹ گئی، اور اٹلی ہی کی کڑی عملاً اہل یورپ کے لیے باقی رہی۔

اس مسئلہ پر ایک اسپینی اسکالر سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ واقعات کی فطری رفتار میں جب بھی تشدد کے ذریعہ تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے گی، ہمیشہ اسی قسم کا منفی نتیجہ نکلے گا۔ اس دنیا میں تدریجی تبدیلی ہی قابل عمل ہے۔ ریڈیکل تبدیلی صرف ایک لفظ ہے۔ اس کے نتیجہ میں عملاً جو چیز ظہور میں آتی ہے وہ صرف تخریب ہے نہ کہ تبدیلی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی اور نویں صدی عیسوی کے درمیان یورپ میں بت اور مذہبی تصویروں کے خلاف جو مہم اٹھی اس کو بھی مسلم اسپین ہی سے تحریک ملی تھی (ان الدعوة الى نبذ الصور والتماثيل كانت متأثرة بالاسلام)

کلودیس (Claudius) کو ۸۲۸ء میں تورین کا اسقف مقرر کیا گیا۔ وہ مذہبی تصویروں کو غیر مقدس قرار دینے میں اتنا شدید تھا کہ وہ اس قسم کی تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا اور اپنے چرچ میں اس کی عبادت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ کلودیس اندلس میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی پرورش ہوئی (ولد وربى فى الاندلس الاسلامية) ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين ۱۳۹-۱۳۸

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی مسلم سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائی حکمرانوں نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو مارنا اور بھگانا شروع کر دیا۔ مگر بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان اسپینیوں کے لیے بہترین مزدور اور بہترین کاریگر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کے صنعت و حرفت اور زراعت و باغبانی کے نظام کو ترقی دی تھی اور اس کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس لیے اسپینیوں کو عام مسلمانوں سے وہ نفرت نہیں ہو سکتی تھی جو ان کو سیاسی حکمرانوں سے تھی۔

مگر مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد ان مسلمانوں نے عیسائی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ بار بار ان کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ اگرچہ ناکافی تیاری کی بنا پر وہ ہر بار کچلے جاتے تھے۔ مزید یہ کہ اسپین کی مذہبی مخالفت کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں تھا بلکہ وہ تمام غیر عیسائی مذاہب سے تھا۔

چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ اسپینی یہودی بھی یکساں عتاب کا نشانہ بنے۔

غرناطہ کی موجودہ آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً ایک ہزار اسپینی مسلمان ہیں۔ ان مسلمانوں کو حکومت وقت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو چھپائے بغیر آزادی کے ساتھ شہر میں رہتے ہیں۔ ۱۹۹۳ میں غرناطہ کے مسلمانوں نے عید الفطر کی نماز الحمراء میں ادا کی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اسپین کے ٹی وی سسٹم نے اس نماز کی مکمل فلم بندی کی تھی۔ اس کو ٹی وی کے نیشنل پروگرام کے تحت براڈکاسٹ کیا گیا جس کو پورے ملک میں نہایت شوق کے ساتھ دیکھا گیا۔

کچھ لوگ اسپین کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے کہ سارا اسپین مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا۔ مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے اور فطرت کے خلاف بھی۔ اصل یہ ہے کہ وہاں تین طبقے تھے۔ ایک، مذہبی طبقہ، دوسرے، حکمراں طبقہ، تیسرے، عوام۔

یہ صحیح ہے کہ مذہبی طبقہ (مسیحی چرچ) مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کا دشمن بن گیا تھا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں وہاں مذہبی طبقہ کا بہت اثر تھا اس لیے انھوں نے دونوں فرقوں پر کافی ظلم بھی کیا۔ مگر حکمراں طبقہ کے دل میں مسلمانوں کے لیے وہ نفرت نہ تھی۔ کیوں کہ مسلمان ان کے ملک کی ترقی کا سبب بنے ہوئے تھے۔

مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ چرچ کے لوگوں نے جامع قرطبہ کے کچھ ستونوں کو گرایا اور اس کے ایک حصہ میں چرچ بنا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے چارلس پنجم (۱۵۵۸—۱۵۰۰ء) کو اس چرچ کے افتتاح کے لیے بلایا۔ مگر شاہ اسپین جب وہاں آیا اور مسجد کے بقیہ حصہ کو دیکھا تو وہ بہت غضب ناک ہوا۔ اس نے کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ مسجد اتنی خوب صورت اور اتنی عالی شان ہے۔ اگر میں جانتا تو تم کو ہرگز اسے توڑنے کی اجازت نہ دیتا۔ کیوں کہ اس کے ایک حصہ کو توڑ کر تم نے جو چرچ بنایا ہے وہ تم دوسری جگہ بھی بنا سکتے تھے۔ مگر یہ مسجد تو ایک ایسی نادر عمارت ہے جس کی دوسری مثال سارے عالم میں موجود نہیں۔

چارلس پنجم نے اہل کلیسا کے زیر اثر ۱۵۲۵ء میں بلنسیہ اور اراغون کے مسلمانوں کے نام یہ حکم جاری کیا کہ وہ اپنی زبان، مذہب، لباس، عادات کو ترک کرکے مکمل طور پر عیسائی ہو جائیں، ورنہ ان کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس کے بعد ۱۵۲۸ میں بلنسیہ کے بارہ افراد کا ایک وفد بادشاہ سے ملا اور اس سے درخواست کی کہ اس حکم کو واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس حکم کا نفاذ روک دیا۔ اس

کی وجہ یہ تھی کہ یہ مسلمان اپنی محنت اور اپنی مہارت کی بنا پر وہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں کے لیے قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو نکال دیا گیا تو ان کے کھیت اور باغ ویران ہو جائیں گے اور ان کی اقتصادیات پر اس کا نہایت مضر اثر پڑے گا۔

مسلم اقتدار کے خاتمہ کے بعد مسجد قرطبہ کے ایک حصہ کو عیسائیوں نے چرچ میں تبدیل کر دیا۔ مگر اس کا سبب عیسائیوں کے ظلم کے ساتھ خود مسلمانوں کی نادانی بھی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں ایک مسیحی پیشوا سینٹ ونسنٹ (Saint Vincent Ferrer) گزرا ہے۔ مسیحیوں نے اس کے نام پر قرطبہ میں دریا کے کنارے ایک چرچ تعمیر کیا تھا۔ اس علاقہ پر سیاسی قبضہ کے بعد مسلمانوں نے عین اسی چرچ کی جگہ اپنی مسجد بنا دی۔ اس طرح اس مسجد کے ساتھ غیر ضروری طور پر نزاع کی حالت قائم ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کو ۷۸۶ء میں سلطان عبدالرحمٰن الداخل نے عیسائیوں کو راضی کر کے اس جگہ کو خرید لیا اور وہاں مزید توسیع کے ساتھ عظیم مسجد قرطبہ کی تعمیر کی۔ اس تعمیر پر دو سال میں ۸۰ ہزار دینار خرچ ہوئے۔ عیسائیوں کو جب دوبارہ سیاسی غلبہ ملا تو انھوں نے مسجد کے توسیعی حصہ کو تو چھوڑ دیا۔ مگر سینٹ ونسنٹ چرچ کی ابتدائی جگہ کو دوبارہ انھوں نے گرجا میں تبدیل کر دیا۔

اسپین میں مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسیحیوں نے بہت سی مسجدوں کو چرچ بنا دیا تھا۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے بعض مغربی مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ مسیحیوں کی طرف سے جوابی کارروائی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کثیر تعداد میں چرچ کو مسجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ مسیحیوں کو جب غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی جگہ پر اپنے چرچ بنا دیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں :

"اسلام میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کوئی علاقہ مسلمانوں نے صلح سے نہیں بلکہ بزور شمشیر جنگ کے ذریعہ فتح کیا ہو تو وہاں کی زمینوں اور عمارتوں پر انھیں شرعاً مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس اختیار میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو ضرورۃً ختم کر دیں، یا مسجد میں تبدیل کر لیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے اس شرعی اختیار کو بہت کم استعمال کیا۔ بعض مقامات پر کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت کلیسا کو مسجد بنایا گیا۔" اندلس میں چند روز، صفحہ ۲۱

یہ بات صحیح نہیں۔ "بزور شمشیر فتح" کا مذکورہ حکم صرف اس وقت ہے جب کہ فریق ثانی خود جارحیت

کرے اور اس کے نتیجہ میں جنگ پیش آئے۔ جب کہ معلوم ہے کہ اسپین نے اس قسم کا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جارحیت کی صورت میں بھی مذکورہ شرعی مسئلہ کا تعلق صرف زمینوں اور عمارتوں سے ہے۔ اس میں عبادت خانہ شامل نہیں ہے۔ کسی قوم کے عبادت خانہ کو توڑنا صرف اس وقت جائز ہے جب کہ اس کو بنانے والے سب کے سب اسلام قبول کر کے نمازی بن گئے ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کو ناحق مارنا گویا تمام انسانوں کو مارنا ہے۔ اسی طرح کسی ایک عبادت گاہ کو ڈھانا گویا تمام عبادت گاہوں کو ڈھانا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کمیت قابل لحاظ نہیں ہوتی۔

اسپین سے مسلمانوں کا کلی انخلاء نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے زیر قبضہ اسپین میں غیر مسلموں سے انتہائی رواداری اور انصاف کا معاملہ کیا تھا۔ مسلمانوں کی علمی ترقیوں سے مقامی آبادی اتنا زیادہ متاثر تھی کہ لوگ اسی طرح عربی لکھنے اور بولنے کو فخر سمجھتے تھے جس طرح برٹش حکومت کے دور میں ہندستان کے لوگ انگریزی لکھنے اور بولنے کو فخر سمجھنے لگے تھے۔ اسپینیوں کی ایک بڑی تعداد مستعرب (Mozarab) بن گئی تھی۔ یہ تقریباً اسی قسم کے لوگ تھے جیسے مغل دور میں ہندستان کے کائستھ۔ مسلمان اسپین کی زراعت اور صناعت کے لیے بہترین کاریگر اور ماہرین فراہم کر رہے تھے۔ اسپینیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حتی کہ خود اسپین کے مسیحی حکمرانوں میں کئی حکمراں ایسے تھے جو مسلمانوں کے حق میں اپنے دل کے اندر نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس طرح کے مختلف طاقت ور اسباب اس میں مانع تھے کہ مسلمانوں کو مکمل طور پر اسپین سے باہر نکال دیا جائے۔

تقریباً تین لاکھ (300,000) مورسکو (Moriscos) جو اسپین سے نکالے گئے وہ بھی قانون فطرت کے مطابق عسر میں یسر کی مثال بن گئے۔ یہ لوگ اسپین سے نکل کر زیادہ تر الجیریا، تیونس اور مراکو میں بس گئے۔ ان کا یہ آنا ان ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ ان آفریقی ملکوں میں تبلیغ اسلام کے لیے یہاں قادریہ سلسلۂ تصوف کی ایک خانقاہ ساقیۃ الحمراء کے نام سے قائم تھی۔ مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ مسلم مذہب کو ان افریقیوں کے اندر داخل کرنے کا کارنامہ ان اسپینی مسلمانوں نے انجام دیا جو ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اسپین سے نکال دیے گئے تھے:

But the honour of winning an entrance among them for the Muslim faith was reserved for a number of Andalusian Moors who were driven out of Spain after the taking of Granada in 1492. (p. 129)

اقبال کو دو بار اسپین کے علاقہ میں جانے کا موقع ملا۔ پہلی بار ۱۹۰۸ میں جب یورپ کے ایک سفر کے دوران وہ اسپین کے ساحل (سسلی) سے گزرے۔ اس پر انھوں نے ایک تاثراتی نظم بھی لکھی تھی جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔

اسپین کے لیے اقبال کا دوسرا سفر جنوری ۱۹۳۲ میں ہوا۔ اس وقت تیسری گول کانفرنس لندن میں ہوئی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے جو لوگ ہندستان سے گئے ان میں سے ایک اقبال بھی تھے۔ کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ پیرس ہوتے ہوئے غالباً ۵ جنوری کو اسپین میں داخل ہوئے اور اپنے تین ہفتہ کے قیام میں میڈرڈ اور غرناطہ اور قرطبہ کو دیکھا۔

اقبال کو اسپین کے علاوہ دوسرے کئی ملکوں کے سفر کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں :
بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے (بال جبریل)۔ مگر صرف کسی ملک کا سفر کرنا یا اس کو دیکھنا اس ملک کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایک سفر میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ انجینیر تھے اور یورپ کی ایک شپنگ کمپنی میں ۲۰ سال سے ملازم تھے۔ انھوں نے دنیا کے اکثر ملکوں کا سفر کیا تھا۔ مگر جب میں نے گفتگو کی تو اندازہ ہوا کہ عالمی زندگی کے کسی بھی پہلو پر وہ کوئی گہری واقفیت نہیں رکھتے۔

اصل یہ ہے کہ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، آدمی کو پیشگی طور پر ایک تیار ذہن (Prepared mind) ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ کسی چیز کو حقیقی طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ تاریخ اور دوسرے علوم کے گہرے مطالعہ سے آدمی ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو چکا ہو۔ اس کے بعد ہی وہ کسی ملک کو گہرائی کے ساتھ جان سکتا ہے یا وہاں کے سفر سے کوئی حقیقی بات دریافت کر سکتا ہے۔

۱۹۰۸ میں اقبال نے اسپین کے ساحل کو دیکھ کر کہا تھا :

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

یہ محض ایک شاعرانہ تخیل ہے نہ کہ واقعی معنوں میں کوئی تاریخی واقعہ۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کبھی بھی "تہذیب حجازی" کا مزار نہیں بنا۔ وہاں سے بعض مسلم خاندانوں کا سیاسی اقتدار ضرور ختم ہوا۔ مگر جہاں

تک حجازی تہذیب یا اسلام کا معاملہ ہے اس کا وجود خاندانی اقتدار کے خاتمہ کے بعد بھی اسپین میں باقی تھا اور آج بھی وہ وہاں موجود ہے۔

اقبال نے فاتح اسپین طارق بن زیاد کے بارہ میں لکھا ہے کہ طارق نے جب اندلس کے ساحل پر اپنی کشتی کو جلا دیا تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر میں یہ تم نے غلط کام کیا :

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت   گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست

حالانکہ کشتیوں کو جلانے کا یہ افسانہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اور وہ کسی بھی قابل اعتماد تاریخی کتاب میں موجود نہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : الرسالہ مئی ۱۹۸۹)

اسی طرح اقبال اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں :

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی   ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

یہ بھی اقبال کی ایک تاریخی بھول ہے۔ کسی ابن بدرون نے کبھی غرناطہ کا مرثیہ نہیں لکھا۔ اصل یہ ہے کہ ابن عبدون الفہری (م ۵۲۹ھ) ایک اسپینی شاعر تھا۔ اس کا تعلق بطلیوس (Badajoz) کے مسلم حکمراں متوکل بن المظفر سے تھا جو ملوک الطوائف میں سے ایک تھا۔ ابن عبدون اسی متوکل کا وزیر تھا اور شاعر بھی تھا۔ متوکل بن المظفر کو یوسف بن تاشفین نے اس کے دو بیٹوں سمیت مروا دیا تھا۔ اس المیہ پر ابن عبدون نے عربی میں ایک مرثیہ لکھا۔ اس مرثیہ کا تعلق سقوط بطلیوس سے تھا نہ کہ سقوط غرناطہ سے۔

ابن عبدون کے اس مرثیہ کی شرح ایک صاحب نے کی جو شاعر نہیں تھے بلکہ صرف عالم تھے۔ ان کا نام ابن بدرون (عبد الملک بن عبد اللہ بن بدرون) تھا۔ انھوں نے ۶۰۸ھ میں وفات پائی۔

مسجد قرطبہ پر اقبال کی طویل نظم کا ایک مصرعہ یہ ہے : کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق۔

اس طرح کے بہت سے اشعار اقبال کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے بارہ میں کہا :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اسی طرح وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" حتی کہ ان کی ایک تعریفی نظم رام کے بارہ میں بھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز   اہلِ وطن سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اقبال کے اس قسم کے اشعار کو اُس زمانہ میں برا نہیں مانا گیا۔ لیکن اس طرح کی بات اگر آج کوئی کہے

تو خود اقبال کے پرستار یہ کہیں گے کہ دیکھو اس شخص کو، یہ ہندو کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا تشخص مٹانا چاہتا ہے۔

عبد المجید بن عبد اللہ بن عبدون الفہری (م ۵۲۹ ھ) اندلس کے ایک ممتاز عالم اور ادیب ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ابو مروان عبد الملک ایک وزیر تھے۔ ان کے لڑکے ابو بکر ایک کاتب سے "کتاب الاغانی" کی کتابت کروا رہے تھے۔ درمیان میں ایک روز انھیں کتابت شدہ حصہ کو اصل نسخہ سے ملا کر اس کی تصحیح کرنا تھا۔ اس وقت کتابت کا اصل نسخہ موجود نہ تھا۔ انھوں نے کسی آدمی کو اصل نسخہ لانے کے لیے باہر بھیجا تھا۔

اس درمیان میں ایک بوڑھا آدمی وہاں آگیا جو بظاہر غیر اہم تھا۔ بات چیت کے دوران اس کو معلوم ہوا کہ ابو بکر کے ہاتھ میں کتاب الاغانی ہے اور وہ مقابلہ کر کے اس کی تصحیح کرنے کے لیے اصل نسخہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ میں بولتا ہوں، تم اپنی کتاب کھول کر ملا لو۔ ابو بکر نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کتاب ہے۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ کتاب تو نہیں ہے، البتہ یہ کتاب مجھ کو یاد ہے۔ اس کے بعد بوڑھے آدمی نے اپنے حافظہ سے کتاب پڑھنا شروع کیا اور ابو بکر اپنے کتابت شدہ نسخہ کو کھول کر اس سے ملانے لگے۔ ابو بکر کو سخت حیرت ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ ایک لفظ کے فرق کے بغیر بوڑھا آدمی کتاب کو دہرائے چلا جا رہا ہے۔

ابو بکر حیرانی کے عالم میں گھر کے اندر گئے اور اپنے باپ کو پورا قصہ سنایا۔ ان کے باپ ابو مروان عبد الملک ننگے پاؤں بھاگ کر باہر آئے۔ انھوں نے اس بوڑھے آدمی کو گلے سے لگایا۔ ان کی ضیافت کی اور پورا اعزاز کے ساتھ سواری دے کر انھیں رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد بیٹے نے پوچھا کہ یہ بوڑھا آدمی کون تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ تمہارا برا ہو، یہ اندلس کے ادیب اور علم ادب میں اس کے سردار ابن عبدون ہیں (ویحك هذا اديب الاندلس وسيدها فى علم الادب، هذا ابومحمد عبد المجيد بن عبدون) الاعلام ۴/۱۴۹

اسپین کے مسلم عہد میں جو بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک ابن حزم ہیں۔ وہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا زمانہ ۳۸۴ھ اور ۴۵۶ھ کے درمیان ہے۔ یہ زمانہ مسلم اسپین کا انتہائی اختلاف کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے اندلس میں مالکی فقہا کا غلبہ تھا جو قیاس سے کام لینے میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔

ابن حزم نے سمجھا کہ فقہ میں قیاس کو داخل کرنا بس یہی اختلاف اور بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ چنانچہ وہ قیاس کے منکر ہو گئے اور صرف ظاہر پر زور دینا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کا نام ہے : ابطال القیاس والرای والاستحسان والتعلیل۔

ابن حزم نے لکھا کہ إن اللہ تعالیٰ یقول : وما اختلفتم فیہ من شیئ فحکمہ الی اللہ۔ ولم یقل سبحانہ وتعالیٰ فحکمہ الی الرائی والقیاس (الاحکام فی اصول الاحکام ۷/۵۳)

اس ظاہری مسلک کی بنا پر ابن حزم بہت زیادہ نزاعی شخصیت بن گئے۔ وہ کئی بار قید کیے گئے۔ ان کی تکفیر وتضلیل کی گئی۔ ان کی کتابیں جلادی گئیں۔ حتی کہ ان کی لکھی چار سو کتابوں میں سے اب بمشکل چالیس کتابیں دنیا میں باقی ہیں۔

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ابن حزم کا کیس دراصل انتہا پسندی کا کیس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانہ کے فقہا کثرت سے قیاس کا غلط استعمال (سوء استخدام) کر رہے تھے۔ لیکن اگر تمام فقہی کتابیں جلادی جائیں اور صرف قرآن وحدیث دنیا میں رہ جائے تب بھی غلط استعمال کی برائی باقی رہے گی۔ کیونکہ غلط استعمال کا سبب متن میں نہیں ہوتا بلکہ آدمی کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔

میں نے مزید کہا کہ فقہاء اسلام نے چار چیزوں کو مصادر شریعت قرار دیا ہے —— قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کے الفاظ کی اتباع کی جائے تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مصادر شریعت تین ہیں : قرآن، سنت اور اجتہاد۔ اجتہاد سے مراد آزادانہ رائے نہیں ہے، بلکہ وہ رائے ہے جو قرآن وسنت کی بنیاد پر مخلصانہ طور پر قائم کی گئی ہو۔ اجتہاد کے مختلف درجے ہیں۔ انھیں درجات کا نام قیاس اور اجماع ہے۔

قاضی مُنذِر بن سعید قرطبہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۳۶۶ھ میں قُرطبہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ علم اور زہد دونوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ کے اندلس میں وہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ اور آخر تک اس عہدہ پر قائم رہے۔

ابن الاثیر نے اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں ۳۶۶ھ کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ سلطان عبد الرحمٰن الناصر نے جب الزہراء کا محل تعمیر کر لیا تو ایک دن وہ اپنے سونے کے تخت پر

بٹھا۔ دربار میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ سلطان نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم نے سنا ہے کسی نے ایسا عالی شان محل بنایا ہو۔ حاضرین نے کہا کہ ہم نے نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا (لم نر نسمع بمثلہ) لوگوں نے خوب تعریف کی مگر قاضی منذر سر جھکائے بیٹھے رہے۔

آخر میں سلطان نے قاضی منذر سے بولنے کے لیے کہا۔ قاضی منذر رو پڑے اور ان آنسوان کی داڑھی تک آ گئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم، میرا یہ گمان نہیں تھا کہ شیطان تمہارے اتنا زیادہ قابو پا جائے گا کہ وہ تم کو کافروں کے درجہ تک پہنچا دے۔ سلطان نے کہا کہ دیکھئے کہ آپ کہہ رہے ہیں اور کیسے آپ مجھے کافروں کے درجہ تک پہنچا رہے ہیں۔ اس کے بعد قاضی منذر نے سورہ الزخرف کی آیات ۳۳-۳۵ پڑھیں۔ ان آیتوں کو سن کر سلطان عبد الرحمٰن سخت غمگین ہو گیا اور رونے لگا۔ اس نے کہا کہ اللہ آپ کو بہتر جزا عطا فرمائے۔ اور مسلمانوں میں آپ جیسے لوگ پیدا کرے۔

اسی طرح ایک بار اندلس میں قحط پڑا۔ سلطان عبد الرحمٰن نے ایک آدمی کو قاضی منذر کے پاس بھیجا کہلایا کہ قاضی صاحب بارش کے لیے دعا کریں۔ قاضی منذر نے قاصد سے پوچھا کہ سلطان خود کیا کر رہے ہیں قاصد نے کہا کہ میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ انھوں نے شاہی لباس اتار کر معمولی کپڑے پہن لیے تھے اور زمین پر سر رکھ کر یہ کہہ رہے تھے کہ خدایا، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، کیا تو میری وجہ سے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

قاضی منذر نے شاہی قاصد سے کہا کہ تم بارش لے کر جاؤ۔ کیوں کہ جب زمین کا بادشاہ عاجزی اختیار کرتا ہے تو آسمان کا بادشاہ رحم فرماتا ہے۔ اس کے بعد قاضی منذر باہر نکلے اور استسقاء کی نماز پڑھی۔ پھر منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ لوگ تقریر سن کر رونے لگے۔ جب وہ گھر لوٹے تو بارش شروع ہو چکی تھی (المجلد الثامن، صفحہ ۶۷۴-۶۷۵)

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ بعد کے دور میں علماء کے درمیان یہ غلط روایت چل پڑی کہ لوگوں نے حکومت میں عہدہ لینے کو کمتر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا۔ یہ عالم کے مناقب میں شمار ہونے لگا کہ اس کو حکومت نے عہدہ کی پیش کش کی اور اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ حالاں کہ یہ پیغمبر کی سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مشرک بادشاہ کے یہاں عہدہ قبول کیا۔

میں نے کہا کہ یہ روش اسلامی مزاج کے مطابق نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما اصالحین اور حکمرانوں کے بیچ میں دوری قائم ہوگئی۔ اس دوری کے نتیجہ میں بہت سے اعلیٰ مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔ اسلام کی بعد کی تاریخ کا یہ ایک افسوس ناک باب ہے کہ رجاء بن حیوہ اور قاضی ابو یوسف اور قاضی منذر اور شیخ احمد سرہندی جیسی مثالیں اس میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

اسپین کے مسلم عہد میں جو بڑے بڑے دماغ اٹھے ان میں سے ایک ممتاز نام ابن الطفیل کا ہے۔ وہ ۱۱۰۰ء میں اندلس میں وادی آش (Guadix) میں پیدا ہوا۔ ۱۱۸۵ء میں مراکش میں اس کی وفات ہوئی۔ الموحدین کا سلطان، ابو یوسف المنصور اس کے جنازہ میں شریک ہوا۔ ابن الطفیل ایک فلسفی اور طبیب تھا۔ اس کی تعلیم غرناطہ میں ہوئی۔ وہ ایک اوریجنل فکر رکھنے والا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے حالات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے فرانسیسی مصنف لیون غوتیہ (Leon Gauthier) کی کتاب بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

اس کی ایک نسبتاً مختصر کتاب حی بن یقظان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب ہے زندہ ابن بیدار (The living one, son of the vigilant) یہ ایک فلسفیانہ کہانی ہے۔ ایک انسان بچپن سے لے کر بڑی عمر تک خالص فطرت کے ماحول میں رہتا ہے۔ اس کا کسی انسان سے سابقہ پیش نہیں آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت اور کائنات کے بے آمیز مطالعہ کے ذریعہ خدا کو پالیتا ہے۔ ابن طفیل اس دل چسپ کہانی کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خدا ایک حقیقت ہے اور عین عقل انسانی کا تقاضا ہے۔

حی بن یقظان ہی کے نمونہ پر بعد کو رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) لکھی گئی۔ ابن طفیل کی اس کتاب کا ترجمہ تقریباً ستر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ڈچ زبان میں اس کا ترجمہ ۱۶۷۲ء میں ہوا۔ روسی زبان میں ۱۹۲۰ میں، اسپینی زبان میں ۱۹۳۴ میں۔ اس عربی کتاب کا پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۶۷۱ء میں ہوا۔ یہ ترجمہ ایڈورڈ پوکوک (Edward Pococke) نے کیا تھا۔

مسلم اسپین میں ادب وشاعری کو بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ کثیر تعداد میں شعراء پیدا ہوئے۔ خود اسپین کا پہلا اموی حکمراں عبد الرحمٰن الداخل بھی شاعر تھا۔ خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر (الثالث) کے دربار کا ایک شاعر اس کے دور کی تعریف میں کہتا ہے کہ اللہ نے اسلام کا راستہ واضح کر دیا۔ اور لوگ دین میں جوق در جوق داخل ہو گئے:

قد اوضح الله للاسلام منهاجا　　والناس قد دخلوا فی الدین افواجا

دوسرا شاعر مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد کہتا ہے کہ کیا یہ شہر دین اسلام کا محفوظ قلعہ نہ تھا۔ مگر خدا نے اس کو ذلیل کر دیا :

الم تك معقلا للدين صعبا　　فذللك كما شاء القدير

ایک اور شاعر کے مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے کہ ہر چیز جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں نقص کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی آدمی کو خوش گوار زندگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے :

لكل شيئ اذا ما تم نقصان　　فلا يغر بطيب العيش انسان

یہ تین اشعار نہ صرف اسپین کے مسلم دور کی تصویریں ہیں۔ بلکہ اس میں پوری دنیا میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اندلس میں دوسری ترقیوں کے ساتھ فن موسیقی اور آلات موسیقی کی بھی کافی ترقی ہوئی۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے عبد العزیز بن عبد الجلیل کی کتاب الموسیقا الاندلسیۃ المغربیۃ دیکھی۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ میں کویت سے چھپی ہے۔ وہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاہم اس موضوع سے ناآشنا ہونے کی بنا پر وہ میری سمجھ میں زیادہ نہ آسکی۔

اسپین کی مسلم سلطنت کے زوال کے بعد جب ان حکمرانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں کھنڈر یا غیر آباد ہو چکی تھیں۔ ان کے محلوں اور باغوں میں انسانوں کے بجائے جانور رہنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں ۴۳۵ھ میں ابو الحزم بن محمد بن جھور کا گزر مدینۃ الزہراء سے ہوا۔ اس نے جب شاہی دور کی ان برباد عمارتوں کو دیکھا تو اس پر ایک عجیب حیرت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے تاثر کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے :

قلت یوما لدار قوم تفانوا　　این سکانك العزاز علینا

فاجابت هنا اقاموا قلیلا　　ثم ساروا ولست اعلم اینا

یعنی وہ قوم جو فنا ہو گئی، میں نے ایک دن اس کے مسکن سے پوچھا۔ تمہارے وہ مکین کہاں گئے جو ہم کو بہت عزیز تھے۔ اس نے جواب دیا کہ تھوڑے دن وہ یہاں ٹھہرے تھے۔ پھر وہ چلے گئے اور مجھ کو نہیں معلوم کہ وہ کدھر گئے (نفح الطیب)

یہ صرف مدینۃ الزہراء کے مکینوں کی کہانی نہیں، یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اس

دنیا میں جو بھی آتا ہے، تھوڑی مدت کے بعد وہ اس طرح یہاں سے چلا جاتا ہے کہ اس کے چھوڑے ہوئے کھنڈروں کے سوا کوئی اور نشان اس کا یہاں باقی نہیں رہتا۔

اسپینی زبان میں ابھی تک ایک مثل ہے جس کا ترجمہ عربی میں ایک شخص نے اس طرح کیا: کل مَن احبّہ اللّٰہ رزقہ منزلاً فی اشبیلیہ (جس آدمی سے خدا محبت کرتا ہے، اس کو اشبیلیہ میں ایک مکان دے دیتا ہے)

یہ مثل اس وقت بنی جب اشبیلیہ (اور دوسرے اندلسی شہروں میں) مسلم تمدن کا غلبہ تھا۔ اس وقت یہ شہر عمدہ مکانات، سڑکیں، باغات اور صاف ستھری زندگی کے لیے ایک عالمی نمونہ بنے ہوئے تھے۔

المعتمد بن عباد اسی اشبیلیہ کا حکمراں تھا۔ یہاں ابھی تک ایک قدیم عمارت الکازار کے نام سے ہے۔ جو القصر کی اسپینی صورت ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے فخر کے ساتھ اس واقعہ کو دہرایا کہ ملوک الطوائف کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور المعتمد بن عباد نے افریقہ کے حکمراں یوسف بن تاشفین کو مدد کے لیے بلایا۔ اس وقت ایک مسلمان نے اس کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ جب یوسف بن تاشفین یہاں اپنی فوجوں کو لے کر آئے گا تو وہ تم کو بے دخل کر کے خود تمہاری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ المعتمد نے جواب دیا: رعی الجمال ولا رعی الخنازیر۔ یعنی اگر میں ایک عرب بادشاہ کا قیدی بن کر اس کا اونٹ چراؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں ایک فرنگی بادشاہ کا قیدی بن کر اس کی خنزیروں کو چراؤں۔

ایک صاحب نے فخر کے ساتھ اس قول کو دہرایا۔ میں نے کہا کہ انسانوں کو "اونٹ" اور "خنزیر" میں بانٹنا یہ خالص قومی مزاج ہے۔ مومن کا مزاج داعیانہ مزاج ہوتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اللہ کے بندوں کے روپ میں دیکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی غیر داعیانہ مزاج اندلسی مسلمانوں کی تباہی کا سبب بنا۔ عیسائیوں کو "خنزیر" سمجھنے کے بجائے اگر وہ ان کو "مدعو" سمجھتے تو شاید اسپین کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ایک عرب سیاح نے اپنے اسپینی سفر کے تاثرات بتاتے ہوئے کہا کہ جب میں نے قرطبہ کی تاریخی یادگاریں دیکھیں جو ابھی تک اپنی عظمت کی داستان سنا رہی ہیں تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت حالت یہ تھی کہ سیاحوں کے قافلے میرے پاس سے گزر رہے تھے اور وہ میری حالت کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ ایک عربی ہے جو اپنے اسلاف کی عظمت پر رو رہا ہے

(تمرّ بی قوافل السیّاح فیعرفون انی عربی ابکی مجد اجدادی)

میں نے کہا کہ اس قسم کی عمارتوں کو دیکھ کر مجھے بھی رونا آتا ہے۔ مگر میرا رونا اسلاف کی عظمت کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر ہوتا ہے کہ انسان کتنا زیادہ نادان ہے کہ ایسی چیزوں کے اوپر اپنی عظمت کا محل کھڑا کرتا ہے جو آخر کار کھنڈر ہو جانے والی ہیں۔

غرناطہ کے قصر الحمراء میں ایک جگہ ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس میں بڑی عبرت ہے۔ اس دیواری کتبہ میں اسپینی زبان میں لکھا ہوا ہے کہ میکسیکو کا ایک سیاح آرہی ایکا سا الحمراء کو دیکھنے کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ جب وہ دونوں محو حیرت ہو کر اس تاریخی محل کو دیکھ رہے تھے تو عین اسی وقت ایک سائل وہاں آگیا جو کہ اندھا تھا۔ سیاح نے سائل کو دیکھ کر اپنی بیوی سے کہا: اے خاتون، اس کو زیادہ صدقہ دے دو کیوں کہ کسی آدمی کی اس سے بڑی کوئی بدبختی نہیں ہو سکتی کہ وہ غرناطہ کے قصر کے سامنے کھڑا ہو مگر وہ اس کو دیکھنے کے لیے اندھا ہو۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس سے بھی زیادہ بدقسمت وہ آنکھوں والا انسان ہے جو فطرت کی حسین تر دنیا کے سامنے ہو مگر وہ اس میں خدا کا جلوہ دیکھنے سے محروم رہے۔

قصر الحمراء کے ایک کمرہ کے سامنے ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں واشنگٹن ارونگ نے قیام کیا تھا۔

ارونگ (Washington Irving) ایک امریکی ادیب تھا۔ ایک امریکی ادارہ نے ۱۸۲۶ء میں اس کو اسپین بھیجا۔ یہاں آکر جب اس نے غرناطہ کو دیکھا تو اس کی محبوب صورتی پر وہ اتنا گرویدہ ہوا کہ وہ یہیں مقیم ہو گیا اور غرناطہ اور الحمراء کے بارہ میں اپنی دو کتابیں لکھیں:

Irving had become absorbed in the legends of the Moorish past, and wrote his Conquest of Granada and Tales of the Alhambra. (V/435)

واشنگٹن ارونگ ۱۷۸۳ء میں نیویارک میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۵۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

الحمراء قلعہ اور محل دونوں تھا جس طرح دہلی کا لال قلعہ دونوں ہے۔ یہ اندلس کے مسلم حکمرانوں نے غرناطہ میں بنایا تھا۔ یہ قصر بنیادی طور پر ۱۲۳۸ اور ۱۳۵۸ کے درمیان بنایا گیا۔ ۱۴۹۲ء میں جب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت آخری طور پر ختم ہوئی تو یہ قصر بھی زد میں آیا۔ اس کے بعد کئی بار اس عمارت کو نقصان پہنچا۔ تاہم ۱۸۲۸ میں اس کی مرمت کر کے اس کو دوبارہ دل کش بنانے کی کوشش کی گئی۔

موجودہ الحمراء میں کچھ حصہ مسلمانوں کا بنایا ہوا ہے اور کچھ حصہ بعد کے عیسائی حکمرانوں کا۔
الحمراء کے ایک خاص حصہ میں سفید سنگ مرمر سے بنے ہوئے بارہ شیر ہیں۔ یہ گویا طاقت اور ہمت کی علامت ہیں۔ قصر کے اس حصہ کے مختلف نام ہیں ——— فناء السباع ، دیوان الاسد، مأسدة ، بیت الاسود۔

الحمراء صرف ایک محل نہیں، وہ نہایت وسیع باغات کے درمیان بیرون شہر گویا ایک شاہی اقامت گاہ تھی۔ اس کی تعمیر پر بہت زیادہ دولت خرچ کی گئی۔ تاہم اس کا تعمیری سامان زیادہ مضبوط نہ تھا۔ اپنے عظیم حسن کے باوجود وہ غیر مستحکم تعمیراتی سامان کے ذریعہ بنی ہوئی ایک عمارت کہی جائے گی۔
الحمراء کے محلات اس وقت بنائے گئے جب کہ یہاں کی مسلم حکومت سمٹ کر صرف غرناطہ تک محدود ہوگئی تھی۔ اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ لال قلعہ کے حکمراں کی طرح وہ باہر سے مضبوط پتھر بڑی مقدار میں منگا سکے۔ وہ زیادہ مستحکم عمارت کھڑی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے شاید اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے زیادہ خوب صورت عمارتیں کھڑی کر دیں۔
قصر الحمراء ۲۲۰۰ مربع میٹر کے رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے ہر حصہ میں آیتیں، حدیثیں، دعائیں، اشعار اور دوسری عربی عبارتیں لکھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ خاص طور پر بنو الاحمر کا خاندانی شعار وَلاغالبَ اِلا اللّٰہ اس کے ہر حصہ میں نقش کیا ہوا نظر آتا ہے۔
آخری دور کی سلطنت غرناطہ (۱۴۹۲ - ۱۲۳۲ء) کا بانی محمد بن یوسف الاحمر تھا۔ وہ ارجونہ کا قلعدار تھا۔ اس نے بغاوت کر کے غرناطہ پر قبضہ کر لیا، اور اپنا لقب الغالب باللّٰہ اختیار کیا۔ اسی سلطنت کے زمانہ میں غرناطہ کا مشہور قصر الحمراء تعمیر ہوا۔ اس خاندان (بنو احمر) کے حکمرانوں نے اسی لفظ کو اپنا شعار بنالیا۔ وہ عمارتوں وغیرہ پر کثرت سے وَلاغالبَ اِلا اللّٰہ لکھا کرتے تھے۔
اقبال ۱۹۳۳ میں اندلس گئے تھے۔ واپسی کے بعد انھوں نے مختلف مواقع پر اپنے سفر کے تاثرات بتائے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا : میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا۔ مگر (انسانوں سے خالی اس قصر میں) جدھر نظر اٹھتی، دیوار پر ھو الغالب لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے۔ کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو۔ (اقبال یورپ میں، از سعید اختر درانی)

یہ احساس بڑا عجیب ہے۔ میرا اپنا حال تو یہ ہے کہ مجھے انسانوں کی بھیڑ میں بھی خدا ہی دکھائی دیتا ہے اور وہاں بھی میرے اندر ربانی جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر اقبال خدا کے ذکر کے ہجوم میں کسی انسان کو تلاش کر رہے ہیں تاکہ اس سے وہ ہم کلام ہو سکیں۔

پچھلے چودہ سو سال میں مسلم دنیا میں جو اہل دماغ پیدا ہوئے اس کی فہرست میں ابن خلدون کا نام ممتاز طور پر شامل ہے۔ اس کا اسلوب تحریر اور اس کا طرز فکر دونوں انتہائی حد تک اوریجنل تھا۔ وہ ان چند مسلم اہل علم میں سے ہے جنھوں نے اپنے افکار کی آفاقیت کی بنا پر عالمی سطح پر اپنا اعتراف حاصل کیا، اگرچہ یہ عالمی اعتراف اس کو پانچ سو سال بعد مل سکا۔

ابن خلدون تیونس میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۰۶ء میں قاہرہ میں اس کی وفات ہوئی۔ تاہم اس کی زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ اندلس میں گزرا۔ اور اگر اس کے حاسدین اور مخالفین نے اس کو اندلس چھوڑنے پر مجبور نہ کیا ہوتا تو اس کی قبر شاید قاہرہ کے بجائے قرطبہ یا غرناطہ میں ہوتی۔

پروفیسر چارلس اساوی (Charles Issawi) نے لکھا ہے کہ ——— ۱۸۶۰ء میں مقدمہ کا مکمل ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوا، اس کے بعد ہی ایسا ہوا کہ ابن خلدون کو اپنی عظیم حیثیت کے مطابق عالمی مقام ملے :

> But it was only after the 1860s, when a complete French translation of *The Muqaddima* appeared, that Ibn Khaldun found the worldwide audience his incomparable genius deserved. (9/149)

ایک مستشرق نے اپنا ایک مقالہ دکھایا۔ اس کا ایک حصہ ابن خلدون کے بارہ میں تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ عباسی خلافت کے بعد اسلامی حکومت کا آرتھوڈاکس پولیٹکل نظریہ ایک بحران کا شکار ہو گیا۔ ابن خلدون نے سیاسی ڈھانچہ کے مقابلہ میں سماجی اور طبیعیاتی طاقتوں کی اہمیت پر زور دیا۔ اس نے عباسی خلافت کے تحت کلاسیکل سیاسی اتحاد کے تصور کو رد کر دیا۔ البتہ اس نے تمام مسلمانوں کے روحانی اتحاد کا اقرار کیا :

> **He rejected the classical political unity under the Abbasid Caliph but admitted the spiritual unity of all Muslims.**

مذکورہ فرانسیسی مستشرق نے پوچھا کہ ابن خلدون کے اس نظریہ کے بارہ میں آپ کی رائے کیا

ہے۔ میں نے کہا کہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کو صحیح مانتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح یورپی نوآبادیات کے زمانہ میں سفید فام کی ذمہ داری (White man's burden) کا نظریہ اس کی تبریر کے لیے گھڑا گیا، اسی طرح عباسی دور میں عالمی خلافت کا نظریہ اس کی مذہبی حمایت کے لیے وضع کیا گیا۔ قرآن وسنت میں وہ سراسر اجنبی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق، روحانی ترقی اور روحانی اتحاد مسلمانوں کی مستقل ذمہ داری ہے اور سیاسی اقتدار صرف ایک عارضی خدائی انعام۔

میں نے کہا کہ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آج مسلم دنیا قتل وخوں ریزی کا کارخانہ بنی ہوئی ہے۔ مصر اور الجزائر سے لے کر بوسنیا اور کشمیر تک اسی بے بنیاد سیاسی نظریہ کے تحت بے فائدہ جنگ جوئی کا عمل جاری ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ہر جگہ مذہبی، روحانی اور دعوتی مواقع حاصل ہیں مگر وہ ان کو استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ وہ بس سیاست کی چٹان پر اپنا سر پٹک رہے ہیں، کیونکہ اپنی غلط سوچ کی بنا پر انھیں اس کے سوا کوئی اور کام دکھائی نہیں دیتا۔

میری پسندیدہ تفسیروں میں سے ایک خاص تفسیر الجامع لاحکام القرآن ہے۔ یہ تفسیر اسپین (قرطبہ) میں لکھی گئی۔ اس کے مولف ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری ہیں۔ وہ قرطبہ کے ایک بڑے عالم تھے۔ اسی لیے وہ القرطبی کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے ۶۷۱ ھ میں وفات پائی۔

القرطبی کا فقہی مسلک مالکی تھا۔ مگر اپنی بے تعصبی کی بنا پر انھوں نے کئی جگہ امام مالک کے مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مالک نماز میں بچہ کی امامت کو ناجائز بتاتے ہیں۔ مگر القرطبی اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بچہ کا نماز میں امام بننا جائز ہے جب کہ وہ قرآن کی قرأت کرنا جانتا ہو (امامة الصغير جائزة اذا كان قارئا) تفسیر القرطبی ۱/۳۵۳

اسی طرح امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ رمضان میں روزہ رکھنے والا ایک شخص اگر بھول کر کھالے تو اس کو قضا کا روزہ رکھنا ہوگا۔ مگر القرطبی اس رائے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام مالک کے سوا دوسرے فقہاء کے نزدیک بھول کر کھانے والے کے اوپر روزہ کی قضا نہیں ہے، اور میں کہتا ہوں کہ یہی مسلک صحیح ہے (قلت وهو الصحيح) تفسیر القرطبی ۲/۳۲۲

موجودہ زمانہ میں علمی ذوق اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آدمی یا تو کلی موافق ہو سکتا ہے یا کلی مخالف۔ اگر کوئی شخص، مثال کے طور پر، ایک جماعت کو مفید جماعت بتائے مگر اس کے

بعض طریقوں سے وہ اختلاف کرے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص مصلحت پرست ہے۔ اصل میں تو وہ اس جماعت کا مخالف ہے، مگر مفاد کی بنا پر وہ اس کی تعریف کر رہا ہے۔

مسلم اسپین میں پیدا ہونے والی علمی شخصیتوں میں سے ایک ممتاز شخصیت ابوالقاسم الزہراوی (Abulcasis) کی ہے۔ اس کی کتاب التصریف لاطینی زبان میں ۱۴۹۷ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد یورپ کی تمام اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب تقریباً ۵۰۰ سال تک اہل یورپ کے لیے طب اور سرجری میں مرجع بنی رہی۔ ہٹی کے الفاظ میں، اس نے یورپ میں جراحی کی بنیاد قائم کرنے میں مدد دی:

It helped lay the foundations of surgery in Europe. (p. 577)

زہراوی سے پہلے سرجری (جراحی) کا کام پچھنے لگانے والے کیا کرتے تھے وہ اصول طب اور علم تشریح الاعضاء کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض اپنے خاندانی رواج کے تحت جراحی کا کام کرتے تھے اور اکثر مریضوں کو سخت نقصان پہنچاتے تھے۔ زہراوی نے جراحی (آپریشن) کو علم تشریح الاعضاء کی بنیاد پر قائم کیا، اس نے انسانی جسم کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے اصول مقرر کیے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ پہلے تم انسانی جسم کا تشریحی مطالعہ کرو اور یہ جانو کہ وریدیں اور شریانیں اور اعصاب کہاں واقع ہیں، اس کے بعد جراحی کا کام کرو۔ اس نے مشاہدہ اور تجربہ کو جراحی کا لازمی حصہ قرار دیا۔ زہراوی نے فن جراحت میں بہت سی نئی نئی باتیں دریافت کیں۔

مسلم اسپین کی تاریخ میں ہر قسم کی سبق آموز مثالیں موجود ہیں۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں میں سے ایک نامور حکمراں سلطان عبدالرحمٰن الثالث ہے۔ وہ ۳۰۰ھ میں قرطبہ کے تخت پر بیٹھا۔ اور پچاس سال تک حکومت کی۔ اس کا زمانہ سلطنت ہر اعتبار سے نہایت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ یہی سلطان ہے جس نے مشہور قصر الزہراء تعمیر کرایا تھا جو اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ عالی شان محل سمجھا جاتا تھا۔ مگر زمانہ نے اس محل کو اس طرح مٹایا کہ آج آپ قرطبہ جائیں تو وہاں آپ کو اس کے صرف کھنڈر دکھائی دیں گے۔

قصر الزہراء میں آرام و عیش اور شان و شوکت کی تمام ممکن چیزیں اکٹھا کی گئی تھیں۔ ۳۵۰ھ میں اسی قصر شاہی میں عبدالرحمٰن الثالث کا انتقال ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں

ایک کاغذ ملا۔ اس میں سلطان نے اپنے ان دنوں کا حال خود اپنے قلم سے لکھا تھا جو غم سے خالی تھے۔ مگر پچاس سالہ دورِ حکومت میں ایسے بے فکری کے ایام کی تعداد صرف چودہ دن تھی۔

سلطان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا الحکم بن عبدالرحمٰن قرطبہ کے تخت پر بیٹھا۔ قصر الزہراء جو اس کے باپ نے بے پناہ محنت اور لاتعداد دولت کے ذریعہ بنایا تھا اس کو وراثت میں مل گیا۔ اس نے اپنا شاہی لقب المستنصر باللہ اختیار کیا۔

الحکم نے پندرہ سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ مگر اس کے بھی آخری ایام مایوسی کے ایام تھے۔ کیوں کہ آخری زمانہ میں وہ مفلوج ہوگیا اور فالج کی حالت ہی میں ۳۶۶ھ میں قرطبہ میں اس کا انتقال ہوگیا (توفی بقرطبۃ مفلوجاً)

قصر الزہراء نہایت خوب صورت ہونے کے ساتھ بہت بڑا تھا۔ اسی لیے اس کو مدینۃ الزہراء کہا جاتا تھا۔ اس میں تفریح اور عیش کے تمام اسباب اکٹھا کیے گئے تھے۔ وہ چالیس سال میں بن کر تیار ہوا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس کے جلد ہی بعد زوال شروع ہوا، اور تعمیر کے بعد چالیس سال سے بھی کم مدت میں وہ کھنڈر ہو کر رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی منذر نے اس کی بابت یہ شعر کہے تھے کہ اے زہراء کو بنانے والے جو اپنے وقت کو اس میں غرق کیے ہوئے ہے، کیا تم ٹھہر کر غور نہیں کرتے۔ وہ کتنا زیادہ خوب صورت ہے، بشرطیکہ اس کی رونق پژمردہ نہ ہوتی :

یا بانی الزھراء مستغرقا　　اوقاتہ فیھا اماتمھل

للہ ما احسنھا رونقا　　لو لم تکن زھرتھا تذبل

اندلس میں عربوں نے جو سیاسی نظام قائم کیا وہ اس طرح تھا کہ ایک ان کا مرکزی سلطان یا خلیفہ ہوتا تھا اور مختلف علاقائی حصوں میں ماتحت امیر ہوا کرتے تھے جن کو آج کل کی زبان میں گورنر کہا جاسکتا ہے۔ ابتداءً کئی سو سال تک عربوں میں سے امراء مقرر کیے جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ خیال تھا کہ وہ ہم نسل ہونے کی بنا پر زیادہ قابلِ اعتماد ثابت ہوں گے۔

مگر اس دنیا میں ہمیشہ ہر دوسری چیز پر انٹرسٹ فائق ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاسی انٹرسٹ نے ان امراء کے اندر بغاوت کا رجحان پیدا کیا۔ ہر عرب اپنے علاقہ کو مرکز سے الگ کر کے خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں مرکزی سلطان اور امراء کے درمیان لڑائیاں جاری ہوگئیں۔

عبدالرحمٰن الثالث نے اس پالیسی کو بدلا۔ اس نے عرب امرا کا زور توڑنے کے لیے بربر قبائل میں سے امیر اور وزیر مقرر کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں یہ لوگ بہت وفادار رہے۔ کیوں کہ امیر اور وزیر کے عہدے ان کی توقعات سے بہت زیادہ تھے۔ مگر دھیرے دھیرے جب وہ دولت اور اقتدار سے آشنا ہوگئے تو ان کے ذہن میں بھی بغاوت کے خیالات پرورش پانے لگے۔ عبدالرحمٰن الثالث کی زندگی تک تو یہ لوگ دبے رہے۔ مگر اس کی موت کے بعد وہ سب کے سب سرکش بن کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے راجدھانی قرطبہ پر حملے کئے۔ قصر الزہرا کو تباہ کر ڈالا۔

ہر شہر اور ہر علاقہ کا امیر مرکز کا باغی ہوگیا۔ حتیٰ کہ اندلس میں تقریباً دو درجن چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ جن کو الگ الگ فتح کرنا عیسائیوں کے لیے آسان ہوگیا۔

سرکشی اور بغاوت کا تعلق عرب اور غیر عرب سے نہیں ہے، اس کا تمام تر تعلق انٹرسٹ سے ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے انٹرسٹ کی طرف دوڑتا ہے۔ اسی سے انتشار اور بغاوت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے روکنے والی چیز صرف تقویٰ ہے، اور ایسا تقویٰ کسی بہت خوش نصیب آدمی ہی کو ملتا ہے جو انٹرسٹ کے خلاف اس کے لیے چیک بن جائے۔

روایت کو توڑنے سے کتنی بڑی خرابی آتی ہے، اس کی بہت سی مثالیں اسپین کی مسلم تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً سلطنت غرناطہ کا تیسرا حکمراں محمد مخلوع تھا۔ اس کو اس کے بھائی نصر بن محمد نے ۷۱۰ھ میں قتل کرادیا تاکہ اس کا کوئی سیاسی رقیب باقی نہ رہے۔ مگر یہ جان کے احترام کی روایت کو توڑنا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد حکمرانوں کے قتل کا لمبا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس کے بعد سلطان ابوالولید کو اس کے بھتیجے نے ۷۲۵ھ میں قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد سلطان محمد غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس کو بھی اس کے رشتہ داروں نے ۷۳۳ھ میں قتل کردیا۔ اس کے بعد سلطان یوسف کو حاکم بنایا گیا۔ مگر وہ بھی ۷۵۵ھ میں نیزہ مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر سلطان اسماعیل تخت نشین ہوا۔ مگر ۷۶۱ھ میں خود اس کے بھائی نے اس کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ

کسی سماج میں یہ روایت قائم کرنا ہو کہ انسانی جان کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اور اس کو کسی حال میں قتل نہیں کرنا چاہیے، تو یہ روایت ایک لمبی تاریخ کے بعد بنے گی۔ مگر اس روایت کو توڑنے کے لیے کسی مدت کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی روایت ایک بار توڑ دی جائے تو پھر اس کو از سر نو

قائم کرنا انتہائی دشوار ہوجاتا ہے۔ روایت شکنی کے اسی خطرہ سے حدیث میں اس طرح آگاہ کیا گیا تھا کہ :

اذا وُضع السیفُ فی امتی لم یُرفع عنها الی یوم القیامة (ابوداؤد، کتاب الفتن)

سقوط اندلس پر بہت سے شاعروں نے مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں زیادہ تر فریاد و ماتم کا انداز ہے۔ تاہم مجھے ابو علی الحسن بن رشیق کے دو شعر بہت پسند ہیں۔ اس نے کہا کہ اندلس کی سرزمین میں جو چیز مجھے بے لطف کرتی ہے ان میں سے معتمد (جس پر اعتماد کیا جائے) اور معتضد (نہایت مضبوط) جیسے القاب ہیں۔ یہ شاہانہ القاب اسی طرح غیر واقعی ہیں جیسے کوئی بلی نتھنے پھلا کر شیر کی صورت کی نقل کرنے لگے :

مِمّا یُزَهِّدُنی فی ارضِ اَنْدَلُسٍ اسماءُ مُعْتَمَدٍ فیها وَمُعتَضِدِ

القابُ مملکةٍ فی غیرِ موضِعِها کَالْهِرِّ یَحکی انتفاخاً صورةَ الاسَدِ

یہ دونوں شعر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں خلافت کی بحث کے تحت نقل کیے ہیں (صفحہ ۲۲۹)

ایک حاکم کو جب سادہ طور پر امیر المومنین کہا جائے تو اس کے نہ رہنے سے لوگوں میں صرف یہ احساس پیدا ہوگا کہ ہمارا سیاسی حاکم نہ رہا۔ لیکن اگر اس کو جہاں پناہ اور محافظ اسلام جیسے القاب سے یاد کیا جانے لگے تو اس کے ہٹنے کے بعد لوگوں کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ آخری طور پر لٹ گئے۔ اب ان کے پاس قیام حیات کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔

مسلم اسپین صرف تمدنی ترقی ہی کی مثال نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ وہ رواداری کی بھی نہایت اعلیٰ مثال تھا۔ عرب اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت فیاض اور روادار واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ وہاں کے کام کی نوعیت یہ تھی کہ مسلم اہل علم کے ساتھ یہودی اور عیسائی اہل علم اور فن کار بھی مساوی طور پر شریک رہتے تھے۔ اس طرح اشتراک عمل کے ماحول نے باہمی رواداری کا ماحول بھی اپنے آپ پیدا کر دیا تھا۔

فرانسیسی مستشرق رینان (Renan) نے ابن رشد پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سائنس اور لٹریچر کے ذوق نے دسویں صدی میں دنیا کے اس خصوصی گوشہ میں رواداری کا ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کا نمونہ موجودہ زمانہ میں مشکل سے کہیں مل سکتا ہے۔ مسیحی، یہودی اور مسلمان ایک ہی زبان (عربی) بولتے تھے۔ ایک ہی گیت گاتے تھے۔ ایک ہی طرح ادبی اور علمی مطالعہ میں حصہ لیتے تھے۔ وہ تمام

رکاوٹیں جو لوگوں کو الگ الگ کرنے والی ہیں، وہ سب وہاں ختم کر دی گئی تھیں۔ تمام کے تمام لوگ ایک مشترک تہذیب کے لیے مل کر کام کرتے تھے :

The taste for science and literature had, by the tenth century, established, in this privileged corner of the world, a toleration of which modern times hardly offer us an example.

اب سوال یہ ہے کہ جب مسلم اسپین میں اتنا زیادہ رواداری کا ماحول تھا، پھر کیوں ایسا ہوا کہ وہاں کے مسیحی باشندے مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور ان کو وحشیانہ طور پر اپنے ملک سے نکالنا شروع کر دیا۔ اس کا سبب جو اس سفر کے بعد میرے علم میں آیا وہ یہاں کے مذہبی طبقہ کا جنون تھا۔

اصل یہ ہے کہ مسلم اسپین کے روادارانہ ماحول کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسپین کے مسیحی باشندے خود بخود کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ بہت سے لوگ جنھوں نے اپنا مذہب نہیں بدلا، انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب اختیار کر لی۔ چنانچہ ان کو مستعرب (Mozarab) کہا جانے لگا۔

مسیحی چرچ کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ مسلمانوں کے ذریعہ اسپین میں علوم کے دروازے کھلنا، زراعت، صنعت، تعمیرات اور دوسرے شعبوں میں غیر معمولی ترقی، سماجی زندگی میں انصاف اور رواداری کا آنا، اس قسم کی تمام مثبت چیزیں ان کے لیے غیر اہم بن گئیں۔ ان کو صرف یہ یاد رہا کہ ان کے ہم مذہب تیزی سے غیر مسیحی تہذیب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے اسپین کے مسیحیوں کو مسلمانوں سے روکنا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں اور مسیحیوں میں دوری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر میں انھوں نے وہ مجنونانہ تدبیر اختیار کی جس کو عام طور پر رضاکارانہ شہادت (voluntary martyrdom) کہا جاتا ہے (ہسٹری آف دی عربس، اڈیشن ۱۹۷۰، صفحہ ۵۱۶)

انھوں نے مسلمانوں کی نفسیات کا مطالعہ کر کے یہ نکالا کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے خلاف باتوں کو سن کر بگڑ جاتے ہیں اور ایسے آدمی کو قتل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سڑکوں پر نکل کر علی الاعلان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی اور بدگوئی شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان مشتعل ہو کر انھیں قتل کر ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں کو بدنام کر کے مسیحیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متنفر کر دیا جائے۔

اس انوکھی تدبیر کا چیمپین اسپین کا بشپ ایولوجیس (Eulogius) تھا۔ اس نے قرطبہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بار بار علی الاعلان سب وشتم کیا۔ اس کے بعد علماء کے فیصلہ کے مطابق، سلطان عبدالرحمٰن دوم نے ۱۱ مارچ ۸۵۹ء کو اسے برسر عام قتل کرادیا۔

اس طرح ایک کے بعد ایک مسیحی چرچ کے افراد عوامی مواقع پر آکر شتم رسول کا فعل کرتے رہے اور اس کے نتیجہ میں مسلم تلوار سے قتل کیے جاتے رہے۔ یہ واقعہ نویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں پیش آیا جو اس وقت مسلم اسپین کا مرکز تھا۔ یہ عقوبت جس کے اسباب خود مسیحی لوگوں نے پیدا کیے تھے، آخر کار ۵۳ مسیحیوں کے قتل تک جا پہنچی:

this persecution, provoked by the Christians themselves, took a toll of 53 victims. (17/415)

اس قسم کے مجنونانہ واقعات نے اسپین کے مسیحیوں، خاص طور پر وہاں کے مذہبی طبقہ کے دل میں مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت پیدا کردی۔ یہاں تک کہ چرچ کے لیے آسان ہوگیا کہ وہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج عام کا فتویٰ جاری کرسکے۔

حکیم احمد شجاع صاحب کا خیال تھا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں علوم عصریہ کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ اقبال کو خط لکھا۔ اقبال نے انھیں جواب دیا کہ ان مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ اگر یہ ملّا نہ رہے تو ہندستانی مسلمانوں کا وہی حال ہوگا جو اندلس میں آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود وہاں کے مسلمانوں کا ہوا (الفرقان، لکھنؤ، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴، صفحہ ۲۳)

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے یہ بالکل الٹی بات کہی۔ اندلس جیسا حال کسی مسلم قوم کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے علماء اجتہاد کی صلاحیت سے محروم ہوجائیں۔ اور اجتہاد کی صلاحیت سے محرومی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ وقت کے تقاضوں سے بے خبر ہوگئے ہوں۔

اندلس کے اصحاب چرچ نے جب "رضاکارانہ شہادت" کا فتنہ کھڑا کیا، اس وقت وہاں کے علماء اگر اجتہادی صلاحیت کے حامل ہوتے اور مسیحی دنیا کے حالات سے پوری طرح باخبر ہوتے تو وہ فتویٰ دیتے کہ یہ چرچ کی ایک نہایت گہری سازش ہے۔ اگر ہم ان کو قتل کریں تو ہم خود ان کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس لیے ہم کو انھیں قتل نہیں کرنا ہے بلکہ حکمت کے،

ساتھ ان کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اور پھر وہ چرچ کی سازش کا توڑ اس طرح کرتے کہ اس کے جواب میں وہ تعارف اسلام کی پر امن مہم زور و شور کے ساتھ چلا دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسیحی عوام چرچ سے متنفر ہو کر تعلیمات محمدی کی طرف مائل ہو جاتے اور اتنی تیزی سے اسلام قبول کرتے کہ چرچ کی سازش برعکس طور پر اندلس میں مسلمانوں کی مزید تقویت اور استحکام کا سبب بن جاتی۔

علماء کی حکیمانہ تدبیر چرچ کے پادریوں کو عوام کی نظر میں دیوانہ کا درجہ دے دیتی۔ مگر ان کی ناقص رہنمائی نے ان پادریوں کو اندلس کے مسیحیوں کی نظر میں شہید اور ہیرو کا مقام عطا کر دیا۔ اور پھر وہ کچھ پیش آیا جو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

ایک یورپی اسکالر (مستشرق) نے اسپین میں مسلم سلطنت کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان میں داخل ہوئے تو ابتدائی مرحلہ میں طارق اور نصیر نے بغداد کی مدد سے یہاں کی مسیحی فوجوں پر فتح حاصل کی تھی۔ مگر آخری مرحلہ میں مسیحی قوتوں کے مقابلہ میں وہ اپنے مرکز کی مدد سے محروم رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اندلس میں قائم ہونے والی مسلم خلافت بغداد کی خلافت کی حریف بن گئی تھی۔ اس نے کبھی بھی بغداد کی مرکزی خلافت سے مصالحت کی کوشش نہیں کی:

Rival caliphate of Cordova never reconciled itself to the central caliphate of Baghdad.

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ عبد الرحمٰن بن معاویہ اموی جب عباسیوں کی دار و گیر سے بھاگ کر اندلس پہنچا تو اس وقت کے امیران اندلس خطبۂ جمعہ میں بغداد کے خلیفہ کا نام لیتے تھے۔ عبد الرحمٰن نے ابتداءً ایسا ہی کیا۔ مگر بعد کو اس نے خطبہ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کا نام لینا بند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا اس نے خاندان بنو امیہ کے ایک شخص عبد الملک بن نے اندلس میں اپنی حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں عبد الرحمٰن کی مدد کی تھی:

و هذا عبد الملك هوالذي ألزم	عبد الملک ہی نے عبد الرحمٰن کو مجبور کیا کہ وہ خلیفہ
عبد الرحمٰن بقطع خطبة المنصور	منصور کا نام خطبہ میں لینا بند کر دے۔ عبد الملک
وقال له ، تقطعها و إلا قتلت	نے کہا کہ تم اس کو بند کرو ورنہ میں اپنے آپ کو
نفسي. و كان قد خطب له	ہلاک کر لوں گا۔ چنانچہ عبد الرحمٰن نے اس کا خطبہ

عشرہ اشھر، فقطعھا۔ پڑھنا بند کر دیا حالاں کہ دس مہینہ تک اس نے
(الکامل فی التاریخ لابن اثیر ۱۰/۶) خلیفہ بغداد ہی کا خطبہ پڑھا تھا۔

خلیفہ المنصور کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے اندلس پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد سے آخر تک بغداد کی خلافت اور اندلس کی مسلم ریاست کے درمیان معاونت کے بجائے رقابت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ یہ رقابت صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اندلس کی مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

دکتور حسین مونس کا سفرنامہ رحلۃ الاندلس، حدیث الفردوس الموعود کے نام سے ۱۹۶۳ میں جدہ سے چھپا تھا۔ وہ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ادبی اور جذباتی انداز میں ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: لان موضوعہ یمس عاطفۃ المسلم و وجدان العربی (صفحہ ۹)

مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل اسپین ہم سے ایک بالشت زمین بھی سخت معرکہ اور دو طرفہ اموات کے بغیر حاصل نہیں کر سکے۔ پھر کیسے یہ کہا جاتا ہے کہ عرب اس زمانہ میں کمزور ہو گئے تھے۔ ان پر عیش پسندی چھا گئی تھی۔ پھر جواب دیتے ہیں کہ جو ہوا وہ یہ تھا کہ قسمت نے اندلس میں ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ڈھائی صدیوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں اٹھا جو قیادت اور سیاست اور تدبیر کا جامع ہو (الذی حدث ھو ان الحظ خاننا فی الاندلس۔ خلال ھذین القرنین ونصف القرن لم یظھر رجل واحد جامع لصفات الزعامۃ والقیادۃ والسیاسۃ والتدبیر) صفحہ ۱۶۶

اس جواب کے بعد دوبارہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری ڈھائی سو سال میں کیوں قائدانہ اوصاف کے لوگ پیدا نہیں ہوئے، جب کہ اس سے پہلے بار بار ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ کا تعلق دور زوال سے تھا نہ کہ افراد کی عدم پیدائش سے۔ یہ زوال ہر سلطنت اور ہر قوم پر آتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں۔

لکھنؤ کے عربی جریدہ الرائد (۱۰-۲۶ رمضان ۱۴۱۲ھ) میں الاستاذ انور الجندی کا ایک مضمون نقل کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا: ھذا واجبنا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم مسلمانوں کی آج شدید ترین ضرورت ہے کہ ہم اندلس کے المیہ کا مطالعہ کریں، کیوں کہ ہم پچھلے چالیس سال سے پھر اندلس کے

مشابہ بحران میں مبتلا ہو گئے ہیں (ونحن المسلمين اليوم فى اشد الحاجة الى دراسة مأساة الاندلس لانفنا منذ اربعين سنة قد وقعنا فى ازمة قريبة الشبه بها)

اس کے بعد مضمون میں کہا گیا تھا کہ آج دوبارہ ایسے حالات درپیش ہیں جو ہم کو اندلس جیسے المیہ میں مبتلا کر دیں۔ کیوں کہ عالمی صہیونیت ہم کو وہیں دھکیل دینے کے لیے سرگرم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو مقدس جہاد کے لیے تیار کریں (لابد ان يقف المسلمون موقف الاستعداد و ان يدربوا الاجيال على الجهاد المقدس)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو جہاد و قتال کا مسئلہ بتانا سراسر نادانی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فقدانِ جہاد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فقدانِ تقویٰ کا مسئلہ ہے۔ قرآن میں بار بار بتایا گیا ہے کہ خدا متقیوں کے ساتھ ہے (التوبہ ۳۶) اگر تمہارے اندر تقویٰ ہو تو مخالفین کی سازشیں تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا ئیں گی (آل عمران ۱۲۰) گویا کہ تقویٰ دفاع کے لیے ایک موثر مددگار ہے۔

تقویٰ کا دفاعی قوت ہونا کوئی پراسرار بات نہیں، یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقویٰ آدمی کے اندر یہ صفت پیدا کرتا ہے کہ کسی کے ساتھ دشمنی ہو تب بھی وہ اس کے بارہ میں منصفانہ انداز میں سوچے، تب بھی وہ انصاف ہی کی بات کہے (المائدہ ۸) حریف کے بارہ میں درست رائے قائم کرنا ہی اس کے مقابلہ میں درست اور کارگر منصوبہ بندی کی واحد ضمانت ہے۔ اس طرح تقویٰ کا تعلق براہ راست طور پر دفاعی تدابیر سے جڑ جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں انڈیا کے ہندوؤں کی مثال لیجئے۔ ذاتی طور پر میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف نہیں سمجھتا بلکہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا ہم قوم سمجھتا ہوں۔ تاہم بہت سے مسلم رہنما اور مسلم دانش ور ہندوؤں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف دفاعی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر ان کی کوششیں نہ صرف ناکام ہیں بلکہ الٹا نتیجہ پیدا کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقدانِ تقویٰ کی وجہ سے وہ ہندو مسئلہ کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم پریس تقریباً بغیر استثناء ہندوؤں کو ظالم اور متعصب کے روپ میں دکھانے میں مصروف ہے۔ مثال کے طور پر مکہ کے ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی کے شمارہ ۱۷ رجب ۱۴۱۵ھ (۱۹ دسمبر ۱۹۹۴) میں ہندستانی مسلمانوں کی فراہم کردہ ایک رپورٹ چھپی ہے۔

اس کا عنوان ہے کہ انڈیا کے ہندوؤں کا یہ منصوبہ ہے کہ وہ دہلی کی مسجدوں کو کھیل کود کے میدان میں تبدیل کر دیں (مخطط هندوسی لتحويل مساجد دلهي إلى ملاعب) اس رپورٹ میں دوسری مذموم کوششوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندستان کی ہندو حکومت یہ ارادہ رکھتی ہے کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر روک لگانے کے لیے مردوں کو جبری طور پر بانجھ بنا دے (ان حكومة الهند-الهندوكية - تعمد من اجل الحد من زيادة عدد المسلمين فی الهند الى التعقيم الاجباری للرجال)

یہ بات سراسر لغو اور بے بنیاد ہے، مگر آج تمام مسلم دانشور اور رہنما ہندوؤں کے بارہ میں اسی قسم کے غیر واقعی اندازہ کا شکار ہیں۔ اور جو لوگ اپنے "حریف" کے بارہ میں غیر واقعی اندازہ کا شکار ہو جائیں وہ ان کے مقابلہ میں کامیاب منصوبہ بھی کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کانفرنس میں مسلمان بھی قابل لحاظ تعداد میں تھے۔ انڈیا اور پاکستان سے ایک ایک آدمی تھے۔ اس کے علاوہ مراکو، تیونس، مصر، سوڈان، سعودی عرب، فلسطین، ترکی، وغیرہ سے کافی لوگ آئے تھے۔ بہت سے پہلوؤں سے ان میں کافی فرق تھا۔ مگر ایک بات میں تقریباً سب کی سوچ ایک تھی۔ ہر ایک کے نزدیک موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس مظلومیت کا کیس تھا۔ ہر ایک کے نزدیک وہ غیر مسلم قوموں کی سازش اور زیادتی کا شکار ہو رہے تھے۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ کیوں کر اس انداز میں سوچتے ہیں۔ یہ تو خود دین اسلام کی تردید ہے۔ خدا کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اس دین کی اور اس کے حاملوں کی حفاظت فرمائے گا۔ پھر یہ تو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ ہم یہ خیال کریں کہ خدا نے کسی صلیبی یا صیہونی یا استعماری طاقت کو اس بات کا کھلا موقع دے دیا ہے کہ وہ ہم کو تباہ کر ڈالیں۔

آپ لوگوں کو اس کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ کچھ متعصبین نے اندلس میں مسلمانوں کا خاتمہ کرنا چاہا تھا مگر وہ ان کا خاتمہ نہ کر سکے۔ اسلام دوبارہ یہاں نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا۔ اسی طرح ساری دنیا میں مخالفین کی سازشیں ناکام ہو کر رہ جائیں گی۔

میں نے کہا کہ اندلس کے تجربہ کے ذریعہ خدا ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ اے پیروان محمد، تم لوگ عزم اور ہمت کے ساتھ توحید کے مشن کو دنیا میں پھیلاؤ۔ میں لوگوں کے مقابلہ میں

تمہاری یقینی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں (واللہ یعصمک من الناس)

غرناطہ اسلام کی توسیع کی تاریخ میں ایک علامتی لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے اپنے لکچر (۸ مئی ۱۸۴۰) میں پیغمبر اسلام کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ گویا ایک چنگاری اوپر سے گری، ایک ایسے ملک میں جو بظاہر تاریک اور ناقابل لحاظ تھا، مگر دیکھو، یہ ریت اس طرح جل اٹھی کہ دہلی سے غرناطہ تک سب روشن ہوگیا :

> It is not as if a spark had fallen, one spark, on a world of what seemed black unnoticeable sand; but lo, the sand proves explosive powder, blazes heaven-high from Delhi to Grenada. (p. 71)

اس "روشنی" کو جو لوگ سیاسی اقتدار کے معنی میں لیتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ روشنی ایک مدت تک جلنے کے بعد بجھ گئی اور صدیوں سے وہ جزئی یا کلی طور پر بجھی ہوئی ہے، مگر یہ معیار درست نہیں۔ میں اس روشنی کو فکری اور روحانی معنی میں لیتا ہوں۔ اس لیے مجھ کو آج بھی یہ روشنی جلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، نہ صرف دہلی سے غرناطہ تک، بلکہ زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک۔

جو لوگ جدید حالات کے پس منظر میں اندلس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس موضوع پر ۱۹۹۱ میں عربی میں ایک معلوماتی کتاب چھپی ہے۔ ۱۴۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام و پتہ یہ ہے :

الصحوة الاسلامية في الاندلس اليوم، تاليف د۔ علي المنتصر الكتاني

مركز البحوث والمعلومات، ص ب ۸۹۳، الدوحة، قطر

مصنف جو اسپین کے پڑوسی ملک المغرب سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے کافی تلاش و تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود اسپین سے مسلمان کبھی ختم نہیں ہوئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے عجیب واقعات لکھے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ الغرناطی نام کے ایک شخص سے میری ملاقات کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں ۵ نومبر ۱۹۷۲ کو ہوئی۔ اس کی پیدائش برشلونہ میں ہوئی تھی۔ پھر اس نے پاکستان میں ۱۹۶۹ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو میری دادی نے اپنی موت کے وقت مجھے اپنے قریب بلایا اور سرگوشی کے انداز میں میرے کان میں کہا کہ عیسائی دین ہمارا دین نہیں ہے۔ اور وہ سچا دین بھی نہیں۔ جب تم بڑے ہو جاؤ تو

پنے دین کو جاننے کی کوشش کرنا (ان الدین النصرانی لیس دیننا و لیس ھو الدین لحق- عند ما تکبر حاول ان تعرف دینك) صفحہ ۸۸

الغرناطی نے بڑے ہونے کے بعد اسپین کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ اور پھر وہ اپنی دادی کی بات کو سمجھ گیا اب اس نے دین اسلام کو جان لیا اور اس پر مطمئن ہوگیا اور پاکستان جاکر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین کے بہت سے لوگوں نے اس طرح دوبارہ اپنے اسلام کا اعلان کیا ہے۔

مسلم دانشوروں کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ بلا تحقیق بڑی بڑی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے اس مزاج کا اظہار اسپین کے معاملہ میں بھی بار بار ہوتا رہا ہے۔ مثلاً بمبئی کے ماہنامہ البلاغ (فروری ۱۹۹۵) میں ایک صاحب اسپین کے تذکرہ کے تحت لکھتے ہیں کہ "یہ بھی تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ جس اسپین پر مسلمانوں نے باضابطہ طور پر ۱۴۹۲ تک حکومت کی، وہاں آج ایک مسلمان نہیں" (صفحہ ۵۳) مگر جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔

اس قسم کی خلاف حقیقت باتیں مختلف عنوانات کے تحت اتنی زیادہ چھپی ہیں کہ اس نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر بے ہمتی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ اس قسم کی منفی باتوں کی مسلسل تکرار نے موجودہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا ہے کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے۔ ہر طرف ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہر قوم ان کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

قوموں کی اس وہمی تصویر نے مسلمانوں سے ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ان سے چھین لیا ہے۔ اور وہ دنیا کی قوموں کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ دعوت مسلمان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ مگر دعوت کا عمل انجام دینے کے لیے مدعو کے حق میں خیر خواہی درکار ہے، مسلمانوں کے دل میں دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی نہیں، اس لیے ان کے یہاں اسلام کی داعیانہ طاقت کا استعمال بھی نہیں۔

عجیب بات ہے کہ اسپین کے سفر سے کچھ پہلے ہندستان کے ایک مشہور عالم اور بزرگ کا خط (۴ اکتوبر ۱۹۹۴) مجھ کو ملا۔ موصوف نے اس میں مجھ کو کچھ مشورے دیے تھے۔ اور آخر میں اپنے مشورہ کی اہمیت و ضرورت کو بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ —— "اس لیے کہ اس ملک کو اندلس ثانی

بنانے کی بڑی منظم کوشش کی جارہی ہے۔"

ہندستان اور اندلس دونوں سے تفصیلی واقفیت کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات دہرانا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جہاں تک اندلس کا تعلق ہے، وہاں ہر قسم کی جارحیت کے باوجود کبھی بھی اسلام یا مسلمانوں کا وجود ختم نہیں کیا جا سکا تھا۔ اور اب تو وہاں دوبارہ اسلام اس شان کے ساتھ آرہا ہے کہ الصحوۃ الاسلامیۃ فی الاندلس الیوم جیسے ٹائٹل کے ساتھ کتابیں چھپ رہی ہیں۔ پھر جب خود اندلس اول نہیں بن سکا تو اندلس ثانی آخر کیوں کر بن جائے گا۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے تو یہاں مسلمانوں کو یقیناً کچھ مسائل کا سامنا ہے۔ مگر یہ مسائل کسی نہ کسی صورت میں ہر جگہ ہیں، حتی کہ مسلم ممالک میں بھی۔ اصل یہ ہے کہ مسائل زندگی کا جزء ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مسائل کو چیلنج کے روپ میں لیں۔ نہ یہ کہ "اندلس ثانی" کا فرضی خطرہ بتا کر مسلمانوں کو پست حوصلہ کریں۔

دور اول میں مسلمانوں کو پہلے غزوۂ بدر میں فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد غزوۂ احد میں ان کو شکست ہو گئی۔ اس پر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوئے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عسکری یا سیاسی فتح کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں ہے۔ وہ مختلف مصالح کے تحت مختلف قوموں کو باری باری دی جاتی ہے :

إن یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولہا بین الناس (آل عمران ۱۴۰)	اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔ اور (فتح و شکست کے) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔

اسپین کی سیاسی شکست کے معاملہ میں اور موجودہ زمانہ میں اس قسم کی دوسری شکستوں کے معاملہ میں ہمارے علماء اور دانشور جس طرح تبصرہ کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے اہل علم کا پورا طبقہ اس آیت کو بھول گیا ہے۔ ہمارے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے اس طرح کی سیاسی شکستوں کو اعداء اسلام کی سازش کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ قرآن کے مطابق، ایسے تمام واقعات خود خدا کے فیصلہ کے تحت پیش آتے ہیں۔ وہ ایام الاعداء نہیں ہیں بلکہ وہ ایام اللہ ہیں۔

طرز فکر کا یہ فرق بے حد فیصلہ کن ہے۔ سیاسی فتح و شکست کے واقعات کو اگر ایام الاعداء سمجھا جائے تو اس سے فریاد اور احتجاج کا ذہن بنتا ہے۔ جو صرف مزید نقصان کا باعث ہے۔ اس کے برعکس اگر ان واقعات کو ایام اللہ سمجھا جائے تو قوانین فطرت پر غور کرنے کا مزاج بنے گا۔ پیش آنے والے مسئلہ کو ظلم کے بجائے چیلنج کے روپ میں لیا جائے گا۔ لوگوں کی ساری توجہ اپنی کمیوں کو دور کرنے اور از سر نو زیادہ موثر منصوبہ بندی میں لگ جائے گی۔ یہاں تک کہ ہاری ہوئی بازی دوبارہ نئی شان کے ساتھ جیت لی جائے گی۔ یہی مطلب ہے وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کا۔

اُردن کے عربی میگزین (الاجنحۃ (مارچ ۱۹۹۰) میں ایک بار میں نے ایک مصری خاتون لیانبیل کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے اسپین کا سفر کیا تھا اور وہاں عرب دور کے پرعظمت آثار دیکھے تھے، انھوں نے لکھا تھا کہ یہاں میں نے تاریخ النصر العربی کو بھی دیکھا اور تاریخ الذل العربی کو بھی مضمون کے مطابق، انھوں نے رو کر اپنے آپ سے کہا کہ عرب کی یہ تاریک رات آخر کب تک باقی رہے گی (الیٰ متی سیستمر ھذا اللیل العربی)

اس کے برعکس راقم الحروف نے جب اسپین کا سفر کیا تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسپین میں مسلم رات ختم ہو گئی اور وہاں صبح کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہر واقعہ میں تاریک رخ بھی ہوتا ہے اور روشن رخ بھی۔ آپ کے اندر منفی طرز فکر ہو تو آپ تاریک رخ کو دیکھیں گے اور مثبت طرز فکر ہو تو روشن رخ کو۔

۱۹۷۶ کے موسم خریف میں حکومت اسپین کے زیر انتظام ایک پانچ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کا عنوان تھا: المؤتمر الأول لتاریخ إسبانیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسپین کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی اس پہلی عالمی کانفرنس کے ایجنڈا میں جن شہروں کو خصوصی بحث و تحقیق کا موضوع بنایا گیا، ان میں نہ میڈرڈ کا نام تھا، جو موجودہ اسپین کا سیاسی مرکز ہے، نہ برشلونہ شامل تھا جو اسپین کے ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ صرف ان شہروں کے تاریخی و تہذیبی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا جن کا تعلق مسلم اسپین سے ہے یعنی اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حکومت اسپین کی نظر میں اپنے ملک کی تاریخ بے معنی اور بے وقعت ہو جاتی ہے اگر اس سے اسلامی دور کو حذف کر دیا جائے۔

مذکورہ کانفرنس میں ایک بڑا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا، اس کو ایک عرب دکتور مصطفےٰ الشکعہ نے بیان کیا ہے، جو اس میں شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شکاگو یونی ورسٹی کے نمائندہ ڈاکٹر اسمتھ (Dr Smith) نے کانفرنس میں جو مقالہ پیش کیا وہ اول سے لے کر آخر تک اسلام اور مسلمانوں کے اوپر جارحانہ حملہ تھا۔ حتیٰ کہ اپنی بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ اسپین کے باشندوں نے جو سب سے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے یہاں سے عربوں اور مسلمانوں کو باہر نکال دیا (اعظم عمل قام بہ الإسبان هو طرد العرب والمسلمين من إسبانيا) مناہج المستشرقین، الریاض ۱۹۸۵، ۲/ ۲۶۶

اس کے بعد میڈرڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مونتابث کھڑے ہوئے اور نہایت پرزور الفاظ میں امریکی مستشرق کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے نہ تاریخ کو پڑھا ہے اور نہ اس کو سمجھا ہے۔ اگر وہ آٹھ سو سال نہ ہوتے جو اسپین نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے سایہ میں گزارے ہیں، تو ہمارا ملک کبھی تہذیبی تاریخ کے دور میں نہ داخل ہوتا۔ انھیں آٹھ صدیوں کی بدولت اسپین اس قابل ہوا کہ اپنے پڑوس کے یورپی ملکوں میں علم وثقافت کی روشنی پھیلائے جو اُس وقت جہالت، ناخواندگی اور پس ماندگی کے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے:

إنه لم يقرأ التاريخ ولم يفهمه...... إسبانيا ما كان لها أن تدخل التاريخ الحضاري لولا القرون الثمانية التي عاشتها في ظلّ الاسلام وحضارته، وكانت بذلك باعثة النور والثقافة إلى الاقطار الأوروبية المجاورة المتخبطة آنذاك في ظلمات الجهل والأمية والتخلف (کتاب مذکور صفحہ ۲۶۷)

ڈاکٹر مونتابث مشہور اسپینی مستشرق فرانسیسکو کوڈیرا زیڈین (Francisco Codera Zaydin) کے شاگرد ہیں۔ کوڈیرا کا سال پیدائش ۱۸۳۶ اور سال وفات ۱۹۱۷ ہے۔ وہ قدیم اسلامی تہذیب و روایات اور عربوں کی محبت سے سرشار تھا (لقد اُشرب کودیرا حبّ العرب) کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق ایسے خانوادہ سے تھا جو اصلاً عرب تھا۔ جیسا کہ اسپین کے اکثر گھرانوں کا حال ہے۔ عربی زبان سے اس کو اتنا شغف تھا کہ وہ اپنے نام کا تلفظ عربی لہجہ میں اس طرح کرتا تھا: الشيخ فرنسيشكو قدارة زَيدِين۔ امیر شکیب ارسلان اس کو کوڈیرا کے بجائے قديرة کہتے تھے۔

کوڈیرا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ میڈرڈ یونی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے گزارا۔ وہ نہایت ذی علم، اعلیٰ ادبی ذوق اور انصاف پسند طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے اپنے زیر تربیت نوجوانوں میں اسپین کی مسلم تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ خود اس نے اس موضوع پر درجنوں ضخیم کتابیں اسپینی اور انگریزی زبانوں میں لکھی۔ اور اپنے بعض طلبہ کے تعاون سے بہت سے قیمتی عربی مخطوطات کی تحقیق کر کے ان کو جدید معیار کے مطابق (Bibliofica Arabico Hispana) کے نام سے شائع کیا۔ اس کی ذہنی وسعت اور انصاف پسندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ غلط ہوگا کہ اسپین کو یورپی بنانے کی کوشش کی جائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یوروپ کو عربی بنایا جائے (إن من الخطأ العمل على "أَوْرَبَة" إسبانيا، بل الواجب هو "تعريب" أوروبا)

کوڈیرا کے زیر اثر اسپین میں اسکالروں کا ایک بڑا گروہ تیار ہوا، عربوں اور مسلمانوں کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر حد درجہ انصاف پسندی اور قدردانی پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اپنے استاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے آپ کو "بنی کوڈیرا" کہتے ہیں۔ جس سے عربی زبان کے ساتھ ان کے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

میڈرڈ کے شمال مغرب میں ایک شہر ال اِسکوریال (El Escorial) ہے۔ یہاں سولہویں صدی کا ایک پرانا چرچ اور ایک تاریخی محل ہے۔ تاہم اس کی عالمی شہرت کا زیادہ بڑا سبب اس کی وہ عظیم شاہی لائبریری (مكتبة الإسكوريال الملكية) ہے، جس کا شمار دنیا کے قدیم اور مالدار ترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس لائبریری میں نادر عربی مخطوطات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے حتی کہ یہاں پر بعض ایسے عربی مخطوطات محفوظ ہیں جو دنیا کے کسی بھی اسلامی یا غیر اسلامی کتب خانے میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اسپینی فقیہہ اور شاعر ابو اسحاق الالبیری کا دیوان صرف اسکوریال میں ہے۔ جس کا کیٹلاگ نمبر ۴۰۴ ہے۔ یہاں کے عربی مخطوطات کی کئی ببلوگرافیاں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل دو زیادہ معروف ہیں :

1. **Bibliotheca Arabic-Hespana Escurialens**
   by Miguel Casiri (Spanish)

2. Les manuscrits arabes de l'Escurial
by H. Derenbong (French)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب عربوں اور مسلمانوں کو اسپین سے نکالا گیا تو ان کی تمام کتابوں کو یا تو جلا دیا گیا یا دریا میں بہا دیا گیا۔ مگر اسکوریال کے کتب خانہ میں قدیم عربی مخطوطات کی موجودگی اس کی کھلی ہوئی تردید ہے۔

اسکوریال سے اسپینی زبان میں ایک مجلہ نکلتا ہے۔ اس کا نام الاسکوریال میگزین ہے۔ اس میں اکثر کسی نادر عربی مخطوطہ کی تحقیق ہوتی ہے۔ یا اندلس کے عرب سلاطین، وزراء، اطباء، شعراء، ادباء، فلاسفہ اور سائنس دانوں کے بارہ میں اسپینی اہل علم اور ریسرچ اسکالرس کے تحقیقی مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔

مسجد قرطبہ ایک دریا کے کنارے واقع ہے جس کو وادی الکبیر (Guadalquivir) کہا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم "مسجد قرطبہ" میں اس کے حوالے سے دو شعر کہے تھے جو یہاں قابل نقل ہیں :

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اقبال کا یہ خواب موجودہ زمانہ میں واقعہ بن رہا ہے۔ اب اسپین میں نئی اسلامی تاریخ بننا شروع ہوگئی ہے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں جس عمل کا آغاز ہو جائے وہ آخر کار اپنی انتہا تک پہنچ کر رہتا ہے۔

اسپین کے سفر پر روانگی سے چند دن پہلے ڈاک سے مجھے ایک کتاب ملی۔ ۸۵ صفحہ کی یہ انگریزی کتاب بمبئی (ہندو ویویک کیندر) سے چھپی ہے۔ اس کا نام ہے اسلام کا خطرہ :

B.N. Jog, Threat of Islam: Indian Dimensions,
1, Purvanchal, Navghar Marg, Bombay 400081

اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے مذہب اور کلچر کے ساتھ پر امن طور پر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اسلام کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، یعنی اسلام کا مکمل خاتمہ۔ اس معاملہ میں ساری دنیا کو اسپین کے نمونہ کو اختیار کرنا ہے۔ اسپین نے اسلام اور

مسلمانوں کو مکمل طور پر اپنے یہاں سے خارج کر دیا۔ اسی طرح ہندستان اور دوسرے ملکوں کو چاہیے کہ وہ ان کو اپنے یہاں سے خارج کر دیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

یہ بات اس مفروضہ پر کہی گئی ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے خارج کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات واقعہ کے مطابق نہیں۔ پھر جو اسپین خود اسپین میں نہیں بنا وہ دوسرے کسی مقام پر کیسے بن جائے گا۔

مصنف نے بالواسطہ انداز میں اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۲۵ میں آر ایس ایس کی تنظیم اسی خاص مقصد کے لیے بنائی گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ ۷۰ سال کی لمبی مدت میں آر ایس ایس نے کیا کیا۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۲۵ میں سارے برصغیر ہند میں مسلمانوں کی جو مجموعی تعداد تھی اس سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی آج صرف منقسم انڈیا میں ہے۔ گویا آر ایس ایس کی ساری کوششوں کے باوجود اسلام کا قافلہ برعکس سمت میں سفر کر رہا ہے۔

اب بیسویں صدی کے آخر میں جو لوگ اس قسم کی کتابیں چھاپ رہے ہیں وہ صرف نادانی کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اب زمانہ مزید سفر کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ انسان کو صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے سے دل چسپی ہے ——— کیریر بنانے والی کتابیں یا تفریحی کتابیں۔ اور مذکورہ بالا کتاب یقینی طور پر ان دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں آتی۔

یکم دسمبر کو یہاں سے واپسی کا دن تھا۔ صبح کو فجر کی نماز میڈرڈ کے ہوٹل میں پڑھی۔ مسلم عہد میں میڈرڈ کا علاقہ بھی مسلم سلطنت میں شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ اگرچہ ہوٹل کے اس کمرہ میں نہیں، مگر جہاں یہ ہوٹل کھڑا ہے، عین ممکن ہے کہ اس زمین پر اللہ کے کسی بندہ نے سجدہ کیا ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہاں کی فضائیں کسی مومن کی آہوں اور آنسوؤں کی امین ہوں۔

مسلم دور حکومت میں میڈرڈ کا نام مجریت (majrit) تھا۔ یہی لفظ بدل کر اب میڈرڈ بن گیا ہے۔ مسلم عہد کے ایک عالم فلکیات ابوالقاسم مسلمہ (وفات ۱۰۰۷ء) میڈرڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کو المجریطی کہا جاتا ہے۔

دور قدیم میں یہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا قلعہ تھا۔ یہ قلعہ اب میڈرڈ میں موجود نہیں۔ مگر آج وہاں اس سے زیادہ شاندار ایک اسلامک سنٹر کھڑا ہوا ہے جو سعودی عرب کے مالی تعاون سے

بنایا گیا ہے۔ یہ موجودہ یورپ کا سب سے بڑا اسلامک سنٹر ہے۔ اس کی تعمیر پر ۲۰ ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ وہ ۲۰۰ ہزار اسکوائر میٹر رقبہ میں واقع ہے۔

قدرتی طور پر میری خواہش تھی کہ میں میڈرڈ کے اس اسلامی مرکز میں جاؤں اور اس کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھوں۔ مگر چاہنے کے باوجود میں وہاں جا نہ سکا۔ یکم دسمبر کو میڈرڈ سے روانگی کا دن تھا۔ مجھ کو اور کئی دوسرے لوگوں کو صبح کے وقت ایرپورٹ جانا تھا۔ منتظمین کانفرنس نے ہمارے لیے مشترک سواری کا انتظام کیا تھا۔ مگر میں مشترک سواری میں نہیں بیٹھا۔ اس کے بجائے میں نے یہ کیا کہ کچھ سویرے میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی لے کر روانہ ہوا۔

ٹیکسی والے سے میں نے کہا کہ تم مجھ کو سیدھے ایرپورٹ نہ لے جاؤ۔ بلکہ اسلامک سنٹر کی طرف سے گزارتے ہوئے ایرپورٹ لے چلو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میڈرڈ کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے آخر کار میں وہاں پہنچا جہاں خوب صورت اور عالی شان اسلامی مرکز اسپین کی سرزمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر میرا عجیب احساس ہوا۔ میں نے سوچا کہ ہندستان میں کچھ مسلم دانشور مسلمانوں کو ڈرا رہے ہیں کہ تمہارے دشمن ہندستان کو تمہارے لیے دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے ان مسلم دانشوروں کو یہ کہنا چاہیے کہ اے مسلمانو مطمئن رہو۔ جس دنیا میں پہلا اسپین بھی نہ بن سکا وہاں دوسرا اسپین آخر کیسے بنے گا۔

میڈرڈ کے اسلامی مرکز کے ڈائرکٹر اس وقت ڈاکٹر عبد العزیز السرحان ہیں۔ انھوں نے رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے ۹۶-۱۹۹۵ کے لیے ایک دو سالہ منصوبہ بنایا ہے۔ اس دوران اساتذہ کی تربیت، عربی زبان کی تعلیم، اسلامی مسیحی ڈائیلاگ وغیرہ پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۹۹ میں امام ابن حزم کی یاد میں ایک بڑی کانفرنس کی جائے گی۔

میڈرڈ کے اس اسلامک سنٹر کا افتتاح ۲۴ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ (ستمبر ۱۹۹۱) میں ہوا۔ اسپین کے بادشاہ جان کارلوز (King Juan Carlos) نے اس کا افتتاح کیا۔ اس افتتاحی تقریب کی باتصویر رپورٹ المجلہ (۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپی تھی۔ المجلہ نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا تھا کہ اسلام کا منارۂ اذان پانچ سو سال کے بعد پھر اسپین میں واپس آتا ہے (المئذنة الاسلامية تعود الى اسبانيا بعد ۵۰۰ عام)

ریاض کے اخبار العالم الاسلامی (۴ اکتوبر ۱۹۹۲) نے یہ خبر اس عنوان کے ساتھ شائع کی تھی کہ میڈرڈ میں اسلامی ثقافتی مرکز کا افتتاح اسپین اور مسلمانوں کے لیے فخر کی بات ہے (افتتاح المرکز الثقافی الاسلامی فی مدرید مفخرۃ لاسبانیا والمسلمین) اس سنٹر میں مسجد، ہال، کالج، لائبریری قائم کیے گئے ہیں۔ نیز یہاں سے اسپینی زبان میں لٹریچر اور میگزین شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے ہال میں بیک وقت عربی، اسپینی، انگریزی زبانوں میں فوری ترجمہ کا انتظام ہے۔

شاہ اسپین نے (المجلہ کی رپورٹ کے مطابق) اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اسپین اپنے مسلم ماضی پر فخر محسوس کرتا ہے (اسبانیا تشعر بالفخر بماضیھا)

ہندستان میں کچھ لکھنے اور بولنے والے مسلمان یہ انکشاف کرنے میں مشغول ہیں کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کچھ ہندو لیڈر اسپین گئے۔ اس سفر کا مقصد یہ جاننا تھا کہ اسپین سے کس طرح مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تاکہ آزادی ملنے کے بعد اسی عمل کو دہرا کر ہندستان کو دوسرا اسپین بنایا جا سکے۔

اسپین کی سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے یہ بات مضحکہ خیز حد تک بے معنی نظر آئی۔ ظاہر ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کا استیصال کوئی جاری عمل نہیں ہے جس کو کوئی شخص وہاں جا کر دیکھے۔ مسلمانوں کے خلاف جو کچھ بھی ہوا، وہ ماضی کا واقعہ ہے نہ کہ حال کا واقعہ۔ آج کے اسپین میں کہیں بھی کوئی شخص یہ نہیں دیکھ سکتا کہ مسلمانوں کے مفروضہ خاتمہ کے لیے وہاں کیا کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ آج صرف لائبریریوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کو اسپین کے محلوں اور شہروں میں ہوتا ہوا نہیں دیکھا جا سکتا۔

مزید یہ کہ آج کے اسپین میں جو شخص گھومے گا وہ بالکل برعکس تاثر لے کر واپس ہوگا۔ کیوں کہ آج وہ وہاں دیکھے گا کہ عبد الرحمٰن الداخل کو خود اہل اسپین نے دوبارہ تلوار بدست اپنی سرزمین پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ پائے گا کہ آج خود اسپین کی راجدھانی میں نہایت شاندار طور پر نئی مسجد اور نیا اسلامی مرکز بنایا گیا ہے۔ اس طرح آج وہاں جانے والا آدمی جگہ جگہ ایسے واقعات سے دوچار ہوگا جو اس کو بتائیں گے کہ اسپین کی پچھلی نسل نے اگر مسلمانوں کے خلاف زیادتی کی تھی تو اسپین کی موجودہ نسل اس قدیم پالیسی کو چھوڑ کر آج مسلمانوں کا استقبال کر رہی ہے۔ چنانچہ آج اسپین میں مسلمان قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں اور آزادانہ طور پر وہاں پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

صبح ۷ بجے ہوٹل سے نکلا۔ میڈرڈ کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی آخر کار ہماری گاڑی

ایرپورٹ پہنچ گئی۔ میڈرڈ کا ایرپورٹ دوسرے ترقی یافتہ شہروں کے ایرپورٹ کے مقابلہ میں کم منظم دکھائی دیا۔ مثلاً یہاں مجھ کو جو بورڈنگ کارڈ دیا گیا اس پر گیٹ کا نمبر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گیٹ نمبر عین بورڈنگ کے وقت مائک پر اناؤنس کیا جاتا ہے یا مخصوص بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے۔

میڈرڈ سے فرینکفرٹ کے لیے ایبیریا کی فلائٹ نمبر ۴۰۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز میں مطالعہ کے لیے صرف اسپینی زبان کے اخبارات تھے۔ اس لیے میں خلاف معمول دوران پرواز کسی اخبار کو نہ پڑھ سکا۔ جہاز مسافروں کو لیے ہوئے تیزی سے فضا میں اڑ رہا ہے اور مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو اب اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ اسپین جانے کا شوق تو یقیناً مجھے تھا مگر مجھ کو یقین نہیں تھا کہ میں کبھی اسپین کا سفر کر سکوں گا۔ بظاہر یہ ایک نہ ہونے والی بات نظر آتی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ میرے اسفار کا یہ خانہ بھی پورا ہو جائے۔ چنانچہ اچانک ایک روز ڈاک سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے بعد لمبا وقفہ پڑا اور وہاں سے مزید کوئی اطلاع نہیں ملی۔ دوبارہ اچانک آغاز سفر کے صرف دو دن پہلے ٹیلی فون پر وہاں سے بتایا گیا کہ میرے سفری کاغذات بھیج دیے گئے ہیں۔ اس کو ایر فرانس سے حاصل کرلیں۔

جہاز فرینکفرٹ کے قریب پہنچا تو پائلٹ نے مائک پر اعلان کیا کہ فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ٹرافک کی وجہ سے ہم تقریباً پندرہ منٹ تاخیر کے ساتھ لینڈ کر سکیں گے۔ ریلوے میں اگر اگلے اسٹیشن کی پٹری خالی نہ ہو تو ٹرین پچھلے اسٹیشن پر ٹھہرا دی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز کے لیے فضا میں ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ہمارا جہاز فرینکفرٹ کے اوپر اس طرح منڈلانے لگا جس طرح چیل بعض اوقات فضا میں منڈلاتی ہے۔ کچھ دیر تک اس طرح منڈلانے کے بعد کسی قدر تاخیر کے ساتھ جہاز ہوائی اڈہ پر اُترا۔

یہ "فرق" زندگی کا ایک اصول ہے۔ ہوائی جہاز کا پائلٹ اگر اس فرق کو نہ جانے اور اگلے ایرپورٹ کی طرف سے میسج ملنے کے بعد وہ جہاز کو فضا میں ٹھہرا دے۔ یا ٹرین کے ڈرائیور کو جب اگلے اسٹیشن کی طرف سے سگنل نہ ملے تو وہ گول دائرہ میں ٹرین کو گھمانے کا فیصلہ کرے تو یہ دونوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔ ایسے جہاز کا پائلٹ بھی اپنے جہاز کو تباہ کر دے گا اور ایسی ٹرین کا ڈرائیور بھی اپنی ٹرین کو۔

فرینکفرٹ دنیا کے چند اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ شہر نہایت مہنگا ہے۔ مگر یہاں ہر قسم کی اعلیٰ سہولتیں موجود ہیں۔ فرینکفرٹ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عالمی نمائشوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں بہت بڑا نمائشی میدان ہے اور اس میں سال بھر مختلف قسم کی نمائش لگتی رہتی ہے

۵ اکتوبر سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۴ تک یہاں عالمی بک فیر لگی تھی۔ اس میں عالمی اداروں نے اپنی مطبوعات برائے نمائش رکھی تھیں۔ یہ نمائش عام شہریوں کے لیے نہیں تھی۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تھی جو بک ٹریڈ میں ہیں۔ چنانچہ دنیا بھر سے پبلشر، ڈسٹری بیوٹر اور بک سیلر یہاں آئے تھے۔

ایک صاحب کے تعاون سے فرینکفرٹ کی اس نمائش میں الرسالہ بک سنٹر کا بھی ایک اسٹال رکھا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ثانی اثنین نے دہلی سے فرینکفرٹ کا سفر کیا تھا۔ الرسالہ کے اسٹال پر مختلف ملکوں کے بہت سے لوگ آئے اور لٹریچر کو پسند کیا۔ خاص طور پر انھیں اس بات پر حیرت تھی کہ ہندستان میں ایسی معیاری کتابیں چھپ رہی ہیں۔ کافی لوگوں نے لٹریچر طلب کیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف قرآن کے لیے خاص طور پر بڑی بڑی فرمائش نوٹ کرائیں۔

فرینکفرٹ جرمنی کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے۔ جرمنی کی ایک اہمیت یہ ہے کہ یہاں بہت سے بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ استشراق دراصل نوآبادیاتی دور کے ایک مظہر کے طور پر پیدا ہوا چنانچہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ مگر بیسویں صدی میں اس قسم کے مستشرق نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب زیادہ اعلیٰ ذہن دوسرے علمی میدانوں میں چلے جاتے ہیں جہاں انھیں اپنی صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل سکتی ہے، وہ استشراق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی میں بھی بہت سے بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ تاریخ طبری کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ضائع ہو چکی ہے۔ لیکن جرمن مستشرق گڈفریڈ سکارٹن نے اس کا مخطوط حاصل کیا اور برسوں کی محنت کے بعد اس کو درست کر کے شائع کیا۔ اسی طرح ایک اور جرمن مستشرق پروفیسر ساخو جس نے طبقات ابن سعد پر غیر معمولی محنت کر کے اس کو مکمل شائع کیا۔ وغیرہ

مستشرقین نے قدیم عربی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے میں انتہائی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ تاہم جہاں تک خود ان کی اپنی تحریروں کا تعلق ہے، اپنے علم کی وسعت کے باوجود انھوں

نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ذہنی پس منظر اسلام کے مطابق نہیں۔
مثلاً پروفیسر ہیملٹن گب (۱۹۷۱ - ۱۸۹۵) جو نسبتاً جدید مستشرق ہیں، وہ اچھی عربی جانتے تھے۔ انھوں نے حدیث میں پڑھا کہ بعثتُ بالحنیفیۃ السمحۃ۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب محمڈن ازم میں لکھ دیا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کو پہلے حنیفیۃ کہا تھا۔ بعد کو انھوں نے اس کا نام اسلام رکھا۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ پروفیسر گب کا ذہنی سانچہ ارتقائی تصور کے تحت بنا تھا نہ کہ اسلام کے تصورِ وحی کے تحت۔

اسپین میں مسلمانوں نے جس زمانہ میں شاندار تہذیب بنائی، اس زمانہ میں مواصلاتی ذرائع بہت محدود تھے۔ تاہم اس کی امتیازی خصوصیت کی بنا پر اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ جرمنی کی ایک خاتون شاعر رازوِتھا (Hrosvitha) جو نن بھی تھی۔ وہ گینڈرشیم (Gandershsheim) میں ۹۲۵ء میں پیدا ہوئی، ۱۰۰۰ء میں اس نے انتقال کیا۔ اس جرمن شاعرہ نے غالباً اسپین کا سفر نہیں کیا تھا مگر قرطبہ کے بارہ میں اس نے بہت کچھ سنا تھا۔ اس کی ایک لاطینی نظم میں قرطبہ کے بارہ میں یہ الفاظ تھے کہ دنیا کا سب سے زیادہ شان وشوکت والا شہر:

Cordova, the brightest splendour of the world.

فرانس کی جانب جرمنی کی سرحد پر ایک تاریخی شہر ہے جس کا نام لارین (Lorraine) ہے۔ یہ شہر ۹۲۵ء میں جرمنی کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک وہ جرمنی کے قبضہ میں رہا۔ آج کل وہ فرانس میں شامل ہے۔

مسلم اسپین کے اثرات فرانس کے راستہ سے لارین تک پہنچے تھے۔ فلپ ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس میں لکھا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں عربی سائنس لارین پہنچی۔ اس کے اثر سے یہ علاقہ دو صدیوں تک ایک سائنٹفک سنٹر بنا رہا۔ قریب کے دوسرے علاقے بھی عرب علم کو قبول کرنے کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوئے۔ لارین سے یہ علم جرمنی کے دوسرے حصوں تک پہنچ گیا۔ جرمن بادشاہوں کے سفیر اسپین کے مسلم حکمرانوں کے دربار میں جانے لگے۔ ۹۵۳ء میں عظیم جرمن بادشاہ اٹو اول (Otto I) نے جان نامی ایک شخص کو قرطبہ بھیجا۔ وہ وہاں تقریباً تین سال تک رہا۔ غالباً اس نے عربی زبان سیکھی اور واپسی میں اپنے ساتھ عربی کی سائنسی کتابیں لے آیا۔ اس طرح اسپین کا عرب علم پورے

مغربی یورپ میں پھیل گیا (صفحہ ۹۰ - ۵۸۹)

ایک اور مستشرق نے لکھا ہے کہ لیان یا نواری یا بارسلونہ کے مسیحی حکمرانوں کو جب بھی ایک سرجن یا آرکیٹکٹ یا ماسٹر سنگر یا ڈریس میکر کی ضرورت ہوتی تو وہ قرطبہ سے اس کی درخواست کرتے تھے۔ مسلم راجدھانی کی شہرت جرمنی تک پہنچ گئی تھی جہاں ایک جرمن نن نے اس کو دنیا کا ہیرا (Jewel of the World) قرار دیا۔ (صفحہ ۵۲۷)

رِلکے (Rainer Maria Rilke) مشہور جرمن شاعر ہے۔ وہ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۲۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ جرمن مستشرقین نے جن عربی کتابوں کے ترجمے جرمن زبان میں کئے تھے اور اسلام پر جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے کچھ کتابوں کو رِلکے نے پڑھا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا مگر وہ اسلام سے متاثر تھا۔

دکتور عبدالرحمٰن بدوی نے رِلکے پر عربی زبان میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں رلکے کے ایک خط کا عربی ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ ایک مفصل خط ہے۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ جب سے میں نے قرطبہ کا سفر کیا ہے، مجھ کو مسیحیت سے سخت بیزاری ہو گئی ہے۔ میں قرآن کو پڑھتا ہوں۔ اس کے بہت سے مواقع پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز میرے دل کو چھو رہی ہے۔ محمدؐ نے براہ راست خدائے واحد کی طرف راستہ کھولا۔ یہاں انسان خدا سے بات کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسیحیت کی مثال ایسی ہے کہ انسان ہلو، ہلو کرتا رہے اور دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئے۔

اس طویل خط کے آخر میں مصنف لکھتے ہیں: فی ھذا النص الثمین یقرر رلکہ بعدائہ للمسیحیۃ واعجابہ بالاسلام (صفحہ ۱۲۷)

جرمنی سے جدید مسلم تاریخ کے بہت سے واقعات وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۸) کے وقت دو عالمی محاذ بن گئے تھے۔ ایک الائیڈ پاورس کا محاذ جس کی قیادت برطانیہ کر رہا کر رہا تھا۔ دوسرا ایکسس پاورس کا محاذ جس کی قیادت جرمنی کر رہا تھا۔

اس وقت ترکی میں عثمانی خلافت قائم تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ ترکی دونوں محاذوں میں سے کس کا ساتھ دے۔ اس نازک موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے رات دن جاگ کر ایک لمبا مضمون لکھا جو ان کے انگریزی ہفت روزہ کامریڈ میں چھپا۔ اس میں انھوں نے ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ اس

جنگ میں وہ برطانیہ کے مقابلہ میں جرمنی کا ساتھ دیں۔ اس کا عنوان تھا ترکوں کا انتخاب :

The Choice of the Turks

مولانا محمد علی کا یہ طویل مضمون الفاظ کا ایک جنگل تھا جو تدبیر اور دور اندیشی سے یکسر خالی تھا۔ تاہم اس مضمون کی بنا پر نہیں بلکہ ترکی کے جذباتی وزیر جنگ انور پاشا کے جلد بازانہ اندازہ (hasty calculation) کی وجہ سے ترکی جرمنوں کی حمایت میں جنگ میں کود پڑا۔ اگرچہ ترک کیبنٹ کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ ترکی کو اس معاملہ میں غیر جانب دار (neutral) رہنا چاہیے۔

حالات کے عین فطری تقاضے کے تحت اس جنگ میں برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کو فتح حاصل ہوئی اور جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو بری طرح شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر بعد از جنگ سودا بازی (Postwar bargaining) شروع ہوئی۔ فاتح طاقتوں نے ترکی کی عثمانی خلافت کو تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

مثلاً روس نے درۂ دانیال پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے شام پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ برطانیہ نے مصر کو اپنے سیاسی دائرہ میں شامل کر لیا۔ فلسطین کو ایک انٹرنیشنل علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ کو بالفور ڈکلریشن (Balfour Declaration) جاری ہوا جس میں یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک نیشنل ہوم بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ وغیرہ۔ (13/790)

عثمانی خلافت کا خاتمہ اور فلسطین کے محاذ پر پسپائی جیسے حادثات جن کو نادان لوگ کمال اتاترک اور یاسر عرفات کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں، وہ حقیقۃً انور پاشا اور محمد علی جیسے لیڈروں کے حصہ میں جاتا ہے جن کے پاس جذبات کا سرمایہ تو ضرورت سے زیادہ تھا مگر بصیرت کا سرمایہ ضرورت سے بہت کم۔

دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کی جذباتی قیادت کے نتیجہ میں دوبارہ جرمنی کو شکست ہوئی۔ فاتح قوموں (برطانیہ، امریکہ، روس) نے جرمنی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ایک کو ایسٹ جرمنی کہا گیا اور دوسرے کو ویسٹ جرمنی۔ یہ تقسیم یہاں تک پہنچی کہ دونوں حصوں کے درمیان ۱۹۶۱ میں عظیم برلن وال کھڑی کر دی گئی۔ مگر جیسے ہی سوویت یونین کمزور پڑا خود جرمنوں نے نومبر ۱۹۸۹ میں اس دیوار کو توڑ کر گرا دیا اور دونوں حصے مل کر دوبارہ ایک ملک بن گئے۔

ایک بار میں نے پاکستان کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے کہا کہ اسی طرح انڈیا اور پاکستان کو بھی دوبارہ مل جانا چاہیے۔ موجودہ مصنوعی حد بندی کو اگر ختم کر دیا جائے تو اس میں دونوں کو فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جرمنی میں تو دونوں حصوں کے لوگ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں مذہبی اعتبار سے بھائی بھائی تھے۔ مگر یہاں کا معاملہ یہ ہے کہ دونوں کا مذہب الگ الگ ہے۔ مزید یہ کہ ہندو فرقہ اکثریت میں ہے۔ اگر ایسا غیر مساوی اتحاد کیا گیا تو ہندو اپنی اکثریت کے زور پر ہم کو نگل جائے گا۔

میں نے کہا کہ یہ ایک لغو بات ہے۔ یہ اسلام کی نظریاتی طاقت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ خود پاکستان کی تاریخ اس اندیشہ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ پاکستان کا علاقہ ہمیشہ سے مسلم علاقہ نہیں تھا۔ آج وہاں ایک سو ملین سے زیادہ مسلمان پائے جاتے ہیں۔ جب کہ ہندوؤں کی تعداد بمشکل صرف ۱۰ لاکھ ہے۔ مگر شروع میں جب مسلمان اس علاقہ میں آئے تو وہاں آبادی کا تناسب اس کے بالکل برعکس تھا۔ پھر ماضی کے اس تجربہ کے باوجود مستقبل کے لیے آپ لوگ اس قدر خوف اور مایوسی میں کیوں مبتلا ہیں۔ آپ لوگ کیسے مسلمان ہیں کہ آپ کی نگاہ ہندو کی عددی برتری پر تو ہے مگر آپ کی نگاہ اسلام کی نظریاتی برتری پر نہیں۔

جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار فی صد ہے۔ یہاں تقریباً چالیس اسلامی تنظیمیں ہیں۔ پہلی عالمی جنگ میں ترکی جرمنوں کے ساتھ تھا۔ اس طرح جنگ کے دوران فوجی خدمت کے تحت ترکی اور یوگوسلاویہ کے حامی مسلمان جرمنی پہنچے۔ انھوں نے یہاں پہلی مسجد بنائی۔ اب یہاں کے تقریباً ہر شہر میں بڑی تعداد میں مسجدیں اور اسلامی مراکز ہیں۔ ان کے ساتھ تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں۔ ان اداروں میں دس ہزار سے زیادہ مسلم بچے قرآن اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جرمنی کے ایک شہر ہائیڈلبرگ میں ۱۹۹۱ میں ایک بڑی اسلامی مؤتمر ہوئی۔ اس کا شعار تھا: الا ان نصر اللہ قریب۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ حالات میں اس شعار میں قومیت کی بو محسوس ہوتی ہے۔ یہ گویا قومی مقصد کے لیے قرآن کا استعمال ہے۔ اس کے بجائے زیادہ بہتر یہ تھا کہ کسی دعوتی آیت کو شعار بنایا جائے۔ راقم الحروف نے تقریباً چالیس سال پہلے اعظم گڑھ کی نمائش میں ایک اسلامی اسٹال لگایا تھا۔ اس میں عمودی (vertical) انداز میں ایک بہت اونچا بورڈ نصب کیا تھا جس پر یہ آیت مع ترجمہ لکھی ہوئی تھی: واللہ یدعو الی دار السلام۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو بون (جرمنی) میں سبھاش چندر بوس پر ایک سیمنار ہوا۔ اس کو یہاں کے ہندستانی سفارت خانہ نے اسپانسر کیا تھا۔ سبھاش چندر بوس ۴۳-۱۹۴۱ میں جرمنی میں رہے تھے۔ ان کے جرمنی آنے کا مقصد یہ تھا کہ برٹش راج ختم کرنے کے لیے جرمنی سے مدد حاصل کی جائے۔ اس وقت جرمنی میں نازی پارٹی کی حکومت تھی۔

لوئی فشر نے اپنی کتاب لائف آف مہاتما گاندھی میں لکھا ہے کہ سبھاش چندر بوس ایک طوفانی آدمی تھے جن کا کہنا تھا کہ مجھ کو خون دو، اور میں تم سے آزادی کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس نعرہ کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی (صفحہ ۲۵۶)

سبھاش چندر بوس (اور جواہر لال نہرو) اس زمانہ میں نوجوانوں کے مقبول رہنما بنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں فوراً آزادی چاہتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ لڑائی چھیڑنے کے لیے تیار تھے۔ دونوں مہاتما گاندھی کے مصالحانہ رویہ پر نہایت سخت احتجاج کر رہے تھے (صفحہ ۲۶۱) ان کے اثر سے گاندھی جی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ تک انڈیا کو آزاد کر دیا جائے، ورنہ میں یک طرفہ طور پر آزادی کا اعلان کر دوں گا اور اپنی تمام کشتیاں جلا ڈالوں گا (صفحہ ۲۵۷)

سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے سخت مخالف تھے (۲۹۹) گاندھی جی کا نظریہ پرامن جدوجہد کا تھا، جب کہ سبھاش چندر بوس کھلے طور پر تشدد کی بات کرتے تھے اور برطانیہ کے خلاف مسلح بغاوت (armed revolt) کے وکیل تھے (۴۴۲) لوئی فشر نے ۲۵ جون ۱۹۴۶ کو نئی دہلی میں گاندھی جی سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ سبھاش چندر بوس ۱۹۴۴ میں جرمنی گئے۔ اگر ان کا خیال تھا کہ وہ جرمنی سے مدد لے کر انڈیا کو بچا سکتے ہیں تو وہ ایک بیوقوف آدمی تھے اور سیاسی لیڈر بے وقوفی کا تحمل نہیں کر سکتا:

Bose went to Germany. If he believed that India would be saved by Germany, he was stupid, and statemen cannot afford to be stupid. (p. 442)

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل آرمی کے نام سے ایک آزاد فوج بنائی تھی۔ اس کے ایک کیپٹن ڈاکٹر رتن چند (سری گنگا نگر) تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے جس کا عنوان ہے: ایک شام نیتاجی کے ساتھ۔ اس میں وہ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۴ کی ایک میٹنگ کا حال بیان

کرتے ہیں جب کہ نیتاجی برما کے باتو پہاٹ آفیسرز ٹریننگ اسکول کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو سوال وجواب یہ تھا :

سوال : آپ کہتے ہیں کہ ہتھیار بند انقلاب کے بغیر ہندستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ تو سوال یہ ہے کہ ہتھیاروں کا انتظام کیسے ہوگا ؟

جواب : ہندستان میں بہت سے ہتھیار پہلے ہی سے موجود ہیں۔ آپ لوگوں کا کام ان کو چھیننا اور ان کو اپنے استعمال میں لانا ہے۔ مثال کے طور پر میں چٹاگانگ کے اسلحہ خانہ کی ڈکیتی کا ذکر کرتا ہوں۔ جس طرح وہاں سے ہتھیار چھینے گئے تھے اسی طرح اگر ہندستانی کوشش اور ہمت کریں تو باہر سے ہتھیار لانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سوال : جاپانیوں نے ہماری سرکار کو تسلیم کیا ہے۔ ہمیں ہر طرح کی مدد بھی دے رہے ہیں۔ مگر وہ ہماری عزت نہیں کرتے۔ ان کے سپاہی ہمارے افسروں کو سلوٹ تک نہیں کرتے۔ پورٹ ڈکسن میں جب ہم جاپانیوں سے ٹریننگ لینے گئے تھے تو ہم نے اپنے جاپانی انسٹرکٹر سے کہا کہ آپ ہمیں ایک آزاد حکومت کے افراد تسلیم کرتے ہوئے بھی ہمارے افسروں کی عزت نہیں کرتے۔ جاپانی انسٹرکٹر نے جواب دیا کہ آپ کی آزاد حکومت آخر بنائی ہوئی کس کی ہے ؟

جواب : چند ایک افراد کے غلط رویہ اور بد دماغی کے کارن ہم سب جاپانیوں کو برا نہیں کہہ سکتے۔ (ہندسماچار، جالندھر، ۲۳ جنوری ۱۹۹۵)

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۶۰، کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز چلنا شروع ہوا تو اعلان کرنے والی خاتون نے خالص ہندی لہجہ میں یہ الفاظ کہے : لفتھانسا کی اس اڑان پر ہم آپ کا ہاردک سواگت کرتے ہیں۔ لفتھانسا ایک جرمن کمپنی ہے۔ مگر اس کی موجودہ پرواز میں زیادہ تر ہندستانی مسافر ہیں۔ اس لیے مسافروں کی رعایت سے انھوں نے کلام کا یہ انداز اختیار کیا۔

تاجر کو جو تعلق اپنے گاہک سے ہوتا ہے، داعی کو وہی تعلق اپنے مدعو سے ہوتا ہے۔ لوگوں میں اگر دعوتی جذبہ آجائے تو وہ اپنے مدعو کے لیے اسی طرح سراپا ہمدردی بن جائیں گے۔ وہ یک طرفہ طور پر مدعو کی رعایت کریں گے۔ وہ اپنے جذبات سے زیادہ مدعو کے جذبات کا لحاظ کریں گے۔ تاجر اگر اپنے گاہک کی رعایت نہ کرے تو وہ اپنے گاہک کو کھو دے گا، اسی

طرح داعی اگر اپنے مدعو کی رعایت نہ کرے تو وہ مدعو کو دور کرنے کا سبب بن جائے گا۔

۳۰ نومبر کی رات کو لفتھانسا کی فلائٹ میں میرے لیے جو کھانا آیا، اس کی پیکنگ پر جرمن میں میرا نام چھپا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ جرمن اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ اپنی پسند کے کھانے کا لطف اٹھائیے :

enjoy your meal

دہلی میں رزرویشن کے وقت یہ لکھوا دیا گیا تھا کہ مجھے سفر میں انڈین ویجیٹیرین میل چاہیے۔ حسب قاعدہ یہ ہدایت ہر جگہ کے کمپوٹر پر ریکارڈ ہو گئی۔ چنانچہ اس سفر میں آتے اور جاتے ہوئے میں نے چار جہاز استعمال کیے جو تین مختلف کمپنیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہر ایک میں خود بخود "اسپشل میل" کے لیبل کے ساتھ میرا مطلوب کھانا میرے لیے آتا رہا۔ موجودہ جہاز جس میں میں نے فرینکفرٹ سے دہلی کا سفر کیا، اس میں تقریباً ساڑھے چار سو سیٹیں تھیں۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کمپوٹر اور انڈسٹریل تہذیب نے کیسا نظام بنایا ہے اور کس طرح وہ عالمی سطح پر نہایت صحت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

یہ فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ساڑھے سات گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد رات کو ڈیڑھ بجے ہمارا جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہاں جہاز سے نکل کر باہر جانے کے لیے آدمی ایک لمبی گیلری سے گزرتا ہے۔ ایک طرف یہ گیلری ہے اور دوسری طرف وسیع انتظار گاہ ہے۔ دونوں کے درمیان شیشہ کی دیوار حائل ہے۔ اس طرح دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

جس وقت میں گیلری سے دوسرے ہم سفر لوگوں کے ساتھ باہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگ انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ یہاں اس انتظار میں تھے کہ آگے جانے والے جہاز سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو سکیں۔

اس دنیا میں ہر اسٹیشن اور ہر ایرپورٹ پر یہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ ہر وقت کچھ لوگ آتے ہیں اور کچھ لوگ واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کے اعتبار سے ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہو کر دنیا میں آرہے ہیں۔ کچھ اور لوگ اپنی مدتِ قیام پوری کر کے آخرت کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ آنا اور جانا اسی طرح جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے اور دو دنیاؤں کے نظام کو ختم کر کے صرف ایک دنیا کا نظام ابدی طور پر قائم کر دیا جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

ستمبر ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۶

ضروری اعلان

اس شمارہ میں "یکساں سول کوڈ" کے موضوع پر ایک جامع مضمون شائع کیا جارہا ہے۔ موضوع کی اہمیت کی بنا پر اس کو الگ کتابچہ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ اس کتابچہ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلایا جائے۔ اس کتابچہ کی قیمت پانچ روپے ہوگی۔ لیکن جو حضرات اسے مفت تقسیم کروانا چاہیں گے ان کے لیے رعایتی قیمت تین روپے ہوگی۔ کم از کم ۱۰۰ کی تعداد لینے پر ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

مینجر الرسالہ

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333

Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

اعتماد و توکل

قرآن (آل عمران ۱۵۹) میں ہے کہ جب تم معاملہ کا فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو (فاذا عزمت فتوکل علی اللہ) گویا عمل کا پختہ ارادہ انسان کو کرنا ہے اور نتیجہ کے معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دینا ہے۔

الترمذی کی روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اگر تم اللہ پر اس طرح بھروسہ کرو جس طرح بھروسہ کرنے کا حق ہے تو ضرور وہ تم کو اسی طرح روزی دے گا جس طرح وہ چڑیا کو روزی دیتا ہے۔ چڑیا صبح کو خالی پیٹ نکلتی ہے اور شام کو بھرے پیٹ کے ساتھ واپس آتی ہے (لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر۔ تغدو خماصا وتروح بطاناً)

چڑیا اپنے بسیرے کے مقام سے نکل کر روزی کی تلاش میں جاتی ہے۔ یہ نکلنا اس کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو رزق اسے ملتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ رزق کی تلاش چڑیا کا کام ہے اور تلاش کے نتیجہ کا تعلق خدا سے۔

الترمذی (کتاب القیامۃ) میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں، آپ نے فرمایا تم اپنے اونٹ کو باندھو اور پھر توکل کرو (یا رسول اللہ اعقلہا و اتوکل او اطلقہا و اتوکل۔ قال اعقلہا و توکل) گویا اپنے جانور کو باندھنے کا کام خود آدمی کو انجام دینا ہے۔ باندھنے کے بعد جانور ٹھہرے گا یا رسی توڑ کر بھاگ جائے گا، اس معاملہ میں خدا کی کارسازی پر اعتماد کرنا ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ کوشش میری طرف سے اور اس کی تکمیل اللہ کی طرف سے (السعی منی والاتمام من اللہ)

ہر کام میں ایک چیز ہوتی ہے محنت، اور دوسری چیز ہے نتیجۂ محنت۔ توکل کا تعلق محنت سے نہیں ہے بلکہ نتیجۂ محنت سے ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جب وہ کوئی کام کرنے کے لئے اٹھے تو پورے عزم کے ساتھ اس کو انجام دے۔ وہ اپنی پوری طاقت اس میں لگا دے۔ مگر نتیجہ کے معاملہ کو وہ اللہ کے اوپر چھوڑ دے۔ آدمی اگر محنت کو خدا پر چھوڑے گا تو اس سے کاہلی اور بے عملی پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ نتیجہ میں توکل کا طریقہ اختیار نہ کرے گا تو وہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

تنگی میں آسانی

فتح مکہ کا واقعہ ۸ھ میں پیش آیا۔ اس کے بعد آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ مکہ سے طائف کا سفر فرمایا۔ اس سفر میں جو واقعات پیش آئے، ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا:

قال ابن اسحاق: ثم سلك في طريق يقال لها الضيقة. فلما توجه رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل عن اسمها، فقال ما اسم هذه الطريق. فقيل الضيقة. فقال: بل هي اليسرى (البدايہ والنہایہ لابن کثیر ۳۴۶/۴)

پھر آپ ایک راستہ میں چلے جس کو تنگ راستہ کہا جاتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے اس کا نام پوچھا۔ کہا گیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ آسان راستہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ وہ تنگ ہے مگر بند تو نہیں۔ بظاہر اگرچہ یہ راستہ تنگ دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن اگر ہمت اور احتیاط سے کام لیں تو یقیناً ہم اس سے گزر سکتے ہیں۔ پھر تنگی کے باوجود اگر وہ ہمارے لیے رکاوٹ نہیں تو ہم اس کو تنگ کیوں کہیں۔ کیوں نہ ہم اس کو آسان کہیں۔ کیوں کہ اصل مقصد گزرنا ہے اور وہ اب بھی ہمیں حاصل ہے۔

یہ واقعہ اس طرح کے معاملات میں مومن کے مزاج کو بتاتا ہے۔ مومن چیزوں کو ان کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں دیکھتا بلکہ چیزوں کو ان کے باطن کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ مومن معاملات کے تاریک پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے اور صرف اس کے روشن پہلو پر اپنی تمام توجہ لگا دیتا ہے۔ مومن کیا ہے کو نہیں دیکھتا، وہ ہمیشہ یہ دیکھتا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے۔ مومن ناموافق پہلو کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ صرف موافق پہلو پر اپنی ساری نظریں جما دیتا ہے۔

مومن منفی سوچ سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ اس کی سوچ تمام تر مثبت سوچ ہوتی ہے۔ مومن کی شخصیت کو بتانے کے لئے اگر نفسیاتی اصطلاح استعمال کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مومن ایک مثبت مفکر (positive thinker) ہوتا ہے۔ یعنی مثبت ذہن رکھنے والا انسان۔

مومن کی یہ صفت اس کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے رکاوٹیں بھی زینہ بن جاتی ہیں۔ تنگ راستہ بھی اس کے لئے کشادہ راستہ بن جاتا ہے۔

صبر — سپیریر سولیوشن

قرآن کی تقریباً دو سو آیتیں براہ راست طور پر صبر سے متعلق ہیں۔ اور بقیہ آیتیں بالواسطہ طور پر صبر سے متعلق۔ گویا قرآن کی تمام تعلیمات صبر پر مبنی ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قرآن صبر کی کتاب ہے۔

صبر کی براہ راست آیتوں کا معاملہ واضح ہے۔ مثلاً واستعینوا بالصبر والصلاۃ (البقرہ ۴۵) واصبر علیٰ ما اصابک (لقمان ۱۷) وتواصوا بالصبر (العصر ۳) ودع اذاھم (الاحزاب ۴۸) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں براہ راست الفاظ میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔

مگر دوسری بیشتر آیتوں کا بھی صبر سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً قرآن کی پہلی آیت ہے: الحمد للہ رب العلمین (الفاتحہ) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس کا شکر اور تعریف کریں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کوئی بھی آدمی ناخوشگوار تجربات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآن کے مطابق انسان کو کبد (مشقت) میں پیدا کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں خوشیوں اور مسرتوں کی زندگی بنا سکے۔

پھر حقیقی معنوں میں کوئی آدمی شکر کرنے والا کیسے بن سکتا ہے۔ اس کا واحد راز صبر ہے۔ یعنی آدمی جب دنیا میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرے گا، اسی وقت اس کے لئے ممکن ہوگا کہ سچا کلمۂ شکر اس کی زبان پر جاری ہو سکے۔ اسی لئے قرآن میں شکر کے ساتھ صبر کو وابستہ کیا گیا ہے (لقمان ۳۱)

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مسائل کے مقابلہ میں تسخیری انداز کا برتر حل دریافت کر سکے۔ آدمی جب فریق ثانی کے مقابلہ میں بھڑک جائے تو وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ وہ سوچ کر کوئی گہرا جواب دے یا کوئی دوررس منصوبہ بنا سکے۔ مگر جب وہ صبر وتحمل سے کام لیتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ فوری اقدام کے بجائے سوچا سمجھا ہوا اقدام کرے۔ اور یہ تاریخ کا تجربہ ہے کہ فوری اقدام کرنے والا ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور سوچ سمجھ کر اقدام کرنے والا ہمیشہ کامیاب۔

صبر ہر قسم کے مسائل کا برتر حل (سپیریر سولیوشن) ہے۔

دس اقوال

امریکہ میں چھپی ہوئی ایک کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب ایک کامیاب امریکی تاجر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نے یہ کتاب اپنے ۲۰ سالہ تجارتی تجربات کی روشنی میں تیار کی ہے۔ اس خوبصورت کتاب میں ہر صفحہ پر دو تجارتی اصول جلی حرفوں میں درج ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ٹاپ پر فارمرس نے ہمیشہ مثبت عادات (positive habits) کے ذریعہ ترقی کی ہے۔

The Book of Excellence by Byrd Baggett.
236 habits of effective salespeople

ان مثبت عادتوں کو مصنف نے ۲۳۶ چھوٹے چھوٹے جملوں میں مرتب کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر میں نے دس جملے منتخب کئے ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

A bad attitude cancels all other positive skills.
Be as critical of yourself as you are of others.
You are not learning anything when you are talking.
Excellence is not optional.
Take an active, not passive, role in helping your community.
Customers love humility.
Patience is a virtue. Don't give up.
There is no replacement for effort.
Success does not come easily. Are you willing to pay the price?
Stop, listen, and think before you respond.

یعنی ایک برا رویہ تمام دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اپنے بارہ میں بھی اتنا ہی تنقیدی بنو جتنا تم دوسروں کے لئے تنقیدی ہو۔ جب تم بولتے ہو تو تم کچھ سیکھ نہیں رہے ہو۔ امتیاز کوئی اختیاری چیز نہیں۔ اپنی کمیونٹی کی مدد کرنے میں فعال کردار ادا کرو۔ گاہک ہمیشہ تواضع کو پسند کرتے ہیں۔ برداشت ایک نیکی ہے، اس کو کبھی نہ چھوڑو۔ کوشش کا کوئی بدل نہیں۔ کامیابی آسانی سے نہیں آتی، کیا تم اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔ ٹھہرو، سنو، اور جواب دینے سے پہلے غور کرو۔

یہ اقوال اس فطری حکمت کو بیان کرتے ہیں جن کو اختیار کرکے کوئی شخص دنیا میں اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ یہ اقوال کامیابی کی کنجی ہیں۔

الرسالہ ستمبر ۱۹۹۵

حقیقت کی تلاش

لیوس کیرول (Lewis Carrol) ایک برٹش مصنف ہے۔ وہ ۱۸۳۲ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۹۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے بچوں کے لئے کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ اتنی دلچسپ ہیں کہ اس کی کہانیوں کی ایک کتاب کو پڑھ کر چھ سال کے ایک بچہ نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس کی ۶۰ ہزار جلدیں ہوں :

he wished there were 60,000 volumes of it. (3/967)

تاہم لیوس کیرول ایک غمگین آدمی تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ تنہائی میں زندگی گزار کر مرگیا۔ اس نے کہا کہ —— میں اس دنیا میں کیا ہوں۔ اُف ، یہ ایک عظیم معما ہے :

Who in the world am I? Ah, that's the great puzzle.

یہ اس دنیا میں ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ کوئی زیادہ شدت کے ساتھ اس کو محسوس کرتا ہے اور کوئی کم شدت کے ساتھ۔ تاہم کوئی بھی آدمی اس سوال سے خالی نہیں۔

عام جانوروں کا بنیادی مسئلہ صرف دو ہے، غذا اور تحفظ۔ جانور کو اگر یہ دو چیزیں مل جائیں تو اس کے بعد وہ نہایت سکون کے ساتھ سو جائے گا۔ مگر انسان کے اندر اسی کے ساتھ ایک اور چیز کی شدید طلب پائی جاتی ہے۔ اور وہ ہے زندگی کی حقیقت۔

فلسفہ اور سائنس جیسے علوم اس سوال کا تشفی بخش جواب نہیں دیتے۔ کیوں کہ فلسفہ اور سائنس کا علم تو خود انسان نے بنایا ہے۔ یعنی وہی انسان جو حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے وہی ان علوم کو مرتب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام علوم ناقص ہیں، اور ناقص علم سے کامل جواب حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

پیغمبرانہ الہام اسی سوال کا جواب ہے۔ جو آدمی اس کا مطالعہ کرے گا وہ اس میں اپنی طلب کا جواب پالے گا۔ پیغمبرانہ الہام خود اپنی ذات میں صداقت ہے۔ طالب کی بے آمیز فطرت کے سامنے جب یہ ربانی کلام آتا ہے تو خود اس کا اندرونی احساس یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ عین وہی چیز ہے جو اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ پیغمبر کا الہامی کلام طالب کے لئے اپنی دلیل آپ بن جاتا ہے۔

دلیل کی زبان میں

یکساں سول کوڈ کا مسئلہ ملک کے سامنے تقریباً ۰، سال سے ہے۔ اکثریتی فرقہ عام طور پر اس کا حامی رہا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت مسلمانوں کی طرف سے سامنے آئی ہے۔ اس مدت میں ہمارے علماء اور دانشوروں نے ہزاروں کی تعداد میں اس کے خلاف مضامین اور بیانات شائع کیے ہیں۔ جلسوں اور تقریروں کی صورت میں اس مسئلہ پر جتنا زیادہ بولا گیا ہے شاید کسی اور ملی مسئلہ پر نہیں بولا گیا ہے۔

تاہم ان تمام کوششوں کا نتیجہ صفر ہے۔ ان مخالفتوں، نیز بعض دوسرے اسباب سے اگرچہ ایسا ہوا کہ یکساں سول کوڈ کی بنیاد پر ہندستانی پارلیمنٹ نے ابھی تک ایکٹ نہیں بنایا۔ تاہم ہماری ہنگامی مخالفتیں ایک اور نقصان کو ظہور میں آنے سے روک نہ سکیں۔ اور وہ اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان بڑھتی ہوئی نفرت ہے۔ اکثریتی فرقہ کا ذہن جب یہ ہو کہ یکساں سول کوڈ ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ تو ایسی حالت میں اس قسم کے کوڈ کا نہ بننا یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ اقلیتی فرقہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ اور اقلیتی فرقہ کے خلاف اکثریتی فرقہ کا یہ تاثر بلاشبہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے کم خطرناک نہیں۔

اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ یکساں سول کوڈ کے نظریہ کو عین اسی بنیاد پر رد کیا جائے جو اکثریتی فرقہ کے نزدیک قابل لحاظ ہے۔ یعنی دلائل وحقائق کی بنیاد۔ جب ہم یہ کہیں کہ "یکساں سول کوڈ ہمارے مذہب میں مداخلت ہے" تو یہ زبان فریق ثانی کو صرف ایک ناپسندیدہ چیخ و پکار معلوم ہوتی ہے۔ مگر جب ہم یہ ثابت کردیں کہ یکساں سول کوڈ خود قومی مصالح اور عقلی دلائل کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو یقیناً وہ ہماری بات پر غور کرے گا اور اس کو ماننے پر مجبور ہوگا۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ہر تقاضے کو دلائل فطرت کے زور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب یکساں سول کوڈ کے معاملہ کو دلائل فطرت کے زور پر رد کرنا ممکن ہو تو کیا ضرورت ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو فریق ثانی کو منفی شور وغل کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتی۔

اس طرح کے نزاعی معاملات میں یہی اسلام کا طریقہ ہے۔ الجاحظ (۲۵۵-۱۶۳ھ) عربی ادب کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک مشہور کتاب البیان والتبیین ہے۔ اس کتاب میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مختلف ادبی خصوصیات بیان کی ہیں۔ احادیث کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نے آپ کی ایک صفت ان الفاظ میں بیان کی ہے :

کانَ لَا یُرِیدُ اسکاتَ الخصمِ إلّا بما یعرِفُہ۔

آپ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے مخالف فریق کو آپ انھیں باتوں کے ذریعہ چپ کراتے تھے جن سے وہ واقف اور آشنا ہو۔

اسی بات کو الشاطبی نے اپنی کتاب الموافقات میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اختلافی بحث میں وہی دلیل معتبر ہے جو متنازع فیہ نہ ہو بلکہ فریق ثانی کے نزدیک تسلیم شدہ ہو۔ (الموافقات فی اصول الاحکام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۹۸)

اس اصول کی روشنی میں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ یکساں سول کوڈ کے معاملہ میں ہم اپنے نقطۂ نظر کو عقلی دلائل اور علمی حقائق کی روشنی میں بیان کریں۔ کیوں کہ یہی انداز اور یہی اسلوب فریق ثانی کے نزدیک قابل لحاظ ہے اور یہی وہ انداز استدلال ہے جس کو موجودہ زمانہ میں باوزن استدلال سمجھا جاتا ہے۔

زیر نظر مقالہ میں اسی خاص اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں مسلّمہ حقائق اور متفق علیہ معیار کی روشنی میں ملّت مسلمہ کے نقطۂ نظر کو مدلل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مقالہ لوگوں کو سنجیدہ غور و فکر پر مجبور کرے گا اور ان شاء اللہ وہ حالات پیدا ہوں گے جب کہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس قدیم نزاع کا خاتمہ ہو جائے۔

اگلے ۴۲ صفحات میں جو مقالہ "یکساں سول کوڈ" کے عنوان سے شامل ہے، وہ وقت کے اسی اہم ترین موضوع پر دلائل وحقائق کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔ اس میں کامن سول کوڈ کو اینٹی مسلم بتانے کے بجائے اس کو اینٹی ریزن ثابت کیا گیا ہے۔ الرسالہ کے علاوہ اس کو علاحدہ پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کیا جارہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کو پھیلایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ان شاء اللہ اس کو انگریزی اور ہندی زبان میں بھی شائع کیا جائے گا، یہاں تک کہ لوگ کہہ اٹھیں : کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا۔

یکساں سول کوڈ

دلائل وحقائق کی روشنی میں

مولانا وحید الدّین خان

Al-Risala Book Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128 Fax: 91-11-4697333

یکساں سول کوڈ

یکساں سول کوڈ کا تصور آزادی (۱۹۴۷) کے پہلے سے ہندستان میں چلا آرہا ہے۔ مگر اب وہ زیادہ تر دستور ہند کا مسئلہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ آزادی کے بعد ملک کا جو دستور بنا اس میں یونیفارم سول کوڈ کے نام سے اس کی بھی ایک باقاعدہ دفعہ شامل کر دی گئی۔ یہ دستور کی دفعہ ۴۴ ہے جو اس کے رہنما اصولوں کے تحت درج کی گئی ہے۔

دستور: غیر ضروری طوالت

دستور ایک اعلیٰ قانونی دستاویز ہے۔ دستور کا مقصد ان بنیادی اصولوں کا تعین ہے جس کی روشنی میں قومی حکومت (یا کسی اجتماعی ادارہ) کو چلایا جا سکے۔ خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے دستور کو مختصر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ دستور جتنا لمبا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں اختلافات پیدا ہوں گے اور بار بار اس میں ترمیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس طرح دستور کا احترام ختم ہو جائے گا۔ حتی کہ طوالت اور پیچیدگی کی بنا پر آخر کار ایسا ہوگا کہ صرف کچھ ماہرین دستور ہی اس کو جانیں گے۔ عام شہریوں کو اس سے کوئی واقفیت یا دل چسپی باقی نہ رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ بین اقوامی شہرت کے ماہر دستوریات (constitutionalism) وسکانسن یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ فلمین (David Fellman) سے لے کر انڈیا کے سب سے بڑے ماہر دستور مسٹر نانی پالکھی والا تک نے مختصر دستور کی حمایت کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام ترقی یافتہ قوموں کے دستور نہایت مختصر ہیں۔ مثلاً غیر ترقی یافتہ ریاست جارجیا (Georgia) کا نظر ثانی شدہ دستور پانچ لاکھ (500,000) الفاظ پر مشتمل ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ امریکہ (United States) کا دستور صرف سات ہزار الفاظ پر مبنی ہے۔ اسی طرح جاپان کا دستور انتہائی مختصر ہے جس کو موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ قوموں کے درمیان نمبر ایک قوم کی حیثیت حاصل ہے (5/85-86)

انڈیا کا دستور غالباً تمام قومی دستوروں میں سب سے زیادہ لمبا ہے۔ بارہ تفصیلی شیڈول (schedules) کے علاوہ اصل دستور ۳۹۵ دفعات پر مشتمل ہے۔ جب کہ اکثر دفعات کی ذیلی دفعات

بھی ہیں۔ اس لمبی دستور سازی کا نادرست ہونا اسی سے ثابت ہے کہ نومبر ۱۹۴۹ کے بعد سے اب تک اس میں تقریباً ۸۰ ترمیمات ہو چکی ہیں اور مزید ترمیم کا مطالبہ جاری ہے۔ ان سب کے باوجود یہ "جامع" دستور ملک کو ترقی کے راستہ پر آگے لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد انڈیا کی دستور ساز اسمبلی کے صدر (۴۹-۱۹۴۶) تھے۔ یہ دستور اگرچہ انھیں کی زیر صدارت بنا اور اس کی تکمیل کے بعد انھوں نے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو اس پر اپنا دستخط کیا۔ تاہم وہ لمبی دستور سازی کے خلاف تھے:

In his valedictory address to the constituent Assembly Dr Rajendra Prasad said that everything cannot be written in the Constitution and hoped for the development of healthy conventions. But these have not been developed and everything has to be written in the Constitution.

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی میں اپنا الوداعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ دستور میں ہر چیز لکھی نہیں جا سکتی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ صحت مند روایات قائم کی جائیں گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس یہ ذہن بن گیا کہ ہر چیز کو دستور میں لکھ دیا جائے (ہندستان ٹائمس ۲۴ مئی ۱۹۹۵)

کسی دستور کی غیر ضروری طوالت اس میں غیر ضروری دفعات کو شامل کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہندستانی دستور میں اس قسم کی کثیر غیر ضروری دفعات شامل ہیں انھیں میں سے ایک ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں (directive principles) کی دفعہ ۴۴ ہے جو مشترک سول کوڈ سے متعلق ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے گی کہ انڈیا کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ حاصل ہو جائے:

The State shall endeavour to secure for the citizens a uniform civil code throughout the territory of India.

دستور کی یہ دفعہ اتنا ہی غیر دستوری ہے جتنا یہ کہنا کہ ریاست اس بات کی کوشش کرے کہ ملک کے تمام شہریوں کے لیے یکساں فہرست طعام (uniform menu) وجود میں آجائے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ ملک کے تمام مرد و عورت اور بوڑھے اور بچے ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں اور ایک ہی قسم کا لباس پہنیں۔ اسی طرح یہ بھی یقینی طور پر ممکن نہیں ہے کہ ایک بڑے ملک کے تمام مرد و عورت

ایک ہی ڈھنگ پر شادی کی رسوم ادا کریں، خواہ اس کے لیے باقاعدہ قانون کیوں نہ بنا دیا جائے۔
دستور کا کام قومی پالیسی کے بنیادی اصولوں کو متعین کرنا ہے نہ کہ نجی معاملات میں لوگوں کے انفرادی ذوق کو مٹا کر غیر ضروری طور پر یکسانیت لانے کی کوشش کرنا۔

تاہم جب کوئی چیز لکھ کر چھاپ دی جائے تو بہت سے لوگ اس کو واقعہ سمجھ لیتے ہیں۔ یہی حال دستور کی اس دفعہ کا بھی ہوا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس کا حوالہ دے کر مانگ کرتے رہتے ہیں کہ یکساں سول کوڈ کا دور لانے کے لیے پارلیمنٹ ایک قانون بنائے اور اس کو پورے ملک میں رائج کیا جائے۔

نہرو رپورٹ

پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کا ذہن کافی پہلے سے چلا آرہا ہے۔ غالباً اس کا اظہار سب سے پہلے ۱۹۲۸ میں نہرو رپورٹ کی صورت میں ہوا۔ نہرو رپورٹ حقیقۃً آزاد ہندستان کے دستور کا ایک پیشگی ڈرافٹ تھا جس کو مشہور ماہر قانون موتی لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ اس دستوری مسودہ میں تجویز کیا گیا تھا کہ آزاد ہندستان میں شادی بیاہ کے معاملات کو یکساں ملکی قانون کے تحت لایا جائے گا۔ اس وقت علماء نے اس کی سخت مخالفت کی۔ مزید یہ ہوا کہ اس وقت کی برٹش حکومت نے بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں ہندستان کے لیے درجۂ مستعمرہ (dominion status) کی بات کہی گئی تھی جو انگریزوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ میں اس پر غور کرنے کے لیے کانگرس کا ایک اجلاس لاہور میں بلایا گیا۔ اس اجلاس نے اس کے عملی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد نہرو رپورٹ کو رد کر دیا۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ

۱۹۸۵ سے یکساں سول کوڈ کے مسئلہ نے نئی قانونی اہمیت اختیار کر لی جب کہ سپریم کورٹ کے ججوں نے اس کے حق میں اپنی رائے دینا شروع کر دیا۔

اس معاملہ میں عدالتی بحث کا آغاز سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندرا چوڑ کے فیصلہ سے ہوتا ہے۔ ۱۹۸۵ میں انھوں نے محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں اپنا مشہور فیصلہ دیا تھا۔ اس فیصلہ میں اصل زیر بحث معاملہ سے تجاوز کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس کی

کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے تحت قانون بنانا وقت کا تقاضا ہے۔ اور یہ کہ ایک کامن سول کوڈ قومی ایکتا کو لانے میں مددگار ہوگا :

a common civil code will help the cause of national integration.

اس کے بعد اسی ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ کے جسٹس چن نپا ریڈی نے ایک کیس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیس ایک اور مثال ہے جو اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ یکساں سول کوڈ ہماری فوری اور ناگزیر ضرورت بن چکا ہے :

The present case is yet another which focuses...on the immediate and compulsive need for a uniform civil code.

یہی بات زیادہ مفصل اور تاکیدی انداز میں سپریم کورٹ کی دو رکنی ڈویژن بنچ نے مئی ۱۹۹۵ میں اپنے متفقہ فیصلہ میں کہی ہے۔ اس کے ممبران جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس آر ایم سہائے تھے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ دستور کی دفعہ ۴۴ کے مطابق، یونیفارم پرسنل لا کو نافذ کرنا قومی استحکام کی طرف ایک فیصلہ کن قدم ہے۔ اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ کسی بھی وجہ سے ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں تاخیر کی جائے :

to introduce a uniform personal law (is) a decisive step towards national consolidation... There is no justification whatsoever in delaying indefinitely the introduction of a uniform personal law in the country (p. 22).

دستور کی دفعہ ۴۴

یہ ساری باتیں دستور کی دفعہ ۴۴ کے حوالے سے کہی جا رہی ہیں۔ یہ دفعہ دستور ہند کے چوتھے حصہ میں ہے۔ یہ حصہ اسٹیٹ پالیسی کے لیے رہنما اصولوں (directive principles) کی حیثیت سے دستور میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی دفعہ ۳۷ میں یہ صراحت ہے کہ اس حصہ میں جو دفعات درج کی گئی ہیں وہ کسی بھی عدالت کے ذریعہ قابل نفاذ نہیں ہیں۔ اس کا تعلق تمام تر حکومت اور ریاست سے ہے۔ ایسی حالت میں سپریم کورٹ کے ججوں کا بار بار دفعہ ۴۴ کے حوالے سے یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ چھیڑنا ایک ایسے مسئلہ میں دخل دینا ہے جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ جنتا دل نے اس

فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے (دی پائنیر ۱۵ مئی ۱۹۹۵) اس کو اپنی حد سے گزر کر پارلیمنٹ کی حد میں داخل ہونا قرار دیا :

It is a judicial trespass on Parliament's jurisdiction.

اسی پس منظر میں دی ہندستان ٹائمس (۱۲ مئی ۱۹۹۵) نے اپنے اڈیٹوریل میں فیصلہ پر تبصرہ کا آغاز اس جملہ سے کیا تھا کہ —— ہندستان کی سپریم کورٹ نے حالیہ برسوں میں بار بار یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ وہ ایسے مقامات میں گھس پڑتی ہے جہاں داخل ہونے سے فرشتے بھی گھبراتے ہیں :

India's Supreme Court in recent years has displayed a penchant for rushing into terrain that angels fear to tread.

خود دستور کے مطابق، یونیفارم سول کوڈ کو ایکٹ کی صورت دینے کا تعلق تمام تر حکومت سے ہے۔ اور حکومت کا حال یہ ہے کہ ۱۹۵۶ میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف طور پر کہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ میں اس کو تکمیل تک پہنچاؤں :

I do not think that at the present moment the time is ripe in India for me to try to push it through.

یہی بات اس کے بعد اندرا گاندھی نے بھی کہی۔ اور اب موجودہ پرائم منسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے بھی یہی بات کہہ دی ہے (ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۸ جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۷) اب یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو عملاً یونیفارم سول کوڈ لانا ہے وہ تو اس سے بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اختیار میں سرے سے اس کا معاملہ نہیں وہ اس کے حق میں پر جوش تقریریں کر رہے ہیں۔ اس قسم کی لفظی کارروائی صرف وقت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مذہبی آزادی ایک لازمی حق

جو لوگ دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر یونیفارم سول کوڈ کی وکالت کرتے ہیں۔ انھوں نے غالباً اس پر بہت کم غور کیا ہے کہ خود اسی دستور کی دفعہ ۲۵ میں اس کی تردید موجود ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۲۵ میں ہندستان کے ہر شہری کو ضمیر اور مذہبی عمل اور مذہبی تبلیغ کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تمام افراد مساوی طور پر آزادیٔ ضمیر کا حق رکھتے ہیں۔ ان کو حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر مذہب کا اقرار کریں، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں :

* All persons are equally entitled to freedom of conscience and the right freely to profess, practise and propagate religion.

مذہب کا یہ انتخاب فرد یا گروہ کی خود اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ اسی لیے دفعہ ۲۵ کی تشریح (explanation I) میں کہا گیا ہے کہ سکھوں کی مذہبی آزادی میں ان کا یہ حق بھی شامل ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے ساتھ کرپان (تلوار) رکھیں۔ دستور میں "کلچرل رائٹس" کے تحت عمومی طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ہندستانی شہریوں کا کوئی بھی طبقہ جو اپنا الگ کلچر اور زبان رکھتا ہو، اس کو حق ہوگا کہ وہ اپنے کلچر اور زبان کی حفاظت کرے (دفعہ ۲۹)

مزید یہ کہ مذہبی آزادی کی دفعہ جو دستور میں ہے وہ دستور کے اس حصہ میں ہے جس کا تعلق شہریوں کے بنیادی حقوق (fundamental rights) سے ہے، جب کہ مذکورہ دفعہ ۴۴ دستور میں دیے ہوئے رہنما اصول (directive principles) کے تحت آئی ہے۔ اور خود دستور کی دفعہ ۳۷ کے مطابق، اس کے رہنما اصولوں کی دفعات اس کے بنیادی حقوق کی دفعات کے تابع ہیں نہ کہ اس سے آزاد۔

ایسی حالت میں دستور کی دفعہ ۴۴ کا حوالہ دے کر حکومت سے یہ کہنا کہ وہ یکساں سول کوڈ کو بذریعہ قانون ملک میں نافذ کرے، خود دستور کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ جب تک ملک میں کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس قسم کی قانون سازی کو اپنے مذہب میں بے جا مداخلت قرار دیتا ہے، اس وقت تک خود دستور کی رو سے ایسا قانون بنانا ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی پارلیمنٹ ایسا قانون بنائے اور ملک کا کوئی مذہبی گروہ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں مرافعہ کرے تو عدالت عالیہ جو دستور کی محافظ ہے، وہ یقینی طور پر ایسے قانون کو کالعدم قرار دے دے گی۔

دستور ہند میں مذہبی آزادی کی دفعہ کوئی سادہ بات نہیں ہے۔ یہ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) کے تحت ہے جس کو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ میں جاری کیا تھا، اور جس کا ایک مستقل ممبر ہندستان بھی ہے۔ اس منشور کے آرٹیکل ۱۸ میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ہر آدمی کو مذہب کی آزادی ہوگی۔ اس میں مذہب بدلنے کی آزادی اور اپنے پسندیدہ مذہب پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہندستان نے اس عالمی منشور پر قومی حیثیت سے اپنا دستخط ثبت کیا ہے۔ اس طرح مذہبی آزادی ہر ہندستانی شہری کا ایک ایسا حق بن جاتی ہے جس کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب اور پرسنل لا

سپریم کورٹ کی مذکورہ دو رکنی ڈویژن بنچ کے ۱۳ صفحہ کے فیصلہ (مئی ۱۹۹۵) میں اس قسم کی قانون سازی کا جواز یہ کہہ کر نکالا گیا ہے کہ نکاح و طلاق کے معاملہ کا تعلق مذہب سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ملکی قانون سے ہے۔ جسٹس کلدیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ دستور کی دفعہ ۴۴ اس تصور پر مبنی ہے کہ مہذب سماج میں مذہب اور پرسنل لا کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں۔ اس کی دفعہ ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے جب کہ دفعہ ۴۴ سماجی تعلقات اور پرسنل لا کو مذہب سے الگ کر رہی ہے :

Article 44 is based on the concept that there is no necessary connection between religion and personal law in a civilised society. Article 25 guarantees religious freedom whereas Article 44 seeks to divest religion from social relations and personal law.

یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ مذہب کا تعلق، تمام علما مذہب کے اتفاق کے مطابق، تین چیزوں سے ہے۔ عقیدہ، عبادت، اخلاقی اقدار (ethical values) اور اخلاقی اقدار میں بلاشبہ یہ بات سرفہرست ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان جائز جنسی تعلق کی صورت کیا ہو۔ نکاح کا تعلق اسی اخلاقی مسئلہ سے ہے، اس لیے وہ لازمی طور پر مذہب میں شامل ہے۔

مذہب اور پرسنل لا کا یہ تعلق اتنا زیادہ واضح ہے کہ خود ڈویژن بنچ کے اسی فیصلہ میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ چنانچہ بنچ کے دوسرے رکن جسٹس آر این سہاے اپنے علاحدہ فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ شادی، وراثت، طلاق، کنورزن اپنی نوعیت اور حیثیت میں اتنا ہی مذہبی ہیں جتنا کہ عقیدہ۔ آگ کے کنارے سات پھیرا کرنا یا قاضی کے سامنے ایجاب و قبول کرنا بھی اتنا ہی عقیدہ اور ضمیر کا مسئلہ ہے جتنا کہ خود عبادت :

Marriage, inheritance, divorce, conversion are as much religious in nature and content as any other belief or faith. Going round the fire seven rounds or giving consent before Qazi are as much matter of faith and conscience as the worship itself.

۱۸ الرسالہ ستمبر ۱۹۹۵

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دلیل سے نکاح کے معاملہ کو مذہب سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب نکاح و طلاق کا معاملہ مذہب کا معاملہ ہے تو دستور کی دفعہ ۲۵ کے مطابق، کسی بھی پارلیمنٹ یا کسی بھی ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی گروہ کے اس مسلّمہ حق کو اس سے چھین لے اور اس کی مرضی کے بغیر اس کے اوپر ایسا قانون نافذ کرے جو مذکورہ دفعہ کے مطابق، اس کے مذہبی معاملہ میں مداخلت کے ہم معنی ہو۔

کامن کوڈ اور قومی ایکتا

کامن سول کوڈ کا مقصد کیا ہے۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں کہے گا کہ کامن کوڈ برائے کامن کوڈ (common code for the sake of common code) ہمارا مقصد ہے۔ پھر اس کا اصل مقصد کیا ہے، اس کے تمام وکیل متفقہ طور پر اس کا ایک ہی فائدہ بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں باہمی قربت پیدا ہوگی۔ اور مشترک قومیت کو وجود میں لانے میں مدد ملے گی۔ کامن کوڈ لوگوں کے اندر کامن فیلنگ پیدا کرے گا۔ اس طرح وہ مضبوط انڈین نیشن وجود میں آجائے گی جس کا پچاس سال سے ہم کو انتظار ہے۔

مگر یہ محض قافیہ بندی کی بات ہے۔ صرف لفظی اشتراک کی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کامن کوڈ سے کامن فیلنگ کا ظہور ہوگا۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی رشتہ نہیں۔ تمام متعلق حقائق اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔

جسٹس کلدیپ سنگھ اپنے فیصلہ میں لکھتے ہیں کہ حکومت نے ہندوؤں کے روایتی قانون کو کوڈ کی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ ہندو میریج ایکٹ ۱۹۵۵، ہندو سکسشن ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو مائناریٹی اینڈ گارجین شپ ایکٹ ۱۹۵۶، ہندو اڈاپشن اینڈ مینٹیننس ایکٹ ۱۹۵۶ بنایا جاچکا ہے۔ ان قوانین نے روایتی ہندو قانون کی جگہ لے لی ہے جو کہ مختلف مکاتب فکر اور مذہبی کتابوں پر مبنی تھا۔ ان جدید قوانین نے ان سب کو ایک یونیفارم کوڈ کی حیثیت دے دی ہے۔ جب ۸۰ فی صد سے زیادہ شہری پہلے ہی سے مشترک پرسنل قانون کے تحت لائے جاچکے ہیں تو اب اس کا کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کو مزید التوا میں ڈالا جائے (صفحہ ۲)

جسٹس کلدیپ سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ آخر حکومت کو کتنا زیادہ وقت چاہیے کہ وہ دستور ہند کی

دفعہ ۴۴ کے تحت دی ہوئی ہدایت کی تعمیل کرے۔ ہندوؤں کا روایتی قانون، ہندوؤں کا پرسنل لا جس کا تعلق وراثت، جانشینی اور شادی بیاہ سے ہے، بہت پہلے ۵۶ - ۱۹۵۵ میں قانونی کوڈ کی صورت اختیار کر چکا۔ اب کسی بھی قسم کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے کہ ملک میں یونیفارم پرسنل لا کے نفاذ میں غیر متعین تاخیر کی جائے۔ ہندوؤں کا پرسنل لا، جس کا تعلق شادی، جانشینی وغیرہ سے ہے، وہ سب اسی طرح مقدس سمجھے جاتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں یا عیسائیوں کے قانون۔ مگر ہندو اور ان کے ساتھ سکھ، بدھسٹ اور جینی فرقہ نے قومی اتحاد اور استحکام کی خاطر اپنے جذبات کو بھلا دیا۔ تاہم کچھ اور فرقوں نے ابھی ایسا نہیں کیا ہے، اگرچہ دستور پورے ہندستان میں ایک ہی کامن سول کوڈ نافذ کرنے کی تاکید کرتا ہے (صفحہ ۲۱ - ۲۲)

جسٹس کلدیپ سنگھ کے فیصلہ کا جو اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اس موصوف کے نزدیک ملک کی بہت بڑی اکثریت (۸۰ فی صد سے زیادہ) اس مشترک عائلی قانون کے تحت بالفعل لائی جا چکی ہے جس کے لیے وہ مکمل قسم کا یکساں پرسنل قانون بنانے کی پُرزور وکالت کر رہے ہیں۔ پھر جب آبادی کی اتنی بڑی اکثریت میں مطلوب قانون عملاً آچکا ہے تو اس کے وہ مثبت نتائج کہاں ہیں جو اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی ہر سطح پر قومی یک جہتی کا فقدان ہے۔ لوگوں میں کوئی نیشنل کیرکٹر نہیں۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اجلاس کے دوران ایسے ہنگامے ہوتے ہیں کہ کارروائی کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گاؤں پنچایتوں میں پہلے سے بھی زیادہ جھگڑے ہو رہے ہیں۔ عدالتوں میں نزاعی مقدمات کی بھرمار ہے۔ دو مختلف فرقوں سے بھی زیادہ ایک ہی فرقہ کے مختلف طبقات میں ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اکثر ریاستوں میں علاقائی ہنگامے جاری ہیں۔ حتیٰ کہ کئی ریاستوں میں علاحدگی کی متشددانہ تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کا سول قانون ایک ہی ہے۔ مگر ان جماعتوں نے اتنے بڑے پیمانہ پر باہمی لڑائی جاری کر رکھی ہے کہ ملک کا استحکام شدید طور پر خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ خود سپریم کورٹ کے مذکورہ جج صاحبان کے فیصلہ کے مطابق، اصل مسئلہ کامن کوڈ کے نفاذ کا نہیں ہے، بلکہ کامن کوڈ کے نفاذ کے باوجود نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم دوسری تدبیر تلاش کریں نہ کہ ناکام ہو جانے والی تدبیر کے مزید بے سود اعادہ پر اپنا وقت ضائع کریں۔

باہمی تفریق برٹش کی دین

آج جس "کامن فیلنگ" کی بات کی جارہی ہے وہ اس سے پہلے صدیوں سے ہمارے ملک میں پوری طرح موجود تھی۔ ملک کے مختلف فرقے مل جل کر محبت کے ساتھ باہم زندگی گزارتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کامن سول کوڈ جیسی کسی چیز کا سرے سے کوئی وجود نہ تھا۔ ہر فرقہ کی کلچرل شناخت الگ تھی، اور ہر ایک اپنی اپنی مذہبی روایت کے مطابق شادی بیاہ کی رسوم ادا کرتا تھا۔ پھر بھی وہ چیز پوری طرح موجود تھی جس کو قومی یک جہتی کہا جاتا ہے۔

ہندستانی سماج کے اس توازن کو جس چیز نے برہم کیا وہ کوئی غیر کامن کوڈ نہیں تھا، بلکہ سابق برٹش حکومت کی وہ پالیسی تھی جس کو سابق لفٹنٹ جنرل کوک (General Coke) نے فارمولے کی صورت دیتے ہوئے کہا تھا کہ لڑاؤ اور حکومت کرو:

Divide and rule

اس غیر مطلوب صورت حال کا ابتدائی آغاز لارڈ ایلگن (James Bruce Elgin) کے زمانہ میں ہوا جو ۶۳-۱۸۶۲ میں ہندستان کا وائسرائے تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر وڈ (Wood) نے لندن سے نئی دہلی میں مقیم وائسرائے کو خط لکھا کہ:

We have maintained our power in India by playing off one part against the other and we must continue to do so. Do all you can, therefore, to prevent all having a commoh feeling.

ہم نے ہندستان میں اپنا اقتدار وہاں کے ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف لڑا کر باقی رکھا ہے۔ ہمیں ایسا کرتے رہنا چاہیے۔ اس لیے لوگوں کو مشترک احساس سے روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرو

(دی ہندستان ٹائمس ۳۰ مارچ ۱۹۹۵)

برٹش حکمرانوں کی یہی سوچی سمجھی پالیسی تھی جس نے ہندستان کی بنی بنائی مشترک قومیت کو بکھیر دیا۔ انھوں نے ہر موقع کو استعمال کر کے لوگوں کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ انھوں نے حکومت کے تمام ذرائع سے کام لے کر باہمی نفرت کا ایک مصنوعی جنگل اگا دیا۔ بد قسمتی سے آزادی کے بعد بھی یہ آگ بجھائی نہ جا سکی۔ اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہی اس کی اصل وجہ ہے۔ اس کے علاوہ یونیفارم سول کوڈ کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یکساں کوڈ یکسانیت کا ذریعہ نہیں

یکساں کوڈ کا کوئی بھی تعلق یکسانیت یا باہمی اتحاد سے نہیں۔ ایک ہی سول کوڈ کو اپنانے والے بار بار آپس میں لڑتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، قدیم ہندستان میں کورو اور پانڈو دو رشتہ دار خاندان تھے، دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں وہ عظیم جنگ ہوئی جس کو مہا بھارت کہا جاتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اعلان کیا ہے کہ دہلی کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے اگلے الکشن میں وہ قاتلانہ جبلت (killer instinct) کے ساتھ مہا بھارت برپا کرے گی (ٹائمس آف انڈیا ۲۴ جولائی ۱۹۹۵) اس نئی مہا بھارت کے دونوں فریق دوبارہ وہی لوگ ہیں جن کا سول کوڈ بالکل یکساں ہے۔

پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں ایک طرف جرمنی اور اٹلی وغیرہ تھے، اور دوسری طرف برطانیہ اور فرانس وغیرہ۔ دونوں گروہوں میں ہلاکت خیز جنگ ہوئی۔ حتی کہ مرنے اور شدید طور پر زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۰ ملین تک پہنچ گئی۔ یہ دونوں جنگ آزما فریق عیسائی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے یہاں وہی سول کوڈ رائج تھا جو کہ دوسرے کے یہاں رائج تھا۔ مگر یہ قانونی یکسانیت دونوں کو آپس میں لڑنے سے روکنے والی ثابت نہیں ہوئی۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۵-۱۹۳۹) میں ایک فریق کا قائد جرمنی تھا، اور دوسرے فریق کا قائد برطانیہ۔ دونوں کا کلچر اور سول کوڈ ایک تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف تاریخ کی سب سے زیادہ ہولناک جنگ لڑی۔ دونوں کا "یکساں سول کوڈ" کو ماننا انھیں باہمی جنگ سے روکنے والا نہ بن سکا۔

سابق وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کو ۱۹۸۴ میں کچھ لوگوں نے مار ڈالا، جبکہ قاتل اور مقتول دونوں کا سول کوڈ ایک تھا۔ پنجاب میں علٰحدگی کی خونیں لڑائی جن دو فریقوں کے درمیان جاری ہوئی وہ دونوں ایک ہی سول کوڈ کو ماننے والے تھے۔ ہر دن اخبار میں شوہروں اور بیویوں کے درمیان ظالمانہ سلوک کے واقعات چھپتے رہتے ہیں، جبکہ دونوں کے دونوں ایک ہی سول قانون سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں کروروں ہندستانی ایک دوسرے کے خلاف سنگین الزامات لگا کر قانونی لڑائی لڑ رہے ہیں، حالاں کہ بیشتر حالت میں دونوں فریقوں کا سول کوڈ ایک ہی ہوتا ہے۔ وغیرہ

حقیقت یہ ہے کہ ہم آہنگی اور باہمی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ کا بے فائدہ ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ کوئی نیا قانون بنا کر از سر نو اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دانشوران قوم کا ردعمل

سپریم کورٹ آف انڈیا کی ڈویژن بنچ کا فیصلہ (۱۰ مئی ۱۹۹۵) اخباروں میں چھپا تو برادران وطن اور دانشوران قوم کا ردعمل کثرت سے سامنے آیا۔ ایک طبقہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو اس طرح لیا گویا کہ یہ ملک کے موجودہ سماجی مسائل کا کوئی حتمی حل ہے۔ تاہم ان میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنھوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اور کسی ایک یا دوسری وجہ سے اس کو رد کر دیا۔ اس دوسرے طبقہ کے چند حوالے حسب ذیل ہیں۔

1. Politics of Uniform Civil Code
   by Partha S. Ghosh
   The Hindustan Times, New Delhi, May 22, 1995
2. Living with Religion
   by Kuldip Nayyar
   The Statesman, New Delhi, May 31, 1995
3. Uniform Civil Code: Judiciary Oversteps its Brief
   by H.M. Seervai
   The Times of India, New Delhi, July 5, 1995
4. Personal Laws: Uniformity no Essential
   by Balraj Puri
   Indian Express, New Delhi, July 6, 1995
5. Civil Code: The Constitutional Perspective
   by K.C. Markandan
   The Hindustan Times, New Delhi, June 19, 1995.

نمونہ کے طور پر مسٹر بلراج پوری کے مذکورہ مضمون کے کچھ حصے یہاں اصل انگریزی میں نقل کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کامن سول کوڈ کے تصور کو پوری طرح رد کر دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :

سپریم کورٹ کے معزز ججوں نے قومی اتحاد کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس کی حمایت میں انھوں نے جو دلائل دیے ہیں، اس پر میرا اعتراض بہت بنیادی ہے۔ میرے نزدیک جج صاحبان، قومی تعمیر کے عمل میں برعکس طور پر اثر انداز ہوئے ہیں، ہندستانی قوم کے مشترک کردار پر اور مسلمانوں کے درمیان نیز مسلمانوں اور دوسرے فرقوں، خاص کر ہندوؤں کے ساتھ ڈائیلاگ پر جو کہ اس کے پرسنل لا کی اصلاح کے سوال پر جاری تھا۔ یہ کہہ کر کہ مسلم پرسنل لا کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کو یکساں قانون کا حصہ نہ بنایا جائے، جج صاحبان نے مسلم خواتین کے معاملہ کو مسلمانوں کے علاحدہ تشخص کے تابع کر دیا ہے۔ اور اس طرح انھوں نے ایک اچھے مقصد کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔

یکسانیت اور اصلاح کے درمیان قطعی طور پر کوئی بھی منطقی ربط نہیں۔ اول الذکر کے خلاف کیس اتنا ہی ناقابل تردید ہے جتنا کہ وہ مؤخر الذکر کے معاملہ میں ہے۔ یکساں سول کوڈ، قومی اتحاد اور استحکام کے فروغ کے لیے کوئی قطعی چیز نہیں، جیسا کہ جج صاحبان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دستور ہند کی اسٹیٹ لسٹ میں ۶۶ اندراجات ہیں اور کانکرنٹ لسٹ میں ۴۷ اندراجات ہیں، جن کے معاملہ میں ریاستوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ الگ الگ قوانین بنا سکتی ہیں، اور ان میں یکسانیت ضروری نہیں ہے۔ اگر ریاستوں کی جغرافی اور ثقافتی عدم یکسانیت کی بنیاد پر بنائے جانے والے غیر یکساں قوانین ملک کے اتحاد کے لیے خطرہ نہیں ہیں تو غیر جغرافی نوعیت کے مذہبی گروہوں میں عدم یکسانیت سے وہ کیوں خطرہ بن جائیں گے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی فرقہ مذہب کی بنیاد پر اپنے لیے علٰحدہ وجود کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ مگر کیا ہم نے زبان کی بنیاد پر علٰحدہ وجود کا اقرار نہیں کیا ہے اور زبان کی بنیاد پر از سر نو ملک کی تنظیم نہیں کی ہے۔ کیا منڈل اصول کے تحت ذات کی بنیاد پر تشخص کو سیاسی جواز نہیں دیا گیا ہے۔ پھر معزز جج کیوں استثنائی طور پر صرف مذہبی گروہ کو علٰحدہ تشخص کا حق دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ ایک غیر منطقی روش ہے، اور سماجی اور سیاسی اعتبار سے مسلّم حقائق کے خلاف ہے۔ کیا یہ تشخص محض ایک جج کے اعلان سے ختم ہو جائے گا۔ (انڈین اکسپریس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

There is absolutely no logical connection between uniformity and reform. The case against the former is as unassailable as it is for the latter. Nor is uniform law imperative, as the judges argue, for the promotion of national unity and solidarity. There are a number of 66 entries in the State List and 47 in the Concurrent List of the Constitution on which States are empowered to make laws without any obligation to conform to uniformity. If diversity of laws, based on geographical and cultural diversities of the States, has not threatened the unity of the country, would it be threatened only if the diversities are of non-territorial form as are religious communities?

Justice Kuldip Singh has proclaimed that no community could claim to remain a separate entity on the basis of religion. Have not we conceded separate entities based on languages and reorganised the country on a linguistic basis? Have not caste-based identities been recognised in the Mandal principle and all identities, cultural, tribal, caste and religious acquired political legitimacy? Why does the honourable judge single out the claim of a religious community for a distinct identity? It defies logic and socially and politically the accepted reality. Can this identity disappear by a mere pronouncement of a judge?

گرو گولوالکر کے خیالات

آر ایس ایس کے سابق سرسنچالک گرو گولوالکر نے ۲۰ اگست ۱۹۷۲ کو دہلی میں دین دیال ریسرچ ٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی اتحاد کے لیے یکساں سول کوڈ ری ضروری چیز نہیں۔ ان کی یہ تقریر مدر لینڈ (۲۱ اگست ۱۹۷۲) میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ہفت روزہ آرگنائزر ۲۶ اگست ۱۹۷۲) میں اس موضوع پر ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ یہ رپورٹ انگریزی میں اگلے صفحات میں رج کی جارہی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا :

میں نہیں سمجھتا کہ نیشنلزم کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہمیں یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی انونی یکسانیت کا قومی اتحاد سے کوئی تعلق نہیں۔ انڈیا ہمیشہ تنوع کا ملک رہا ہے۔ اس کے باوجود لمبی رت سے ہم ایک طاقتور اور متحد قوم بنے رہے۔ اتحاد کے لیے ہمیں ہم آہنگی کی ضرورت ہے نہ کہ یکسانیت کی۔ برا احساس یہ ہے کہ فطرت زیادہ یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ ہمارے پاس زندگی کا بہت لمبا تجربہ ہے، اور ہمارا بحربہ یہ ہے کہ تنوع اور اتحاد دونوں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دستور ہند میں ایک دفعہ یکساں سول کوڈ کے حق میں موجود ہے۔ مگر ایک چیز محض اس لیے پسندیدہ نہیں ہوجاتی کہ وہ کسی دستور میں لکھی ہوئی ہے۔ ہر حال ہمارا دستور کچھ بیرونی دستوروں کا ملغوبہ ہے۔ اس کو ہندستانی تجربات کی روشنی میں نہیں بنایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان یکساں سول کوڈ کے مخالف ہیں، کیوں کہ وہ اپنا علٰحدہ تشخص باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی بھی طبقہ یا فرقہ جو اپنا الگ تشخص چاہتا ہو اس سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، جب تک یہ تشخص حب وطن کے جذبات کو گھٹانے والا نہ ہو۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ احساسات ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو اپنے طریق زندگی پر رہنے کا پورا حق ہے، البتہ انھیں ملک سے اور اس کے کلچر سے محبت کرنا چاہیے۔ ہندوؤں کے لیے بھی یکساں سول قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ آخر ہزاروں سال سے ہندو اس قسم کے فرق کے باوجود مل جل کر رہ رہے ہیں۔

کسی کو یہ بات فلسفیانہ معلوم ہوسکتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یکسانیت قوموں کے لیے موت کی نشانی ہے۔ فطرت یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک ہر طریق زندگی کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ البتہ ان تمام تنوعات کو قومی اتحاد میں مددگار ہونا چاہیے۔

Q. Don't you thing that Muslims are opposing a uniform civil code only because they want to maintain their separate identity?

A. I have no quarrel with any class, community or sect wanting to maintain its identity so long as that identity does not detract from its patriotic feeling. I have a feeling that some people want a uniform civil code because they think that the right to marry four wives is causing a disproportionate increase in the Muslim population. I am afraid this is a negative approach to the problem.

The real trouble is that there is no feeling of brotherliness between Hindus and Muslims. Even the secularists treat the Muslims as a thing apart. Of course their method is to flatter them for their bloc votes. Others also look upon them as a thing apart, but they would like to flatten out the Muslims by removing their separate identity. Basically there is no difference between the flatterers and the flatteners. They both look upon Muslims as separate and incompatible.

My approach is entirely different. The Muslim is welcome to his way of life so long as he loves this country and its culture. I must say the politicians are responsible for spoiling the Muslims. It was the Congress which revived the Muslim Leage in Kerala and thus caused the increase of Muslim communalism throughout the country.

Q. If we carry this argument backwards, even the codification of the Hindu law would be considered unnecessary and undesirable.

A. I certainly consider the codification of Hindu law as altogether unnecessary for national unity and national integration. Throughout the ages we had countless codes—and we were not any the worse for them. Till recently Kerala had the matriarchal system. What was wrong with that? All law-givers. ancient and modern, are agreed the custom does, and must, prevail over the law.

"Custom is more effective than shastras", say the shastras. And custom is the local or group code. All societies recognise the validity ,of the local custom or code.

Q. If a uniform civil law is not necessary, why is a uniform criminal law necessary?

A. There is a difference between the two. The civil law concerns mainly the individual and his family. The criminal law deals with the law and order and thousand other things. It concerns not only the individual but also the society at large.

Q. Would it really be correct to allow our Muslim sisters to remain in purdah and be subjected to polygamy?

A. If your objection to Muslim practices is on humanitarian grounds, then that becomes a valid objection. A reformist's attitude in these matters is allright. But a mechanical leveller's attitude would not be correct. Let the Muslims evolve their old laws. I will be happy when they arrive at the conclusion that polygamy is not good for them, but I would not like to force my view on them.

Q. This seems to be a deep philosophical question.

A. It very much is. I think uniformity is the death-knell of nations. Nature abhors uniformity. I am all for the protection of various ways of life. However, all this variety must supplement the unity of the nation and not range itself against it.

(Reproduced from *Manthan*, New Delhi, July 1986)

Golwalkar on Uniform Civil Law

On August 20, 1972, Shri Guruji, Sarsanghachalak, RSS, inaugurated the Deendayal Research Institute in Delhi. On this occasion he said that a uniform civil code was not necessary for national unity. *The Motherland* of New Delhi carried the following report on August 21, 1970

> New Delhi, August 20—Shri M.S. Golwalkar, Sarsanghachalak of Rashtriya Swayamsevak Sangh, said here today that the present-day Indian politicians lacked original thinking on the problems of Indian society.

Shri Guruji was speaking at the inauguration of the Deendayal Research Institute and the celebration of Sri Aurobindo Centenary by the Institute. Shri R.R. Diwakar, President, Gandhi Peace Foundation, presided. A huge elite audience attended the function in front of the Institute building on Rani Jhansi Road, Jhandewala.

Citing the example of politicians' efforts to solve problems without thinking, he referred to the question of uniform civil code for all in the country, and said that such a uniformity was not necessary in itself; Indian culture permitted diversity in unity. 'The important thing is to infuse a spirit of intense patriotism and brotherhood among all citizens, Hindu and non-Hindu, and make them love this motherland according to their own religion.

In a special interview with *Organiser*, Shri Guruji reiterated his above view. Here is the substance of the conversation, as published in that paper's issue of August 26, 1972:

Q. You don't think that a uniform civil code is necessary for promoting the feeling of Nationalism?

A. I don't. This might surprise you or many others. But this is my opinion. I must speak the truth as I see it.

Q. Don't you think that uniformity within the nation would promote national unity?

A. Not necessarily. India has always had infinite variety. And yet, for long stretches of time, we were a very strong and united nation. For unity, we need harmony, not uniformity.

Q. In the West the rise of nationalism has coincided with unification of laws and forging of other uniformities.

A. Don't forget that Europe is a very young continent with a very young civilisation. It did not exist yesterday and it may not be there tomorrow. My feeling is that nature abhors excessive uniformity. It is too early to say what these uniformities will do to Western civilisation in times to come. Apart from the here and the now, we must look back into the distant past and also look forward to the remote future. Many actions have long-delayed and indirect consequences. We in this country have millennia of experience. We have a tested way of life. And our experience is that variety and unity can, and do, go together.

Q. A Directive Principle of State Policy in our Constitution says that the State would strive for a uniform civil code.

A. That is all right. Not that I have any objection to a uniform civil code, but a thing does not become desirable just because it is in a Constitution. In any case our Constitution is a hotch-potch of some foreign constitutions. It has not been conceived and drafted in the light of Indian experience.

فطرت کا نظام

ذوق دہلوی (۱۷۸۹-۱۸۵۴) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہ فطرت کا قانون ہے۔ آپ کسی باغ میں کھڑے ہوں تو وہاں ہر پودے اور ہر پیڑ کا انداز جدا ہوگا۔ ہر درخت کا پھول الگ الگ رنگ میں اپنی بہار دکھا رہا ہوگا، پورا باغ تنوعات کا ایک مجموعہ نظر آئے گا۔ حتیٰ کہ چڑیاں بھی الگ الگ آوازوں میں اپنے نغمے سنا رہی ہوں گی۔ وہ کہہ رہی ہوں گی کہ خالق کو ایسا باغ پسند ہے جہاں کوئل کی کوک ہو تو بلبل کے چہچہے بھی ہوں۔ کوئی چڑیا ایک ڈھنگ کی آواز نکالے تو دوسری چڑیا کسی اور ڈھنگ سے فضا میں اپنے گیت بکھیرے۔ ہر چیز تنوع کا ایک نیا نمونہ ہو۔

یہ تنوع اس کائنات کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح انسان میں بھی۔ حیاتیات اور نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ نہ صرف انگوٹھے کے نشانات بلکہ ہر آدمی کے سیل دوسرے آدمی کے سیل سے جدا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کی آنکھ دوسرے آدمی کی آنکھ سے نہیں ملتی۔ یہ اختلاف و تنوع صرف ظاہری حسن کے لیے نہیں ہے۔ اس کے اندر زبردست حکمت چھپی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی تنوع اور اختلاف سے تمام انسانی ترقیاں وابستہ ہیں۔ اسی سے نئی نئی دریافتیں سامنے آتی ہیں۔ اسی سے افکار کا تصادم ہوتا ہے جو آخر کار فکری ارتقار کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی سے باہمی چیلنج پیش آتے ہیں جو انسان کی ذہنی بیداری کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

کسی مجلس میں تمام شرکار کی رائے ایک ہو تو اس سے کوئی نیا آئیڈیا برآمد نہیں ہوگا۔ کسی صنعتی نظام میں اگر تمام انجینیر ایک ہی مولڈ میں ڈھلے ہوئے ہوں تو وہ کسی نئی ٹکنالوجی تک نہیں پہنچ سکتے۔ کسی سماج میں اگر تمام اہل قلم یکساں ذوق کے مالک ہوں تو وہ کوئی تخلیقی ادب ظہور میں نہیں لاسکتے۔ کسی ملک کے سیاست داں اگر سب کے سب ایک ہی سانچہ میں ڈھل کر نکلے ہوں تو وہ کوئی بڑا سیاسی کارنامہ نہیں دکھا سکتے۔

تنوع اور اختلاف اس دنیا کا عام قانون ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں خود اپنے زور پر جاری و ساری ہے۔ کوئی انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی طاقت کے زور پر اس نظام کو بدلے تو فطرت کا طوفان اس مصنوعی نظام کو توڑ کر دوبارہ اس کو تنوع کے اصول پر قائم کر دے گا۔

قابل عمل نہیں

حقیقت یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ ایک ناقابل عمل خواب ہے، اس کا داخلی ثبوت خود دستور ہند کے اندر موجود ہے۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو دستور کی دفعہ ۴۴ اور ۳۷۱۔ اے کے تقابل کے ذریعہ سامنے آتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دستور کی دفعہ ۴۴ میں مقرر کیا گیا ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کے لیے بلا استثنار ایک ہی یونیفارم سول کوڈ بنایا جائے۔ مگر اسی دستور کی ترمیمی دفعہ ۳۷۱۔ اے کہتی ہے کہ ناگالینڈ میں ناگاؤں کے درمیان جو مذہبی اور سماجی قاعدے رائج ہیں اور ان کے یہاں جو مختلف روایتی قوانین ہیں، ان کے بارہ میں پارلیمنٹ کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ ریاست ناگالینڈ میں وہ بدستور قابل نفاذ رہیں گے۔ اِلّا یہ کہ خود ناگالینڈ کی اسمبلی ان کے بارہ میں ایک تجویز کے ذریعہ ایسا طے کرے:

No Act of Parliament in respect of (Naga customary laws) shall apply to State of Nagaland unless the Legislative Assembly of Nagaland by a resolution so decides (371-A).

ظاہر ہے کہ ان دونوں دفعات میں تضاد ہے۔ یہ تضاد اسی لیے ہے کہ ہمارے دستور سازوں نے بزعم خود جامع دستور بنانے کے لیے محض تخیل کے زور پر اس میں مختلف چیزیں اکٹھا کر دیں جو حقیقت کی دنیا میں کبھی اکٹھا ہونے والی نہ تھیں۔ غالباً اسی لیے دستور ساز اسمبلی کے ایک سینئر ممبر سر الادی کرشنا سوامی آئر نے دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل کا قانون ساز ادارہ ہو سکتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سرے سے اس کی کوشش ہی نہ کرے:

The future Legislatures may attempt a uniform civil code or they may not. (Sir Alladi Krishnaswami Aayyar)

قانون کی محدودیت

قانون کوئی بالاتر چیز نہیں۔ دوسری تمام انسانی چیزوں کی طرح انسانی قانون بھی ایک محدود چیز ہے۔ ایک حد کے بعد انسانی سماج پر اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۵ میں الہ آباد ہائی کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ اس میں اندرا گاندھی کے انتخاب کو نہ صرف رد کیا گیا تھا بلکہ اندرا گاندھی کو چھ سال تک انتخاب میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا

گیا تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کرکے مزید اضافہ کے ساتھ دہلی کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۸۶ میں یوپی کی ایک عدالت نے اپنے فیصلہ کے تحت بابری مسجد کا بند دروازہ کھلوا دیا تاکہ ہندو آسانی کے ساتھ اس کے اندر پوجا کی رسم ادا کر سکیں۔ بظاہر اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوش گوار تعلق قائم کرنا تھا۔ مگر اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد ایسا طوفان برپا ہوا کہ ہندو مسلم تعلقات آخری حد تک بگڑ گئے اور ہندستان سیاسی اور اقتصادی تباہی کے کنارے پہنچ گیا۔

شاہ بانو کیس میں ۱۹۸۵ میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا۔ بظاہر اس کا مقصد عورتوں کے ساتھ انصاف کرنا تھا، مگر عملی نتیجہ یہ ہوا کہ راجیو گاندھی گورنمنٹ نے ایک قانون بنا کر سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو کالعدم کر دیا۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس معاملہ کو بھرپور طور پر اپنے سیاسی فائدہ کے لیے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ہندستانی پارلیمنٹ میں اس کے ممبروں کی تعداد دو سے بڑھ کر ۱۱۹ تک پہنچ گئی اور کئی ریاستوں میں اس کی حکومت قائم ہو گئی۔

قانون کی محدودیت اس سے بھی ثابت ہے کہ ہندو کوڈ بل ۱۹۵۵ میں اگرچہ کسی ہندو کے لیے صرف ایک ہی نکاح کی اجازت رکھی گئی ہے۔ مگر ۱۹۶۱ کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی شرح ہندوؤں کے اندر مسلمانوں سے زیادہ ہے :

According to the Indian census report of 1961, the percentage of Hindus having more than one wife was more than that of the Muslims.

انگریزوں نے ہندستان میں اپنے دو سو سالہ اقتدار کے زمانہ میں صرف پانچ سو قانون بنائے۔ ہمارے لیڈروں کو ملک میں ۱۹۴۷ میں اقتدار ملا تو انھوں نے ۴۵ سال کی مدت میں پانچ ہزار سے زیادہ قانون بنا ڈالے۔ مگر اصلاحی قوانین کی کثرت صرف الٹا نتیجہ دینے والی (counter-productive) ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ملک میں جھگڑے بہت بڑھ گئے۔ کرپشن میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ انصاف حاصل کرنا انتہائی دشوار کام بن گیا۔ عورتوں کی حالت ہمیشہ سے زیادہ خراب ہو گئی۔ یہ حالات سماج سدھار کے لیے نئی تدبیر تلاش کرنے کا تقاضا کرتے ہیں نہ کہ قوانین میں مزید اضافے کا۔

تبدیلیٔ مذہب کا مسئلہ

سپریم کورٹ کی ڈویژن بنچ کے سامنے جو پٹیشن تھا اس کا براہ راست کوئی تعلق یونیفارم سول کوڈ سے نہیں تھا۔ یہ پٹیشن در اصل چار ہندو خواتین کی طرف سے عورتوں کی ایک تنظیم کلیانی (Kalyani) نے دائر کیا تھا۔ اس تنظیم کی پریسیڈنٹ شریمتی سرلا مدگل ہیں۔ ان چار ہندو عورتوں نے کہا تھا کہ ہمارے شوہروں نے اسلام قبول کرکے دوسرا نکاح کر لیا ہے، جب کہ انھوں نے ہمیں طلاق نہیں دی۔ ان کا قبول اسلام صرف اس لیے تھا کہ وہ اسلام کے قانون نکاح سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دوسری بیوی حاصل کر سکیں۔ اس لیے عدالت ان کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے کر ہماری مدد کرے۔

عدالت نے مذکورہ پٹیشن کو منظور کرتے ہوئے چاروں ہندوؤں کے دوسرے نکاح کو کالعدم قرار دے دیا۔ اور ان کو ان کی پہلی بیوی کی طرف واپس لوٹا دیا۔ یہ فیصلہ دیتے ہوئے جسٹس کلدیپ سنگھ لکھتے ہیں :

جب تک ہم اصل منزل تک نہ پہنچیں، یعنی ہندستان کے تمام شہریوں کے لیے یونیفارم سول کوڈ، اس وقت تک یہاں ہندو شوہر کے لیے ایک کھلا محرک (inducement) باقی رہے گا جو کہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہو۔ جب کہ اس کی پہلی بیوی ابھی موجود ہو، ایسا ہندو اپنے مسلم ہونے کا اعلان کرکے دوسری شادی کرے گا۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے یک زوجگی کا قانون ہے، اور مسلم قانون چار شادیوں تک کی اجازت دیتا ہے، کوئی کج رو ہندو شوہر ایسا کر سکتا ہے کہ وہ اسلام قبول کرلے تاکہ ہندو لا کے ضوابط سے بچ سکے اور دوسری شادی کے باوجود فوجداری قانون کی پکڑ میں نہ آئے۔ (صفحہ ۵)

اسی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہوئے دی ہندستان ٹائمس ۲۱ جون ۱۹۹۵ میں لیٹرس کے کالم میں مسٹر چمن لال ورما نے لکھا تھا کہ یکساں سول کوڈ کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان لوگوں کو مذہب کے غلط استعمال سے روکا جا سکے جو ایک قانون کی دفعات سے بچنے کے لیے دوسرے قانون کی دفعات کا سہارا لیتے ہیں :

A uniform civil code is required to prevent the misuse of religion to evade the provisions of one law to take advantage of those of another.

نیا قانون بنانا کسی بھی درجہ میں پچھلے قانون کے غلط استعمال کے خلاف چیک نہیں۔ قانون کے غلط استعمال کا موقع ہر حال میں باقی رہتا ہے۔ ٹیکس ماری کو روکنے کے لیے بے شمار قوانین اور ضوابط بنے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ٹیکس ماری کا سلسلہ ہمالیائی سطح پر جاری ہے۔ پھر جب کسی بھی قانون میں اس کے غلط استعمال کو روکنا ممکن نہ ہو سکا تو سول کوڈ میں کیونکر ایسا ممکن ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ یونیفارم سول قانون کے نفاذ کے بغیر اگر ایسے ہندوؤں کے لیے کوئی قانونی چیک نہیں ہے تو سپریم کورٹ کے فاضل جج صاحبان کے لیے کیوں کر ایسا ممکن ہوا کہ وہ ایسے غلط ہندوؤں کے لیے سزا کا فیصلہ سنائیں اور ان کے دوسرے نکاح کو باطل (invalid) قرار دے دیں۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے جج صاحبان نے اپنا مقصد انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۴۹۴ کے ذریعہ حاصل کیا۔ گویا عدالت کی خود اپنی مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بالفعل ایسے مانع قوانین موجود ہیں۔ اور کج رو ہندو کے لیے یہاں کوئی بے قید محرک پایا نہیں جاتا، حتی کہ موجودہ قوانین کے تحت بھی نہیں۔ پھر ایسے کج رو لوگوں کو کج روی سے روکنے کے لیے کسی نئے سول قانون کی کیا ضرورت :

The Court's own ruling shows that no such inducement is available to an "errant Hindu" even under existing law. You do not need a civil code to deter him.

دفعہ ۴۴ قابل حذف

اوپر میں نے جو تجزیہ کیا ہے اور جو دلائل جمع کیے ہیں، اس کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کی کوئی بھی قانونی یا اخلاقی یا سماجی معنویت نہیں۔ وہ کچھ دماغوں کا ایک فرضی تخیل تھا۔ اب اس کا واحد انجام یہ ہونا چاہیے کہ اس کو دستور سے حذف کر دیا جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح جسم کی فاضل آنت (Appendix) کا آپریشن کر کے اسے نکال دیا جاتا ہے۔

اس قسم کا دستوری آپریشن کوئی نئی چیز نہیں۔ دستور ہند میں بار بار ایسے حذف و اضافے کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدائی دستور میں انفرادی ملکیت کو مکمل طور پر محترم قرار دیا گیا تھا اور حکومت کو دستوری طور پر یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ کسی کی جائز ملکیت کو اس سے چھین سکے۔ مگر ۱۹۵۵ میں دستور میں چوتھا ترمیمی ایکٹ (The Constitution (Fourth Amendment) Act 1955)

منظور کیا گیا جس کی رو سے اسٹیٹ کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ کسی بھی شخص کی نجی ملکیت کو جبراً اپنے قبضہ میں لے لے۔ اس ایکٹ کی رو سے مالک جائداد کو اس حق سے بھی محروم کر دیا گیا کہ سرکاری معاوضہ اگر اس کو مارکٹ کی شرح سے کم معلوم ہو تو وہ عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کر سکے۔

اسی طرح ابتدائی دستور میں سابق راجاؤں کو صَرفِ خاص (privy purses) کا حق دیا گیا تھا مگر ۱۹۷۱ میں دستور میں ۲۶ ویں ترمیم کی گئی جس کی رو سے اس دفعہ کا خاتمہ کر دیا گیا اور صَرفِ خاص سے سلسلہ میں ان کو دیے ہوئے تمام دستوری حقوق کو یکسر ساقط کر دیا گیا۔ وغیرہ۔

ان نظائر کی روشنی میں یہ بات کسی بھی درجہ میں انوکھی نہیں ہے کہ ایک اور ترمیم کے ذریعہ دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کو کامل طور پر حذف کر دیا جائے۔ اس کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوگا۔ البتہ ہمارا دستور ایک ایسے بوجھ سے ہلکا ہو جائے گا جو غیر ضروری طور پر اس کے اوپر لاد دیا گیا تھا۔

یونی کلچرنیشن یا ملٹی کلچرنیشن

ہندستان میں پچھلے سو سال سے دو مختلف سیاسی گروپ موجود رہے ہیں اور آج بھی وہ الگ الگ ناموں کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک وہ جو سیکولر آئیڈیالوجی پر ملک کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا وہ جو ہندو آئیڈیالوجی پر ہندستانی سماج کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہندستان میں تمام لوگوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنایا جانا چاہیے۔

لیکن اگر غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھا جائے تو یونیفارم سول کوڈ دونوں ہی کے نظریات کے خلاف ہے۔ اگر وہ اپنے نظریہ میں مخلص ہوں تو ہرگز انھیں اس قسم کے تصور کی حمایت نہیں کرنا چاہیے۔

سیکولرزم کا مطلب ہے ــــــ مذہب کے معاملہ میں اسٹیٹ کا عدم مداخلت (non-interference) کی پالیسی اختیار کرنا۔ لوگوں کو اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی دیتے ہوئے صرف مشترک دنیوی امور کا انتظام و انصرام کرنا۔ یہی سیکولرزم کا عالمی سطح پر متفقہ مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے مطابق دستور ہند کی تشکیل کی گئی ہے۔

کچھ لوگ سیکولرزم کی تشریح اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ خود ایک مذہب ہے اور تمام مروجہ مذاہب کو ختم کر کے نجی دائرہ سے لے کر اجتماعی دائرہ تک زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دائرہ میں لینا چاہتا ہے۔

یہ انتہاپسندی ہے۔ اس قسم کے انتہاپسند لوگ ہر مذہب اور ہر نظام میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ خود اسلام
ایسے انتہاپسند لوگ موجود ہیں جو اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس میں اسلام سیاست اور جنگ
مذہب بن جاتا ہے۔ مگر یہ غلو اور تشدد ہے، وہ اسلام کی صحیح نمایندگی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیکولرزم اور یونیفارم سول کوڈ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔
ہندستان کا سیکولر گروپ اگر واقعۃً سیکولر گروپ ہے تو اس کو یونیفارم سول کوڈ کی بات نہیں کرنا
چاہیے۔ کیوں کہ انفرادی دائرہ میں مذہبی آزادی سیکولرزم کا بنیادی اصول ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندو آئیڈیالوجی کی بنیاد پر کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ اس گروہ کو جاننا چاہیے
کہ وہ ہندو آئیڈیالوجی میں عقیدہ رکھتا ہے تو یہ خود اس کے اپنے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ وہ ہر طبقہ اور
فرقہ کو ایک ہی سول کوڈ کے تحت لانے کی کوشش کرے۔

ہندو آئیڈیالوجی کا بنیادی اصول سرو دھرم سمبھاو ہے۔ یعنی سب دھرم سچے ہیں۔ ہندوازم
کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ کثرت میں وحدت (unity in diversity) کو مانتا ہے۔ اس کے
نزدیک حقیقت کے ظاہری فارم مختلف ہوتے ہیں مگر اندرونی حقیقت ایک ہوتی ہے۔ گویا ہندوازم
کا عقیدہ ہے ——— انیکتا میں ایکتا کو دیکھنا۔

سول کوڈ یا کسی بھی کوڈ کا تعلق ظاہری فارم سے ہے نہ کہ اندرونی اسپرٹ سے۔ ایسی حالت
میں یہ ہندو نقطۂ نظر کے خلاف ہوگا کہ مختلف گروپوں کے پرسنل لا کو ختم کر کے سب کے لیے صرف ایک
کوڈ جاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک (مثلاً برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ) میں ملٹی کلچرنیشن کا اصول رائج
ہے۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملک سے لے کر امریکہ جیسے بڑے ملک تک ہر جگہ اسی اصول کو اختیار کر کے
ترقی ہو رہی ہے۔ سوویت یونین غالباً واحد ملک ہے جہاں یونی کلچرنیشن بنانے کی کوشش کی گئی۔
اس کے لیے ہر قسم کی ریاستی طاقت استعمال کی گئی۔ مگر یونی کلچرنیشن تو نہیں بنی، البتہ خود سوویت یونین
ٹوٹ کر ختم ہوگیا۔ تاریخ عالم کے یہ تجربات ہماری آنکھ کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یکسانیت کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ قانون سے۔ اگر کسی سماج میں
تاریخی عمل کے ذریعہ یکساں کلچر آجائے تو وہاں یکساں کوڈ بھی بن جائے گا۔ اس سے پہلے ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اضافۂ آبادی کا ہوّا

متعدد سینئر شہریوں نے یہ بات کہی ہے کہ شادی بیاہ کا معاملہ انتہائی نجی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کمیونٹی چاہتی ہے کہ اس نجی معاملہ میں وہ اپنے روایتی طریقہ پر قائم رہے تو اس میں دوسری کمیونٹی والوں کو اعتراض کرنے کی کیا ضرورت۔ اس واضح نامعقولیت کے باوجود کچھ انتہا پسند پولیٹکل عناصر کیوں یونیفارم سول کوڈ لانے کے لیے اتنا زیادہ شور وغل کر رہے ہیں۔ حتی کہ انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ آنے والے لوک سبھا الکشن میں ان کا اصل انتخابی اشو (main poll theme) یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ ہوگا (دی ہندستان ٹائمس ۱۷ جولائی ۱۹۹۵) جب کہ یقینی طور پر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں یونیفارم سول کوڈ کی بنیاد پر قانون بنانے کا عملاً کوئی امکان نہیں۔ اس جوش وخروش کا سبب خود یونیفارم سول کوڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نام پر سیاسی فائدہ حاصل کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ عناصر انتہائی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ غلط پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اگلی صدی کے نصف اول میں یہ واقعہ ہونے والا ہے کہ مسلمان یہاں اکثریت میں ہو جائیں اور ہندو خود اپنے ملک میں اقلیت بن کر رہ جائیں۔

اس بے بنیاد پروپگنڈے کے لیے انھوں نے ایک پر فریب نظریہ وضع کیا ہے۔ وہ اکثریتی فرقہ کے عوام سے کہتے ہیں کہ دیکھو، آزادی کے بعد بننے والی گورنمنٹ نے ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ کے ذریعہ ہندوؤں کو تو قانونی طور پر پابند کر دیا کہ وہ صرف ایک بیوی رکھ سکتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا جو پرسنل لا ایکٹ (۱۸۶۰) ہے، اس کے تحت ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ چار بیویاں رکھے۔ ہندو کے اوپر پابندی لگی ہوئی ہے، مگر مسلمان کے اوپر کوئی پابندی نہیں۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو کے مقابلہ میں مسلمان چار گنا زیادہ بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس ملک میں ہندوؤں کی آبادی اگر ۱-۲-۳-۴-۵ کی رفتار سے بڑھے گی تو مسلمانوں کی تعداد ۱-۴-۸-۱۶-۳۲ کی رفتار سے بڑھتی چلی جائے گی۔ اپنے سیاسی حریف کی اس طرح بھیانک تصویر دکھا کر یہ لوگ ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا رہے ہیں۔ وہ ہندو عوام سے کہہ رہے ہیں کہ اس ہندو ورودھی سرکار کے خلاف ووٹ دے کر اس کو باہر پھینک دو:

Throw out this anit-Hindu government.

یہ پروپگنڈا بلاشبہ آخری حد تک بے بنیاد ہے۔ مسلمان عام طور پر ایک ہی شادی کرتے ہیں۔ میری

عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے۔ مگر اس پوری مدت میں میرے علم میں کوئی ایک بھی ہندستانی مسلمان نہیں آیا جس نے چار شادیاں کر رکھی ہوں۔ حتی کہ ایسا کرنا ممکن بھی نہیں۔ کیوں کہ تمام مسلمان چار شادیاں اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ان کے یہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد چار گنا زیادہ ہو۔ یا ان کے پاس کوئی ایسا کارخانہ ہو جہاں وہ زیادہ عورتیں پیدا کر سکیں۔ مگر موجودہ مسلم سماج میں نہ تو عورتیں زیادہ ہیں اور نہ مسلمانوں کے پاس کوئی عورت ساز فیکٹری موجود ہے۔ ایسی حالت میں ان کے لیے کیوں کر ممکن ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص چار چار بیویاں رکھے۔ مسٹر بلراج پوری کا ایک پیراگراف اس سلسلہ میں نقل کرنے کے قابل ہے :

" اس خدشہ کا پہلا مقدمہ کہ تعدد ازواج کے حق میں قانونی دفعہ اس پر عمل تک بھی پہنچائے گی، شماریاتی مطالعہ سے ثابت نہیں ہوتا۔ عورت کی حیثیت کے بارہ میں نیشنل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق، تعدد ازواج فی الحقیقت دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے اندر کم ہے۔ اس کا دوسرا مقدمہ کہ تعدد ازواج مسلمانوں کی آبادی کو زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھائے گا، منطقی طور پر مغالطہ آمیز ہے۔ بچہ پیدا کرنے کے قابل عورتوں کی تعداد چونکہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے، اگر کچھ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو بہت سے مردوں کو بیویاں ہی نہیں ملیں گی۔ کسی فرقہ میں غیر شادی شدہ مردوں کی کثیر تعداد کسی بھی طرح اس فرقہ کی تولیدی صلاحیت میں اضافہ نہیں کرتی۔ واضح طور پر، چار آدمی چار بیویوں کے ساتھ زیادہ بچے پیدا کریں گے، بمقابلہ اس کے کہ ایک ہی مرد کے ساتھ چار بیویاں ہوں۔ اس طرح تعدد ازواج کا طریقہ آبادی میں اضافہ کی رفتار کو گھٹانے والا ہے نہ کہ اس کو بڑھانے والا (انڈین اکسپریس ۶ جولائی ۱۹۹۵)

تقریباً یقینی ہے کہ مذکورہ انتہا پسند سیاسی عناصر اگلے الکشن میں ہندو ووٹروں سے کہیں گے کہ دیکھو، دستور کی دفعہ اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے باوجود مسلمان یکساں سول کوڈ بنانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ وہ ایسا قانون بنانے کے مخالف اس لیے ہیں کہ اس کے بعد انھیں چار شادیوں کی اجازت نہیں رہے گی اور اس طرح وہ اپنی آبادی بڑھانے اور ہندوؤں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے بارہ میں اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کر سکیں گے۔ اس لیے ہمیں ووٹ دے کر ہم کو اقتدار تک پہنچاؤ تاکہ ہم اس خطرہ کا دفعیہ کر سکیں۔ مگر اس پروپگنڈے کا بے بنیاد ہونا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ خدا کی دنیا میں وہ کامیاب نہ ہو۔ ملک کا سب سے بڑا اخبار ٹائمس آف انڈیا ہر روز اپنے پہلے صفحہ پر اس قانون فطرت کا اعلان کرتا ہے کہ سچائی غالب آتی ہے (Let Truth Prevail)

مساوات نہیں ایڈجسٹمنٹ

۱۹۵۴ میں ہندستانی پارلیمنٹ نے اسپیشل میرج ایکٹ منظور کیا تھا۔ اس کے مطابق، مرد اور عورت کسی مذہبی رسم کی ادائگی کے بغیر مخصوص کورٹ میں جاتے ہیں اور ایک مجسٹریٹ کے سامنے اقرار کر کے ایک دوسرے کے قانونی میاں اور بیوی بن جاتے ہیں۔ کامن سول کوڈ اگر سیکولر اصول پر بنایا جائے تو وہ موجودہ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کی ایک توسیع ہوگی۔ میں نے دہلی میں تحقیق کی کہ یہاں کتنے لوگ ہیں جنھوں مذکورہ ایکٹ کے تحت اپنی شادی کی ہے۔ کافی تلاش و تحقیق کے بعد مجھے صرف دو آدمی ملے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ یہ دونوں کسی مذہبی رسم کے بغیر سادہ طور پر کورٹ میں گئے اور وہاں اپنا نکاح رجسٹر کرالیا۔ مگر چند ہی سال کے بعد دونوں شادیاں ٹوٹ گئیں اور اب مرد و عورت دونوں الگ الگ رہتے ہیں۔ میں نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس علٰحدگی کا سبب "ایگوازم" تھا۔ دونوں میں اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر تکرار ہو جاتی۔ یہ تکرار بڑھتے بڑھتے مستقل علٰحدگی تک پہنچ گئی۔

مساوات مرد و زن کا جدید نظریہ کاغذ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر زندگی میں سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ ایڈجسٹمنٹ ہے نہ کہ مساوات۔ مساوات کا تصور حقوق طلبی کا مزاج بناتا ہے اور ایڈجسٹمنٹ کا تصور حقوق کی ادائگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ مساواتی ذہن کے مرد و عورت اکثر لڑکر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، اور ایڈجسٹمنٹ کا ذہن رکھنے والے کامیاب گھر کی تعمیر کرتے ہیں۔

میں نے جاپان کے بارہ میں ایک کتاب پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جاپانی عورت اور مرد کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں (I am under someone) اپنے اس احساس کی بنا پر جاپانی انسان ہمیشہ فریق ثانی سے ایڈجسٹ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی عورت سب سے زیادہ بری بیوی ہے اور جاپانی عورت سب سے زیادہ اچھی بیوی۔ اس کا راز یہی ہے۔ امریکی عورت پر سب سے زیادہ جو خیال مسلط ہوتا ہے وہ برابری کا تصور ہے۔ اس کے برعکس جاپانی عورت برابری اور نابرابری کی بحث سے اوپر اٹھ کر صرف یہ احساس لیے ہوتی ہے کہ مجھے موافقت کے اصول پر زندگی گزارنا ہے۔ اسی لیے ازدواجی زندگی میں امریکی عورت ناکام رہتی ہے اور جاپانی عورت کامیاب ——— اچھا خاندان بنانے کے لیے ہمیں سب سے زیادہ ایڈجسٹمنٹ پر زور دینا ہے نہ کہ مغربی تصور کے مطابق مساوات پر۔

ہندو برادریوں کا رواج

خود ہندوؤں میں شادی بیاہ کا کوئی ایک مقرر طریقہ نہیں۔ ہندوؤں میں سیکڑوں کی تعداد میں مختلف گروہ ہیں، اور ہر گروہ اپنے اپنے خاندانی یا علاقائی رواج کے مطابق شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کرکٹ کے مشہور کھلاڑی ساچن ٹنڈولکر (Sachin Tendulkar) نے ۲۵ مئی ۱۹۹۵ کو بمبئی میں مسز انجلی مہتا سے شادی کی تو اخباری رپورٹ کے مطابق، ان کے نکاح کی تقریب مہاراشٹر کے روایتی انداز (traditional Maharashtrian-style) میں ادا کی گئی (پانیر ۲۶ مئی ۱۹۹۵)

آج بھی تقریباً تمام ہندو اپنی شادیاں اپنے مذہبی رواج کے مطابق کرتے ہیں، اگرچہ اسپشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ کی صورت میں ان کے لیے ایک عمومی قانون موجود ہے:

Almost all Hindus still solemnise their marriages through religious customs although there is a civil way out through the Special Marriages Act of 1954. (The Hindustan Times, May 22, 1995)

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں۔ یہ دراصل وہی ہے جو ہونا چاہیے۔ شادی بیاہ کا تعلق انتہائی نجی معاملات سے ہے۔ ایسے معاملات میں ہر فرقہ ہمیشہ اپنے خاندانی یا گروہی رسم و رواج کے مطابق ہی عمل کرتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

اصل ضرورت: نیشنل کیرکٹر

انڈیا کو ایک متحد اور پر امن اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لیے اصل میں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نیشنل کیرکٹر ہے۔ ملک میں جتنی بھی کمیاں ہیں، یا جو بگاڑ بھی یہاں نظر آتا ہے۔ ان سب کا اصل سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آزادی کے بعد ملک کے لوگوں میں نیشنل کیرکٹر پیدا نہ کیا جا سکا۔

نیشنل سوچ شخصی سوچ کی ضد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ذاتی مفاد کو اہمیت دینے کے بجائے قومی مفاد کو اہمیت دے۔ جہاں کہیں دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ ہو تو وہ شخصی مفاد کو پس پشت ڈال دے اور قومی مفاد والے طریقہ کو اختیار کر لے۔

باہر کا کوئی ملک پیسہ دے کر آپ کو خریدنا چاہے تو اپنے ملک کی محبت آپ کو اس سے روک دے۔ ٹیکس نہ دینے میں آپ کو ذاتی فائدہ ہو رہا ہو تب بھی آپ ٹیکس دیں کیوں کہ اس سے قوم کو فائدہ

ہوگا۔ ملاوٹی چیزیں سپلائی کرنے میں آپ کا ذاتی نفع بڑھتا ہو مگر آپ ایسا نہ کریں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے۔ ذاتی شکایت کے باوجود آپ قومی املاک کو نقصان نہ پہنچائیں اور اقتصادی پہیہ کو روکنے کی کوشش نہ کریں، کیوں کہ اس میں ملک کی تباہی ہے۔ الکشن میں اگر آپ ہار جائیں تو دل سے اپنی ہار کو مان لیں۔ کیوں کہ ہار نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کا پورا سیاسی نظام بگڑ جاتا ہے۔ اگر آپ ذمہ داری کے عہدہ پر ہیں تو اپنے مالی فائدہ کے لیے سکینڈل اور اسکیم میں ملوث نہ ہوں، کیوں کہ ایسا کرنے سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو ایک بار حکومت مل جائے تو یہ نہ چاہیں کہ میں ہی ہمیشہ حکومت کی گدی پر بیٹھا رہا ہوں۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاسی خود غرضی ملک کے جمہوری ڈھانچہ کو تباہی اور بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیتی ہے۔ اگر آپ لیڈر ہیں تو اپنے الکشنی مفاد کے لیے ایک گروہ کے اندر دوسرے گروہ کے خلاف نفرت اور خوف کے جذبات نہ پیدا کریں۔ کیوں کہ اس سے آپ کا ووٹ بنک تو بنے گا۔ لیکن ملک کا بینک دیوالیہ ہو کر رہ جائے گا۔ وغیرہ

اسی کا نام سچی دیش بھگتی ہے۔ اور یہی ملک کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہی چیز آج ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ دیش بھگت کے بجائے خویش بھگت ہو گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے فائدہ کی خاطر ملک کے فائدہ کو بھول گیا ہے۔ اسی خویش بھگتی نے ملک کا وہ برا حال کر دیا ہے جس کی آج ہر آدمی شکایت کر رہا ہے۔

دیش بھگتی کا من سول کوڈ جیسی ظاہری کارروائیوں سے کبھی نہیں آئے گی۔ بلکہ لوگوں کی سوچ کو تعمیری رخ دینے سے آئے گی۔ اس کے لیے ہمیں تمام ذرائع کو استعمال کر کے لوگوں کو ایجوکیٹ کرنا ہوگا۔ ہمیں تعمیر شعور یا ذہنی بیداری کی ایک طویل اور ہمہ گیر مہم چلانی ہوگی۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی دوسری چیز اس کا بدل نہیں۔

تعلیم کی اہمیت

دستور ہند کے رہنما اصولوں کے تحت جو دفعات درج ہیں ان میں سے ایک اس کی دفعہ ۴۵ ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے کہ ریاست یہ کوشش کرے گی کہ دستور کے نفاذ کے بعد دس سال کی مدت میں وہ تمام بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کر دے، یہاں تک کہ وہ چودہ سال کی عمر تک پہنچ جائیں :

The state shall endeavour to provide, within a period of ten years from the commencement of this Constitution, for free and compulsory education for all children untill they complete the age of fourteen years.

غالباً بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ دفعہ دستور کے رہنما اصولوں کے تحت درج شدہ دفعات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی یہی دفعہ سب سے زیادہ غیر اہم بنی ہوئی ہے۔ سپریم کورٹ نے کبھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ حکومت سے باز پرس کرے کہ دس سال کی مقرر مدت گزرنے کے باوجود اس دفعہ پر عمل کیوں نہیں کیا گیا۔

دستور ہند کا نفاذ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نومبر ۱۹۵۹ میں دس سال کی یہ مقرر مدت پوری ہو گئی۔ مگر ملک کے تمام نوجوانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا نشانہ کسی بھی درجہ میں حاصل نہ ہو سکا۔

تعلیم کی اہمیت قومی تعمیر کے لیے اتنی زیادہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کامن سول کوڈ کا معاملہ صرف ایک نان اشو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا واحد لکاتی نشانہ صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہم ملک کی آبادی کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنائیں۔ اس کے سوا جس چیز کو بھی نشانہ بنایا جائے گا وہ اصل قابل لحاظ چیز سے توجہ کو ہٹانے (shift of emphasis) کے ہم معنی ہوگا۔ اور اس طرح توجہ کو اہم سے ہٹا کر غیر اہم میں الجھا دینا ایک قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت۔

تعلیم کا تعلق اصلاً سروس سے نہیں ہے۔ تعلیم کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ شعور کی تربیت کرتی ہے۔ وہ آدمی کو صحیح طرز پر سوچنے والا بنا دیتی ہے۔ سماج یا قوم میں جتنے بھی مثبت اور مفید واقعات ہوتے ہیں وہ سب انھیں لوگوں کی دین ہوتے ہیں جو صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔

صحیح طرز فکر آدمی کے اندر دور اندیشی پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو بتاتا ہے کہ وہ اختلافات سے کس طرح نپٹے۔ وہ آدمی کے اندر وہ بالغ نظری پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس سے آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کو جانتا ہے۔ وہ ظاہر سے گزر کر اندرونی حقیقت کو دریافت کر لیتا ہے۔ صحیح طرز فکر سے صحیح عمل ظہور میں آتا ہے، اور صحیح عمل ہی کسی فرد یا گروہ کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

سماج میں یک جہتی اور اتحاد کی فضا بنانے کے لیے اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ لوگوں کا

شادی بیاہ کا طریقہ ایک ہو۔ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ لوگ صحیح طرز فکر کے حامل ہوں۔ صحیح طرز فکر کیا ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوگا۔

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ – ۱۸۶۳) کو ایک کرسچین بھائی نے اپنے مکان پر بلایا۔ کرسچین نے سوامی جی کو جانچنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے ملاقات کے کمرہ میں ایک میز پر نیچے اور اوپر بہت سی مذہبی کتابیں رکھ دیں۔ سب سے نیچے ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن رکھی۔ اس کے اوپر مختلف مذہبوں کی کتابیں، اور سب سے اوپر اپنی مذہبی کتاب بائبل۔ سوامی ویویکانند جب کمرہ میں داخل ہوئے تو کرسچین میزبان نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھئے، اس کے بارہ میں آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ سوامی جی کتابوں کی مذکورہ ترتیب کو دیکھ کر مسکرائے، اور کہا: فاؤنڈیشن تو بہت اچھی ہے۔

سوامی جی اگر اس معاملہ کو وقار (پرسٹیج) کا اشو بناتے تو وہ بگڑ جاتے۔ وہ کہتے کہ کیا تم نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے یہاں بلایا تھا۔ اب دونوں میں تکرار شروع ہو جاتی۔ عین ممکن ہے کہ یہ تکرار بڑھ کر اس نوبت تک پہنچتی کہ امن قائم کرنے کے لیے پولیس کو بلانا پڑتا۔ لیکن سوامی جی نے اس کو وقار کا مسئلہ بنانے کے بجائے اس کو اعراض کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو معاملہ دونوں کو لڑائی تک پہنچاتا، وہ دونوں کے درمیان مسکراہٹ کے تبادلہ پر ختم ہو گیا۔

یہ قابل قدر واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ کیا اس لیے کہ سوامی ویویکانند اور مذکورہ کرسچین کا شادی بیاہ کا طریقہ ایک تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ کیوں کہ ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا عیسائی۔ اور ہندوؤں اور عیسائیوں میں شادی بیاہ کا طریقہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سوامی ویویکانند ایک ایسے آدمی تھے جن کی اعلیٰ تعلیم نے ان کو حد درجہ باشعور بنا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح کسی واقعہ کو منفی رخ دینے کے بجائے اس کو مثبت رخ دیا جا سکتا ہے۔ وہ سوچنے کا آرٹ جانتے تھے۔ وہ زندگی کی سائنس سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح اختلاف کے باوجود اتحاد کے ساتھ رہا جا سکتا ہے۔ اس کا راز سوامی جی کی شعوری بیداری تھا نہ کہ کسی قسم کا مشترک سول کوڈ۔

مسلمانوں سے خطاب

آخر میں مسلمانوں سے میں گزارش کروں گا کہ وہ سپریم کورٹ کے موجودہ فیصلہ (۱۹۹۵) کے معاملہ میں ماضی کی اس غلطی کو ہرگز نہ دہرائیں جو سپریم کورٹ کے سابق فیصلہ (۱۹۸۵) کے معاملہ میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ دس سال پہلے جب شاہ بانو کیس پر عدالت عالیہ کا فیصلہ سامنے آیا تو مسلمانوں نے سارے ملک میں احتجاج اور مظاہرہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کا براہ راست فائدہ ملک کے انتہا پسند ہندو عناصر کو پہنچا۔

اب دوبارہ یہ عناصر انتظار کر رہے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر سڑکوں پر آجائیں، تاکہ وہ مسلم خطرہ کا ہوّا کھڑا کر کے ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا سکیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ اپنی موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ اگر مسلمانوں نے دوبارہ مظاہراتی طریقے اختیار کیے تو یقینی طور پر وہ ان کے لیے خطرہ بن جائے گا۔

یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی جگہ ہے۔ یہاں ہر ایک اس انتظار میں رہتا ہے کہ وہ دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ فریق ثانی کو یہ موقع ہمیشہ اس وقت ملتا ہے جب کہ ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آپ بھڑک اٹھیں اور عاجلانہ اقدام کر بیٹھیں۔ اسی لیے قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ —— تم صبر کرو، جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (الاحقاف ۳۵) صبر کا طریقہ فریق ثانی سے یہ موقع چھین لیتا ہے کہ وہ آپ کی کمزوریوں کا استحصال کر سکے۔ جب کہ بے صبری کا طریقہ آپ سے ایسی غلطیاں کراتا ہے کہ آپ نہایت آسانی سے فریق ثانی کے سازشی منصوبوں کا شکار ہو جائیں۔

کسی فریق کے خلاف سازش اگرچہ دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ مگر عملاً سازش کا شکار ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ خود فریق کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھنے میں زیر سازش گروہ کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

معجزہ کیا ہے

معجزہ کے لفظی معنی ہیں عاجز کر دینے والا۔ پیغمبروں کو معجزات اسی لیے دیے گئے تاکہ لوگ ان کی صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ معجزہ کو مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے معجز ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی کو جب تک اپنے مخصوص میدان میں عجز کا تجربہ نہ ہو وہ صحیح طور پر اس کی اعجازی حیثیت کا احساس نہیں کر سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، جن کا زمانہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح ہے، انھوں نے مصر کے جادوگروں کے سامنے دعوتی تقریر کی۔ مگر وہ اس سے متاثر نہ ہو سکے۔ لیکن جب، انھوں نے جادوگروں کے سانپوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے سانپ کا کرشمہ دکھایا تو تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے نظریاتی دلائل کا وزن محسوس کرنے کے باوجود اپنے مخصوص میدان میں پھر بھی وہ اپنے آپ کو موسیٰ سے فائق سمجھ رہے تھے۔ مگر موسیٰ کا عصا جب ان کے سانپوں سے زیادہ بڑا سانپ بن کر ظاہر ہوا تو حضرت موسیٰ کی عظمت آخری طور پر ان کے اوپر منکشف ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ دل سے حضرت موسیٰ کا اعتراف کر لیں۔

اسی لیے پیغمبروں کو جو معجزہ دیا جاتا ہے وہ مخاطب کے اپنے میدان کے اعتبار سے دیا جاتا ہے۔ مصر کے جادوگروں کو یہ فخر تھا کہ وہ رسیوں کو سانپ کی صورت دے سکتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ کے عصا کو زیادہ بڑا سانپ بنا کر انھیں دکھایا گیا۔ شام و فلسطین کے طبیب عام مریضوں کو اچھا کرتے تھے تو حضرت مسیح کو یہ خصوصیت دی گئی کہ ناقابل علاج امراض میں مبتلا لوگ صرف ان کے چھونے سے اچھے ہو جائیں۔ عرب کے لوگوں کو اپنے ادب پر فخر تھا تو پیغمبر اسلامؐ کو قرآن کی صورت میں ایسا برتر ادبی نمونہ دیا گیا جس کے آگے ان کے تمام ادبی شہ پارے ہیچ نظر آنے لگے اور کہنے والے کہہ پڑے کہ: ا بعد القرآن۔

خدا کا داعی اپنی ذات میں اپنی صداقت کا ثبوت ہوتا ہے۔ مگر مخاطبین عام طور پر اس کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اس وقت خدا یہ کرتا ہے کہ مخاطبین کی اپنی فوقیت کے میدان میں انھیں داعی کے مقابلہ میں زیر کر دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے تاکہ داعی حق کی صداقت اس کے مخاطبین کے اوپر ناقابل انکار درجہ میں واضح ہو جائے۔

قرآنی اصول

قرآن میں ازدواجی زندگی کے احکام کے ذیل میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی گزارو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو (و عاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسیٰ ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللہ فیہ خیراً کثیراً) النساء ۱۹

اس قرآنی تعلیم کا تعلق صرف میاں اور بیوی سے نہیں ہے۔ وہ تمام انسانی تعلقات کے لئے عام ہے۔ خدا کی اس دنیا میں کامیاب اجتماعی زندگی گزارنے کا واحد اہم اصول یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد شعوری طور پر اس کو یاد رکھیں کہ کسی کی کوئی روش اگر ان کی پسند کے خلاف ہے تو خود اسی کے اندر کوئی اور صفت ہوگی جو ان کی پسند کے مطابق اور مفید ہو گی۔ اس لئے ہر ایک کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ متعلق مرد یا عورت کی ناپسندیدہ صفت کو نظر انداز کر کے اس کی پسندیدہ صفت کی بنیاد پر اس کو اپنا لے۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کامل نہیں۔ ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی کمی پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جس مرد یا عورت کا ہم تجربہ کر رہے ہوتے ہیں، اس کی کمی ہمارے علم میں آجاتی ہے۔ اور جس مرد یا عورت کا ہمیں عملی تجربہ نہیں ہوا اس کی کمی ہمارے علم میں نہیں آتی۔ اس لئے ہم غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ باقی لوگ تو اچھے ہیں، صرف یہ شخص برا ہے۔ حالاں کہ ایک کو چھوڑ کر جب ہم دوسرے سے معاملہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلا آدمی۔

اس لئے یہ ذہن درست نہیں کہ اس کو چھوڑ کر فلاں کو پکڑو۔ اس کے بجائے صحیح بات یہ ہے کہ نباہ کا ذہن پیدا کیا جائے۔ کامل کی تلاش آدمی کو کہیں نہیں پہنچاتی۔ اور نباہ کی روش آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ زندگی گزارے، وہ ہر ایک کے ساتھ مل کر اپنے لئے کامیاب زندگی کی تعمیر کر سکے۔

کل کا مسئلہ

پاکستان میں اس وقت مسز بے نظیر بھٹو وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہیں۔ اور میاں محمد نواز شریف اپوزیشن کے لیڈر ہیں۔ دونوں رات دن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۵ اپریل ۱۹۹۵) کے صفحہ اول پر ایک خبر کی سرخی یہ ہے کہ: کل سے ڈریں، کل بہت قریب ہے۔

اسلام آباد کی ڈیٹ لائن کے ساتھ خبر میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ اور قائد حزب اختلاف میاں محمد نواز شریف نے کہا ہے کہ میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ آنے والے کل سے ڈریں اور اپنے مستقبل کی فکر کریں۔ کیوں کہ اب کل کا دن بہت نزدیک ہے۔ ہم پاکستان کے مستقبل سے کھیلنے والوں کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہمارا عزم آسمان سے بھی بلند ہے۔ ہم پاکستان کا مستقبل بچانے کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

اس خبر میں ایک سیاسی لیڈر دوسرے سیاسی لیڈر کو جس "کل" سے ڈرا رہا ہے وہ آخرت کا کل نہیں ہے، بلکہ اسی دنیا کا سیاسی کل ہے۔ اس انتباہ کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے خلاف کارروائیوں سے باز آجاؤ، ورنہ ہم اتنی اودھم مچائیں گے کہ تمہاری حکومت ہی گر جائے۔

اگر آخرت کے کل کا مسئلہ ہو تو ہر آدمی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھے گا۔ کوئی شخص جب دوسرے کو ڈرائے گا تو عین اسی وقت وہ خود بھی ڈر رہا ہوگا۔ مگر دنیا کے کل کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہاں جب ایک شخص دوسرے آدمی کو ڈراتا ہے تو اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں محفوظ سمت میں ہوں۔ آنے والا کل دوسرے کے لئے مسئلہ ہے۔ وہ میرے لئے کوئی مسئلہ بننے والا نہیں۔

سیاسی کل کا نظریہ لوگوں میں سرکشی کا جذبہ ابھارتا ہے، اور اخروی کل کا عقیدہ لوگوں میں تواضع پیدا کرتا ہے۔ سیاسی کل کے پیچھے دنیا پرستی ہے اور اخروی کل کے پیچھے دنیا سے بے رغبتی۔ سیاسی کل خود غرضی کی پیداوار ہے اور اخروی کل ربانیت کی پیداوار۔

۱ جناب محمد میاں عبد اللہ میاں صاحب (پٹن، گجرات) الرسالہ کے مضامین کا گجراتی ترجمہ کرکے لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے الرسالہ مارچ ۱۹۸۸ کا ایک مضمون "یہ انسان" کا گجراتی زبان میں ترجمہ کرکے اس کو ہینڈ بل کی صورت میں چھپوایا ہے اور اس کو لوگوں خاص طور پر غیر مسلموں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح کی کوشش مختلف لوگ اپنے اپنے انداز سے کر رہے ہیں۔

۲ سنٹر فار پروموشن آف آلٹر نیٹو انسٹی ٹیوشنس (نئی دہلی) کے تحت ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ کو نوائڈا میں ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا : ریلیجن اینڈ میڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر خطاب کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ میڈیا کی شکایت کرنے کے بجائے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ میڈیا کو غلط استعمال کا موقع نہ دیں۔

۳ جاپان کے زیر انتظام سولہ ملکوں کے ۱۵۰ آدمی عالمی پیس مارچ کر رہے ھیں۔ وہ راس کماری سے اپنا پیدل مارچ شروع کرکے اگست ۱۹۹۵ میں ہیروشیما پہنچیں گے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ کو گاندھی درشن (نئی دہلی) میں ان کے استقبال کے لئے میٹنگ تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور "امن" کے موضوع پر خطاب کیا۔

۴ امریکہ کے نشریاتی ادارہ انڈپنڈنٹ براڈکاسٹنگ ایسوسی ایٹس (I.B.A.) کے نمائندہ مسٹر ہولک (Julian Crandall Hollick) ۲۶ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اب ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بلا اعلان ایک نیا فیصلہ لیا ہے۔ وہ یہ کہ اختلافی مسائل پر وہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے بلکہ پر امن تدبیر کے ذریعہ اپنے اختلافات کو حل کریں گے۔

۵ واشنگٹن کی نشریاتی تنظیم (Quorum Communications) کے صدر بنجمن بی ناگلیانو (Benjamin B. Nagliano) ۲۷ مارچ ۱۹۹۵ کو اپنی ویڈیو ٹیم کے ساتھ مرکز میں آئے۔

انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ فنڈ منٹلزم کا مطلب اگر بنیادی تعلیمات کی طرف واپسی ہو تو وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ لیکن اگر اس کا مطلب انتہا پسندی اور جنگجوئی ہو تو یقینی طور پر وہ غیر اسلامی اور قابل ترک ہے۔

۶ مز ورجینیا وان ڈائک (Virginia Van Dyke) امریکہ کی واشنگٹن یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع ہے:

Religious leaders in politics — alternative sources of political mobilisation

اس سلسلہ میں وہ ۲۹ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئیں اور مذکورہ موضوع پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ ہندستان کی تاریخ میں ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ اب ہندو اور مسلمان دونوں میں نیا سیاسی شعور جاگا ہے۔ قدیم طرز کی جذباتی سیاست کا دور اب ملک میں ختم ہو رہا ہے۔ اس کی ایک علامت یہ ہے کہ بابری مسجد کے اشو پر مسلم لیڈر مسلمانوں کو موبیلائز کرنے میں ناکام ہیں۔ اسی طرح ہندو لیڈر دوسری مسجدوں کے اشو پر ہندوؤں کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔

۷ انگریزی پندرہ روزہ نیشن اینڈ دی ورلڈ کے نمائندہ مسٹر آصف عمر نے ۳۰ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جو لوگ ہمارے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو سرینڈر کرنے کے لیے کہتے ہیں، وہ ہمارے اوپر ایک جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ریلسٹک اپروچ اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں نہ کہ سرینڈر کرنے کی۔ اس لیے جس کو تنقید کرنا ہے وہ ہماری اصل بات پر تنقید کرے نہ کہ ایک جھوٹی بات کو ہماری طرف منسوب کرے اور پھر اس کی روشنی میں ہمارے خلاف بے بنیاد درائے زنی کرے۔

۸ بھارت وکاس پریشد کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے راجستھان راودسے پور،

بھیل واڑہ) کا سفر کیا۔ وہاں ۳۱ مارچ۔ یکم اپریل ۱۹۹۵ کو مختلف خطاب کئے اور ملاقاتیں کیں۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۹ سری ستیہ سائی سیوا سمیتی کی طرف سے نوائیڈا (دہلی) میں ایک سرو دھرم سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ منتظمین کی طرف سے ان کے لئے اسلام کے اصول (Tenets of Islam) کا موضوع مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر تقریباً آدھ گھنٹہ تک خطاب کیا۔

۱۰ مولانا جمیل صاحب نے مدراس سے اطلاع دی ہے کہ الرسالہ میں شائع شدہ مقالہ "اسلام میں عدل اجتماعی" تامل زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس کو تمل دانشوروں اور حقوق انسانی کے لئے جدوجہد کرنے والے لوگوں تک پہنچایا جا رہا ہے۔ الحمد للہ اس کے بہت اچھے اثرات سامنے آرہے ہیں۔

۱۱ ۹ اپریل ۱۹۹۵ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ یہ میٹنگ مسٹر مدھو مہتا کی صدارت میں ہندستانی اندولن کے زیر اہتمام ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندستان کے مستقبل کی تعمیر پر اپنے خیالات پیش کئے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سسٹم میں تبدیلی کے بجائے انسان میں تبدیلی لانے پر محنت صرف کرنا چاہئے۔

۱۲ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے نمائندہ مہاراج کرشن بھارت نے ۹ اپریل ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق حج کی عبادت سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ حجر اسود کی کوئی مشابہت بت سے نہیں ہے۔ بت کی پرستش اسلام میں اس لئے منع ہے کہ اس میں نافع اور ضار کا تصور ہوتا ہے۔ جب کہ حجر اسود کو نہ نافع وضار مانا جاتا اور نہ کوئی حاجی اس کے آگے جھکتا۔ کعبہ میں حضرت ابراہیم کے زمانہ کی واحد چیز صرف حجر اسود ہے۔ اس لئے اس کو پیغمبر کی تاریخی یادگار سمجھ کر چومتے ہیں، اور کسی چیز کو چومنا اسلام میں ناجائز نہیں۔ چومنا اور پرستش کرنا دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۱۳ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)

کے کانفرنس ہال میں ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے وہاں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہ خطاب انشاء اللہ تعالیٰ کی صورت میں الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۱۴ سمرون چیریٹیبل ٹرسٹ کی طرف سے ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں کیمپ لگایا گیا۔ یہ لوگ معذور افراد کو دوبارہ قابل کار بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ان کی تقریب میں شرکت کی اور معذوروں اور ضرورتمندوں کی خدمت کی اہمیت پر خطاب کیا۔

۱۵ روزنامہ ہندستان (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اشوک کنکر نے ۱۱ اپریل ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ وہ ناخوشگوار باتوں پر اوائڈ کریں۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے وہ اپنی پسماندگی کو دور کر سکتے ہیں اور دوسری قوموں کی طرح ترقی کی راہ میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔

۱۶ یو این آئی کے نمائندہ مسٹر موکیش کوشک نے "دور بھاشس چرچا" کے تحت ۱۴ اپریل ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اصل سوال لوگوں کی سوچ کو بدلنے کا ہے۔ جب تک لوگوں کی سوچ نہ بدلے، محض سسٹم یا قانون کے بدلنے سے سماجی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

۱۷ انجمن فلاح المسلمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے لکھنؤ کا سفر کیا۔ وہاں ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ کو گنگا پرساد میموریل ہال میں جلسۂ عام کو خطاب کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۸ ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن کا درس دیا۔ درس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے، اور اس امتحان میں آدمی صرف صبر کے ذریعہ پورا اتر سکتا ہے۔

۱۹ اٹلی کی ایک مذہبی تنظیم کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اٹلی کا سفر کیا اور وہاں کی ورلڈ کانگرس

(۲۱ - ۲۳ اپریل ۱۹۹۵) میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲۱ سنٹر فار پروموشن آف آلٹرنیٹو انسٹی ٹیوشنس (نئی دہلی) کے تحت ۲۹ اپریل ۱۹۹۵ کو نوائیڈا میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: ریلیجن اینڈ ماس میڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۲۲ ایک مسلم تنظیم کی دعوت پر مئی ۱۹۹۵ کے پہلے ہفتہ میں کلکتہ اور مرشد آباد (بنگال) کا سفر ہوا۔ اس سفر میں متعدد خطابات ہوئے نیز ملاقات اور گفتگو کے پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲۳ ہندی روزنامہ دینک ہمالیہ درپن کے دہلی کے نمائندہ مسٹر پردیپ ٹھاکر نے ۶ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے تسٹی کرن یا ووٹ بنک کی سیاست کا سبب مسلمانوں کا احساس عدم تحفظ ہے۔ اگر صحیح رہنمائی کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر سے عدم تحفظ کے احساس کو نکال دیا جائے تو مسلمانوں کے اکسپلائٹیشن کی یہ سیاست بھی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

۲۴ آکاش درشن انٹرپرائزز (دہلی) نے ۷ مئی ۱۹۹۵ کو دور درشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق حج سے تھا۔ حج کا تاریخی پس منظر، اس کی شرعی اہمیت، اس کے مختلف قواعد کو سادہ انداز میں بتایا گیا۔

۲۵ فرنچ نیوز ایجنسی کے نمائندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۱۱ مئی ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ خاص سوال یہ تھا کہ آج کے اخباروں میں سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ چھپا ہے کہ حکومت دستور ہند کی دفعہ ۴۴ کے تحت کامن سول کوڈ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کارروائی کرے۔ جواب دیا گیا کہ خالص دستوری اعتبار سے یہ درست فیصلہ ہو سکتا ہے مگر عملاً وہ ناممکن ہے۔ دستور کی بہت سی چیزیں (مثلاً ہندی کو پندرہ سال میں واحد قومی زبان بنانا) ساری کوشش کے باوجود عمل میں نہ آسکا۔ اسی طرح کامن سول کوڈ بھی موجودہ حالات میں قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ ہندستانی سماج ۹۹ فیصد سے زیادہ روایتی سماج ہے۔

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اکتوبر ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۷

AL-RISALA (Urdu)

1. Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

صبر و توکل

والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ماظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الآخرۃ أکبر لوکانوا یعلمون . الذین صبروا و علی ربھم یتوکلون (النحل ۴۱ - ۴۲)

اور جن لوگوں نے اللہ کے لئے اپنا وطن چھوڑا ، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا ، ہم ان کو دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے ، کاش وہ جانتے ۔ وہ ایسے ہیں جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کے ساتھ توکل کا نہایت گہرا تعلق ہے ۔ صبر ایک عظیم دینی عمل ہے ۔ مگر اس دنیا میں صبر کی روش پر وہی لوگ قائم رہ سکتے ہیں جو اللہ رب العٰلمین کی ذات پر بے پناہ بھروسہ رکھتے ہوں ۔

اس آیت میں جن اہل ایمان کا ذکر ہے ، یہ وہ لوگ تھے جن پر ان کے مخالفوں نے ظلم کیا ۔ مگر وہ منفی ردعمل میں مبتلا نہیں ہوئے ۔ ان کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرا کہ وہ ظالموں کو سبق سکھائیں ۔ یا ان سے ان کے ظلم کا انتقام لیں ۔ اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ اس مقام سے ہٹ گئے جہاں ان کے اوپر ظلم ہو رہا تھا ۔ وہ انسانوں سے الجھنے کے بجائے خدا کی طرف متوجہ ہو گئے ۔

ان کے اس عمل ، ہجرت کو قرآن میں صبر کہا گیا ۔ اور پھر فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا پر توکل کرنے والے ہیں ۔ صبر کے ساتھ توکل کا ذکر نہایت اہم ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی آدمی صبر کے طریقہ پر قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے اندر توکل علی اللہ کی صفت نہ ہو ۔

ناموافق صورت حال پیش آنے کے بعد جو آدمی بے برداشت ہو کر لڑنے لگے ، وہ اپنی اس روش سے ثابت کرتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کو جانتا تھا ۔ وہ خدا کی برتر طاقتوں سے واقف نہ تھا ۔ اگر وہ خدا کی خدائی کو اور اس کے وعدوں کو جانتا تو وہ صبر کرتا ۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا کہ صبر کرنے میں زیادہ بڑی طاقت کو اپنے مخالف کے مقابلہ میں کھڑا کر رہا ہوں ۔ یہ طاقت خود مالک کائنات کی ہے جس کی پکڑ سے بچنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ۔

عافیت کی زندگی

لما قدم حاتم الاصم الی الامام احمد قال له الامام: اخبرني كيف السلامة من الناس. فقال حاتم بثلاثة اشياء: تعطيهم من مالك ولا تاخذ من مالهم وتقضي لهم حقوقهم ولا تطالبهم بحقوقك وتصبر على اذاهم ولا توذيهم (الدعوة الرياض، ۲۰ ذی القعدہ ۱۴۱۵ھ)

حاتم اصم جب امام احمد کے پاس آئے تو امام احمد نے ان سے کہا کہ مجھے بتائیے کہ لوگوں سے محفوظ کیسے رہا جائے۔ حاتم اصم نے کہا کہ تین چیزوں کے ذریعہ سے۔ ان کو اپنا مال دیں مگر خود ان کا مال نہ لیں۔ لوگوں کے حقوق ادا کریں مگر اپنے حقوق ان سے نہ مانگیں۔ لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کریں اور خود ان کو ایذا نہ پہنچائیں۔

ان تینوں باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ یک طرفہ طور پر لوگوں کو یہ احساس دلا دیں کہ وہ آپ سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس کے بعد آپ بھی ان سے پوری طرح محفوظ ہو جائیں گے۔ لوگوں کو یہ احساس تین تدبیروں کے ذریعہ دلایا جا سکتا ہے۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس سے اپنے آپ کو مستغنی بنا لیں۔ مگر آپ کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے آپ لوگوں کو حسب توفیق ان کا حصہ پہنچاتے رہیں۔ آپ لوگوں سے لینے والے نہ بنیں، اس کے بجائے آپ لوگوں کو دینے والے بن جائیں۔

لوگوں کا جو حق آپ کے اوپر ہو اس کی ادائیگی میں آپ کوئی کوتاہی نہ کریں۔ مگر دوسروں کے اوپر آپ کا جو حق آتا ہو، اس کو دوسروں سے وصول کرنے کی کبھی کوئی مہم نہ چلائیں۔

معاشرتی زندگی میں بار بار ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے آپ کو تکلیف پہنچے گی۔ اس طرح کے مواقع پر آپ یک طرفہ صبر و تحمل کی پالیسی کو اختیار کر لیں، آپ صرف اتنا ہی نہ کریں کہ دوسروں کو آپ ایذا نہ پہنچائیں، بلکہ اس سے بڑھ کر آپ کا رویہ یہ بن جائے کہ دوسروں کی ایذاؤں پر آپ صبر کر لیں، آپ لوگوں سے بدلہ لئے بغیر انھیں معاف کر دیں۔

دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کا یہی واحد یقینی نسخہ ہے۔ اس کے سوا جو تدبیر اختیار کی جائے گی وہ امن و عافیت دینے والی نہیں بن سکتی۔

گھر سے محرومی

۲۸ مارچ 1995 کو دہلی میں ایک بڑا دردناک واقعہ ہوا۔ مسز اندو واہی (۶۱ سال) نے کستوربا گاندھی مارگ کی بلڈنگ (ایشیا ہاؤس) کی آٹھویں منزل سے کود کر خودکشی کرلی۔ نیچے آتے ہی ان کا پورا جسم کچل اٹھا اور فوراً ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

مسز اندو واہی آل انڈیا ریڈیو کے ہندی شعبہ میں چیف نیوز ریڈر تھیں۔ پچھلے سال ان کو وہاں سے ریٹائرمنٹ مل گیا۔ ایشیا ہاؤس ایک سرکاری بلڈنگ ہے۔ اس کی پہلی منزل پر ان کو دو کمروں کا ایک فلیٹ برائے رہائش ملا ہوا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب انھیں یہ فلیٹ خالی کرنا تھا جس میں وہ پچھلے ۲۰ سال سے رہ رہی تھیں۔ فلیٹ چھوڑنے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ تھی۔ ان کے شوہر کا انتقال ۱۹۸۹ میں ہوگیا تھا۔ اب وہ اپنی بیٹی سونیا اور اپنے داماد اشوک کمار کے ساتھ یہاں رہ رہی تھیں (ہندستان ٹائمس ۲۹ مارچ 1995)

ریٹائرمنٹ کے بعد اندو واہی بہت پریشان تھیں۔ انھوں نے اگرچہ جمنا پار کی ریڈیو کالونی میں اپنا ایک گھر بنا لیا تھا۔ مگر ان کو یہ خیال پریشان کئے ہوئے تھا کہ موجودہ سرکاری فلیٹ کناٹ پلیس کے علاقہ میں ہے اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں مگر جمنا پار جانے کے بعد وہ ان شہری سہولتوں سے محروم ہو جائیں گی۔ یہ احساس ان پر اتنا زیادہ طاری ہوا کہ ایشیا ہاؤس کی آخری منزل پر چڑھ کر انھوں نے خودکشی کی چھلانگ لگا دی۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو اچانک میری زبان سے نکلا کہ —— انسان آج اچھے گھر کو چھوڑ کر معمولی گھر میں جانے کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اس دن انسان کا کیا حال ہوگا جب وہ ہر قسم کے گھر سے محروم کر دیا جائے گا۔

انسان خودکشی نہ کرے تب بھی اس پر موت آنی ہے۔ موت کے بعد اچانک وہ محسوس کرے گا کہ اس کا تمام اثاثہ اس سے چھن چکا ہے۔ اس دن تمام گھر والے بے گھر ہو چکے ہوں گے۔ اس دن گھر والا صرف وہ ہوگا جس سے خدا خوش ہو اور اپنی طرف سے اس کو ایک گھر عطا کرے۔ اور اس کو اپنی جنت میں قیام کی اجازت دیدے۔

نتیجہ خیز کام

۱۹۱۷ میں مصری عدالت کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ معاملہ یہ تھا کہ مصر کے ایک عالم نے یہ کہہ دیا تھا کہ نوح علیہ السلام ہی پہلے نبی تھے۔ کیوں کہ آدم کا ذکر قرآن میں نبی اور رسول کی حیثیت سے نہیں کیا گیا ہے۔ اس رائے پر کچھ لوگ غصہ ہوگئے۔ ایک شخص نے قاہرہ کی شرعی عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ اس عالم نے ایک معلوم دینی حقیقت کا انکار کیا ہے۔ اس لئے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔ اور اس پر ارتداد کی سزا نافذ کی جائے۔ شرعی عدالت نے دعویٰ کو تسلیم کرتے ہوئے مذکورہ عالم کے خلاف فیصلہ دیدیا۔ اس نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ یہ شخص مرتد ہے اور اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی۔

مگر اس کے بعد مقدمہ عدالت اپیل (court of appeal) میں گیا، اور عدالت اپیل نے ابتدائی فیصلہ کو کالعدم قرار دے دیا۔ جج نے اپنے فیصلہ میں کہا:

اختجلتمونا امام الناس اعظم خجل۔ فالافرنج مشتغلون بما یفیدهم، وانتم مشغولون بمالا یفید۔ (المجلہ، جلد ۱۶۰۔ ۲۲ جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۳۵)

تم نے لوگوں کے سامنے ہم کو بہت زیادہ شرمندہ کیا۔ فرنگیوں کا یہ حال ہے کہ وہ ان چیزوں میں مشغول ہیں جو ان کے لئے مفید ہیں اور تم ایسی چیزوں میں مشغول ہو جن کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس واقعہ پر اب ۸۰ سال گزر چکے ہیں۔ مگر تمام دنیا کے مسلمان آج بھی مزید اضافہ کے ساتھ اسی قسم کے بے فائدہ کاموں میں مشغول ہیں۔ حالاں کہ حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی بے فائدہ کام کو چھوڑ دے۔ (من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ)

حقیقت یہ ہے کہ عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ صرف وہ کام کیا جائے جو حقیقی معنوں میں نتیجہ خیز ہو۔ آدمی وہی بات سوچے جس کی کوئی افادیت ہو۔ وہ وہی بات بولے جس میں کوئی خیر ہو۔ وہ وہی کام کرے جس کا کوئی مثبت انجام نکلنے والا ہو۔ وہ وہی اقدام کرے جو کوئی بہتر مستقبل پیدا کرنے والا ہو۔

دعوت اور اصلاح

۱۰ مئی ۱۹۹۵ کو دہلی میں ساؤتھ افریقہ کے دو نوجوانوں سے ملاقات ہوئی ــــ فیصل جو تھیا صاحب اور غلام محمد صاحب۔ انھوں نے سوال کیا کہ دعوت اور اصلاح میں کیا رشتہ ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ دعوت کا کام کرنے سے خود اپنی اصلاح ہوتی ہے۔ مگر یہ بات ابھی تک ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔

میں نے کہا کہ دعوت اور اصلاح میں گہرا رشتہ ہے۔ اور یہ عین انسانی نفسیات کے مطابق ہے۔ نفسیات کا علم بتاتا ہے کہ آدمی خارجی طور پر جس کام میں مشغول ہو، اندرونی طور پر بھی وہ اسی کام میں مشغول ہوتا ہے۔ خارجی عمل اور داخلی حالت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

ایک سچا داعی جس نے دعوت کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہو، وہ کیا کرتا ہے۔ اس کو ایک جلسہ میں اسلام کی دعوت پیش کرنا ہے۔ اب وہ یہ کرے گا کہ سب سے پہلے قرآن وحدیث اور دوسری کتابوں میں موضوع کا مطالعہ کرے گا۔ وہ غور کرکے اپنی تقریر کے نکات مقرر کرے گا۔ وہ دعا کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذہن کو کھول دے اور اس کے دل میں وہ صحیح بات ڈال دے جو اس کو اجتماع عام میں کہنا چاہئے۔ پھر وہ دو رکعت صلاۃ الحاجہ پڑھ کر دعا کرے گا کہ خدایا، میری مدد فرما۔ مجھ سے وہ بات کہلا دے جو تیری مرضی کے مطابق ہو۔ جب وہ اجتماع گاہ میں پہنچے گا تو بار بار دعا کرے گا کہ: رَبِّ اشرح لی صدری ویسرلی أمری واحلل عقدة من لسانی یفقھو قولی۔

اس طرح ایک سچے داعی کی زندگی میں "دعوت" کا عمل شروع ہونے سے پہلے "اصلاح" کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو مخاطب بنانے سے پہلے وہ خود دعوت حق کا مخاطب بن جاتا ہے۔ پھر جب وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے تب بھی بار بار وہ دل ہی دل میں دعا کرتا رہتا ہے۔ بظاہر وہ بندوں کے سامنے ہوتا ہے مگر حقیقۃً وہ اللہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت عین اسی وقت اصلاح بھی ہے۔ دوسروں کو پیغام پہنچانا خود اپنے آپ کو بھی مخاطب بنانا ہے۔ جو آدمی صحیح معنی میں دعوتی عمل میں مشغول ہو وہ اسی کے ساتھ لازمی طور پر خود اپنی اصلاح کے عمل میں بھی مشغول ہو جاتا ہے۔

انتظامی حکمت

الرجال قوّامُونَ علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعضٍ وبما انفقوا من اموالھم فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللّٰہ (النساء ۳۴)

مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال خرچ کئے۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرتی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔

خاندان، وسیع تر انسانی نظام کا، ایک ابتدائی جزء (یونٹ) ہے۔ اس ابتدائی وحدت کو دو فرد، مرد اور عورت، مل کر چلاتے ہیں۔ زیادہ بڑے نظاموں کی طرح، گھر کا چھوٹا نظام بھی صحیح طور پر صرف اسی وقت چل سکتا ہے جب کہ دونوں میں سے ایک حاکم ہو، اور دوسرا اس کے مقابلہ میں ماتحت حیثیت قبول کرے۔ دونوں یکساں درجہ میں صاحب حکم ہوں تو اس نظام کا چلنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔ مذکورہ آیت میں اسی حکمت کو بتایا گیا ہے۔

آیت میں فضل کا لفظ ہے۔ فضل کے معنی عربی زبان میں زائد کے ہیں (لسان العرب ۱۱/۵۲۶) اللہ تعالیٰ نے مذکورہ مصلحت کی بنا پر عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو ایک زائد خصوصیت پیدائشی طور پر عطا فرمائی ہے جو نظام فطرت میں کامیاب کارکردگی کے لئے انھیں درکار تھی۔

مرد کی خصوصیت زائدہ یہ ہے کہ وہ کمانے اور خرچ اٹھانے کی اضافی صلاحیت رکھتا ہے اس کے مقابلہ میں عورت کی اضافی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر قنوت (اطاعت) کا مزاج نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ گویا عورت اور مرد کو گھر کا نظام چلانے کے لئے الگ الگ جو صفات درکار ہیں وہ پیشگی طور پر دونوں کے اندر پیدا کر دی گئی ہیں۔

عورت اور مرد دونوں کے لئے پسندیدہ بات یہ ہے کہ وہ اس پورے معاملہ کو آزمائش کی نظر سے دیکھیں۔ ہر ایک کی توجہ اس پر ہو کہ اس کو جس کار خاص کے لئے بنایا گیا ہے اس کارِ خاص کو اسے بحسن و خوبی انجام دینا ہے۔ اسی حسن کارکردگی پر آخرت میں ان کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔

ذاتی ذمہ داری

دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) کے دوران سرونسٹن چرچل برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ عام طور پر ترشد و پسند لیڈر کی حیثیت سے مشہور رہیں۔ ایک بوڑھے برطانی شہری نے مجھے بتایا کہ چرچل نے اس جنگ کے زمانہ میں برطانی قوم کو جو ماٹو دیا وہ یہ تھا ــــ سب کچھ میرے اپنے اوپر منحصر ہے:

It all depends on me.

یہ ایک بہترین ماٹو ہے۔ یہ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں یکساں طور پر مفید ہے۔ میرے بھائی عبد المحیط خاں (انجنیئر) نے بتایا کہ ایک بار وہ چندی گڑھ کے ایک ٹریننگ کیمپ میں شریک ہوئے۔ یہ کیمپ پالی ٹکنیک کے پرنسپلوں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور اس میں لکچر دینے کے لئے ایک انگریز پروفیسر کو بلایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح ایک ہندستانی منسٹر کو کرنا تھا۔ منسٹر جب مائک پر کھڑے ہوئے تو اچانک بجلی چلی گئی اور لاؤڈ اسپیکر نے کام کرنا بند کر دیا۔ وہاں تبادل انتظام کے طور پر بیٹری نہ تھی۔ البتہ کالج کے ورکشاپ میں بیٹری موجود تھی۔

اس وقت زیر تربیت پرنسپل صاحبان کالج کے کسی چپراسی یا ورکر کو تلاش کرنے لگے تاکہ اس کو ورکشاپ بھیج کر وہاں سے بیٹری منگوائیں اور اس سے لاؤڈ اسپیکر کو چلائیں۔ مگر انگریز پروفیسر کو جیسے ہی صورتحال کا علم ہوا وہ خود بھاگ کر ورکشاپ میں پہنچا اور بھاری بیٹری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دوڑتا ہوا آیا اور لاؤڈ اسپیکر کے نظام سے جوڑ کر اس کو چلا دیا۔

کسی قوم کے افراد میں یہی مزاج اس قوم کی اجتماعی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ افراد کے اندر یہ اسپرٹ جتنا زیادہ پائی جائے گی، اتنا ہی زیادہ وہ قوم ترقی کر سکے گی۔

عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ سماج میں کوئی خرابی دیکھتے ہیں تو ایک قانون بنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں یا نظام میں تبدیلی لاکر اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ مگر قانون اور نظام کی ایک حد ہے۔ اپنی حد پر پہنچ کر قانون اور نظام غیر موثر ہو جاتے ہیں۔ اصلاح کا اصل طریقہ یہ ہے کہ افراد کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

ایک شرعی مسئلہ

یورپ کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک غیر مسلم اسکالر سے ہوئی۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ اس وقت ساری دنیا میں پناہ گزینوں کی جو تعداد ہے اس میں تقریباً ۹۵ فی صد پناہ گزیں مسلمان ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ایک جنگ جو (militant) مذہب ہے جو اپنے پیروؤں کو اینٹی اسٹبلشمنٹ بناتا ہے۔ وہ ہر جگہ اپنے حکمرانوں کے باغی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد حکمرانوں کی طرف سے ان پر تشدد (persecution) ہوتا ہے تو وہ بھاگ بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لیتے ہیں۔ اسلام کی اس تعلیم نے خود مسلمانوں کو بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے اور وہ دنیا والوں کے لیے بھی مصیبت بن گئے ہیں۔

یہ بات جو مغربی پروفیسر نے کہی وہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بارہ میں عام تاثر ہے۔ یہ مسلمانوں کے اوپر کوئی فرضی الزام بھی نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عملی طور پر موجودہ مسلمان یہی کام کر رہے ہیں۔ ہر جگہ وہ اینٹی اسٹبلشمنٹ بنے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ وہ اپنے ملک کی حکومتوں سے ٹکراؤ چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی تباہی کی صورت میں نکل رہا ہے جس کا صرف ایک جزء عالمی پناہ گزینوں میں مسلمانوں کی مذکورہ کثرت ہے۔

عام حالت میں یہ صرف مسلمانوں کا یا ان کے کچھ لیڈروں کا ایک گروہی واقعہ ہوتا۔ جو کچھ غلط فہمی ہوتی وہ صرف کچھ مسلمانوں کے بارہ میں ہوتی۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ مسلم عاملین (activists) اپنی یہ جنگ جویانہ مہم اسلام یا اسلامی جہاد کے نام پر چلا رہے ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر مسلمانوں کا یہ عمل اسلام کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس عمل سے اسلام بدنام ہو رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی متشددانہ سیاسی سرگرمیوں میں سارے مسلمان شامل نہیں ہیں۔ ان کا ایک طبقہ ہی عملی طور پر ان میں ملوث ہے۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ موجودہ مسلم دنیا کے علماء اور دانشور ان افعال کی مذمت نہیں کرتے۔ اس طرح خود شرعی اصول کے مطابق، تمام مسلمان براہ راست یا بالواسطہ طور پر مسلم جنگ جوئی کے مؤید بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ برائی پر چپ رہنا برائی کی تائید کرنا ہے۔

ان حالات میں یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ مذکورہ قسم کی متشددانہ تحریکیں لوگوں کی نظر میں اسلام کی

نمائندہ تحریکیں قرار پائیں ۔ لوگ یہ رائے قائم کریں کہ یہی اسلام کا اصل مطلوب عمل ہے ۔ اسلام تشدد کا مذہب ہے ۔ وہ دوسرے مذاہب یا نظاموں کے ساتھ موافقت کر کے رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔ اس مقالہ میں مجھے اسی مسئلہ کا علمی جائزہ لینا ہے ۔

اسلام بنیادی طور پر ایک امن پسند مذہب ہے ۔ اسی لیے پیغمبر اسلام کو رحمۃ للعالمین (الانبیاء ۱۰۷) کہا گیا ہے ۔ یعنی سارے عالم کے لیے رحمت ۔ گویا کہ پیغمبر اسلام پیغمبر رحمت ہیں نہ کہ پیغمبر حرب ۔ آپ کا طریقہ عدم تشدد (non-violence) ہے نہ کہ تشدد (violence)

تاہم موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں اختلاف اور نزاع کا پیش آنا لازمی ہے ۔ ایک فرد اور دوسرے فرد، اسی طرح ایک گروہ اور دوسرے گروہ میں مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں کیا کیا جائے ۔ اس کا جواب صبر ہے ۔ قرآن میں بہت زیادہ صبر کی تلقین کی گئی ہے ۔ حتیٰ کہ اگر براہ راست احکام کے ساتھ بالواسطہ احکام کو شامل کر لیا جائے تو پورا قرآن کتاب صبر نظر آئے گا ۔

صبر و اعراض کا مطلب یہ ہے کہ ناخوش گوار باتیں پیش آنے کی صورت میں رد عمل کا انداز اختیار نہ کیا جائے بلکہ یک طرفہ طور پر برداشت کر لیا جائے تاکہ جو شکایتی بات پیدا ہوئی ہے وہ اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جائے ۔

اس کے باوجود ایسی حالتیں پیش آسکتی ہیں جب کہ بات بڑھ جائے ۔ ابتدائی شکایت باقاعدہ نزاع کی صورت اختیار کرنے لگے ۔ اس وقت اہل اسلام کو کیا کرنا چاہیے ۔ اس سلسلہ میں ایک اصولی ہدایت دی گئی کہ والصلح خیر (النساء ۱۲۸) یعنی صلح کر لینا بہتر ہے ۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ الحرب خیر (جنگ بہتر ہے) مگر یہ فرمایا کہ الصلح خیر (صلح بہتر ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزاعی امور میں اسلام کی اسپرٹ صلح ہے نہ کہ حرب ۔

اس طرح عدم نزاع کو اسلام نے ایک بنیادی اجتماعی اصول کی حیثیت دے دی ہے ۔ خواہ فرد اور فرد کے درمیان کا معاملہ ہو یا گروہ اور گروہ کے درمیان کا معاملہ، ہر موقع پر اصلاً اس اصولی ہدایت کو ملحوظ رکھنا ہے کہ ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے ۔ اور اگر بالفرض ٹکراؤ پیش آجائے تو پہلی فرصت میں صلح کا طریقہ اختیار کر کے نزاع کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ کیوں کہ ٹکراؤ ہمیشہ مسئلہ کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں مسئلہ کا حل نہیں ۔

مسلم حکمراں کا معاملہ

اجتماعی نزاعات کی سب سے زیادہ سنگین صورت وہ ہے جو عوام اور حکمراں کے درمیان پیش آتی ہے۔ اس کو ایک لفظ میں سیاسی نزاع بھی کہا جاسکتا ہے۔ انسانوں کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ خود خواہ کیسے ہی ہوں، مگر حکمراں طبقہ کو وہ ہمیشہ آئیڈیل کے معیار سے ناپتے ہیں، جب کہ آئیڈیل کا حصول اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا گروہ حکمراں بنتا ہے، فوراً ہی لوگوں کو اس سے شکایت شروع ہو جاتی ہے۔ یہ شکایت بڑھ کر کبھی ٹکراؤ اور جنگ تک پہنچ جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں احادیث میں نہایت تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ یہ ہدایات تمام کی تمام عملی معقولیت (practical wisdom) پر مبنی ہیں۔ یعنی ناممکن کی چٹان سے سر ٹکرانے کے بجائے ممکن کے میدان میں کوششوں کو موڑ دینا۔

یہ ہدایات خاص طور پر حدیث کی کتابوں میں ابواب الفتن کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ حدیثیں بگڑے ہوئے حکمرانوں کے بارہ میں شرعی حکم کو بتاتی ہیں۔ وہ حکم یہ ہے کہ ایسے حکمرانوں سے ہرگز سیاسی ٹکراؤ نہ کیا جائے۔ بلکہ ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنے آپ کو غیر سیاسی دائرہ میں مصروف رکھا جائے۔

ان روایات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر فرمادیا تھا کہ میرے بعد تم اپنے حکمرانوں میں بہت بگاڑ دیکھو گے۔ لیکن بگاڑ اور ناانصافی کے باوجود تم ان کے خلاف خروج (بغاوت) نہ کرنا۔ تم ہر حال میں صبر کے اصول پر قائم رہنا۔ تم کسی بھی عذر کو لے کر حکمرانوں سے لڑائی نہ کرنا۔ بلکہ اپنی بکری اور اونٹ میں مشغول ہو کر اپنے ضروری دینی فرائض کو ادا کرتے رہنا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ واضح اور قطعی ہدایت حدیث کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کے نظام حکومت میں بہت زیادہ بگاڑ آگیا۔ مگر مسلم علماء نے ان حکمرانوں کے خاتمہ کے لیے کبھی کوئی مخالفانہ سیاسی مہم شروع نہیں کی۔ بنوامیہ، بنوعباس اور دوسرے حکمرانوں میں خود آپس میں تو مختلف صورتوں میں ٹکراؤ پیش آیا۔ مگر صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور علماء نے کبھی اصلاح سیاست کا نام لے کر ان کو سیاست سے بے دخل کرنے کی تحریک نہیں چلائی۔

یہ بات نہ صرف عملی طور پر ہوئی۔ بلکہ نظری طور پر تمام علماء نے اس پر اتفاق رائے کرلیا۔ تمام علماء اور فقہاء نے متفقہ طور پر یہ فتویٰ دیا کہ ایک مسلم حکمراں جس کی حکومت عملاً قائم ہوگئی ہو، خواہ بظاہر وہ ظالم

اور فاسق کیوں نہ ہو، اس کے خلاف خروج (بغاوت) کرنا جائز نہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ امام نووی کچھ احادیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" اور اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ارباب اقتدار سے ان کے اقتدار کے معاملہ میں نزاع نہ کرو اور نہ ہی ان کے اوپر اعتراض کرو، اِلّا یہ کہ تم ان میں کوئی ایسا ثابت شدہ منکر فعل دیکھو جس کو تم اسلام کے بنیادی امور میں سے جانتے ہو۔ پس جب تم ایسی چیز دیکھو تو تم ان پر نکیر (قولی نصیحت) کرو۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہو حق بات کہو۔ باقی ان کے خلاف خروج (عملی بغاوت) اور ان سے جنگ تو وہ اجماع مسلمین کے تحت حرام ہے، خواہ یہ حکمراں فاسق اور ظالم کیوں نہ ہوں (واما الخروج علیہم وقتالہم فحرام باجماع المسلمین وان کانوا فسقۃ ظالمین) اور یہ جو مفہوم میں نے بیان کیا اس کی تائید میں کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں۔ اور اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حکمراں فسق کی بنا پر معزول نہیں ہوتا۔ اور فسق کی بنا پر حکمراں کے معزول ہو جانے کی بات جو فقہ کی کتابوں میں ہمارے بعض اصحاب نیز معتزلہ کی طرف منسوب کر کے بیان ہوئی ہے وہ غلط ہے اور اجماع کے خلاف ہے۔ علماء نے ایسے حکمراں کے معزول نہ ہونے اور اس کے خلاف خروج کے حرام ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ اس کے نتیجہ میں بدامنی اور خوں ریزی اور آپس کے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ پس اس کی معزولی (یا اس کے خلاف خروج) کی صورت میں اس سے زیادہ بگاڑ اور فساد برپا ہوگا جتنا کہ اس کے برسر اقتدار رہنے کی صورت میں تھا" (صحیح مسلم بشرح النووی ۲۲۹/۱۲)

اس شرعی اصول پر جانچئے تو معلوم ہوگا کہ مسلم ملکوں میں اٹھنے والی وہ تمام تحریکیں باطل تحریکیں تھیں جو موجودہ صدی میں مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے اٹھیں۔ بظاہر ان کا نعرہ تھا کہ وہ فاسق حاکموں کو ہٹانا چاہتے ہیں تاکہ شرعی قانون کا نظام قائم کر سکیں۔ مگر حقیقۃً یہ شرعی قانون کی نفی تھی۔ کیوں کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ایک مسلم حکمراں جس کی حکومت عملاً قائم ہو چکی ہو، اس کے خلاف کسی بھی حال میں خروج (بغاوت) نہ کرو۔

اس قسم کی تمام تحریکیں، مذکورہ شرعی حکم کے مطابق، ناجائز تحریکیں تھیں۔ کیوں کہ وہ قائم شدہ مسلم حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے اٹھائی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پُرشور تحریکوں سے کوئی مثبت اسلامی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ بے پناہ قربانیوں کے باوجود وہ اپنے ملکوں کو تباہی

اور بربادی کے سوا کوئی اور تحفہ نہ دے سکیں۔ خدا کی اس دنیا میں کسی غیر اسلامی عمل سے کبھی کوئی اسلامی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔

مسلمانوں کو سیاسی نزاع سے روکنے کا مطلب ان کو بے عملی کی طرف لے جانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان کو بے فائدہ عمل کے میدان سے نکال کر مفید عمل کے میدان میں سرگرم کیا جائے۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ دنیا مسائل کی دنیا ہے۔ یہاں یہ مسائل زندگی کبھی کسی کو ملنے والی نہیں۔ اگر آپ سیاسی مسئلہ کو ختم کرنے کے نام پر جنگ چھیڑیں تو جب آپ سیاسی مسئلہ کو ختم کر چکے ہوں گے، اس کے بعد پھر کوئی نیا مسئلہ آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ برصغیر ہند کے علماء نے انگریزی مسئلہ کو ختم کرنے کے نام پر قربانیاں دیں۔ مگر جب انگریزی مسئلہ ختم ہو گیا تو معلوم ہوا کہ اکثریتی بالادستی کی صورت میں ایک نیا مسئلہ یہاں ان کے لیے موجود ہے۔ مصر میں اخوانیوں نے شاہ فاروق کو سیاسی مسئلہ سمجھ کر ان کے خلاف بغاوت کی۔ مگر شاہ فاروق کے خاتمہ کے بعد دوبارہ فوجی ڈکٹیٹر شپ کا شدید تر مسئلہ ان کے سامنے موجود تھا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے ایوب اور بھٹو کو مسئلہ سمجھ کر ان کے خلاف ہنگامہ خیز مہم چلائی۔ مگر ایوب اور بھٹو کا خاتمہ کسی بھی درجہ میں مسائل کے خاتمہ کے ہم معنی نہ بن سکا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں مسائل ہماری زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ایسی حالت میں مسائل سے ٹکرانا صرف ایک نادانی کا فعل ہے۔ موجودہ دنیا میں عمل کا صحیح طریقہ صرف ایک ہے ——— مسائل کو نظر انداز کرنا اور مواقع کو استعمال کرنا۔ یہی اسلام کا حکم ہے، اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

مسائل رخی جدوجہد موجودہ دنیا میں کبھی کسی مفید نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔ اس قسم کی جدوجہد کا واحد انجام صرف یہ ہے کہ ایک مسئلہ کو ختم کرنے کے نام پر ٹکراؤ کیا جائے، اور جب وہ مسئلہ ختم ہو تو اس کے بعد نئے پیش آمدہ مسئلہ کے نام پر دوبارہ احتجاج یا ٹکراؤ کی نئی مہم شروع کر دی جائے۔ اور بے فائدہ قربانیوں کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے۔

مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرنا حالت موجودہ پر ٹھہراؤ نہیں ہے۔ یہ دراصل ناممکن میدان سے ہٹ کر ممکن میدان میں اپنی طاقت کو استعمال کرنا ہے۔ اور ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ ممکن میدان میں اپنی طاقت صرف کریں وہ آخر کار ممکن کو بھی پا لیتے ہیں اور ناممکن کو بھی۔

غیر مسلم حکمراں کا معاملہ

جہاں تک مسلم حکمراں کا معاملہ ہے، اس کے خلاف خروج کی حرمت صریح احادیث سے ثابت ہے۔ اسی لیے تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکمراں اگر غیر مسلم ہو تو اس کے بارہ میں شریعت اسلامی کا حکم کیا ہے۔

یہاں شریعت کا اصولِ قیاس ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اصول فقہ میں یہ بات مسلّم ہے کہ شرعی احکام کے ماخذ چار ہیں ـــــــ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ زیر بحث معاملہ میں قیاس کے اصول میں ہمارے لیے واضح رہنمائی موجود ہے۔

فقہ کی تمام اہم کتابوں میں قیاس پر بحث کی گئی ہے۔ شرعی قیاس کیا ہے، اس کو اصول فقہ کی کسی بھی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فنی اصطلاحات سے قطعِ نظر، سادہ طور پر قیاس کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ اشتراکِ علت کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں دوسری چیز کے مماثل حکم ثابت کرنے کا نام ہے (اثبات مثل حکم معلوم فی معلوم آخر لاشتراکهما فی علة الحکم، ناصر الدین البیضاوی، منہاج الوصول، ۲/۳)

بیضاوی کے مذکورہ الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے دکتور صلاح الدین زیدان نے لکھا ہے کہ: جب حکم کی علت میں مماثلت پائی جائے تو نتیجۃً حکم میں بھی مماثلت ہوگی (التماثل فی علة الحکم یؤدي الی التماثل فی الحکم، الدکتور صلاح الدین زیدان، حجیۃ القیاس، صفحہ ۲۳)

مثال کے طور پر شراب کے بارے میں یہ حکم ثابت ہے کہ وہ حرام ہے لیکن کھجور سے تیار کی گئی نبیذ کا حکم صراحۃً قرآن یا حدیث میں موجود نہیں۔ مگر فقہاء نے اس کو حرام قرار دیا ہے کیوں کہ نبیذ اور شراب میں ایک قدرِ مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے دونوں کا مسکر یعنی نشہ آور ہونا۔ اب چونکہ اسی قدرِ مشترک کی بنا پر شریعت نے شراب کو حرام ٹھہرایا ہے لہٰذا نبیذ اور کھانے پینے کی وہ ساری چیزیں جو مسکر (نشہ آور) ہیں ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو شراب کا حکم ہے۔

اس اصول قیاس کو سامنے رکھ کر مذکورہ معاملہ پر غور کیجئے تو جو بات سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ ـــ پیغمبر اسلام نے صراحت کے ساتھ غیر عادل مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) سے منع فرمایا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کا اقدام زیادہ بڑا نقصان (بدامنی اور جان و مال کی تباہی) پیدا کرے گا۔

معلوم ہوا کہ اس ممانعت کی اصل علت شدید تر برائی کا پیدا ہونا ہے۔ یہ شدید تر برائی اس وقت بھی پوری طرح ظہور میں آئے گی جب کہ حکمراں غیر مسلم ہو۔ گویا دونوں جگہ علت کا اشتراک پایا جارہا ہے۔ اور جب علت مشترک ہے تو شرعی اصول کے مطابق حکم بھی مشترک ہوگا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت میں جس طرح غیر عادل مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت ناجائز ہے اسی طرح غیر مسلم حکمراں کے خلاف بھی بغاوت ناجائز ہے خواہ وہ لوگوں کو غیر عادل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خاص مسئلہ میں مسلم حکمراں اور غیر مسلم حکمراں کا فرق محض اضافی ہے۔ کیوں کہ حکمراں کے خلاف خروج کی ممانعت اس لیے نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہ ممانعت صرف اس لیے ہے کہ اس قسم کا فعل زیادہ بڑا شر پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ ایسا اقدام عملی طور پر الٹے نتیجہ والا (counter-productive) ثابت ہوگا۔ اٹھنے والا اپنے خیال کے مطابق تو ظلم کو ختم کرنے کے لیے اٹھے گا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے عظیم تر ظلم ظہور میں آئے گا۔

ایسا ہونا بالکل یقینی ہے۔ کیوں کہ حکمراں کسی معاشرہ کا وہ عنصر ہے جس کے پاس ہر قسم کی طاقتیں ہوتی ہیں۔ جب اس کے وجود کو چیلنج کیا جائے گا تو لازماً وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لیے اپنی ان طاقتوں کو استعمال کرے گا۔ اس کے بعد تشدد، خوں ریزی، اموال کی تباہی، امن وامان کا غارت ہو جانا جیسے یقینی نتائج رونما ہوں گے۔ چھوٹی برائی کو دور کرنے کی کوشش میں زیادہ بڑی برائی پیدا ہو جائے گی۔

گویا یہاں حکم کی جو علت ہے وہ حکمراں کا مسلم ہونا نہیں ہے بلکہ حکمراں کا اس پوزیشن میں ہونا ہے کہ وہ خروج کا عمل پیش آنے کے بعد پورے معاشرہ کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے گا۔ سیاسی خروج کی حرمت کا سبب حاکم کا مسلمان ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب ترتب فتنہ ہے۔ اور قیاس شرعی کے مطابق، جب علت مشترک ہے تو حکم بھی مشترک ہو جائے گا۔ یعنی غیر مسلم حکمراں کے خلاف خروج بھی اسی طرح ناجائز قرار پائے گا جس طرح مسلم حکمراں کے خلاف خروج ناجائز ہے، کیوں کہ باعتبار انجام دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حکمراں کے خلاف خروج اس وقت تک جائز نہیں جب تک اقامت صلاۃ میں وہ کوئی رکاوٹ نہ ڈال رہے ہوں۔ اس حدیث میں "صلاۃ" کی اجازت کا ذکر دراصل

مذہبی آزادی کی علامت کے طور پر آیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام کو جب تک عبادت اور قول وعمل کی آزادی حاصل ہے ، ان کو اپنے حکمراں کے خلاف سیاسی معزولی کی تحریک چلانا جائز نہیں ، خواہ یہ حکمراں مسلم ہو یا غیر مسلم۔

موجودہ زمانہ میں تمام غیر مسلم حکومتوں میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اینٹی اسٹبلشمنٹ سیاست کے سوا وہ ہر مذہبی سرگرمی کے لیے پوری طرح آزاد ہیں۔ ایسی حالت میں ان ملکوں میں سیاسی حکمرانوں کے خلاف تحریکیں چلانا سراسر ناجائز فعل ہے۔ اس قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی ، خواہ وہ اسلام کے نام پر کی جائے ، یقینی طور پر وہ غیر اسلامی قرار پائے گی ۔

مذکورہ احادیث اور شرعی حکم کے مطالعہ سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکمراں کے اندر اگر غلطی یا ناانصافی دکھائی دے تو اصلاً جس چیز کا جواز ہوگا وہ قولی نکیر ہے ۔ یعنی لفظی تنقید کی صورت میں اظہار رائے ۔ اور وہ بھی عوامی تقریر کی صورت میں نہیں بلکہ تنہائی کی ملاقات میں ، جیسا کہ بزرگ صحابی عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم کو ضرور ہی کچھ کہنا ہو تو ایسی مجلس میں کہو جس میں صرف تم ہو اور وہ (فان کنت لابد فاعلاً ففیما بینك وبینه)

موجودہ زمانہ میں کئی ایسے غیر مسلم ملک ہیں جن کے بارہ میں مسلم پریس روزانہ ظلم وزیادتی کی داستان سناتا رہتا ہے ۔ یہ طریقہ شریعت کے مطابق تطفیف ہے ، اور تطفیف کو قرآن میں نہایت برا فعل بتایا گیا ہے ۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان غیر مسلم ملکوں میں ظلم وزیادتی کے واقعات کب شروع ہوئے ۔ جب آپ اس اعتبار سے جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ مسلمانوں کے سیاسی جہاد کے بعد کے واقعات ہیں نہ کہ پہلے کے واقعات ۔ ان علاقوں میں مسلمانوں کو پوری طرح مذہبی آزادی حاصل تھی ۔ وہ امن کے ساتھ وہاں زندگی گزار رہے تھے ۔ مگر جب وہاں جہاد کے نام پر "گن کلچر" کو فروغ دیا گیا تو اس کے بعد وہاں کے حکمرانوں نے بھی تشدد کا جواب تشدد سے دینا شروع کیا ۔ ایسی حالت میں ان مظالم کی اصل ذمہ داری ان انتہاپسند مسلم لیڈروں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی مخالفانہ کارروائیوں سے اس کا سبب بنے ۔ حدیث میں ہے کہ ان الفتنة نائمة لعن الله من ایقظها ۔ اس حدیث کے مطابق ، اصل مجرم موقظ فتنہ ہے نہ کہ صاحب فتنہ ۔

ایک شرعی اصول

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کو لوگ پکارتے ہیں تم ان چیزوں کو برا نہ کہو،
وہ لوگ اللہ کو برا کہنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو مزین کر دیا
(الانعام ۱۰۸)

اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے عمل کو نتیجہ رخی (result-oriented) عمل
ہیے۔ ہر اقدام سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ اگر نتیجہ غیر مطلوب نکلنے
تو اقدام سے پرہیز کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو عمل الٹا نتیجہ والا
(counter-producti ثابت ہو، وہ عمل اسلام میں جائز نہیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص ملعون ہے جو اپنے باپ کو گالی
. لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیسے کوئی شخص اپنے باپ کو گالی دے گا، آپ نے فرمایا کہ تم
، کے باپ کو گالی دو گے پھر وہ تمہارے باپ کو گالی دے گا۔ تم کسی کی ماں کو گالی دو گے پھر وہ
ماں کو گالی دے گا۔ اسی بنا پر فقہ میں ایک مستقل مسئلہ بنا ہے جس کو ترك المصلحة للمفسدة
ہے۔ یعنی ایک بظاہر مطلوب کام کو اس لیے چھوڑ دینا کہ اس کے کرنے سے زیادہ بڑا
اہو گا۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۱۶۴)

اس شرعی اصول کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے وہ تمام اقدامات غیر اسلامی قرار پاتے ہیں جن کو
، نام پر شروع کیا گیا۔ کیونکہ ان اقدامات کا نتیجہ زبردست تباہی کی صورت میں نکلا۔ اقدام
ے پہلے مسلمانوں کو جو کچھ حاصل تھا وہ بھی ان سے کھو یا گیا اور مزید کوئی چیز انھیں حاصل نہ ہو سکی۔

ایک اعتراض

مذکورہ بات کے سلسلہ میں اکثر مسلم دانشور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات جو آپ کہہ رہے
مسیحی نقطۂ نظر ہے جو انفعالیت پر قائم ہے۔ اسلام تو ایک انقلابی دین ہے جو فعالیت میں یقین
،۔ مگر یہ کچھ افراد کی محض ذاتی ریزننگ ہے۔ ہم نے جو بات کہی ہے وہ قرآن و حدیث کے
سے کہی ہے۔ وہ مکمل طور پر شرعی نصوص پر مبنی ہے۔ جب کہ معترض حضرات کی بات تمام تر
نگ پر مبنی ہے۔ اور کسی کی ذاتی ریزننگ شرعی نصوص کا بدل نہیں بن سکتی۔

مسلم دانشوروں میں ایک بالکل بے بنیاد خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ اسلام ایک ارتقا یافتہ مذہب ہے ، اور دوسرے مذاہب غیر ارتقا یافتہ مذاہب ہیں۔ حالانکہ یہ بات صریح اسلامی نصوص کے خلاف ہے۔ قرآن کے مطابق ، ہر پیغمبر کو ایک ہی دین دیا گیا۔ اسلام اور دوسرے مذاہب میں غیر محرف اور رف کا فرق ہے نہ کہ ارتقائی اور غیر ارتقائی کا۔

مثال کے طور پر مسلم خطبا اکثر حضرت مسیح کے اس قول کا استخفاف کرتے ہیں کہ پس جو قیصر کا ہے مر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو (متی ۲۲ : ۲۱) حالانکہ یہ مخصوص حالات کے اعتبار سے ایک حکیمانہ ایت ہے اور وہ خود اسلام میں عین اسی طرح موجود ہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک وایت ہے جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

نکم ستَرون بعدی اثَرَةً و اموراً ـکرونها۔ قالوا فما تأمرنا یارسول الله۔ ال : اَدّوا الیهم حقّهم وسَلوا الله ـقّکم۔

(مشکاۃ المصابیح ۲ / ۱۰۸۷)

میرے بعد تم لوگ (حکمرانوں میں) خود غرضی اور منکر چیزیں دیکھو گے۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول ، پھر اس وقت کے لیے آپ ہم کو کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ان کو ان کا حق ادا کرو اور اللہ سے اپنا حق مانگو۔

ایک شبہہ کا ازالہ

مذکورہ شرعی اصول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت اہل اسلام کو قانع حال (statusquoist) ا دینا چاہتی ہے۔ شریعت کے اس حکم کا مقصد دراصل نازک صورت حال میں اپنے عمل کے لیے نقطۂ آغاز (starting point) حاصل کرنا ہے۔ نزاعی صورت حال میں اگر ردعمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ البتہ ملی طور پر ٹھہراؤ (statusquoism) کے ہم معنی ہوگا۔ ایسی حالت میں اہل اسلام سامنے کی چٹان سے کراتے رہیں گے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے اپنا راستہ نہ پا سکیں گے۔

اس لیے شریعت نے اہل اسلام کو مذکورہ حکم دیا۔ یعنی وہ حالات کے ناموافق پہلو پر صبر کریں تاکہ وہ حالات کے موافق پہلو کو استعمال (avail) کر سکیں۔ یہ قانون قدرت ہے کہ ہر صورت حال میں آدمی ے لیے کچھ موافق پہلو اور کچھ ناموافق پہلو دونوں بیک وقت موجود ہوں۔ موافق پہلو کو استعمال کرنے کی واحد یمت ناموافق پہلو کو برداشت کرنا ہے۔ مذکورہ شرعی حکم دراصل اسی قیمت کو ادا کرنے کی ایک صورت ہے۔

زندگی کا سفر کبھی نقطۂ اختتام سے شروع نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا سفر جب بھی شروع ہو گا، ابتدائی نقطہ سے شروع ہو گا۔ زندگی میں کامیاب سفر کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کو نقطۂ آغاز مل جائے۔ صحیح نقطۂ آغاز مل جانے کے بعد منزل پر پہنچنا اتنا ہی یقینی ہو جاتا ہے جتنا تاریک شام کے بعد روشن صبح کا نکلنا۔

تعبیر کا مسئلہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام میں یہ جائز نہیں کہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے ان کے خلاف جنگ برپا کی جائے تو ایسا کیوں ہے کہ آج ساری دنیا میں مسلمان اسی قسم کے سیاسی ہنگامے برپا کیے ہوئے ہیں۔ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے ان مسلم مفکرین پر ہے جنھوں نے اسلام کی سیاسی تعبیر کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو یہ نشانہ دیا کہ وہ تمام مخالف طاقتوں سے لڑ کر ساری دنیا میں اسلام کا اقتدار قائم کریں۔

حدیث کے الفاظ میں، اسلامی دعوت کا نشانہ یہ تھا کہ قلب انسانی کو بدلا جائے۔ مگر اس تعبیر نے انتہائی غلط طور پر نظام سیاسی کی تبدیلی کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنا دیا۔ اور اس غلط تعبیر نے ایک ناجائز کام کو اسلام کا اعلیٰ و ارفع مطلوب قرار دے دیا۔ چنانچہ اب تمام لوگ ارباب اقتدار سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ فکر انسانی میں کبھی ایسا بگاڑ بھی آسکتا ہے کہ لوگ سراسر ایک عبث کام کریں اور بطور خود یہ سمجھیں کہ وہ بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں (الکہف)۔ یہی موجودہ زمانہ میں ان نام نہاد انقلابی مسلمانوں کا حال ہے۔ نااہل رہنماؤں کی تزئین کے نتیجہ میں ان کا فکر اس طرح بگڑ گیا ہے کہ اب انھیں اسلام کا اصل دعوتی کام کمتر دکھائی دیتا ہے، اور وہ کام انھیں بڑا دکھائی دیتا ہے جس کو بطور خود انھوں نے اسلامی انقلاب کا نام دے رکھا ہے۔

اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ موجودہ مسلم نسلوں کے ذہن کو درست کیا جائے۔ ان کے اندر انقلابی فکر کے بجائے اصلاحی فکر پیدا کیا جائے۔ ان کے اندر سیاست رخی سوچ کی جگہ آخرت رخی سوچ لائی جائے۔ ان کو نام نہاد انقلابی فکر کے بجائے سچے ربانی فکر پر کھڑا کیا جائے۔

اسلام کی تعبیر موجودہ زمانہ میں تین طریقوں سے کی گئی ہے۔ یہ تینوں تعبیرات مختصر انداز میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ پیغمبر دنیا میں خلیفۃ اللہ بن کر آئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ خدا کے باغیوں کو زیر کر کے خدا کی دنیا
ں خدا کے قانون کی حکومت قائم کریں۔

۲۔ خدا نے پیغمبروں کو اس لیے بھیجا تاکہ وہ حیات انسانی کے بارہ میں خدا کے منصوبہ سے لوگوں کو
گاہ کر دیں۔ یعنی یہ منصوبہ کہ موجودہ دنیا آزمائش گاہ ہے۔ کوئی شخص اِس دنیا میں جیسا عمل کرے گا اسی
کے مطابق وہ آیندہ آنے والی ابدی دنیا میں سزا یا انعام پائے گا۔

۳۔ تیسرا نقطۂ نظر تطبیقی نقطۂ نظر ہے۔ اس کے مطابق، مذکورہ دونوں تعبیر میں صرف ترتیب کا
رق ہے۔ دوسرا نظریہ اسلامی دعوت کے آغاز کو بتاتا ہے اور پہلا نظریہ اسلامی دعوت کے اختتام
و بتا رہا ہے۔

مگر قرآن و سنت کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں سے صرف دوسرا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ تمام متعلق
صوص سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ پہلے اور تیسرے نقطۂ نظر کے لیے قرآن و سنت میں کوئی براہ راست
ص موجود نہیں۔ ان حضرات کا استدلال صرف استنباط پر قائم ہے، اور اسلامی دعوت کا نشانہ متعین
رنے کے لیے استنباطی دلیل ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔

اسلامی دعوت اصلاً یہی ہے کہ تخلیق کے خدائی منصوبہ سے لوگوں کو باخبر کیا جائے۔ اور اس کی
نیاد پر افراد کے اندر ذہنی انقلاب لانے کی کوشش کی جائے۔ اصل دعوتی عمل یہی ہے۔ تاہم
ہر اجتماعی عمل کے بہت سے ضمنی نتائج ہوتے ہیں، اسی طرح دعوتی عمل کے بھی ضمنی اور اضافی نتائج ہیں۔
انھیں اضافی نتائج میں سے ایک اہل ایمان کی حکومت قائم ہونا ہے۔ تاہم حکومت اسلامی کا قیام اسلامی
دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ اللہ اپنے مصالح کے تحت کبھی
ایک کے حق میں اور کبھی دوسرے کے حق میں استخلاف فی الارض کا فیصلہ کرتا ہے۔

اس موضوع کی مزید تفصیل راقم الحروف کی حسب ذیل کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے ——
تعبیر کی غلطی، الاسلام، دین کامل، راہ عمل، احیاء اسلام، وغیرہ۔

ایک سفر

اٹلی کی راجدھانی روم ہے۔ مگر وہاں کا سب سے بڑا شہر میلان (Milan) ہے۔ اس کو اطالوی زبان میں میلانو کہا جاتا ہے۔ یہاں ستمبر ۱۹۹۳ میں انٹرنیشنل سطح کی ایک مذہبی کانفرنس ہوئی۔ اس سلسلہ میں اٹلی اور انگلینڈ کا سفر ہوا۔

اس کا دعوت نامہ ۱۰ ماہ پہلے نومبر ۱۹۹۲ میں مجھے مل گیا تھا۔ اس کے بعد کاغذات موصول ہوتے رہے۔ سفر پر روانہ ہونے سے کافی پہلے کانفرنس کی پوری تفصیل مجھے دہلی میں مل چکی تھی۔ یہ موجودہ زمانہ میں مواصلات (communications) کے جدید ذرائع کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ جدید مواصلات نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ آدمی ایک مقام پر بیٹھ کر سارے عالم میں اشاعت افکار کی مہم چلاسکے۔ قدیم نوآبادیاتی نظام کی علامت اگر ٹیلی گرافک پیغام رسانی تھی تو جدید نوآبادیاتی نظام کی علامت الیکٹرانک پیغام رسانی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ نہ قدیم مواصلاتی دور میں اس کو حقیقی طور پر دعوت کے مقاصد میں استعمال کیا جاسکا اور نہ جدید مواصلاتی دور میں اس کو دعوت کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں دعوتی شعور سرے سے موجود ہی نہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما خلافت ارضی اور قیادت عالمی کے حصول کو دعوت سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ محض سیاسی ہنگامہ آرائی ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

ستمبر ۱۹۹۳ کی ۱۸ تاریخ شروع ہوئی تو گاڑی مجھ کو لئے ہوئے تیزی سے دہلی ایرپورٹ کی طرف جا رہی تھی۔ آج مجھے دہلی سے اٹلی جانا تھا۔ وہاں چند دن قیام کرکے ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔ اس کے بعد مزید سفر کرکے انگلینڈ جانا تھا۔ وہاں دوبارہ چند شہروں میں خطاب اور ملاقات کے پروگرام تھے۔ ان سے فارغ ہوکر مجھے دہلی واپس آنا تھا۔ اس سفر کی روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۸ ستمبر کو صبح تین بجے میں دہلی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مختلف قسم کے لوگ اپنے اپنے سامان کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ چلتے ہوئے، کچھ بیٹھے ہوئے۔ اچانک ایک سوال میرے ذہن میں آیا " یہ مختلف قومیتوں کے اور مختلف مذہبوں کے لوگ یہاں لوٹتے کیوں

نہیں۔" یہ سوال عجیب بھی تھا اور غیر متعلق بھی۔ مگر اس سوال نے ایک اہم حقیقت مجھ پر واضح کر دی۔ اس پر غور کرتے ہوئے مجھ پر کھلا کہ اس کی وجہ ذاتی مشغولیت ہے۔ ہر شخص اپنے مسائل اور اپنے انٹرسٹ میں اتنا زیادہ گم ہے کہ کسی کو دوسرے سے الجھنے کا موقع نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ باہمی لڑائی کے خلاف قدرت کا ایک طاقت ور چیک ہے۔ اس طرح قدرت نے ہر ایک کو اپنی ذات میں اتنا زیادہ گم کر دیا ہے کہ اگر اس کو چھیڑا نہ جائے تو کبھی دنگا اور فساد کی نوبت نہ آئے۔

میں ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھی ایئرپورٹ ٹیکس ادا کرنے چلے گئے۔ کیوں کہ ایئرپورٹ ٹیکس کی ادائگی کی رسید حاصل کئے بغیر بورڈنگ پاس نہیں مل سکتا تھا۔ دو آدمی کے لئے چھ سو روپیہ ایئرپورٹ ٹیکس ادا کیا گیا۔ یہ ایئرپورٹ ٹیکس سب کو دینا پڑتا ہے۔ صرف حاجیوں کے لئے یہ سفر ٹیکس معاف ہے ـــــ سیکولر ملک میں بھی کیسی کیسی غیر سیکولر نعمتیں مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

بورڈنگ کارڈ اور دوسرے مراحل سے گزر کر چیکنگ کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے آدمی نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہوئے پوچھا: آپ آتھر ہیں۔ ہاں۔ کیا ناول لکھتے ہیں۔ نہیں، میرا موضوع نان فکشن ہے۔ اس طرح کے مختصر سوال وجواب کے بعد آگے بڑھا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ عام انسان کے نزدیک کتاب سے مراد بس ناول یا افسانہ ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے نزدیک زندگی کا اصل مقصد پیسہ کمانا ہے۔ کتاب وغیرہ کو وہ صرف تفریح کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور تفریح ناول افسانہ سے ہوتی ہے نہ کہ سنجیدہ کتابوں کے مطالعہ سے۔ کتاب یا مطالعہ کا مقصد شعور کا ارتقاء تھا۔ مگر آج وہ بس وقتی تفریح کا سامان بن کر رہ گیا ہے۔

دہلی ایئرپورٹ پر انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایئرپورٹ کا ایک آدمی آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں واکی ٹاکی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چوڑا ٹیپ۔ اس نے بلند آواز سے پکارا: پسنجر راجندر سنگھ۔ مسافر اٹھا تو اس نے کہا کہ آپ کا ایک سامان ڈیمیج (damage) ہو گیا ہے۔ چل کر اس کی پہچان کر لیں۔ پہچان کرانے کے بعد اس نے اپنا ٹیپ کھولا اور اس کو چاروں طرف سے لگا کر ان کے بنڈل کو خوب مضبوط کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا جی بھر آیا۔ باچشم گریہ میں نے کہا: خدایا، اس مسافر کا تو ایک سامان ڈیمج ہوا تھا اور تلاش کرنے والے نے تلاش کرکے اس کو درست کر دیا۔ میرا تو سب کچھ ڈیمج ہو چکا ہے۔ حتی کہ اِس عمر کو پہنچ کر آپ کا دیا ہوا جسم بھی اب ڈیمج ہو گیا۔ خدایا، تو اپنے فرشتوں کو بھیج دے جو تیری قدرت کی 'ٹیپ' کے ذریعہ میرے تمام ڈیمجز کو درست کر دیں۔

دہلی سے روم کے لئے ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۷ اکے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ایئر انڈیا کی میگزین سکار (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان تھا ——— برٹش راج کا تاج:

The Taj of the Raj

یہ مضمون کلکتہ کی ۷۲ سالہ بلڈنگ وکٹوریہ میموریل کے بارہ میں تھا۔ بتایا گیا تھا کہ ۱۹۰۱ میں ب کوئن وکٹوریہ کا انتقال ہوا اس وقت لارڈ کرزن انڈیا میں برٹش وائسرائے تھے۔ انھوں نے نویز کیا کہ کوئن کی ایک یادگار کلکتہ میں قائم کی جائے۔ اس وقت کلکتہ یہاں کی راجدھانی تھا۔ اس کے طابق کلکتہ کا وکٹوریہ میموریل ہال تعمیر کیا گیا۔ مضمون میں اس کے مختلف پہلوؤں کا تعارف کراتے ہوئے خر میں یہ جملہ درج تھا کہ اس سال جب کہ میموریل اپنی ۷۲ سالہ تقریب منا رہا ہے، وہ ماضی ں ایک شاندار یادگار کے طور پر اب بھی باقی ہے، ایک ماضی جو ناقابل انقطاع طور پر حال سے جڑا را ہے:

it remains quintessentially a majestic testimony to the past — a past that is inexorably linked to the present. (36)

یہ خوبصورت جملہ صرف آدھے معنی میں درست ہے۔ عمارت کے اعتبار سے وہ ماضی سے حال ے جڑا ہوا ہے۔ مگر جس راج کے نام پر یہ عمارت بنائی گئی تھی وہ راج ۱۹۴۷ میں ختم ہو گیا۔ جو لوگ ں فرق کو نہ سمجھیں اور عمارت کے اوپر سیاست کو قیاس کرکے ماضی کے راج کو حال تک وسیع کرنا ہیں وہ ملے ہوئے حال کو بھی برباد کر دیں گے۔

یہ فلائٹ براہ راست دہلی سے روم کے لئے تھی۔ دونوں کے درمیان مسافت ۶۳۸۵ کیلو ٹر ہے۔ یہ سفر پورے آٹھ گھنٹہ میں طے ہوا۔ کچھ وقت سونے میں گزرا اور کچھ وقت پڑھنے میں۔ یہاں ک کہ جہاز پرسکون طور پر روم کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔

روم کے بارہ میں ایک دلچسپ خبر نظر سے گزری۔ ایک اطالوی اخبار (PAESE SERA) کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ اٹلی کے دار السلطنت کو پندرہ ملین چوہے کتر رہے ہیں:

The capital of Italy is now being gnawed away by some 15 million rats.

خبر میں کہا گیا تھا کہ چوہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس ابدی شہر (Eternal city) کے لئے زبردست خطرہ بن گئی ہے۔ کبھی ٹیلیفون کام نہیں کرتا اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ چوہے نے لائن کاٹ دی ہے۔ کبھی بجلی فیل ہو جاتی ہے اور اس کا سبب چوہے ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ابھی تک اس مسئلہ کا کوئی مؤثر حل دریافت نہیں کیا جا سکا ہے ـــــ مہلک گیس چھڑک کر تمام چوہوں کو مارا جا سکتا ہے۔ مگر چوہوں کا یہ خاتمہ اس قیمت پر ہوگا کہ اسی کے ساتھ انسان بھی ختم ہو چکے ہوں ـــــ وہ روم جو انسانی فوجوں کے لئے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، وہ چوہے کی فوج کا مقابلہ کرنے سے بھی عاجز ہے۔

مہاتما گاندھی ایک سفر کے دوران دسمبر ۱۹۳۱ میں روم آئے تھے۔ انھوں نے پوپ اور مسولینی دونوں سے ملاقات کی کوشش کی۔ ان کے سوانح نگار مسٹر لوئی فشر نے اپنی ۵۵۰ صفحہ کی کتاب (The Life of Mahatma Gandhi) میں لکھا ہے کہ پوپ نے کسی وجہ سے ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ مسولینی سے ان کی ملاقات ہوئی جو صرف دس منٹ تک جاری رہ سکی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی عدم تشدد کی بات کرتے تھے اور مسولینی تشدد کے طریقے پر یقین رکھتا تھا۔ مہاتما گاندھی کا بیان ہے کہ عمارت کے جس راستہ سے گزار کر انھیں مسولینی کے کمرہ میں پہنچایا گیا، اس کی دیواروں پر ہر طرف تلواریں لگی ہوئی تھیں۔ خود دفتر کی دیواریں بھی تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مزین کی گئی تھیں (صفحہ ۲۹۵)

مسولینی نے دوسری عالمی جنگ میں یہ سمجھ کر شرکت کی کہ وہ دوبارہ عظیم اطالوی ایمپائر قائم کرنے جا رہا ہے۔ مگر اس کے جنگی اقدامات نے صرف اٹلی کو تباہ کیا۔ جولائی ۱۹۴۳ میں وہ خود اپنے ملک میں گرفتار کرکے قید کر دیا گیا۔ وہاں سے بھاگ کر وہ جرمنی پہنچا۔ مگر جرمنی میں بھی اس کو سکون کی جگہ نہ مل سکی۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۵ کو جرمن فوجیوں نے اس کو عین اس وقت گولی مار کر ہلاک

کر دیا جب کہ وہ بھیس بدل کر جرمنی سے فرار ہونا چاہتا تھا۔

جو لوگ موجودہ زمانہ میں "تلوار" کی بات کرتے ہیں، انھیں مسولینی اور اس کے جیسے دوسرے دیوانوں کے انجام سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

روم میں حال میں ایک شاندار مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی تجویز سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں اٹلی کے حکمراں مسولینی کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس کے مجوز ایرانی نسل کے اطالوی مسلمان عبد الجاسم امینی تھے۔ مگر مسولینی نے اس کو منظور نہیں کیا۔ شاہ فیصل کی کوششوں سے ۱۹۷۳ میں اٹلی کی حکومت نے اس کی اجازت دے دی۔ دو ہزار مربع میٹر کا ایک پلاٹ بھی حاصل ہو گیا۔ ۱۹۸۳ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ دس سال میں ۵۰ ملین ڈالر کے خرچ سے یہ مسجد اور اسلامی مرکز تیار ہوا۔ خرچ کی بیشتر رقم سعودی عرب نے ادا کی ہے۔

یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس میں دو ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے اندر ایک کافی بڑی لائبریری ہے۔ پانچ سو نشستوں کا خوبصورت کانفرنس ہال ہے۔ میں نے جس وقت اس سنٹر کو دیکھا اس وقت ڈاکٹر عبد القیوم خاں اس کے ڈائرکٹر تھے۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ روم میں ایک ہزار چرچ ہیں۔ مگر پرفضا ماحول کے اعتبار سے یہ واحد اسلامی سنٹر سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ اٹلی میں تقریباً چار لاکھ مسلمان ہیں۔ ان میں سے ۱۰ ہزار نو مسلم ہیں۔

Rome's Islamic centre promotes Islamic activities

The Islamic Centre based in the Italian capital, Rome, after gaining recognition by the Government has redoubled its efforts to propagate Islamic Faith and culture throughout the country. Besides providing necessary facilities, the Centre periodically holds seminars and lectures on various aspects of the Islamic culture and civilization. The Centre has also established special institutes for studies on the Holy Qur'an and the tradition of the Prophet (peace be on him). One of the outstanding achievements of the Centre is production of a television series in the Italian language on the condition of the Muslim immigrants in Italy focussing on the problems faced by the immigrants in, carrying out their religious and cultural obligations in the country. The Centre has also published 5000 copies of a book on Islamic worship and other subjects with Italian translation for the benefit of non-Arabs. The production of the book was financed by a prominent Italian Baron Bourna Nova who had embraced Islam a few years ago. The Islamic Centre in Rome has established an institution for teaching Arabic, English and Italian languages for the Muslims living in the various parts of the country and the centre also offers this facility to non-Muslims interested in acquiring the knowledge of Islamic Faith, culture and its civilization.

مکہ کے ہفت روزہ العالم الاسلامی (The Muslim World) کے شمارہ ۱۱ - ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲ کے انگریزی حصہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ یہ روم کے اس اسلامک سنٹر کے بارہ میں تھی جو عربوں کے تعاون سے وہاں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف سعودی عرب کی مشہور دینی شخصیت ہیں۔ وہ رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے روم گئے۔ وہاں انھوں نے پوپ جان پال دوم سے ملاقات کی۔ روم میں انھوں نے ورلڈ نیوز لنک کو ایک مفصل انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو حیدر آباد کے انگریزی روزنامہ نیوز ٹائم (Newstime) کے شمارہ ۱۷ فروری ۱۹۹۳ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ فنڈمنٹلسٹ تحریکیں جو مسلم دنیا میں پھیل رہی ہیں ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کے متشددانہ طریقوں کی تائید نہیں کرتا۔ تشدد کا طریقہ اختیار کرنا مکمل طور پر غیر اسلامی ہے:

It is totally unIslamic to use violence.

ایک اور سوال سلمان رشدی کے خلاف قتل کے فتویٰ کے بارے میں تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی بات سراسر جذباتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج انسانی حقوق کو فروغ دینا چاہئے۔ موت کی سزا صرف ان مجرمین کو دینا چاہئے جو لوگوں کو قتل کریں۔ بقیہ ہر شخص کو انسانی حقوق دیا جانا چاہئے:

Q. What is your opinion of the death penalty imposed on the British author Salman Rushdie.

A. Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. But otherwise, human rights should be given to everybody.

یہ باتیں اگر ہندستان کا کوئی عالم کہے تو تمام مسلمان اس کی جان کے دشمن ہو جائیں گے اور اس کے سر پر لاکھوں روپیہ کا انعام مقرر کریں گے۔ لیکن یہی بات جب سعودی عرب کا ایک عالم کہتا ہے تو اس پر کوئی شور برپا نہیں ہوتا اور نہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہوتا۔ ہمارے خود ساختہ نمائندگان اسلام

اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتے۔ جو لوگ سعودی عرب میں ایک رویہ اختیار کریں اور بقیہ ملکوں میں دوسرا رویہ، ایسے لوگ حدیث کی زبان میں ذوالوجہین ہیں۔ اور ذوالوجہین ہونا انسانیت کے مطابق بھی نہیں، کجا کہ وہ ایمان واسلام کے مطابق ہو۔

روم سے میلانو کے لئے الیتالیا کی ڈومسٹک فلائٹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز ٹھیک وقت پر روم سے روانہ ہوا۔ اس کی کارکردگی اور اندرونی سروس، ہر چیز انٹرنیشنل معیار کے مطابق تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اورنگ آباد میں جب انڈین ایرلائنز کا ایک کمرشیل جہاز (Boeing 377) حادثہ کا شکار ہوا اور اس میں ۵۵ مسافر ہلاک ہوگئے تو اٹلی کی حکومت نے ایک ٹریول ایڈوائس جاری کی۔ اس میں اطالوی سیاحوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ انڈیا میں انڈین ایرلائنز کے ذریعہ سفر کو وائنڈ کریں۔ کیوں کہ اس سے سفر کرنا غیر محفوظ (unsafe) ہے۔ اس پر حکومت ہند نے ایک بیان (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ جون) جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ اس قسم کا مشورہ سراسر احمقانہ اور بے بنیاد ہے:

Such an advice was absolutely silly and baseless.

میں نے جب انڈین ایرلائنز اور الیتالیا کا عملی تقابل کیا تو مجھے خود یہ تردید بے بنیاد نظر آئی۔ یہ انسان کی عام کمزوری ہے کہ جب اس کی کسی کوتاہی کو بتایا جائے تو وہ اصلاح کے بجائے تردید کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ حالاں کہ اگر کوتاہی کی نشاندہی کے بعد اصلاح پر توجہ صرف کی جائے تو وہ زیادہ مؤثر تردید کا کام کرے گی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ یہ واقعہ ۱۴ جون کو دہلی ایرپورٹ پر پیش آیا۔ وزیر اعظم ہند مسٹر نرسمہاراؤ سرکاری وزٹ پر عمان (مسقط) جارہے تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ سرحد پار سے دہشت گردی کو روکنے کے لئے حکومت مسقط کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اس تعاون کے جواب میں حکومت ہند نے مسقط کو جدید ٹکنالوجی کی تربیت دینے میں تعاون کی پیش کش کی۔

وزیر اعظم اپنے خصوصی ہوائی جہاز پر پوری ٹیم سمیت سوار ہوچکے۔ ہوائی جہاز کے دروازے

بند کر دئے گئے۔ قریب تھا کہ جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو۔ اچانک معلوم ہوا کہ ایک صاحب (مس
نریندر) بھی جہاز کے اندر بند ہو گئے ہیں جو وزیر اعظم کے ساتھ جانے والے نہیں تھے اور ص
پہنچانے کے لئے جہاز کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ اس علم کے فوراً بعد ہوائی جہاز کے اندر اور
تیزی سے حرکت شروع ہو گئی۔ مخصوص سیڑھی واپس لائی گئی۔ جہاز کا پچھلا دروازہ دوبارہ کھو
اور مذکورہ صاحب جہاز کے باہر تشریف لائے (ملاحظہ ہو ذیل کی تصویر جو ہندستان ٹائمس
۱۵ جون ۱۹۹۳ سے لی گئی ہے)

جس ملک میں وزیر اعظم تک کے معاملہ میں کارکردگی کا یہ حال ہو، اس ملک میں عوام کو ا
سرکاری شعبوں میں ناقص کارکردگی کا تجربہ ہو تو اس پر نہ تعجب کرنے کی ضرورت ہے اور ن
افسوس کرنے کی ضرورت۔

اس سفر میں میرے ساتھ ڈاکٹر ثانی اثنین خاں بھی ہیں۔ روم سے میلان کے لئے روا
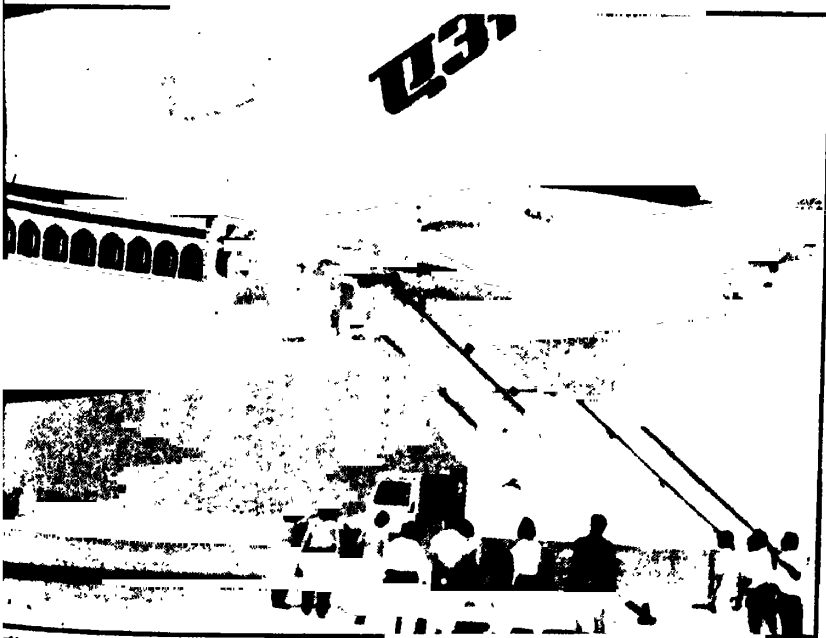
...tter was caused at the airport in New Delhi on Monday as the ramp was brought back and the rear door
...rime Minister's special plane opened again minutes after it was closed Out came P I O S Narendra
...was not scheduled to accompany the Prime Minister but found himself locked in — PTI photo

۔روم سے میلان کی پرواز تقریباً ۴۵ منٹ کی ہے۔ ہم لوگ میلان پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔
ہ اس وقت دہلی میں رات ہو چکی تھی۔ ایرپورٹ کے وی آئی پی لاونج میں کچھ وقت گزرا یہاں
ں کے منتظمین سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ان سے دیر تک میلان کی شہری اور تاریخی معلومات
تگو ہوئی۔ ایرپورٹ سے روانہ ہوئے تو گاڑی سیدھے ہوٹل نہیں گئی بلکہ شہر کے مختلف راستوں
گزرتی ہوئی ہوٹل پہنچی۔ اس طرح پہلے ہی دن شہر کا بڑا حصہ دیکھ لیا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان ملکوں میں ہر چیز کا ایک معیار مقرر ہو گیا ہے۔ مثلاً
ں پر کثرت سے گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، مگر وہ نہ آواز نکالتیں اور نہ ہی ہارن بجاتیں۔ فٹ پاتھ
ں خرید و فروخت کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ مکانات کی ایک خوبصورت وضع ہر جگہ برقرار
ہے۔ دہلی میں کہیں لال بتی پر گاڑی کھڑی ہوتی ہے تو مانگنے والے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ یہاں اس
نظر بھی کہیں نہ تھا۔ بدنظمی اور بے ترتیبی کی مثالیں بھی دکھائی نہیں دیں۔

عام لوگ جب ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو ان کو پہلا خیال یہ آتا ہے کہ ان کو بھی یہاں بسنے کا
ں جائے۔ مگر میرے دل میں ہمیشہ یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ ہمارا وطن بھی کاش ایسا ہی ترقی
و جائے۔ مگر سرگرمیوں کے طوفان میں ابھی تک ہمارے یہاں اس کی شروعات بھی نظر نہیں آتی۔

میلان میں میرا قیام ہوٹل (Hotel Palazzo Delle Stelline) کے کمرہ نمبر ۲۴۵ میں تھا۔ ۱۸
ر کو عشاء کی نماز میں نے یہیں پڑھی۔ اس کے بعد سو گیا۔ جلد ہی گہری نیند آگئی۔ رات کو ایک
، اور نئے قسم کا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ ایک وقت آئے گا
تمہاری کتابیں بخاری کی کتاب کی طرح ہو جائیں گی۔

یہ خواب غالباً دونوں میں ایک ظاہری مشابہت کی بنا پر ہے۔ محمد بن اسماعیل البخاری
ا-۱۹۴ھ) صاحب صحیح کے بارہ میں امام مسلم نے کہا تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ
ں آپ کے مثل کوئی نہیں۔ آپ سے صرف اسی کو بغض ہو سکتا ہے جو حاسد ہو
ایہ والنہایہ ۱۱/ ۶۶) اس عظمت کے باوجود حضرت امام کا یہ حال ہوا کہ وہ بخارا
ئے کہ ایک گروہ کو ان سے تعصب ہو گیا۔ اس نے ان کے اوپر تہمتیں لگائیں ۔
لک کہ امام بخاری اپنے وطن سے نکل کر خرتنگ چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی (الاعلام

۱/۴۴) مگر آخر کار صحیح بخاری دنیا کی مقبول ترین کتاب بن گئی۔ اسی طرح انشاء اللہ ابتدائی مخالفتوں کے بعد وہ وقت آئے گا جب کہ یہ غبار ہٹے اور میری تحریریں مقبول عام تحریریں بن جائیں۔

مسیحیوں میں ایک سینٹ ایجی ڈیو (Egidio) گزرے ہیں۔ ان کا ابتدائی نام البورنو (Gil Alvarez Carrillo de Albornoz) تھا۔ وہ ۱۳۱۰ میں اسپین میں پیدا ہوئے، ۱۳۶۷ میں اٹلی میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے سپاہی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ چرچ سے وابستہ ہو گئے اور کارڈینال کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس زمانہ میں بعض وجوہ سے پوپ یازدہم (Pope Gregory XI) کو روم چھوڑ کر فرانس کے شہر اوگنین (Avignon) چلا جانا پڑا تھا۔ سینٹ ایجی ڈیو اپنی خصوصی کوشش سے پوپ کو دوبارہ روم واپس لانے میں کامیاب ہوئے۔

انھیں سینٹ ایجی ڈیو کے نام سے ایک مسیحی تنظیم ہے جس کا صدر دفتر روم میں ہے۔ اس کا نام کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو (Community of S. Egidio) ہے۔ میلان کی انٹرنیشنل کانفرنس اسی کمیونٹی کی طرف سے کی گئی تھی۔

یہاں کی تاریخی شخصیتوں میں سے ایک گیان گالیزو وسکونتی (Gian Galeazzo Visconti) ہے۔ وہ ۱۳۵۱ء میں میلان میں پیدا ہوا۔ پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر ۳ ستمبر ۱۴۰۲ء کو اچانک اس کی وفات ہو گئی۔

گیان گالیزو کا والد میلان کا نواب تھا۔ والد کی وفات کے بعد میلان کی سیاسی تقسیم ہوئی۔ نصف حصہ گیان گالیزو کو ملا اور بقیہ نصف اس کے بھائی برنابو (Bernabo) کے پاس رہا۔ برنابو نے فرانس سے تعلقات پیدا کر کے اپنی طاقت بڑھانا شروع کیا۔ اس کو گیان گالیزو نے اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ سمجھا، اس نے گھات لگا کر برنابو کو گرفتار کر لیا اور اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ برنابو ایک سال کے اندر ہی قید خانہ میں مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ گیان گالیزو نے اس کو زہر دیکر مروایا تھا۔

اب گیان گالیزو کے لئے میدان خالی تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے پورے شمالی اٹلی میں غالب حیثیت حاصل کر لی۔ اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر وہ

ملسل اپنی حکومت کا رقبہ اور طاقت بڑھاتا رہا۔ کہا جانے لگا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ وہ پورے
لی کا حکمراں بن جائے۔ مگر حکومت پر قبضہ کے ۲۴ سال گزرے تھے کہ وہ پلیگ میں مبتلا ہوا اور چند
ن بیمار رہ کر مرگیا۔

یہی ہر شخص کی کہانی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو صرف "۲۴ سال" ملتے ہیں، مگر ہر آدمی
ں طرح عمل کرتا ہے گویا کہ وہ ۲۴ ہزار سال تک زندہ رہنے والا ہے۔ کسی بھی اگلے شخص
ے اپنے پچھلے شخص سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

نویں صدی عیسوی میں اغالبہ اٹلی کے جنوبی حصہ میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ بڑھتے ہوئے
۸۴ میں روم تک پہنچ گئے۔ مگر روم کی مضبوط دیواروں کو عبور کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوسکا۔ اس
ے وہ یہیں سے واپس ہوگئے۔ ہوائی جہاز کے دور میں کوئی دیوار پیش قدمی میں رکاوٹ نہیں بنتی۔
ر قدیم زمانہ میں تمام بڑے بڑے شہر دیواروں سے گھرے ہوئے تھے، اور ان دیواروں کو
بور کرنا عام طور پر سخت دشوار ہوتا تھا۔

تاہم اٹلی کے ساحلی علاقہ باری (Bari) میں عربوں کی حکومت تقریباً ۳۰ سال
اک قائم رہی۔ ۸۷۱ء میں عیسائیوں نے دوبارہ باری کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اٹلی میں
لمانوں کا زور اس حد تک بڑھا کہ پوپ جان ہشتم (۸۷۲-۸۸۲) نے مسلم حکمرانوں کو خراج
اکیا۔ سسلی پر مسلمانوں کا قبضہ ۸۲۷ میں شروع ہوا تھا جو تقریباً ۲۰۰ سال تک جاری رہا۔ مگر خاص
لی میں ان کا نفوذ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مسلمانوں کے جن فوجی سرداروں
ے باری پر قبضہ کیا تھا، انھوں نے اپنے "سلطان" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ سسلی کی
لم حکومت سے کٹ گئے۔

Philip K. Hitti, 'History of Arabs, p. 605

یہ کمزوری آج بھی مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔ جس مسلمان کو بھی کہیں
ر قع ملتا ہے وہ مرکز سے بغاوت کرکے شاخ پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یہی واحد سب سے بڑا سبب ہے
س کی بنا پر مسلمانوں میں کوئی بڑا کام نہیں ہو پاتا۔

اٹلی ہی کا ایک حصہ جزیرہ سسلی ہے۔ یہاں کے شہر پلرمو (Palermo) پر عربوں نے ۸۳۱

ضہ کیا اور اس کے بعد پورے سسلی (صقلیہ) پر اپنی حکومت قائم کی۔ پلرمو اور سسلی کو انھوں
لحاظ سے ترقی دی۔ وہ تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ انھوں نے یہاں نئے زرعی طریقے رائج
اور باغبانی کو غیر معمولی ترقی کے درجہ تک پہنچا دیا:

The city prospered under Muslim rule as an emporium of the rich trade with North Africa. New agricultural techniques were introduced, and luxuriant gardens were planted in the Conca d'Oro (13/930).

دور اول میں مسلمانوں کو عظمت کا جو مقام ملا اس کا راز "شمشیر و سنان" نہیں تھا۔ اس کا
راز صرف ایک تھا۔ اور وہ نفع بخشی تھا۔ دور اول کے مسلمان اہل عالم کے لئے نفع بخش بنے،
لئے اہل عالم نے ان کو عزت اور سرداری کے مقام پر بٹھایا۔ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں نے
شی کی صلاحیت کھو دی ہے، اس لئے موجودہ زمانہ میں انھیں عزت و سرداری بھی نہ مل سکی۔
کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں دوبارہ دوسروں کے لئے نفع بخش بننا
ے گا۔ لفظی شور وغل یا منفی ہنگاموں سے کبھی مسلمانوں کو کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ یہ قدرت کا
ن ہے، اور قدرت کے قانون میں تبدیلی ممکن نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، مسلمانوں کی یلغار یورپ کی طرف جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ ویانا اور
س (Venice) اور روم تک پہنچ گئے۔ ٹائم میگزین کا اسلام پر خصوصی الشمارہ ۱۵ جون ۱۹۹۲
نکلا تھا۔

اس میں اس نے لکھا تھا کہ موجودہ مسلمان یورپ کی زیادتیوں کی شکایت کرتے
، حالاں کہ مسلمانوں کے پورے دور اقتدار میں مسیحی دنیا اپنے آپ کو محاصرہ کے اندر محسوس
تی تھی۔ ۶۳۲ میں پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ایک صدی کے اندر مسلمانوں نے اسپین
فتح کر لیا تھا اور وہ فرانس کے دروازہ پر دستک دے رہے تھے۔ شارلیمین کے باپ چارلس
ل نے تورس کی جنگ میں ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ تاہم ۱۴۵۳ میں عثمانی ترکوں نے
طنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور بلقان کے راستہ سے یورپ کی طرف بڑھنے لگے۔ ۱۶۸۳ میں ویانا
ناکام محاصرہ نے ان کی مزید توسیع کو آخر کار روک دیا:

Yet if Muslims today see themselves as victimized by the West, for most of their history it was Christendom that felt under siege. Within a century of the Prophet's death in 632, the Moors had conquered Spain and were knocking on the doors of France. Charles Martel, father of the Frankish Emperor Charlemagne, stopped them at the Battle of Tours. By 1453, however, the Ottoman Turks had captured Constantinople and were marching through the Balkans toward the back door of Europe. The last, failed siege of Vienna in 1683 halted that expansion. (p.23)

پچھلے ہزار برس کی تاریخ کا بیشتر پہلا حصہ مسلم یلغار کا دور تھا۔ اس کا دوسرا حصہ مغربی یلغار کا دور ہے۔ یہ انصاف کے خلاف ہوگا کہ ابتدائی حصہ کو بھلا دیا جائے اور صرف آخری حصہ کو یاد رکھا جائے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو قرآن کی اس آیت سے نصیحت لینا چاہئے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو ان کو بھی اسی طرح کا زخم پہنچا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (آل عمران ۱۴۰)

میلان کی قدیم تاریخ سے جو واقعات وابستہ ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو الرازی (۸۶۵-۹۲۳ء) سے متعلق ہے جو اسلامی تاریخ کا مشہور فلسفی اور طبیب تھا۔ الرازی کی ایک مشہور طبّی تصنیف کتاب الطب المنصوری ہے۔ یہ کتاب اس نے دس جلدوں میں تیار کی تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ لاتینی زبان میں گیرارڈ (Gerard of Cremona) نے کیا۔ یہ لاتینی ترجمہ پہلی بار میلان سے پندرھویں صدی کی ثمانینات میں شائع ہوا۔

گیرارڈ اٹلی کے شہر کریمونا میں ۱۱۱۴ء میں پیدا ہوا۔ یہ مقام میلان سے قریب ہے۔ گیرارڈ چاہتا تھا کہ وہ بطلیموس کی کتاب المجسطی کا ترجمہ لاتینی زبان میں کرے۔ اس وقت یہ کتاب صرف عربی میں دستیاب تھی۔ چنانچہ گیرارڈ عربی زبان سیکھنے کے لئے طلیطلہ (Toledo) گیا۔ وہاں عربی سیکھ کر اس نے المجستی کا ترجمہ لاتینی زبان میں کیا۔ اس کے بعد وہ طلیطلہ میں رہ گیا۔ مسلم اسپین کے اسی شہر میں ۱۱۸۷ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے تقریباً ۸۰ عربی کتابوں کا ترجمہ لاتینی زبان میں کیا۔

یہ آٹھ سو سال پہلے کی بات ہے جب کہ یورپ کو خود اپنے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عربی زبان کی ضرورت ہوتی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں اور لائبریریوں اور تحقیقی اداروں میں عربی زبان موجود مگر زیادہ تر تاریخی اعتبار سے۔

اٹلی کی روشن خیالی (Enlightenement) کو عام طور پر بیساریا (Beccaria) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس نے اپنی قوم کو یہ نعرہ دیا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشی :

the greatest happiness for the greatest number.

مگر سوال یہ ہے کہ خود بیساریہ کو یہ تصور کہاں سے ملا۔ کیوں کہ اس سے پہلے رومن ایمپائر کے طویل دور میں اہل اٹلی صرف یہ جانتے تھے کہ ہم اپنے بادشاہ کی رعایا ہیں۔ ہمارا اپنا کوئی حق نہیں۔ ہمارے لئے بس وہی ہے جو تاجدار طبقہ ہمیں دیدے۔ اہل اسلام نے جب رومن ایمپائر کے مشرقی حصہ کو توڑا اور تمام انسانوں کی برابری کا انقلابی اعلان کیا، اس کے بعد ہی وہ وقت آیا جب کہ کوئی شخص یہ سوچ سکے کہ خوشی سب کے لئے ہے نہ کہ صرف کچھ لوگوں کے لئے

اٹلی کی تاریخ میں بہت سے سبق ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مسیح کے ابتدائی شاگردوں کی تبلیغ سے اس علاقہ میں مسیحیت داخل ہوئی۔ مگر اس زمانہ کے رومی بادشاہ ڈیسیس (Decius) اور ویلیرین (Valerian) نے اس کو اپنے قدیم مشرکانہ مذہب کے خلاف سمجھا جس میں سورج کو سب سے بڑے خدا کا مقام حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے زمانہ میں مسیحیوں کی سخت تعذیب (Persecution) شروع ہوئی جو چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں تقریباً ۲۰ سال تک جاری رہی۔

مگر قسطنطین اول (Constantine I) مسیحیت سے متاثر ہوگیا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ اپنی ۳۱۲ء کی جنگ اس نے اس مسیحی مونوگرام کی وجہ سے جیتی ہے جو اس نے اپنی فوجوں کی ڈھال پر نقش کرائی تھی۔ اس کے بعد اس نے مسیحی مذہب قبول کر لیا۔ اور پوری مسیحی سلطنت میں مسیحیوں کے خلاف دار و گیر ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلہ میں اس نے اس معاہدہ پر دستخط کئے جو میلان میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ (Edict of Miloan) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ النّاس علیٰ دین ملوکہم کا تھا۔ چنانچہ اس کے جلد ہی بعد مسیحیت سارے رومن ایمپائر میں پھیل گئی

چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں مسیحیت رومن ایمپائر میں ایک مظلوم مذہب کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر اس صدی کے آخر میں مسیحیت نے رومن ایمپائر میں فاتح مذہب

حیثیت حاصل کرلی۔ یہ دنیا انقلابات کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی صورتحال پیش آنے پر نہ کسی کے لئے فخر کا موقع ہے اور نہ کسی کے لئے مایوسی کا۔ ہر فخر یہاں آخر کار ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ہر مایوسی آخر کار امید کے نئے واقعہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یورپ میں جو ابتدائی میڈیکل کالج قائم ہوئے ان میں سے ایک میڈیکل کالج وہ ہے جو پندرھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے شہر سلرنو (Salerno) میں قائم کیا گیا۔ اس میں ابوالقاسم (Abulcasis) کی کتاب بطور نصاب داخل کی گئی۔

ابوالقاسم الزہراوی (۱۰۳۰ - ۱۱۰۶) مشہور ترین عرب سرجن ہے۔ اس کا تعلق قرطبہ سے تھا۔ اس کی کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف کا لاتینی ترجمہ گیرارڈ آف کریمونا نے کیا تھا۔ وہ ۱۴۹۷ میں وینس سے چھپا۔ اس کے بعد ۱۵۴۱ میں بیسل سے اور ۱۷۷۸ میں آکسفورڈ سے شائع ہوا۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپ کے طبی اداروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ پڑھائی جاتی رہی ہے۔

ایک مستشرق کے الفاظ میں، الزہراوی کی اس کتاب کو یورپ میں اتنی زیادہ اہمیت حاصل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں فن سرجری کے بارہ میں نئے خیالات (new ideas) موجود تھے۔ جو اس وقت کی کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے تھے ـــــ اس دنیا میں نئے پن کی قیمت ہوتی ہے۔ جو شخص کوئی نیا تخلیقی آئیڈیا پیش کرے، وہ لازمی طور پر لوگوں کے درمیان قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

ایک مسلم میگزین میں میں نے پڑھا کہ "اسلام اٹلی کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے"۔ یہ بظاہر بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اتنی بڑی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اٹلی کی ۵۷ ملین آبادی میں کیتھولک عیسائیوں کا تناسب ۹۸ فیصد ہے۔ دو فیصد میں پروٹسٹنٹ عیسائی اور یہودی وغیرہ ہیں۔ اس دو فیصد آبادی میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، ان کی آبادی ملک میں تقریباً چار لاکھ ہے۔ اطالوی مسلمان زیادہ تر شمالی افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو روزگار کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں جرمنی، اٹلی اور جاپان نے ایک مشترک فوجی محاذ بنایا۔

جس کو محوری اتحاد (Axis coalition) کہا جاتا تھا۔ انھوں نے تمام طاقتوں کے خلاف مکمل جنگ (total war) کا اعلان کیا (1956)۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے اس سے پہلے ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ کو میلان کی ایک خصوصی میٹنگ میں بتایا تھا کہ آج میں دل کے پورے اطمینان کے ساتھ آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ بیسویں صدی فاشزم کی صدی ہوگی۔ اطالوی طاقت کی صدی، ایک ایسی صدی جس کے دوران اٹلی تیسری بار عالم انسانیت کا قائد بن جائے گا:

On October 25, 1932, Mussolini assured a Milan audience of the world leadership of fascist Italy. Today, with a fully tranquil conscience, I say to you, that the twentieth century will be a century of fascism, the century of Italian Power, the century during which Italy will become for the third time the leader of mankind. (7/185)

میلان اپنی جغرافی خصوصیت کی بنا پر مسلسل مختلف قوموں کے حملوں کا شکار رہا ہے۔ رومیوں نے اس کو ۲۲۲ ق م میں گال (Gauls) سے چھینا۔ اس کے بعد بار بار وہ مختلف حملہ آوروں کی زد میں آتا رہا۔ تاہم میلان کے باشندوں کے لئے یہ صورت حال ایک فائدہ کا سبب بن گئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، ذاتی تحفظ کی ضرورت نے اس کے باشندوں میں ہمت کی صفت پیدا کر دی۔ مزید یہ کہ وہ مال دار اور طاقت ور ہو گئے:

The need of self-protection developed courage in the Milanese, and they also grew rich and powerful. (p.205)

اس دنیا میں ہر ناموافق کے ساتھ موافق موجود ہے۔ تاہم ناموافق واقعہ میں موافق پہلو کو پانے کی ایک لازمی شرط ہے، وہ یہ کہ ایسے مواقع پر آدمی کسی بھی حال میں اپنے اندر شکایتی ذہن پیدا نہ ہونے دے۔

۱۶ ستمبر کے شام کے پروگرام میں میرا مقالہ تھا۔ اس اجلاس کا موضوع تھا: مذہبی بقاء باہم ہندستان میں:

Religious coexistence in India

میں نے انگریزی میں اپنا مقالہ پڑھا۔ میرے علاوہ تین مقالے اور اس مجلس میں پڑھے گئے۔ ۱۲ ستمبر کی صبح کو اٹالین ٹی وی نے انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو کیتھولک یونیورسٹی کے ہال میں ریکارڈ

کیا گیا۔ سوالات کا تعلق کچھ موجودہ کانفرنس سے تھا اور کچھ ہندستان کے حالات سے۔

۱۸ اگست کو شام کا کھانا اجتماعی تھا۔ سب چیزیں اطالوی انداز کی تھیں۔ میں اپنے سادہ کھانے کا اتنا زیادہ عادی ہو گیا ہوں کہ اب دوسرے انداز کی چیزیں کھانا میرے لئے سخت شکل ہوتا ہے۔

میرے ساتھ کھانے کی بڑی میز پر دوسرے تمام مسیحی حضرات تھے۔ ایک فادر روانی کے ساتھ عربی بول رہے تھے۔ اگرچہ لہجہ خالص عربی نہ تھا۔ میرے پاس ایک کرسی خالی تھی۔ اس پر ایک خاتون آکر بیٹھ گئیں۔ وہ مجھ سے عربی زبان میں سوالات کرنے لگیں۔ وہ بے تکلف عربی بول رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کا تعلق لبنان سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں اطالوی ہوں۔ میں نے روم کی یونیورسٹی میں عربی زبان پڑھی۔ پھر میں کئی سال تک شام میں رہی ہوں۔ اب میں روم کی یونیورسٹی میں عربی کے شعبہ میں استاد ہوں۔

مسیحیت کے مذہبی حلقہ میں کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو دوسری زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے مذہبی حلقہ میں ایسے لوگ شاذ و نادر پائے جاتے ہیں۔ اور شاذ کا کوئی اعتبار نہیں، کیوں کہ الشاذ کالمعدوم۔

۱۹ ستمبر کو صبح کے ناشتہ پر الجزائر کے دو تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ الجزائر میں اس وقت امن امان مفقود ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب الجزائر چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے گئے ہیں۔ اور دوسرے صاحب وہیں ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔

انھوں نے کہا کہ الجزائر کی حکومت ایک علمانی حکومت ہے۔ اور اس کے خلاف موجودہ تحریک ایک اسلامی تحریک ہے۔ اس کا مقصد عدل کی حکومت قائم کرنا ہے۔ مگر اس حکومت کو امریکہ اور دُوَل یورپ کی تائید حاصل ہے۔ مسلم ممالک بھی اس کے ساتھ ہیں۔ الجزائر کی فوج کے اعلیٰ افسران بھی حکومت کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ وہ اسلامی تحریک پر ظلم کرنے میں پوری طرح جری ہو گئے ہیں۔ انھوں نے الجزائر کی کئی مسجدیں یہ کہہ کر ڈھا دیں کہ ان کے اندر حکومت کے خلاف تقریریں ہوتی ہیں اور انقلاب کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ یہ مسجدیں اب

تک کھنڈر کی صورت میں پڑی ہوئی ہیں۔
مزید گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ یہ وہ خروج نہیں ہے جو شریعت میں حرام ہے۔ کیوں کہ امام عادل کے خلاف خروج حرام ہے، جب کہ الجزائر کے حکمراں ظالم اور جائر ہیں۔ مگر یہ شرط صحیح نہیں۔ خروج (سیاسی بغاوت) کا مسئلہ عادل اور غیر عادل کے فرق پر مبنی نہیں ہے بلکہ قائم شدہ اور غیر قائم شدہ کے فرق پر مبنی ہے۔ جو حکومت عملاً قائم ہو جائے خواہ وہ کسی کے نزدیک عادل ہو یا غیر عادل، اس کے خلاف خروج لازماً حرام ہوگا۔ اس اعتبار سے الجزائر اور مصر وغیرہ ملکوں میں اسلام کے نام پر سیاسی بغاوت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ شرعی مسئلہ کے اعتبار سے سراسر ناجائز ہیں۔ کیوں کہ یہ تحریکیں قائم شدہ حکومتوں کے خلاف چلائی جا رہی ہیں۔
۱۹ ستمبر کی شام کو میلان کے سب سے بڑے تھیٹر میں افتتاحی اجلاس ہوا۔ یہ ایک عالمی شہرت یافتہ تھیٹر ہے جو ۱۷۷۶ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ غیر معمولی عظیم ہے۔ زیادہ بڑی بڑی تقریبات اسی کے اندر انجام پاتی ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں تین بڑی تقریریں ہوئیں۔ مقررین میں سابق سوویت یونین کے سابق حکمراں گورباچیف بھی شامل تھے۔
میری سیٹ پہلی صف میں دائیں طرف تھی۔ اس لئے میں گورباچیف کو بہت صاف دیکھ سکتا تھا۔ مسیحی دنیا میں گورباچیف کا استقبال غالباً اس لئے ہوا ہے کہ اس کی پالیسی کی وجہ سے سابق سوویت یونین میں چرچ کو آزادی ملی اور مقفل چرچ دوبارہ کھول دئے گئے۔
یہاں کی رسم کے مطابق بعض خاص تقریبات ہوئیں میری سیٹ کا نمبر ۱۱ تھا اور گورباچیف کا نمبر ۱۴۔ گورباچیف اپنی اہلیہ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ وہ پہلی صف میں میرے قریب پہنچے تو مجھ سے اور چند لوگوں سے مصافحہ کیا۔ ان کا چہرہ بظاہر سوکھا ہوا تھا، تاہم انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ جب میں نے گورباچیف کو قریب سے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک دیکھے ہوئے شخص کو دیکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ اخباروں کی تصویروں میں بار بار میں ان کو دیکھ چکا تھا۔ مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی کہ واُتوا بہ متشابھاً (بقرہ ۲۵) میں نے اس سے پہلے گورباچیف کو نہیں دیکھا تھا مگر میں نے ان کی تصویر کو دیکھا تھا۔ اسی طرح اہل جنت نے اگرچہ اس سے پہلے

جنت کو نہیں دیکھا ہوگا مگر انھوں نے اس کی تصویر کو دیکھا ہوگا۔ موجودہ دنیا کی ہر نعمت دراصل نعمت جنت کی ایک تصویر ہے۔

آخر میں گورباچیف نے روسی زبان میں تقریر کی۔ میں نے اس کا انگریزی ترجمہ سنا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ آج کی دنیا کی طاقت ہتھیار نہیں ہے بلکہ ریزن ہے۔ یہ بات ایک ایسا شخص کہہ رہا تھا کہ جو تاریخ کے ہولناک ترین ہتھیاروں کا مالک رہ چکا ہے۔

کانفرنس میں ایک عرب شیخ سے ملاقات ہوئی۔ فلسطینیوں کی طرف سے اسرائیل کے اعتراف کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ تمام عرب ممالک اس پر چپ ہیں۔ کسی نے بھی اس کی مذمت نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راضی ہیں۔ انھوں نے پر مسرت چہرہ کے ساتھ کہا: انا فرحان، واللہ انا فرحان (میں خوش ہوں، بخدا میں خوش ہوں) اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ پچاس سالہ ٹکراؤ کے نتیجے میں ان کا سب کچھ کھو یا گیا تھا۔ ان کے لئے نہ امن تھا، نہ رہنے کی جگہ اور نہ معاش کا انتظام۔ ایسی حالت میں ان کے لئے کوئی اور صورت باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نام کے ساتھ آپ کی اس رائے کو اپنے سفرنامہ میں لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں نہیں (لا لا)

مجھ میں اور دوسروں میں یہی فرق ہے۔ میں جو حالات سے موافقت کی بات کرتا ہوں وہ کسی بھی درجہ میں تنہا میری رائے نہیں ہے۔ وہی تمام باشعور مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے لوگ صرف نجی ملاقاتوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں، وہ اس کے لئے اعلان کی ہمت نہیں کرتے۔ جب کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے وہی میری زبان پر بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس دہرے معیار کا تحمل نہیں کر سکتا کہ میرے دل میں کچھ اور ہو اور میری زبان پر کچھ اور۔

۲۸ ستمبر کو کانفرنس کے تمام شرکا چھ گروپ میں بانٹ دئے گئے۔ ہر گروپ کے لئے الگ الگ موضوع مقرر کر دیا گیا۔ یہ پروگرام یہاں کی مشہور کیتھولک یونیورسٹی میں تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نیز شہر کے لوگ بڑی تعداد میں ان پروگراموں میں شریک ہوئے۔ ایک گروپ کا موضوع وسط ایشیا میں امن تھا۔ میں اس میں شریک ہوا۔

اس میں مختلف ملکوں کے یہودی علماء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ایک یہودی ربی نے کہا کہ واشنگٹن میں اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن کا جو عمل شروع ہوا وہ بہت مشکل ہے تاہم امید ہے کہ خدا کی مدد سے امن کی کوشش کرنے والے اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گے:

By the help of God, peace makers will make it.

۲۰ ستمبر کو شام کا کھانا میلان کے پرانے قلعہ میں تھا۔ یہ قلعہ چودھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا مگر ابھی تک وہ نہایت اچھی حالت میں ہے۔ اس میں ایک میوزیم قائم ہے۔

یہاں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک دکتور کمال الشریف تھے جو اردن سے آئے تھے۔ وہ فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ انھوں نے فرانس کے مشہور مصنف اینڈرے مالراکس (Andre Malraux) کے بارہ میں بتایا کہ اس نے کہا ہے کہ اکیسویں صدی یا تو مذہبی صدی ہوگی یا سرے سے اس کا وجود ہی نہ ہوگا:

القرن الواحد والعشرون اما ان یکون قرن الدین او لا یکون

یہ بات نہایت درست معلوم ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ حالات بظاہر پہلے امکان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر مذہب کا احیاء جاری ہے۔ حالات انسان کو تیزی سے مذہب کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پہلے مرحلے میں بظاہر ہر مذہب ابھرے گا۔ اس کے بعد انسان صحیح تر مذہب کی تلاش کرنا چاہے گا۔ اور یہ دوسری کوشش اس کو "دین محفوظ" تک پہنچانے کا سبب بن جائے گی۔

۲۱ ستمبر کی صبح کو دوبارہ مجھے چھ پینل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے اس پینل کا انتخاب کیا جو بوسنیا کے مسئلہ پر تھا۔ ہال میں پہنچا تو وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ غالباً آج سب سے زیادہ لوگ اس کو سننے کے لئے آئے تھے۔ حاضرین میں سے کثیر تعداد شہر کے لوگوں کی تھی۔

مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ زیادہ تر تقریریں انگریزی میں ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ بوسنیا کا مسئلہ یورپ کی امیج کے لئے فنڈمنٹل الجبری کے ہم معنی ہے۔ یہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں۔

بوسنیا کی ٹریجڈی کا کچھ بھی تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اسلام سولھویں صدی میں بوسنیا میں پھیلا۔ ایک صاحب نے کہا کہ :

It is nothing to do with the gospel. It is not a religious conflict; but a political one..

ایک صاحب نے کہا کہ مارشل ٹیٹو نے ساری دنیا کو دھوکہ دیا۔ اس نے پورے یوگوسلاویہ کو ایک نیشن بتایا۔ حالاں کہ وہاں مختلف گروہ تھے، کوئی ایک نیشن نہیں تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ بوسنیا میں آرمی پوری طرح سرب کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مسئلہ اس لئے اتنا بڑھا کہ آرمی سب کی سب سرب پرستش ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ کیتھولک چرچ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔ وہ صرف زیادتی (atrocity) کے خلاف ہے۔ ایک پادری نے کہا کہ بوسنیا میں صرف مسلمان ہلاک نہیں ہورہے ہیں بلکہ کرسچین بھی بڑی تعداد میں ہلاک ہورہے ہیں۔ انھوں نے جذباتی انداز میں کہا :

Where is the conscience of mankind.

ایک پادری نے کہا کہ میں اپنے گھر میں عبادت اور دعا میں مشغول تھا کہ مسلح افراد کا ایک گروہ میرے گھر میں داخل ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں دعا کر رہا ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس کے لئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اے میرے بچو، تمھارے لئے۔ وہ لوگ باہر نکلے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو چھوڑ دو۔ انھیں کچھ نہ کہو۔ ان کو یقین نہیں تھا کہ کوئی اپنے دشمن کے لئے نیک دعا کرسکتا ہے۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔

اس کانفرنس میں بوسنیا کے ایک عالم شیخ یعقوب سیلموسکی بھی شریک تھے۔ آجکل وہ مقدونیہ (Macedonia) میں مقیم ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر کے ہیں اور روانی کے ساتھ عربی زبان بولتے ہیں۔ ان کا مقدونیہ کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے : 38-91-255650 انھوں نے عربی میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

مارچ ۱۹۹۲ میں بوسنیا کے مسلمانوں کے خلاف ظلم شروع ہوا۔ بوسنیا کی حیثیت پہلے منطقہ عسکریہ کی تھی۔ چنانچہ وہاں نہایت طاقت ور یوگوسلاوی فوج موجود تھی جس میں بیشتر سرب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ یورپ کی پانچویں سب سے بڑی فوج تھی۔ ہر یورپی ملک میں مسلمان موجود ہیں۔ مگر بوسنیا و ہرسک میں یورپ کو مسلمانوں کا وجود برداشت نہیں۔ کیوں کہ ہم وہاں عالم اسلامی کا جزء

لا یتجزیٰ بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ آغاز جنگ سے پہلے یہاں دو ملین مسلمان تھے۔ یورپ یہاں کے مظلوم مسلمانوں کو مقابلہ کی اجازت بھی نہیں دے رہا ہے۔ غیر سربیوں کو ختم کرنا، یہ سرب کا مقصد ہے۔ موجودہ آرمی جو کمیونسٹ دور میں بنی تھی اس میں بیشتر افراد ملحد اور مذہب مخالف ہیں۔

شیخ یعقوب سلیموسکی کی جذباتی تقریر کو تمام حاضرین آلات کے ذریعہ انگریزی اور اطالوی زبان میں سن رہے تھے۔ انھوں نے تقریر ختم کی تو ہال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ کسی اور کی تقریر پر اتنی تالی نہیں بجی۔ انھوں نے کہا : مجھے یقین ہے کہ یہ تالیاں ہمارے نقطۂ نظر کی پرجوش تائید کر رہی ہیں۔

۲۲ ستمبر کو آخری اجلاس تھا۔ صبح سے دوپہر تک کے اجلاس میں لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اور آخر میں امن کے قیام کے موضوع پر تجویز پیش ہوئی اور منظور ہوئی۔

دوپہر بعد حسب روایت "پریر" کی تقریب تھی۔ یعنی امن کے قیام کے لئے اجتماعی دعا مختلف مذہب کے لوگوں کے لئے الگ الگ جگہیں متعین کی گئی تھیں۔ ہمیں ایک چرچ تک پہنچایا گیا۔ یہاں چرچ کی عمارت کے وسیع حصہ کو خالی کر کے مسجد کے انداز میں بنایا گیا تھا امن عالم کے لئے یہ ساتویں انٹرنیشنل میٹنگ تھی۔ اس سے پہلے اس قسم کی میٹنگ اسپین، روم، وارسا، باری، مالٹا، بروسیلز میں ہو چکی ہے۔ اب یہ ساتویں میٹنگ میلان (اٹلی) میں ہوئی ہے۔ ان عالمی اجتماعات میں مخصوص تقریب کے دوران اس کے شرکا، امن کی اپیل پر دستخط کرتے ہیں۔

شیخ یعقوب سلیموسکی کا پتہ یہ ہے:

S. Selimoski Yakub, Rijpset Islamike Ajednice, Sarajeyo (B.H.)

۲۲ ستمبر ۱۹۹۳ کو میلان کے جس وسیع مکان میں مسلمانوں کے لئے اجتماعی عبادت کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ اس کے ایک کمرہ میں کانفرنس کے مسلم شرکا جمع ہوئے۔ سب کی فرمائش پر شیخ یعقوب سلیموسکی نے بوسنیا کے موجودہ حالات پر ایک تقریر کی۔ یہاں سامعین سب مسلمان تھے ابتدائی تقریر میں انھوں نے صرف مسلمانوں پر ہونے والے مظالم بیان کئے۔ تقریر کے بعد لوگوں نے سوالات کئے۔ سوال وجواب کے دوران انھوں نے کئی نئی باتیں بتائیں۔

ایک شخص نے کہا کہ موجودہ حالات کا تقابل ماضی کے حالات سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں نے بہتر حالت سے بری حالت کی طرف چھلانگ لگائی ہے۔ شیخ نے اقرار کیا اور کہا کہ ہاں، لوگوں نے غلطیاں بھی کیں (طبعا كانت هناك اخطاء) انھوں نے کہا کہ جنگ چھڑنے سے پہلے وہاں جذباتی تحریک (حركة عاطفية) پائی جا رہی تھی نہ کہ عقلی تحریک (حركة عقلية)۔ مسلمانوں کے پاس کوئی عسکری طاقت نہ تھی جب کہ بوسنیا میں نہایت طاقتور سرب فوج موجود تھی۔ اسی فوج نے اعلان آزادی کے بعد مسلمانوں کو مارنا شروع کیا۔

شیخ یعقوب کی تقریر سننے کے بعد میں نے ایک عرب عالم (شیخ سکوتہ) سے کہا کہ جب بوسنیا میں سرب کی طاقت ور فوج موجود تھی اور مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہ تھی تو انھوں نے حالات کا لحاظ کئے بغیر آزادی کا اعلان کیوں کر دیا۔ شیخ نے کہا (غفلة كبيرة)

میلان میں ایک بہت بڑا ادارہ ہے جس میں چرچ بھی ہے اور اس کے علاوہ مختلف قسم کی سماجی اور معاشی اور تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس میں اسی ہزار طلبہ کے قیام کا انتظام ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Parrocehia S. Giovanni B. alla Creta

ان کی طرف سے پیغام ملا کہ وہ اپنے یہاں ایک خطاب رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے عیسائی لوگ اسلام کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ آکر انھیں بتائیں کہ اسلام کیا ہے۔ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔

۲۱ ستمبر کی شام کو فادر تارونی (Massimiliano Taroni) اپنے وقت پر آگئے۔ ان کے ساتھ ہم تین آدمی روانہ ہوئے۔ میں، ثانی اثنین اور ڈاکٹر اندریا دلوکا۔ رات کا کھانا ان کے یہاں کھایا گیا۔ کھانا اور ڈائننگ ہال اور اس کی ہر چیز سادہ مگر انتہائی صاف ستھری تھی۔ کھانے کے بعد ان کے ہال میں پروگرام ہوا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ یہ پروگرام اچانک بنا تھا۔ میں نے ۲۰ ستمبر کی شام کا اجلاس چھوڑ دیا۔ اور اپنے کمرہ میں بیٹھ کر پانچ صفحہ پر مشتمل انگریزی میں ایک تقریر تیار کی۔ اس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام کی سادہ تشریح کی گئی تھی۔ لوگوں نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ میری تقریر لے کر کئی لوگوں نے فوری طور پر فوٹو کاپی کر کے حاصل کیا۔

یکساں سول کوڈ

دلائل وحقائق کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خان

بحث کے ذیلی عنوانات

دستور : غیر ضروری طوالت	فطرت کے خلاف
نہرو رپورٹ ۱۹۲۸	ایک ناقابل عمل تجویز
سپریم کورٹ کا فیصلہ	قانون کی محدودیت
دستور کی دفعہ ۴۴ برائے یونیفارم سول کوڈ	تبدیلیٔ مذہب کا مسئلہ
مذہب اور پرسنل لا کا تعلق	دستور کی دفعہ ۴۴ قابل حذف
کامن کوڈ اور قومی ایکتا	یونی کلچر نہیں بلکہ ملٹی کلچر
باہمی تفریق انگریزوں کی دین	اضافۂ آبادی محض ایک ہوّا ہے
یکساں سول کوڈ یکسانیت کا ذریعہ نہیں	خواتین کا مسئلہ مساوات کا نہیں بلکہ ایڈجسٹمنٹ کا
دانشوران قوم کا صحافتی ردعمل	ہندو برادریوں کا رواج ایک نہیں
گرو گولوالکر کی اختلافی رائے	اصل اہمیت کا کام تعلیم ہے

قیمت فی کاپی ۵ روپے
زیادہ تعداد کے لیے خصوصی کمیشن

پتہ :

الرسالہ بک سنٹر، ۱- نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

The Islamic Centre Publicatio
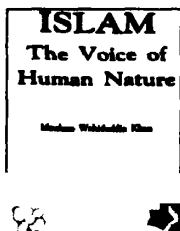
ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE
22x14.5cm, 64 pages
ISBN 81-85063-74-5
Rs. 30
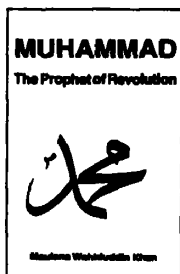
MUHAMMAD: THE PROPHET OF REVOLUTION
22x14.5cm, 228 pages
ISBN 81-85063-00-1
Rs. 85

GOD-ORIENTED LIFE
22x14.5cm, 186 pages
ISBN 81-85063-97-4
Rs. 70

WOMAN ISLAMIC SH
22x14.5cm, 15
Rs. 65 (Paper
Rs. 185 (Hardb
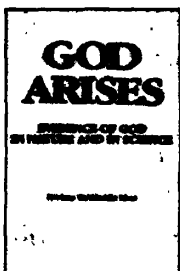
GOD ARISES
22x14.5cm, 271 pages
ISBN 81-85063-14-1
Rs. 85

ISLAM AS IT IS
22x14.5cm, 114 pages
ISBN 81-85063-95-8
Rs. 55
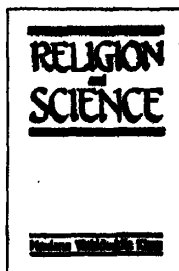
RELIGION AND SCIENCE
22x14.5cm, 96 pages
Rs. 45
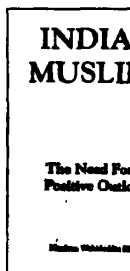
INDIAN MUS
22x14.5cm, 19
Rs. 65 (Paper
Rs. 175 (Hardb

'INTRODUCTION TO ISLAM' SERIES

In this 'Introduction to Islam' series Maulana Wahiduddin Khan—a famous Islamic thinker and scholar and President of the Islamic Centre, New Delhi—has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way. The complete series is as follows:

1. The Way to Find God (20 pages; Rs. 12)
2. The Teachings of Islam (48 pages; Rs. 15)
3. The Good Life (36 pages; Rs. 12)
4. The Garden of Paradise (36 pages; Rs. 15)
5. The Fire of Hell (44 pages; Rs. 15)

The series provides the general public with an accurate and comprehensive picture of Isl the true religion of submission to God. In th pamphlet it is shown that the true path is the that God has revealed to man through prophets. The second pamphlet provide introduction to various aspects of the Islami under forty-five separate headings. Our teachings have been summarized in the pamphlet in words taken from the Qur'an i In the fourth pamphlet the life that makes worthy of paradise has been described a the last pamphlet the life that will condemn to hell-fire.

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013 Tel. 4611128 Fax: 11-469

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۰۲

۱ ہندی اخبار دینک ہندستان کے نمائندہ مسٹر اشوک کنکر نے ۱۱ مئی ۱۹۹۵ ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سپریم کورٹ کے کامن سول کوڈ کے حالیہ فیصلہ کے بارہ میں کہا گیا کہ اس قسم کا مقصد قانون سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ سماجی تبدیلی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس قانون کو قبول کرنے کے لئے سماج تیار نہ ہو وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف برائی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

۲ ۱۱ مئی ۱۹۹۵ کو مسٹر راجندر کمار شرما دوردرشن کی ٹیم لے کر مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر چرار شریف (کشمیر) کی آتش زدگی سے تھا۔ جو کچھ کہا گیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جس نے بھی یہ کام کیا ہے بہت برا کیا ہے۔ یہ درگاہیں روحانیت اور انسانی محبت کے مراکز ہیں۔ ان کو سیاسی ہنگاموں سے دور رکھنا چاہئے تاکہ آئندہ اس قسم کے حادثے نہ پیش آئیں

۳ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے ۱۳ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی آدھ گھنٹہ کی بات چیت نشر کی۔ اس میں ان کے ساتھ پروفیسر ریاض پنجابی شریک تھے۔ بات چیت کا موضوع کشمیر کی چار سو سالہ درگاہ چرار شریف کو جلا کر راکھ کر دینا تھا۔ گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ شیخ نور الدین نورانی ایک صوفی تھے۔ ان کا مشن ہندو مسلم کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنا تھا۔ وہ سیاست اور تشدد سے بہت دور تھے۔ ایسی حالت میں ان کی درگاہ کو جنگجویانہ سیاست کا اڈہ بنانا سخت غلط تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۱ مئی کو یہ درگاہ مع بستی کے جلادی گئی۔

۴ انگریزی روزنامہ ٹیلی گراف کی نمائندہ مسز سوناٹھاکر نے ۱۲ مئی ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا تعلق سپریم کورٹ کے اس حالیہ فیصلہ سے تھا جس میں حکومت ہند کو کامن سول کوڈ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا یہ بالکل غیر عملی فیصلہ ہے، اور غیر عملی فیصلہ ہمیشہ مسائل میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کبھی

مسائل کو حل نہیں کرتا۔

۵ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر عسکری زیدی نے ۱۲ مئی ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق سپریم کورٹ کے تازہ فیصلہ سے تھا جس میں حکومت ہند کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ کامن سول کوڈ بنائے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ دستور کی دفعہ ۴۴ بلاشبہ کامن سول کوڈ کی تجویز کرتی ہے۔ مگر اسی دستور کی دفعہ ۲۵ مذہبی آزادی بھی دے رہی ہے۔ نکاح کا مسئلہ خالص ذاتی نوعیت کا ایک مذہبی معاملہ ہے۔ اگر اس کی بھی آزادی نہ ہو تو دستور میں مذہبی آزادی کی دفعہ بے معنی ہو جاتی ہے۔

۶ یونین آف کیتھولک ایشین نیوز (Union of Catholic Asian News) کے نمائندہ مسٹر اینٹوا کارا (Antoakkara) نے ۱۳ مئی ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر یونیفارم سول کوڈ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ سیکولرزم کا مطلب لامذہبیت نہیں ہے۔ چنانچہ ہندستان کا دستور ایک سیکولر دستور ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں مذہب کی آزادی بھی دی گئی ہے۔

۷ مسٹر اشوک رائنا اور ان کی ٹیم ۱۶ مئی ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور دوردرشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر کے معاملہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ خود کشمیریوں کے محبوب شاعر اقبال نے کہا ہے کہ : چین وعرب ہمارا ہندستاں ہمارا۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ پھر کشمیری چند سیاسی کلیوں کے لئے کیوں لڑ رہے ہیں۔ انھیں سارے ہندستان کو اپنا ملک سمجھنا چاہئے اور وسیع تر دائرہ میں پر امن طور پر اپنی تعمیر و ترقی کا کام کرنا چاہئے۔

۸ پی ٹی آئی کی نمائندہ مسز الینا نے ۱۸ مئی ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ سے تھا جس میں کامن سول کوڈ کی بات کہی گئی ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اس قسم کے معاملات کا تعلق قانون سے نہیں ہوتا بلکہ سماجی روایات سے ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں سول میرج ایکٹ موجود

ہے۔ مگر ایک فیصد ہندو بھی اس کے تحت شادی نہیں کرتے۔ ان کی ۹۹ فیصد سے زیادہ شادیاں ہندو میرج ایکٹ کے تحت ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ہندو سماج ابھی سول میرج کے لئے تیار نہیں۔

۹. دوردرشن کی ٹیم ۷ امئی ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق ٹاڈا قانون کے خاتمہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ صرف ٹاڈا کو ختم کرنے سے ظلم ختم نہیں ہو سکتا۔ ظلم کو ختم کرنے کے لئے پورے سسٹم کی اصلاح ضروری ہے۔ موجودہ کرپٹ سسٹم کے باقی رہتے ہوئے ظلم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

۱۰. نیوز لیڈر (الہ آباد) اور نئی زمین (دہلی) کی نمائندہ مسز شاداں احمد نے ۱۸ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا یہ شریعت میں مداخلت ہے۔ جواب دیا گیا کہ مداخلت کا سوال تو اس وقت ہے جب کہ وہ زیر عمل آئے۔ موجودہ حالات میں تو وہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔

۱۱. راشٹریہ سہارا (ہندی) کے نمائندہ مسٹر راکیش آریہ نے ۱۸ امئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے پچھڑے پن کا سبب خود مسلمانوں کی نام نہاد لیڈر شپ ہے۔ یہ لیڈر شپ اپنی سوچ میں زمانہ سے پچھڑی ہوئی ہے۔ وہ کامپٹیشن کے دور میں ریزرویشن کی اصطلاحوں میں سوچتی ہے۔ اسی چیز نے مسلمانوں کو ہر میدان میں پیچھے کر دیا۔

۱۲. جن ستہ پارٹی کی دعوت پر ۱۹ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز نے گوڑگاؤں (ہریانہ) کا سفر کیا اور وہاں ایک میٹنگ سے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع یہ تھا کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس پارٹی کے صدر جسٹس دیبی سنگھ تیوتیا ہیں۔

۱۳. ۲۰ مئی ۱۹۹۵ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں دھرم چاریہ سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور تفریقی سیاست کی برائی پر ایک تقریر کی۔

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۸

فہرست | صفحہ

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

دفع احسن

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك وبینه عداوۃ كانه ولی حمیم (۴۱ : ۳۴)

اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھوگے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

ایک شخص آپ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کرے اور آپ اس پر بھڑک کر اس کی مذمت کرنے لگیں تو اس کے اندر ضد پیدا ہو گی۔ اس کی دشمنی اور بڑھ جائے گی۔ آپ کا ایسا ردعمل آگ پر تیل ڈالنے کے ہم معنی ہوگا۔ جس دشمنی کی ابتدائی صورت آپ کے لئے ناخوشگوار ثابت ہوئی تھی، اب آپ کو اس دشمنی کی انتہائی صورت کا تلخ تر تجربہ برداشت کرنا پڑے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ ایسا کریں کہ جس آدمی نے آپ کے ساتھ دشمنی والا سلوک کیا ہے، اس کے ساتھ آپ اعراض برتیں۔ یا اس کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا معاملہ کریں تو یہ آگ پر پانی ڈالنے کے ہم معنی ہوگا۔ آپ کا ایسا رویہ دشمن کو نفسیاتی شکست میں مبتلا کر دے گا۔ اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ وہ اندرونی طور پر شرمندگی کے احساس میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ مزید دشمنی کرنے کے بجائے دشمنی کی تلافی کی بات سوچنے لگے گا۔

اشتعال کے جواب میں مشتعل ہونا یا منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کرنا دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ کوئی مفید نتیجہ برآمد کرنے والا نہیں۔ یہ نادان آدمی کا کام ہے کہ وہ کوئی خلاف مزاج بات دیکھے تو فوراً بھڑک اٹھے۔ عقل مند وہ ہے جو اقدام سے پہلے نتیجہ کی بات سوچے۔ جو آخری نتیجہ کو سامنے رکھ کر اپنے عمل کا نقشہ بنائے نہ کہ محض وقتی جذبہ کے تحت کارروائی کرنے لگے۔

ہر آدمی اصلاً فطرت کا ایک ظاہرہ ہے۔ ہر ایک آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہے۔ بظاہر کوئی شخص آپ کا دشمن ہو تب بھی اس کو ایک انسان سمجھئے۔ اس کی برائی کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا۔

مومن کی تطہیر

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی بیماری یا تکلیف جو مسلم کو پہنچتی ہے وہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے (ما من مرض او وجع یصیب المسلم الا کان کفارۃ لذنبہ)

اس طرح کی روایتیں مختلف الفاظ میں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی یا ذہنی تکلیف عام انسان کے لئے تو صرف تکلیف ہے۔ مگر صاحب ایمان کے لئے وہ گناہوں کو دور کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو آدمی ایمان و اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے، اس کے لئے خود بخود ایسا ہوتا رہے گا کہ جب بھی کوئی تکلیف پڑی تو اپنے آپ ہی اس کی کوتاہیاں اور اس کے گناہ دھلتے چلے جائیں گے۔ اس کا تعلق تکلیف کے بعد ظاہر ہونے والی نفسیاتی کیفیت سے ہے نہ کہ کسی پر اسرار قسم کے خود کار نظام سے۔

یہ دراصل مومن اور غیر مومن کی نفسیات کے فرق کا معاملہ ہے۔ غیر مومن کو کوئی تکلیف پیش آتی ہے تو اس کو وہ کسی کا ظلم سمجھ کر شکایت اور احتجاج کرتا ہے۔ وہ فریاد و ماتم میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح تکلیف ایک غیر مومن کو منفی ردعمل کے سوا کچھ اور نہیں دیتی۔

اس کے برعکس تکلیف کا معاملہ جب ایک ایسے انسان کے ساتھ پیش آتا ہے جس کو ایمان کی معرفت مل چکی ہو، اسلام نے جس کے ذہنی سانچہ کو بدل ڈالا ہو تو وہ تکلیف کا استقبال خدائی آزمائش کے طور پر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تکلیف اس کے اندر خود احتسابی پیدا کرتی ہے۔ وہ تواضع اور اعتراف میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ نفسیاتی حالت اس کو خدا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دعا کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں اور اپنی کوتاہیوں سے معافی مانگنے لگتا ہے۔

اس طرح تکلیف مومن کے لئے پاکی کا سبب بن جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، تکلیف میں غیر مومن کے لئے منفی نتیجہ ہے اور مومن کے لئے مثبت نتیجہ۔

خوف خدا

عمر بن عبد العزیز بن مروان بن الحکم الاموی (۱۰۱-۶۱ ھ) کا درجہ اسلام میں اتنا بڑا ہے کہ ان کو پانچویں خلیفہ راشد (خامس الخلفاء الراشدین) کہا جاتا ہے۔ ان کی مدت خلافت ڈھائی سال ہے۔ ان کے حالات پر کئی مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

ابن الجوزی	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
عبد اللہ بن الحکیم	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
عبد الرؤف المناوی	سیرۃ عمر بن عبد العزیز
احمد زکی صفوت	عمر بن عبد العزیز
عبد العزیز سید الاہل	الخلیفۃ الزاہد

اموی خلفاء میں وہ واحد خلیفہ ہیں جن کا اعتراف ان کے بعد عباسیوں نے کیا۔ شیعہ حضرات کے درمیان بھی ان کا احترام پایا جاتا ہے۔ اہل اسلام کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی ان کا غیر معمولی اعتراف کیا گیا۔ محمد بن معبد کہتے ہیں کہ میں شاہ روم کے یہاں گیا تو اس کو مغموم حالت میں زمین پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے حال پوچھا تو اس نے کہا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ کتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حادثہ۔ اس نے کہا کہ مرد صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کون۔ شاہ روم نے کہا کہ عمر بن عبد العزیز۔ میرا خیال ہے کہ عیسیٰ بن مریم کے بعد اگر کوئی شخص مردہ کو زندہ کرنے والا ہوتا تو یقیناً وہ عمر بن عبد العزیز ہوتے۔ ایک مسیحی راہب کو لوگوں نے روتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ زمین پر ایک نور تھا، مگر اب وہ نور نہیں رہا۔

عمر بن عبد العزیز کی موت کے بعد کچھ لوگ ان کی اہلیہ کے پاس گئے اور کہا کہ ان کی کوئی خاص بات بتائیے۔ اہلیہ نے کہا کہ خدا کی قسم، عمر نماز اور روزہ میں تم سے زیادہ نہ تھے۔ مگر خدا کی قسم، میں نے کبھی کسی انسان کو نہیں دیکھا جو عمر سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو (واللہ ما کان عمر باکثرکم صلاۃ ولا صیاماً ولکنی واللہ ما رأیت عبداً للہ قط کان اشد خوفاً للہ من عمر)

احتیاطی تدبیر

فطرت کا ایک اصول پیشگی احتیاط ہے۔ اسی اصول کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں میں احتیاطی تدابیر (precautionary measures) اختیار کی جاتی ہیں۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر پیشگی تدبیر اختیار کر لی جائے تو متوقع حادثہ پیش نہیں آتا۔

مثال کے طور پر ہرنیا ایک بیماری ہے۔ جس آدمی کو یہ بیماری ہو جائے اس کو آپریشن تھیٹر میں جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر اس بیماری کی پیشگی تدبیر تقریباً یقینی طور پر اس کو ظہور میں آنے سے روک دیتی ہے۔ یہ پیشگی تدبیر انڈرویر کا استعمال ہے۔ ہرنیا کبھی اچانک نہیں ہوتا۔ اس کی ابتدائی علامت بہت پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ ابتدائی علامت ظاہر ہوتے ہی وہ مخصوص انڈرویر پہننا شروع کر دے تو وہ اس بیماری میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں کھلاڑیوں کے استعمال کے لئے بہت عمدہ قسم کے انڈرویر بنائے گئے ہیں۔ ان کو ایتھلیٹک سپورٹر (athletic supporter) کہا جاتا ہے۔ یہ ایتھلیٹک سپورٹر گویا نہایت موثر قسم کی پیشگی تدبیر ہے جو ہرنیا کی بیماری سے بچاؤ کی تقریباً یقینی ضمانت ہے۔

اسی طرح اجتماعی جھگڑوں کے لئے بھی پیشگی تدابیر ہیں۔ یہ تدبیریں اجتماعی جھگڑوں کو روکنے میں نہایت مؤثر ہیں۔ مثلاً باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنا، افواہوں کی بروقت تردید کرنا، ہر بستی میں امن کمیٹی بنانا، اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کا انداز اختیار کرنا، فریق ثانی کو دشمن سمجھنے کے بجائے اس کو ایک انسان سمجھ کر اس سے برادرانہ معاملہ کرنا۔ نزاع اگر عملاً پیش آجائے تو "لو اور دو" کے اصول پر معاملہ کو ختم کرنا۔ جس شخص یا گروہ کے ساتھ نزاع پیش آئی ہے اس سے حریفانہ طریقہ کے بجائے برادرانہ طریقہ اختیار کرنا، وغیرہ

موجودہ دنیا کے خالق نے ہر معاملہ میں پیشگی بچاؤ کے طریقے رکھ دئے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ان طریقوں کو دریافت کرے اور ان کا استعمال کر کے اپنے آپ کو ان کی زد میں آنے سے بچالے۔

ترقی کا زینہ

جی ڈی برلا ہندستان کے چند انتہائی بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے برٹش دور میں معمولی حیثیت سے آغاز کیا اور اپنی زندگی ہی میں افسانوی حیثیت حاصل کرلی۔ وہ بجا طور پر ہندستانی صنعت کے معماروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

برلا کی ایک سوانح حیات چھپی ہے جس کا نام ہے "کرم یوگی گھنشیام جی" اس کتاب کا دیباچہ ان کے صاحبزادہ کے کے برلا نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ ہندستان ٹائمس (۲۰ اپریل ۱۹۹۴) نے اپنے خصوصی شمارہ میں شائع کیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جی ڈی برلا ابتداءً کلکتہ کی ایک برٹش فرم میں بروکر (دلال) تھے۔ وہ محنت اور دیانتداری کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے اس لئے متعلق افراد ان سے خوش رہتے تھے۔ برلا بظاہر اپنے کام پر مطمئن تھے۔ ان کے دل میں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ خود اپنی کوئی انڈسٹری لگائیں۔ مگر حالات کے اعتبار سے اس طرح کا فیصلہ لینا آسان بھی نہ تھا۔ چنانچہ بروکر کی حیثیت سے وہ اپنے کام میں لگے رہے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ کمپنی کی بلڈنگ میں اوپر جانے کے لئے برلا ایک لفٹ میں داخل ہوئے۔ اس میں ایک انگریز تھا۔ اس نے برلا کو یہ کہہ کر باہر نکال دیا کہ یہ لفٹ انڈین کے استعمال کے لئے نہیں ہے۔ یہ واقعہ توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھا۔ لیکن برلا نے ایسا نہیں کیا کہ اس کے بعد وہ انگریزوں پر اپنا غصہ اتارنے میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے بجائے یہ واقعہ ان کے لئے ایک مہمیز بن گیا۔ برلا کے فرزند کی زبان میں، لفٹ کے واقعہ نے انھیں شدید طور پر متاثر کیا۔ اور ان کو فوری فیصلہ تک پہنچانے کا سبب گیا:

The lift incident acted as a catalyst and made him take an early decision. (p. 8)

برلا نے کمپنی کا کام چھوڑ دیا۔ اور ذاتی کاروبار کے میدان میں داخل ہو گئے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ محنت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ملک کے عظیم صنعت کار بن گئے۔ زندگی میں حادثات کا پیش آنا بھی فطری ہے۔ دانش مند وہ ہے جس کے لئے حادثہ مزید ترقی کا زینہ بن جائے۔

مذہبی استدلال

مسٹر خوشونت سنگھ کا ایک ریگولر کالم ہندستان ٹائمس میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہوتا ہے: ہر کس و ناکس کے لئے عداوت کے ساتھ (with malice towards one and all)

اخبار کے شمارہ ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ میں اس کالم کا ایک عنوان تھا سائنس بمقابلہ خدا (Science versus God) اس میں انھوں نے بتایا کہ ایک اطالوی خاتون (Cedra Osborne) کے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ میں نے تمام مذہبی عقائد کو اور پیغمبروں کو چھوڑ دیا ہے جنھوں نے خدائی علم کا دعوا کیا۔ اور یہ کہ جب تک کوئی شخص مجھے ان سوالوں کا جواب نہ دے اس وقت تک میں لاادریہ (agnostic) رہوں گا۔ یعنی یہ ماننا کہ خدا یا دوسری غیر مادی اشیاء کی ہستی کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔

وہ تین سوالات یہ ہیں (۱) ہم کہاں سے آئے ہیں (۲) ہم یہاں کیوں ہیں (۳) موت کے بعد ہم کہاں جاتے ہیں:

> I wrote to her that I had discarded all religious faith and world's prophets who claimed knowledge of Him. And that till somebody gave me answers to three questions I would remain an agnostic. My questions are: Where have we come from? Why are we here? Where do we go when we die? *The Hindustan Times*, New Delhi, March 25, 1995

میں کہوں گا کہ ان سوالات کا جواب بے حد آسان ہے۔ وہ یہ کہ دوسری حقیقتوں کو ماننے کے لئے انھوں نے جو اصول بالفعل اختیار کر رکھا ہے، اسی کو وہ مذہب اور خدا کے معاملہ میں بھی اختیار کر لیں۔ اور اس کے بعد انھیں اپنے تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔

جو لوگ اپنے کو لاادریہ (agnostic) کہتے ہیں وہ ایک زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس فکری مشکل کی وجہ سے وہ خدا اور مذہب کے معاملہ میں متشکک بن گئے ہیں، وہ فکری مشکل صرف مذہبی سوالات کے بارہ میں ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ فکری مشکل ہر مسئلہ کے ساتھ لگی ہوئی ہے، خواہ وہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔

مذہبی عقائد کے بارہ میں متشکک بننے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ محسوس عقلی دلائل کے

ذریعہ ثابت نہیں ہوتے۔ مگر ٹھیک یہی بات دوسرے تمام امور کے بارہ میں ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر خوشونت سنگھ نے جس میز پر بیٹھ کر یہ الفاظ لکھے ہیں، اس کا معاملہ بھی اتنا ہی مشتبہ ہے جتنا کہ ان کے نزدیک مذہبی عقائد کا معاملہ۔ کیوں کہ یہ میز بظاہر ایک محسوس صورت میں دکھائی دے رہی ہے۔ مگر سائنسی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کوئی دکھائی دینے والی چیز نہیں۔

اس دنیا میں آدمی جس چیز کو بھی مانتا ہے، قرائن کی بنیاد پر مانتا ہے نہ کہ محسوس دلائل کی بنیاد پر۔ کیوں کہ محسوس دلائل قائم کرنا کسی بھی چیز پر ممکن نہیں۔ ہر آدمی، حتی کہ تشکک بھی اس اصول کو مانتا ہے۔ اگر وہ نہ مانے تو وہ زندگی گزار نہیں سکتا۔ اس اصول کو نہ ماننے کی صورت میں وہ ہر چیز، حتی کہ کھانے اور پانی پر بھی شک کرے گا۔ پھر وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

اس اصولی وضاحت کے بعد اب اصل سوال پر آئیے۔ مسٹر خوشونت سنگھ (یا ان کی طرح کے دوسرے لوگوں کے) ان سوالات کا جواب یہ ہے:

۱۔ ہم عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ اور ہم کو خدا نے پیدا کیا ہے۔

۲۔ دنیا میں ہماری زندگی کا مقصد آزمائش ہے۔ یہاں ہم خدا کی طرف سے حالت امتحان میں ہیں۔

۳۔ موت کے بعد ہم عالم آخرت کی طرف چلے جاتے ہیں تاکہ اپنے موجودہ ریکارڈ کے مطابق اس کا انجام پائیں۔

یہ جوابات کیوں صحیح ہیں۔ وہ اس لئے صحیح ہیں کہ تمام قابل حصول قرائن اس کی صحت کی تائید کرتے ہیں۔ اس میں فطرت انسانی کے مطالبات کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اور اس معاملہ کی اس سے بہتر کوئی اور توجیہ ابھی تک سامنے نہ آسکی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب مذہب اور جدید چیلنج)۔

زندگی اور کائنات سے متعلق کوئی بھی چیز جس کو ہم مانتے ہیں اس کو اسی طرح قرائن کی بنیاد پر مانتے ہیں۔ تمام چیزوں کو ہم علم ظنی ہی کی بنیاد پر مانتے ہیں نہ کہ علم قطعی کی بنیاد پر۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک دیانت دار آدمی کے لئے صرف دو میں سے ایک کا چوائس ہے۔ وہ تمام چیزوں کو یا تو قرائن کی بنیاد پر مانے یا کسی بھی چیز کو نہ مانے۔ مسٹر خوشونت سنگھ جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ "تھرڈ آپشن" لے رہے ہیں۔ جب کہ تھرڈ آپشن ممکن ہی نہیں۔

اسلام مذہبِ امن

یورپ کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ وہ ایک عرب ملک سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ روزگار کی تلاش میں تھے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک غیرمسلم ادارہ میں انٹرویو کے لئے گئے۔ گفت گو کے دوران انٹرویو ر نے ان سے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو۔ نوجوان نے کہا کہ ہاں۔ یہ سن کر انٹرویو ر نے فوراً کہا کہ پھر تو تم دہشت گرد ہو:

Then you are a terrorist.

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ایک طبقہ کے کٹرپن اور اس کی جنگ جویانہ سرگرمیوں کی وجہ سے عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اسلام دہشت گردی (terrorism) کا مذہب ہے۔ اسلام اپنا مقصد جنگ اور تشدد کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہ بات مکمل طور پر خلاف واقعہ ہے۔

اسلام مسلمانوں کے کسی رویہ کا نام نہیں ہے۔ اسلام ایک اصولی مسلک کا نام ہے، وہ کسی قوم کے قومی طرز عمل کا نام نہیں۔ مسلمانوں کے عمل کو اسلام سے جانچا جائے گا نہ کہ اسلام کو مسلمانوں کے عمل سے جانچا جانے لگے۔ اگر کچھ مسلمان دہشت گردی کی روش اختیار کئے ہوئے ہیں تو اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں نہ کہ اسلام۔ ان کے اسلامی نعرہ کی وجہ سے ان کا عمل اسلام کا عمل نہیں بن جائے گا۔

اسلام پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور آپ کے نمونہ حیات کا نام ہے۔ اور پیغمبر اسلام امن کے پیغمبر تھے، وہ جنگ کے پیغمبر نہیں تھے۔ اسی لئے قرآن میں آپ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے تم کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (وما ارسلناك إلا رحمةً للعالمين)

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام حرب رکھا۔ عرب ایک جنگجو قوم تھے۔ چنانچہ وہ جنگی

ناموں کو پسند کرتے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام کو معلوم ہوا تو آپ نے حرب نام کو پسند نہیں کیا۔ آپ نے کہا کہ اس کے بجائے تم بچہ کا نام حسن رکھو۔

اس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ آپ پورے معنوں میں ایک امن پسند انسان تھے۔ آپ کی امن پسندی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ آپ حرب جیسا لفظ سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ تشدد میں نہیں بلکہ حسن اخلاق میں یقین رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم انقلاب لے آئے۔ مگر یہ انقلاب امن کی قوت سے برپا کیا گیا نہ کہ جنگ کی قوت سے۔ اگر کبھی آپ نے جنگ کی تو وہ مجبورانہ دفاع کے طور پر تھی نہ کہ آپ کی اپنی پسند اور آپ کے اپنے انتخاب کے تحت۔

امن آپ کی زندگی کا ایک عمومی اصول تھا اور جنگ صرف ایک اتفاقی استثناء۔ چنانچہ اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں آپ نے صرف تین لڑائی لڑی (بدر، احد، حنین) یہ تینوں لڑائیاں دفاعی تھیں اور ان میں مجموعی طور پر صرف ڈیڑھ دن صرف ہوئے۔

زید بن مُہَلہِل نجد میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ وہ زید الخیل کہے جانے لگے۔ خیل عربی زبان میں گھوڑے نیز گھوڑے سوار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے اسلام سے پہلے فارس (شہ سوار) اور شمشیر زن کی تعریف پر ایک پر جوش نظم کہی تھی۔ اس میں وہ اپنے قبیلہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ میری قوم لوگوں کی سردار ہے۔ اور سرداری اس وقت قائد بنتا ہے جب کہ شعلہ بار ہتھیلیوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا ہو:

وقومِي رؤوس الناسِ والرأس قائدٌ　　اذا الحرب شَبَّتْها الأكُفُّ المساعِرُ

زید الخیل ہجرت کے بعد مدینہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیل کا نام پسند نہیں کیا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر زید الخیر رکھ دیا۔ ۹ ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ واقعہ اسلام کی اسپرٹ کو بتاتا ہے۔ اسلام دین رحمت ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو زید شہ سوار بنانا نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی زید صاحب خیر بنے۔ قدیم

عرب میں گھوڑا دوڑانا اور تلوار کا کمال دکھانا ہیروانہ کام سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام نے ان کے جذبات کو موڑا۔ اور ان کو یہ ذہن دیا کہ وہ خیر کے حامل بنیں، وہ خیر کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ وہ لوگوں کو موت کا تحفہ نہ دیں بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا تحفہ دینے کی کوشش کریں۔

آجکل کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کا مقصد تخلیقی (creative) انسان پیدا کرنا ہے۔ اللہ پر ایمان آدمی کے اندر تخلیقی اوصاف کو جگا دیتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ عام سوچ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس کا کردار دوسرے لوگوں کے کردار سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ زمین میں رہتے ہوئے ایک آسمانی انسان بن جاتا ہے۔ وہ ظواہر میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا ہے۔

دوسرے لوگ اگر اپنی ذات کو چاہنے والے ہوتے ہیں تو وہ خیر کو چاہنے والا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ اگر استحصال کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ نفع پہنچانے والا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے مزاج میں اگر سرکشی ہوتی ہے تو اس کے مزاج میں تواضع ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی خصوصیت اگر جنگ پسند ہوتی ہے تو اس کی خصوصیت امن پسند۔ دوسرے افراد اگر لوگوں کو مار کر خوش ہوتے ہیں تو وہ لوگوں کو زندگی دے کر خوشی حاصل کرتا ہے۔ دوسروں کے پاس اگر لوگوں کے لئے نفرت کا تحفہ ہوتا ہے تو اس کے پاس صرف محبت کا تحفہ، خواہ دوسرے لوگ اس سے نفرت کا معاملہ کیوں نہ کر رہے ہوں۔

صحیح البخاری میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اجتماعی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ امام البخاری نے یہ حدیث چار ابواب کے تحت نقل کی ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ماخُیِّرَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بین امرین اِلّا اَخذَ ایسرھما	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملوں میں سے ایک کو لینا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کو لیتے تھے۔
(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۶/۶۵۴)	

یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں

کے درمیان آپ کو جو معاملات پیش آتے تھے، ان میں آپ ہمیشہ آسان پہلو کا انتخاب فرماتے تھے۔ جب ایک طریقہ امن کا ہو اور دوسرا طریقہ ٹکراؤ کا، ایک طرف نزاع ہو اور دوسری طرف موافقت ہو، ایک جنگ کا راستہ ہو اور دوسرا صلح کا راستہ ہو، تو ان تمام صورتوں میں آپ اسی صورت کو اختیار کرتے تھے جو نسبتاً سہل اور آسان ہو۔ غور کیا جائے تو یہ اصول آپ کی پوری زندگی پر چھایا ہوا نظر آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت ایک معلوم اور مشہور سنت ہے۔ مگر عام طور پر اس کا انطباق صرف چھوٹے چھوٹے امور میں کیا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھا رہے ہوتے اور پیچھے سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آجاتی جس کو اس کی ماں مسجد میں لائی تھی تو آپ نماز کو مختصر کر دیتے۔ ایسی حالت میں آپ لمبی سورہ پڑھنے کے بجائے چھوٹی سورہ پڑھ کر نماز کو جلد ختم کر دیتے تاکہ بچہ کی ماں کو پریشانی نہ ہو۔ مگر زیادہ بڑے بڑے امور میں اس سنت کا ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ بڑے امور میں اس کو منطبق کیا جاتا ہے۔

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اگر آپ کعبہ کی تطہیر سے اپنی مہم کا آغاز کرتے تو یہ آپ کے لئے مشکل انتخاب ہوتا۔ اس لئے آپ نے دلوں کی تطہیر سے اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ چنانچہ قرآن میں پہلی آیت یہ اتاری گئی کہ اقرأ باسم ربك الذی خلق گویا کہ طهّر الكعبة من الاصنام کے بجائے آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ طهر القلوب من الاصنام۔

مکی زندگی کے آخر میں آپ کے مخالفین آپ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت ایک صورت یہ تھی کہ آپ دفاعی ذہن کے تحت تمام مسلمانوں کو متحد کر کے جنگ کا طریقہ اختیار کرتے۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ مقابلہ کے بجائے ترک مقام کو اختیار کرنا تھا۔

حدیبیہ کے واقعہ میں آپ کے لئے جنگ اور واپسی میں انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے یہاں بھی جنگ کے طریقہ کو چھوڑا اور میدان سے واپسی کے طریقہ کو لے لیا۔

جن لوگوں نے حج یا عمرہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا ہے کہ کعبہ سے متصل ایک جگہ ہے جس کو حطیم کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ حضرت ابراہیم کی تعمیر کے مطابق، کعبہ میں شامل تھی۔ بعد کو مشرکین نے نئی تعمیر کے وقت اس کو الگ کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد آپ کو موقع تھا کہ کعبہ کو از سر نو بنا کر حطیم کو اس میں شامل کر دیں۔ مگر اس وقت کے حالات میں یہ ایک نزاعی کام تھا۔ چنانچہ نزاع سے بچنے کی خاطر آپ نے کعبہ کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جیسا کہ مشرکین نے اسے بنایا تھا۔

غور کیا جائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی اصول (اختیار الیسر) کا مصداق نظر آئے گی۔ آپ نے ہمیشہ ہر معاملہ میں مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا ہے۔ اسی اصول کو موجودہ زمانہ میں پر امن طریق عمل (peaceful method) کہا جاتا ہے۔

جنگ اور تشدد کا طریقہ اسلام کے لئے مفید نہیں ہے۔ جنگ باز آدمی تشدد کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کا طریقہ اسلام کے لئے بالکل اجنبی ہے۔ کیوں کہ اسلام کا مقصد دل و دماغ کو بدلنا ہے اور دل و دماغ کو بدلنے کا کام تشدد کے ذریعہ کیا جانا ممکن نہیں۔ دل و دماغ کو بدلنے کا کام نصیحت (persuasion) کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ طاقت (force) کے ذریعہ۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہو۔ لوگ آخرت کی جوابدہی کے احساس میں جینے والے بنیں۔ لوگوں کے اندر وہ اعلا روحانی اوصاف پیدا ہوں جن کو تقویٰ، خشیت، انابت، تضرع، اخبات، وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ لوگ حق کو پہچاننے والے اور حق کا اعتراف کرنے والے بنیں۔ لوگوں کے اندر وہ ربانی شخصیت پرورش پائے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔

یہی اسلام کا اصل مطلوب ہے اور جنگ یا تشدد کے ذریعہ اس مطلوب کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ پر امن دعوت و تبلیغ ہے۔ اسلام کے طریق کار کو ایک لفظ میں دعوتی طریقہ کہا جا سکتا ہے نہ کہ جنگ جویانہ طریقہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام ایک دعوت ہے۔ اور دعوتی عمل صرف پر امن حالات

سا انجام دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تناؤ اور ٹکراؤ کا ماحول ہو وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ممکن یں۔ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ ہر قیمت پر انسانوں کے درمیان امن قائم رہے۔ حتی ۔ امن کے قیام کے لئے اگر اہل اسلام کو یک طرفہ قربانی دینا پڑے تو یک طرفہ قربانی دے کر میں امن و امان کو قائم کرنا چاہئے۔

طریق کار ہمیشہ آدمی کے اپنے مشن کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے۔ اسی لئے دادا کا طریق کار ب تاجر کے طریق کار سے مختلف ہوتا ہے۔ دادا کا مقصد لوگوں کو خوف زدہ کرنا ہے۔ وہ جانتا ہے ۔لوگ جتنا زیادہ اس سے خوف میں رہیں گے اتنا ہی زیادہ اس کو اپنا مقصد حاصل رنے کا موقع ملے گا۔ اس لئے دادا یہ کرتا ہے کہ وہ تشدد اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ گوں کو اپنی طاقت کا تجربہ کراتا ہے۔ کیوں کہ ڈر کی نفسیات اسی طریقہ کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔

مگر تاجر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاجر کا مقصد لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا ہے۔ گرویدہ ہونے کے بعد ہی کوئی شخص ایک تاجر کے سامنے اپنی جیب خالی کرنے پر راضی ہو سکتا ہے۔ اس لئے تاجر محبت اور صلح کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ محبت اور صلح کے ذریعہ ہی وہ کسی کو اپنا گاہک بنا سکتا ہے۔

اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ اس لئے اسلام اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ دادا والا طریقہ اختیار کرے۔ اسلام کے لئے صرف تاجر والا طریقہ ہی مفید اور کارگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں یک طرفہ حسن سلوک پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جنگ کے بجائے صلح اور تشدد کے بجائے امن کی تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کا مقصد لوگوں کا ذہن بدلنا اور ان کا دل جیتنا ہے۔ اور اس قسم کا سنجیدہ کام صرف پر امن طور پر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ تشدد کا طریقہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ معاون۔

الفصل بین القضیتین

سعودی کنگ فیصل بن عبد العزیز (۱۹۷۵ - ۱۹۰۶) نہایت مدبر حکمراں تھے۔ پورے عالم اسلام میں انھیں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمنا ہے کہ میں یروشلم جاؤں اور مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ مگر وہ اپنی یہ تمنا پوری نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ان کا آخر وقت آگیا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلے گئے۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فیصل مرحوم یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ایسا نہ ہو کر یروشلم (فلسطین) سے یہودیوں کی حکومت ختم ہو کر وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے، اس وقت تک ایسا کرنا ممکن نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ حالات میں وہاں جانا یروشلم پر یہودیوں کے سیاسی قبضہ یا سیاسی غصب کو تسلیم کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس ذہنی رکاوٹ کی وجہ سے وہ یروشلم نہیں گئے اور اپنے دل کی تمنا دل ہی میں لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو۔

یہ شاہ فیصل کی کوئی انفرادی رائے نہ تھی۔ بلکہ یہی عام طور پر علماء اسلام کا موقف ہے جس کو انھوں نے اس وقت سے اختیار کر رکھا ہے جبکہ یروشلم پر یہودیوں کا سیاسی قبضہ ہوا۔ ۱۹۱۷ میں یروشلم ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ میں جزئی طور پر اور ۱۹۶۷ میں کلی طور پر اس کے اوپر یہودیوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس سلسلہ میں مصر کے شیخ الازھر کا ایک فتویٰ اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ دوسرے علماء اسلام کی رائے بھی قولاً یا عملاً یہی ہے:

"مصر کی قدیم دینی درس گاہ جامعۃ الازہر کے مفتی شیخ جاد الحق علی جاد الحق نے مصر اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں پر بیت المقدس اور مسجد الاقصیٰ میں جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ انھوں نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ مسجد الاقصیٰ اور بیت المقدس کی (سیاسی) آزادی تک عام مسلمانوں کا وہاں جانا غیر اسلامی اور غیر شرعی ہے۔ اس لئے فلسطین اور بیت المقدس کے باسیوں کے سوا دیگر تمام مسلمانوں کو اسرائیل سے (سیاسی) آزادی سے پہلے مسجد الاقصیٰ میں نہیں جانا چاہئے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تعلقات

دس پر اسرائیلی تسلط کو قبول کرلیا ہے۔ جامعۃ الازہر کے مفتی اعظم کے فتویٰ کے بعد حکومت مصر
ے اپنے باشندوں کے بیت المقدس جانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔" (نوائے وقت، لاہور،
ذی الحجۃ ۱۴۱۵ھ - ۱۹ مئی ۱۹۹۵ء)

یہ ایک نہایت اہم شرعی مسئلہ ہے، جس کے بارے میں قرآن وسنت کی بنیاد پر کوئی عملی موقف اختیار کرنا چاہیے، نہ کہ
ض ذاتی احساس یا قومی غیرت وحمیت کی بنیاد پر۔ فلسطین اور بیت المقدس پر یقیناً اہل اسلام کا حق ہے۔ اس کی
ادی کے لیے ان کو پُرامن ذرائع سے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ تاہم قرآن وسنت کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے
ی مسلمان کے لیے خالص عبادتی مقصد کے تحت ایسے وقت میں بھی اس مقدس مقام کی زیارت ممنوع نہیں جب کہ وہاں
رِسلموں کا تسلط قائم ہو۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ میں مذہبی آزادی کے بین اقوامی اعتراف نے بھی علی الاطلاق طور پر
ں کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ مگر مذکورہ قسم کے فتاویٰ کی بنا پر دنیا کے مسلمان نسل در نسل اس عظیم سعادت سے محروم
رہے ہیں کہ وہ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوں اور تیسرے سب سے افضل مقام پر اللہ کی عبادت کر سکیں۔

اگست ۱۹۹۵ میں یروشلم میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کا اہتمام اٹلی کے
یسائیوں کی ایک جماعت نے کیا تھا۔ اور اس کا موضوع یہی خاص مسئلہ تھا۔ اس کی دعوت پر راقم
روف نے اس کانفرنس میں شرکت کی اور اس موقع پر ایک مقالہ (انگریزی میں) پیش کیا۔ اس کا
نوان اسلام میں امن تھا:

Policy of peace in Islam

س مقالہ کو (اردو میں) ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قرآن اپنے بتائے ہوئے طریقہ کو سبل السلام (المائدہ ۱۶) کہتا ہے۔ یعنی امن کے
راستے۔ قرآن میں صلح کی پالیسی کو سب سے بہتر پالیسی بتایا گیا ہے (النساء ۱۲۸) نیز فرمایا کہ خدا
ر امنی کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۵) حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ المؤمن
ن امنہ الناس علیٰ دمائہم و اموالہم (الترمذی، کتاب الایمان) یعنی مومن وہ ہے
س سے لوگ اپنے خون اور اپنے مال کے معاملہ میں محفوظ ہوں۔
اس سے معلوم ہوا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک عملی سوال یہ ہے کہ

موجودہ دنیا میں ہمیشہ کسی نہ کسی سبب سے لوگوں کے درمیان سیاسی یا غیر سیاسی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ افراد میں بھی اور قوموں میں بھی۔ مسلمانوں کے اپنے اندر بھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی۔ اب اگر لوگ اختلافات کو برداشت نہ کریں، بلکہ اختلاف کے پیدا ہوتے ہی اس کے خاتمہ پر اصرار کریں تو لڑائی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کبھی بھی دنیا میں امن قائم نہ ہو سکے گا۔ ایسی حالت میں سوال ہے کہ امن کا مقصد کس طرح حاصل کیا جائے۔

اس اختلاف کی ایک تازہ مثال یروشلم کا مسئلہ ہے۔ یروشلم ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بلینوں انسان اس کو اپنا مقدس مقام مانتے ہیں۔ اس کی امتیازی صفت یہ ہے کہ تین سامی مذاہب کی تاریخ اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

یروشلم تین بڑے مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو ماننے والوں کے لئے ان کی تاریخی یادوں کی علامت ہے۔ وہ ان کے لئے ایک جذباتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہودیوں کے لئے اس کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے نزدیک وہ ان کی قدیم عظمت کا ایک زندہ ثبوت ہے اور ان کی قومی تاریخ کا مرکز ہے۔ عیسائیوں کے لئے وہ ان کے نجات دہندہ حضرت مسیح کی جغرافی یادگار ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اسراء اور معراج کے سفر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ٹھہرے اور یہاں باجماعت نماز میں تمام نبیوں کی امامت فرمائی۔

اس طرح ان تینوں مذاہب کے لئے یروشلم ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تینوں مذاہب کے لوگ چاہتے ہیں کہ یہاں آکر وہ روحانی تسکین حاصل کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب تینوں مذہبوں کے لئے وہ مقدس زیارت گاہ ہے تو کس طرح وہ تینوں کے لئے کھلا رہے اور کس طرح تینوں مذہب کے ماننے والوں کو یہ موقع حاصل رہے کہ وہ بہ آسانی وہاں پہنچ کر اپنے جذبات عقیدت کی تسکین حاصل کریں۔

آجکل ہر طرف القدس لنا کا نعرہ سنائی دیتا ہے۔ یہ نعرہ سیاسی مفہوم میں ہے اور ہر فریق یہ نعرہ لگا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ قدس یا یروشلم پر صرف اس کا قبضہ رہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک جب تک اس مقدس شہر پر اس کا سیاسی غلبہ نہ ہو وہ صحیح طور پر اپنا عبادتی عمل وہاں انجام نہیں دے سکتا۔

اگر اس مقدس مقام کی زیارت کی شرط یہ ہو کہ جو شخص یا گروہ یروشلم میں جائے اس کی قوم کا سیاسی قبضہ بھی وہاں قائم ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ شہر عملی طور پر عبادت کا مقام نہ رہے گا بلکہ جنگ کا میدان بن جائے گا۔ کیوں کہ کسی مقام پر سیاسی اقتدار بیک وقت کسی ایک مذہبی گروہ کا ہی ہو سکتا ہے۔ پھر بقیہ دو مذہبی گروہ جن کا سیاسی قبضہ وہاں نہ ہوگا وہ قابض گروہ کے خلاف جنگ چھیڑ دیں گے۔ اس طرح یہ مقام ابدی طور پر جنگ و جدال کا مرکز بنا رہے گا۔ اس بنا پر کسی کے لئے، حتی کہ قابض گروہ کے لئے بھی یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ پر سکون طور پر وہاں اپنا عبادتی عمل انجام دے سکے۔ یروشلم کے معنی ہی امن کا شہر (city of peace) کے ہیں۔ پھر کیونکر ایسا ہو کہ یروشلم کا امن ہر حال میں برقرار رہے تاکہ ہر فریق ہمیشہ اور یکساں طور پر اس کی زیارت کر سکے۔

جہاں تک اسلام کا سوال ہے، قرآن و حدیث میں یروشلم کے دو بالواسطہ حوالے ملتے ہیں۔ قرآن کی سورہ الاسراء میں معراج رسول کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے، تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں (الاسراء ۱)

روایات بتاتی ہیں کہ ہجرت سے پہلے غالباً ۶۲۲ء کے آغاز میں پیغمبر اسلام کو ایک غیر معمولی سفر کا تجربہ ہوا جس کو اسلام کی تاریخ میں اسراء اور معراج کہا جاتا ہے۔ اس سفر میں خدا کے غیبی اہتمام کے تحت آپ مکہ سے یروشلم پہنچے۔ یہاں آپ نے مسجد اقصیٰ میں باجماعت نماز ادا کی۔ واضح ہو کہ مکہ اور یروشلم کے درمیان ۸۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔

یروشلم کا دوسرا بالواسطہ حوالہ وہ ہے جو حدیث میں آیا ہے۔ البخاری، مسلم، ابو داؤد، النسائی، الترمذی، الموطا وغیرہ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لئے سفر کر کے جانا جائز ہے۔ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔ آخری مسجد کے لئے بعض روایات میں مسجد ایلیاء کا لفظ ہے یعنی فلسطین کی مسجد۔ دوسری روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان تین مسجدوں میں عبادت کرنے کا ثواب دنیا کی دوسری تمام مسجدوں سے بہت زیادہ ہے۔

ایک طرف یروشلم کی مسجد اقصیٰ کی یہ فضیلت ہے کہ اس میں عبادت کرنا مکہ اور مدینہ کی مسجد کے بعد

سب سے زیادہ افضل ہے۔ دوسری طرف قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے کسی خطہ پر سیاسی اقتدار کسی ایک ہی قوم کا قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہے گا۔ کبھی ایک قوم کے پاس اور کبھی دوسری قوم کے پاس۔ اس بات کو قرآن (آل عمران ۱۴۰) میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ـــــ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (وتلك الايام نداولها بين الناس)

اب سوال یہ ہے کہ جب عام قانون فطرت کے تحت یروشلم کا سیاسی اقتدار ابدی طور پر کسی ایک قوم کے پاس نہیں رہ سکتا تو اہل اسلام کے لئے مسجد اقصیٰ میں ہر دور میں عبادت کرنے کی صورت کیا ہو۔ ہر مسلمان فطری طور پر یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ اس مسجد میں داخل ہو کر سجدہ کرے جہاں پیغمبر اسلام نے اور دوسرے تمام نبیوں نے سجدہ کیا۔ اب اگر اس عبادت کو سیاسی اقتدار سے جوڑا جائے اور یہ کہا جائے کوئی مسلمان صرف اس وقت مسجد اقصیٰ میں عبادت کرنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے جب کہ اس علاقہ پر مسلمانوں کی حکومت بھی قائم ہو تو لیبنوں مسلمان، سابق سعودی حکمراں فیصل بن عبد العزیز کی طرح اپنے سینہ میں یہ تمنا لئے ہوئے مرجائیں گے اور اس قیمتی احساس کا تجربہ نہ کر سکیں گے کہ آج میں اس مقام پر خدائے برتر کے لئے سجدہ کر رہا ہوں جہاں پیغمبر اسلام نے تمام نبیوں کے ساتھ سجدۂ توحید ادا کیا۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ اس کا حل خود پیغمبر اسلام کی سنت میں موجود ہے۔ اس سنت کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ معاملہ کے سیاسی پہلو کو الگ رکھتے ہوئے اس کے عبادتی پہلو کو لے لینا۔ مسئلہ کو نظر انداز کر کے امکان کو استعمال کرنا۔ اس سنت کو ہم نے الفصل بين القضيتين کا نام دیا ہے۔ رسول اللہ کی یہ سنت حسب ذیل واقعات سے معلوم ہوتی ہے۔

۱. پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جولائی ۶۲۲ء میں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ یہاں آپ تقریباً ڈیڑھ سال (۶۲۳ کے آخر تک) بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور آپ کے صحابہ بھی اسی طرح عمل کرتے رہے۔ ۶۲۴ء کے آغاز میں قرآن (البقرہ ۱۴۴) میں یہ حکم اترا کہ اب تم لوگ کعبہ کو اپنا قبلۂ عبادت بنالو اور اسی طرف رخ کر کے تمام لوگ پنج وقتہ نمازیں ادا کرو۔

جب قبلہ کی تبدیلی کا یہ حکم اترا تو اسی کے ساتھ قرآن میں یہ حکم بھی اتارا گیا کہ اے مسلمانو، تم لوگ نماز اور صبر سے مدد لو (البقرہ ۱۵۳) صبر کا ایک عام مفہوم ہے۔ مگر اس موقع پر صبر کا ایک خاص مفہوم بھی تھا۔ وہ یہ کہ جس وقت کعبہ کو قبلۂ عبادت بنانے کا حکم اترا اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ عملاً کعبہ اس وقت شرک کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس طرح اہل ایمان کو ایک تکدر ہو سکتا تھا کہ ہم کیوں کر ایک موحدانہ عبادت کا قبلہ ایک ایسی عمارت کو بنائیں جو عملاً شرک اور بت پرستی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ حکم دیا گیا کہ اس پہلو کو صبر کے خانہ میں ڈال دو اور حکم کی تعمیل کرو۔

تاریخ کے مطابق، یہ حالت پورے چھ سال یعنی فتح مکہ تک قائم رہی۔ تحویل قبلہ کے بعد سے چھ سال تک مسلمان اس حال میں کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے کہ وہاں سیکڑوں بت موجود تھے اور وہ پوری طرح شرک کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ یہ صورت حال مکہ کی فتح کے بعد ختم ہوئی جب کہ بتوں کو کعبہ سے نکال دیا گیا۔

اس سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اس اصول کو الفصل بین القضیتین یا عدم الخلط بین الشیئین کہا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے تحت کعبہ اور اصنام کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ اصنام کی موجودگی پر صبر کرتے ہوئے کعبہ کو قبلۂ عبادت بنا لیا گیا۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا نمونہ اسراء اور معراج کے واقعہ میں ملتا ہے۔ پیغمبر اسلام کا سفر معراج ہجرت سے پہلے غالباً ۶۲۲ء میں ہوا۔ اس وقت یروشلم پر مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی۔ بلکہ وہاں مشرک ایرانیوں کا قبضہ تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۶۱۴ء میں ایرانی حکمراں خسرو پرویز نے یروشلم پر حملہ کیا اور اس کو رومیوں سے چھین لیا جو ۶۳ ق م سے اس پر قابض چلے آرہے تھے۔ ایرانی سلطنت کا سیاسی قبضہ ۶۲۹ء میں ختم ہوا جب کہ رومی حکمراں (Heraclius) نے ایرانیوں کو شکست دے کر دوبارہ یروشلم پر اپنا قبضہ بحال کیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل جس وقت اپنے سفر معراج میں یروشلم میں داخل ہوئے اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی اس وقت یروشلم پر ایک غیر مسلم بادشاہ خسرو پرویز کی حکومت تھی۔ اس سے یہ اہم سنت رسول معلوم ہوتی ہے کہ عبادت اور سیاست

کو ایک دوسرے سے مخلوط نہ کرنا چاہئے۔

۳۔ اس سنت نبوی کی تیسری مثال ہجرت کے بعد ۶۲۹ ء میں ملتی ہے۔ اس وقت مکہ مشرکین قریش کے قبضہ میں تھا۔ اس کے باوجود آپ اپنے اصحاب کے ساتھ تین دن کے لئے مکہ میں داخل ہوئے اور وہاں عمرہ کیا اور کعبہ کا طواف کیا۔ ایسا صرف اس لئے ممکن ہوا کہ آپ نے عبادتی معاملہ کو سیاسی معاملہ کے ساتھ مخلوط نہیں کیا۔ اگر آپ اس شرط کو ضروری سمجھتے کہ عمرہ کی عبادت اسی وقت کی جا سکتی ہے جب کہ مکہ پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا ہو تو آپ کبھی اپنے اصحاب کے ساتھ وہاں عمرہ کے لئے داخل نہ ہوتے۔

اس سنت رسول (الفصل بین القضیتین) کی روشنی میں یروشلم کے موجودہ مسئلہ کا حل یہ ہے کہ یروشلم پر سیاسی قبضہ کے مسئلہ کو مسجد اقصیٰ میں عبادت کرنے کے سوال سے الگ کر دیا جائے۔ مسلمان خواہ فلسطین کے ہوں یا بیرونی ملکوں کے، وہ آزادانہ طور پر یہاں آکر مسجد اقصیٰ میں اللہ کے لئے عبادت کریں۔ عبادت کو سیاسی اقتدار کے ساتھ مشروط اور مخلوط نہ کیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یروشلم کے مسئلہ کا واحد عملی حل یہ ہے کہ اس معاملہ میں الفصل بین القضیتین کے مذکورہ بالا اصول کو اختیار کر لیا جائے۔ یعنی کسی نزاعی معاملہ کے دو پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا۔ یہی یروشلم کے مسئلہ کا (بالخصوص موجودہ حالات میں) واحد قابل عمل حل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ یروشلم کے سیاسی پہلو کو اس کے مذہبی پہلو سے الگ رکھیں۔ تاکہ لوگوں کے لیے ان کی عبادت کی راہ میں کوئی نظریاتی رکاوٹ حائل نہ رہے۔ اور وہ ہر حال میں یروشلم جا کر آزادانہ طور پر اپنے عبادتی جذبہ کی تسکین حاصل کر سکیں۔

تاریخی فرق

یروشلم پر مسلمانوں کا قبضہ پہلی بار ۶۳۸ ء میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۰۹۹ء میں دوبارہ وہ مسیحیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۸۸ سال بعد ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ یروشلم پر مسلم قبضہ کو بحال کیا۔

اس طرح گیارھویں صدی اور بارھویں صدی کے درمیان تقریباً ۹۰ سال تک کا زمانہ

ایسا گزرا ہے جب کہ یروشلم غیر مسلموں کے سیاسی قبضہ میں تھا۔ یہ تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب کہ مذہبی آزادی کا دور ابھی نہیں آیا تھا۔ ہر طرف دنیا میں مذہبی جبر کا نظام رائج تھا۔ چنانچہ یروشلم پر مسیحی قبضہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کا وہاں داخلہ بھی عملاً بند ہو گیا۔ ایک عرصہ تک کے لئے مسلمان مسجد اقصیٰ کی زیارت سے محروم کر دئے گئے۔

مگر ۱۹۶۷ میں جب یروشلم یہودی قبضہ میں آیا تو زمانہ بالکل بدل چکا تھا۔ اب ساری دنیا میں مذہبی آزادی کو ہر فرد کا ناقابل تنسیخ حق مان لیا گیا تھا۔ یہ زمانی فرق اتنا طاقت ور تھا کہ یروشلم کے نئے حکمرانوں کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی عائد کر سکیں۔

تاہم مسلمان اس جدید امکان کو استعمال نہ کر سکے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ وہ زمانی فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ چنانچہ سابقہ روایت کے زیر اثر وہ یروشلم جانے سے رک گئے۔ نئی حکومت نے کبھی انھیں یروشلم جانے سے نہیں روکا۔ بلکہ اپنے خود ساختہ تصور کے تحت انھوں نے بطور خود وہاں کا سفر کرنا ترک کر دیا۔

عمومی انطباق

اوپر شریعت کا جو اصول (الفصل بین الفضیتین) بیان کیا گیا، اس کا تعلق صرف یروشلم یا بیت المقدس سے نہیں ہے۔ وہ ایک عام شرعی اصول ہے اور وہ زندگی کے ہر نزاعی مسئلہ پر چسپاں ہوتا ہے۔ حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس طرح اس شرعی اصول سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمان مسلسل طور پر ایک عظیم نعمت (مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر وہاں نماز ادا کرنا) سے محروم ہو رہے ہیں۔ اسی طرح وسیع تر اجتماعی زندگی میں اس اصول کو ملحوظ نہ رکھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں زبردست نقصان سے دوچار ہو رہے ہیں۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے ہر جگہ دینی اور دعوتی سرگرمیوں کے مواقع کھول دئے ہیں۔ مگر مسلمان ان قیمتی مواقع کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔ اس کا واحد سب سے بڑا سبب الفصل بین الفضیتین کے شرعی اصول کو ملحوظ نہ رکھنا ہے۔

اس اصول کا تقاضا تھا کہ مسلمان دینی پہلو اور سیاسی پہلو کو الگ الگ رکھتے۔ وہ سیاست کو اس کے مخصوص دائرہ میں رکھتے ہوئے دینی اور دعوتی امکانات کو بھرپور طور پر استعمال کرتے۔

گر وہ ہر جگہ مکمل اسلامی انقلاب کے نام پر سیاسی حکمرانوں سے ٹکرا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور جدید کے بہترین امکانات استعمال ہونے سے رہ گئے اور مسلمانوں کے حصہ میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ آیا۔

مسلمانوں کے ایک طبقہ میں آجکل ایک جملہ بہت دہرایا جارہا ہے: الاسلام دین ودولة۔ یعنی اسلام مذہب بھی ہے اور حکومت بھی۔ اسی پس منظر میں ایک بیرونی سفر میں کچھ عرب نوجوانوں نے مجھ سے سوال کیا کہ مذہب اور حکومت کی علیحدگی کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے (ما رأيك عن الفصل بين الدين والدولة)

میں نے کہا: اما كعقيدة فلا، واما كضرورة عملية فنعم۔ یعنی عقیدہ کے طور پر تو دونوں میں کوئی فصل نہیں، مگر عملی ضرورت کے طور پر یقیناً دونوں میں فصل ہوتا ہے۔

عقیدہ یا نظریہ ہمیشہ آئیڈیلزم کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک عملی کورس کا تعلق ہے وہ ہمیشہ وقت کے حالات وضروریات کے تابع ہوتا ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے جو کسی استثناء کے بغیر زندگی کے تمام معاملات سے متعلق ہے۔ اور اسی طرح اس کا تعلق اسلام سے بھی ہے۔ اعتقادی طور پر بلاشبہ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں شامل ہیں۔ مگر جب عمل کا منصوبہ بنانا ہو تو وقت کے حقیقی حالات کو ملحوظ رکھنا لازمی طور پر ضروری ہوگا۔

عقیدہ اور عمل کے اسی فرق کی بنا پر اسلام میں کسی قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کو حرام قرار دیا گیا ہے، خواہ وہ حکومت بظاہر غیر اسلامی ہو، اور خواہ اس کے خلاف سیاسی اقدام کرنے والے بظاہر اسلام کے دعاوی کو لے کر اٹھے ہوں۔ کیوں کہ عملی نتیجہ کے اعتبار سے اس قسم کا اقدام فتنہ اور ظلم میں اضافہ کا سبب بنے گا۔ وہ اس کو ختم کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

یہ ناموافق عملی حالات مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ حکومت اتنی طاقت ور اور مستحکم ہو کر دکھائی دیتا ہو کہ وہ اسلام کے علمبرداروں کو کچل ڈالے گی۔ حتی کہ وہ ایسے انقلابیوں کی پیدائش کو روکنے کے لئے مسجد، مدرسہ، صحافت، تعلیمی نظام اور دوسرے تمام اداروں پر اپنا سخت کنٹرول قائم کر کے ملے ہوئے مواقع کا بھی خاتمہ کر دے گی۔ اس کا جو ظلم پہلے مخصوص دائرہ تک محدود تھا، وہ عمومی طور پر پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اس نوعیت کے تباہ کن اقدامات کی مثالیں کشمیر، چیچنیا، بوسنیا، برما، فلپائن، مصر، الجزائر وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان علاقوں میں اسلام کے نام پر جو عملی اقدام کیا گیا وہ صرف تباہی میں اضافہ کا سبب بنا۔ وہ کسی بھی اسلامی نتیجہ تک پہنچانے والا ثابت نہیں ہوا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاشرہ میں قبولیت کا مادہ نہ پایا جاتا ہو۔ اس لئے بظاہر عملی کامیابی کے باوجود تمام قربانیاں بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں۔ اس معاملہ کی مثالیں پاکستان اور افغانستان اور ایران میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان ملکوں میں ہنگامہ خیز اقدامات کے ذریعہ سیاسی تبدیلی لائی گئی۔ تاکہ مذہب اور حکومت کو ایک کیا جاسکے۔

مگر حقیقی نتیجہ کیا ہوا۔ جب سیاسی تبدیلی وقوع میں آچکی تو معلوم ہوا کہ مذہب اور سیاست کی یکجائی والا مطلوب نظام بنانا ممکن ہی نہیں۔ کیوں کہ معاشرہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ پاکستان اسی قسم کے نعرہ پر بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہاں خود غرضی، مادہ پرستی اور باہمی جھگڑوں کا راج قائم ہو گیا نہ کہ اسلام کا راج۔ اسی طرح افغانستان میں بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ سیاسی حکمرانوں کو بدلا گیا۔ مگر جب سیاسی نشانہ حاصل ہو چکا تو اس کے بعد جو ہوا وہ یہ تھا کہ افغانستان کے مختلف قبائلی لیڈر آپس میں لڑ کر پورے ملک کو تباہ کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ اسی طرح ایران میں عالمی شور وغل کے تحت سیاسی تبدیلی لائی گئی۔ اس تبدیلی کو ایک عرصہ تک پروپگنڈے کے زور پر اسلامی ثابت کیا جاتا رہا۔ مگر جب پروپگنڈے کا زور گھٹا تو معلوم ہوا کہ ایران میں چونکہ مطلوب انداز کا معاشرہ تیار نہ تھا اس لئے نام نہاد انقلاب نے ملک کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

یہ مثالیں خلیفہ چہارم حضرت علی کے ایک قول کو یاد دلاتی ہے۔ ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی دنیا میں زبردست خلفشار برپا ہو گیا۔ ان سے کسی نے کہا کہ ابو بکر و عمر کے زمانہ میں مسلم دنیا کے حالات درست تھے، آپ کے زمانہ میں حالات بگڑ گئے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ حضرت علی نے جواب دیا: ان ابا بکر و عمر کانا والیین علیٰ مثلی وانا والٍ علیٰ مثلکم (ابو بکر و عمر میرے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم تھے، میں تمہارے جیسے لوگوں کے اوپر حاکم ہوں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ جیسے حکمراں ہوں تب بھی ضروری ہے کہ معاشرہ میں امثال علی بڑی

تعداد میں موجود ہوں۔ اگر معاشرہ میں علیؓ جیسے افراد نہ ہوں تو صحابی کی حکومت کے باوجود حقیقی معنوں میں کوئی بہتر نظام قائم کرنا ممکن نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین اور حکومت دونوں اگرچہ اعتقادی طور پر ایک ہیں مگر عملی تقاضے کے تحت دونوں کو الگ الگ دیکھنا ہوتا ہے۔ ایک حصہ دین کا وہ ہے جس کی تعمیل فرد کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ ایسے احکام ہر وقت ہر فرد پر فرض رہیں گے۔ افراد کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہر حال میں اس کی تعمیل کریں۔

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو عمل میں لانے کا انحصار اجتماعی حالات اور اجتماعی مرضی پر ہوتا ہے۔ احکام دین کے اس دوسرے حصہ میں پہلے اس کے موافق اجتماعی ارادہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

"اسلام میں دین اور سیاست ایک ہیں" کا نعرہ لگا کر اگر کوئی شخص پہلے ہی مرحلہ میں اجتماعی قوانین کے نفاذ کی مہم چلائے۔ یا حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ بااقتدار ہو کر اجتماعی قوانین کو نافذ کر سکے، تو ایسے اقدامات سراسر غیر اسلامی اور غیر مطلوب ہوں گے۔ ایسا ہر اقدام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد پیدا کرنا ہے نہ کہ احکام اسلامی کا نفاذ کرنا۔

عقیدہ اور عمل میں برائے ضرورت تفریق کا یہ معاملہ کسی نہ کسی اعتبار سے سارے اسلامی احکام میں پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ اور حج کو عقیدہ کے اعتبار سے فرض سمجھے۔ مگر ان کی عملی ادائیگی کی ذمہ داری صرف اس شخص کے اوپر ہے جو اس کی عملی شرطوں پر پورا اترتا ہو۔ اس لئے الفصل بین الفضیتین کی حکمت سارے ہی دینی معاملات میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ مصائب اور مشکلات کا شکار ہیں۔ وہ اس کی ذمہ داری دشمنان اسلام کے اوپر ڈال رہے ہیں جنھوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ انھیں اس حالت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ حتی کہ وہ خود اسلام کی تردید ہے۔ کیوں کہ قرآن وحدیث کے مطابق، خدا اہل ایمان کا مددگار ہوتا ہے۔ پھر کیوں کر ایسا ممکن ہے کہ اہل کفر اہل اسلام کو اپنی سازشوں کا نشانہ بنائیں اور خدا اہل اسلام کی حمایت نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان آج جن مشکل حالات میں گھر گئے ہیں وہ یقینی طور پر مصنوعی ہیں۔ یہ الفصل بین القضیتین کی سنت رسول کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے بطور خود یہ نظریہ بنایا کہ جب تک سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو اس وقت تک دین پر بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ اس غلط مفروضہ کی بنا پر ہر جگہ انھوں نے غیر ضروری طور پر سیاسی حکمرانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہترین دینی امکانات استعمال ہونے سے رہ گئے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ مسلمانوں کا ترقی کا سفر رک گیا ہے۔ مسلمان آج یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا راستہ ہر طرف سے بند ہے۔ مگر اس دنیا میں کبھی کسی گروہ کے لئے راستہ بند نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اوقات وہ گروہ خود اپنی نادانی سے اپنا راستہ بند کر لیتا ہے۔

یہی آج مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ مسلمان مذکورہ سنت رسول پر عمل نہ کر سکے۔ انھوں نے دین کے معاملہ کو سیاسی اقتدار کے معاملہ سے الگ نہیں کیا۔ وہ ہر جگہ حکمراں طبقہ سے ٹکرا گئے۔ کیوں کہ انھوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا کہ جب تک اقتدار پر قبضہ نہ ہو، دین کے اوپر مکمل طور پر عمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بلاشبہ ایک وسوسہ ہے نہ کہ کوئی دینی حقیقت۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دینی معاملہ کو سیاسی اقتدار کے سوال سے الگ کر دیں۔ اور اقتدار کی تبدیلی سے پہلے جو مواقع انھیں حاصل ہیں، ان کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔ اس حکمت نبوی پر عمل کرتے ہی وہ دیکھیں گے کہ ان کے لئے تمام دروازے کھل گئے ہیں، زندگی کا کوئی بھی دروازہ ان کے اوپر بند نہیں۔

درجن سے زیادہ سوال کئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ میں ہر سوال کا جواب انگریزی میں دیتا تھا اور ڈاکٹر اندریا دلوکا اس کو اطالوی زبان میں کہتے تھے۔ لوگوں نے اس پروگرام سے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

مندوبین میں میرے اور ثانی اثنین کے سوا سب کے سب عیسائی تھے۔ ان کے سوالات سب کے سب وہ تھے جو غیر مسلم کے ذہن میں اسلام کے بارہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لوگوں کے تاثر سے اندازہ ہوا کہ اللہ کی توفیق سے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب ان کو ملا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں روزانہ کی عبادت کیا ہوتی ہے۔ میں نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے کیا کبھی کسی مسلمان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ سب نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے نماز کا مختصر تعارف کرایا اور اس کے بعد اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایک رکعت مکمل طور پر عملی صورت میں ادا کی۔

ایک خاتون نے کہا کہ اسلام نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک عورت اور احترام اور حقوق کا تعلق ہے تو اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ یکساں ہے۔ البتہ دونوں میں حیاتیاتی فرق کی بنا پر دونوں کا ورک پلیس الگ الگ رکھا گیا ہے۔ مزید سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے حج کی مثال دی۔ میں نے کہا کہ حج کا ایک رکن صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا ہے۔ یہ دوڑ ایک عورت کے طریقہ کی پیروی ہے۔ تمام حاجی خواہ وہ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا، سب کے سب یہاں عورت کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "عورت پہلے" کے اصول کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شاندار انداز میں اسلام میں قائم کیا گیا ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ انڈیا میں مسلمانوں کا حال کیسا ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمان آزاد ہیں اور وہاں ہر قسم کی اسلامی سرگرمیاں آزادانہ طور پر جاری ہیں کسی بھی اسلامی معاملہ میں کوئی پابندی نہیں۔

مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ نے شاید بابری مسجد کو ڈھائے جانے کا قصہ اخبار میں پڑھا ہو۔ کیوں کہ میڈیا نے اس کا بہت زیادہ پرچار کیا۔ مگر یہی کل بات نہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر بھی موجود رہتا ہے۔ یعنی

ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ یہاں ایڈوانٹج بھی ضرور پایا جائے گا۔ اور انڈیا یقینی طور پر کوئی مستثنیٰ ملک نہیں۔ چنانچہ انڈیا میں اگر ایک بابری مسجد ڈھائی گئی ہے تو اس کے بعد بھی انڈیا میں ساڑھے تین لاکھ مسجدیں باقی ہیں۔ اور وہاں پوری آزادی کے ساتھ عبادت کا عمل کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا میں اگر ایک عسر ہے تو عین اسی وقت وہاں یسر کی تعداد ساڑھے تین لاکھ ہے۔ اس لئے ہمارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

مرکز کے اس اجتماع میں ایک اطالوی نوجوان بھی موجود تھا۔ ان سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی وہ سائنس کے مضمون میں پوسٹ گریجویٹ کا کورس کر رہے ہیں۔ وہ ایک سادہ فطرت نوجوان تھے۔ اسلام سے کچھ واقفیت ہوئی۔ اس سے وہ متاثر ہو گئے۔ اب وہ اسلام کے برحق ہونے پر پوری طرح مطمئن ہیں۔ ان کے کمرہ میں اسلامی کتابیں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

وہ ابھی تک اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ماں کٹر مسیحی ہیں۔ ان کے اندر تڑپ ہے کہ وہ باقاعدہ نماز ادا کریں۔ انھیں اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے نماز پڑھنا شروع کیا تو ان کی ماں سخت ناراض ہوگی اور پھر اس کے بعد انھیں غیر معمولی مشکلات پیش آئیں گی۔

کسی مسلمان سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کا کیس سننے کے بعد کہا کہ جب آپ اسلام کو اپنا مذہب مان چکے ہیں تو اب تمہارے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے ورنہ تم جہنم میں جاؤ گے۔

وہ نوجوان اس سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ مجھ سے گفتگو ہوئی تو میں نے کہا کہ مذکورہ مسلمان نے آپ کو غلط بتایا۔ قرآن میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان کے اوپر بقدر استطاعت ذمہ داری ہے۔ آپ کو جب موقع ہو پردہ میں نماز پڑھ لیں۔ مگر اعلان کے ساتھ آپ نماز نہ پڑھیں۔ فی الحال سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے لئے اس قسم کا مسئلہ نہیں رہے گا۔

مذکورہ قسم کے مسلمانوں کے بارہ میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ وہ مسائل فقہ کو جانتے ہیں۔ مگر وہ مسائل دعوت کو نہیں جانتے۔

مغرب کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان بودساموت الحسین (۱۹۶۴) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا اصل

نام الحسین ہے اور بود ساموت خاندانی لقب ہے۔ دوسرے ملکوں میں خاندانی نام آخر میں ہوتا ہے اور مغرب میں فرانس کے اثر سے پہلے لکھا جاتا ہے۔ جیسے کہ میرا نام وحید الدین خان لکھا جاتا ہے۔ مغرب کے اصول پر لکھنا ہو تو اس کو خان وحید الدین لکھا جائے گا۔

بود ساموت الحسین بولونیا میں رہتے ہیں جو میلان سے تین سو کیلو میٹر دور اٹلی کا ایک شہر ہے۔ پچھلی شام کو انھوں نے ٹی وی پر مجھ کو گورباچیف سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا۔ اس سے انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت میں میلان میں ہوں۔ وہ رات کو سفر کر کے صبح سویرے میلان پہنچے۔ اور ہوٹل میں مجھ سے ملاقات کی۔

انھوں نے بتایا کہ میں اطالویوں میں دعوت کا کام کر رہا ہوں۔ مگر اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان ہیں۔ نام نہاد مسلم جماعتوں کے لوگ یہاں ہر شہر میں موجود ہیں۔ وہ صرف ایک کام میں مشغول ہیں۔ مسلم حکمرانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات ابھار کر مال جمع کرنا اور لیڈری حاصل کرنا۔ خالص دعوت کے کام کو وہ پسند نہیں کرتے کیوں کہ اس میں انھیں اپنی جڑ کٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں بہت سے لوگ حق کے متلاشی ہیں۔ مگر وہ ان کے لئے ہدایت کا دروازہ بند کر رہے ہیں (وبھٰذا المنھج المنحرف یتم اغلاق ابواب الھدایۃ عوض فتحھا امام الباحثین عن الحق، وما أکثرھم)

میں نے کہا کہ آپ نے صحیح کہا۔ اسلامی تحریکات کے نام پر آجکل جو جماعتیں ہر جگہ کام کر رہی ہیں وہ اپنے منحرف فکر کی بنا پر صحیح اسلام کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔ مگر آپ جیسے لوگوں کے لئے مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ دشواریوں کے اضافہ سے اجر میں اضافہ ہوتا ہے (مع کثرۃ العراقیل یزداد الاجر)

ایک پروگرام میں شنتو مذہب کے عبادتی پروگرام کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک شخص سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ باندھے۔ اس کے بعد وہ چند بار رکوع کے انداز میں جھکا۔ اس کے بعد چھوٹی سی کتاب لے کر اس سے پڑھنا شروع کیا۔ غالباً یہ دعا کی کتاب تھی۔

دوسرے مذاہب کی عبادت میں جھکنا ہے مگر سجدہ نہیں ہے۔ جھکنا اطاعت کی علامت ہے اور سجدہ قربت کی علامت۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی عبادتیں اطاعت کا سبق دیتی ہیں مگر

وہ آدمی کو قربت خداوندی کا تجربہ نہیں کراتیں۔ یہ اسلام کی خاص صفت ہے، جیساکہ قرآن میں کہا گیا ہے و اسجد و اقترب۔

۲۲ ستمبر کی صبح کو اٹالین ٹی وی نے انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق انڈیا میں اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کے مواقع موجود ہیں۔ اخباروں میں جو باتیں آتی ہیں وہ حقیقت سے زیادہ مبالغہ ہیں۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اجودھیا کی مسجد مسلمانوں نے کھودی۔ مگر عین اسی زمانہ میں دہلی میں دو درجن مسجدیں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھیں اور ان مسجدوں کو مسلمان دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس فرق کا سبب طریق کار کا فرق ہے۔ اجودھیا میں مسلم لیڈروں نے اپنی تحریک ٹکراؤ کے انداز میں چلائی اور دہلی کی مسجدوں کو واگزار کرانے کی تحریک پرامن انداز میں چلائی گئی طریق عمل کے اسی فرق کی وجہ سے مسلمانوں نے اجودھیا کی مسجد کھودی۔ اور دہلی کی مسجدوں کو حاصل کرلیا۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن جدید دنیا کے لئے "ایک خدا اور ایک انسان" کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف آدمی کو صحیح ڈائرکشن دیتا ہے، اور دوسری طرف تمام انسانوں کو یکساں بنیاد پر متحد کرتا ہے۔

میلان میں ایک اور پرائیویٹ ٹیلیویژن (Tele Chiara) نے انٹرویو لیا۔ یہ کیتھولک ٹی وی کہا جاتا ہے۔ اس کا پورا نام یہ ہے:

Gestione Telecomunicazioni S.R.L.

انھوں نے مختلف سوالات کئے۔ میں نے انگریزی میں جواب دیا جس کا ترجمہ ڈاکٹر اندریا دلوکا (روم) اطالوی زبان میں کرتے رہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ پیس کانفرنس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ عالمی پراسس کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں ایک پراسس جاری ہوا ہے۔ ساری دنیا جنگ اور ٹکراؤ کے راستہ کو چھوڑ کر امن کے راستہ کی طرف جا رہی ہے۔ یہ ایک عالمی پراسس ہے جو انسانی تاریخ میں جاری ہوا ہے۔ موجودہ کانفرنس اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کا پراسس جب تاریخ میں جاری ہو جائے تو لازمی طور پر وہ اپنے نتیجہ تک پہنچ کر رہتا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں مشکلات کو چیلنج کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اسی لئے مجھے مشکلات کو دیکھ کر پریشانی نہیں ہوتی۔ قدرت نے ہماری ترقی کے لئے یہی راستہ مقرر کیا ہے۔ چیلنج نہیں تو ترقی بھی نہیں۔

میلان میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور میں وینس (Venice) میں رہتا ہوں۔ انھوں نے اپنا نام ——— ایلی مینا ٹو دی الّا (illuminatto de Alla) بتایا۔ یہ نام مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ یہ اصل نام کا اطالوی زبان میں ترجمہ ہے۔ میرا اصل نام ظہور احمد ہے۔

نام کے ترجمہ کا یہ طریقہ بہت عجیب ہے۔ یہ خطرناک بھی ہے۔ کیوں کہ چند نسلوں کے بعد ایسے لوگوں کا تشخص ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ اسی کلچر میں ضم ہو جائیں گے جس کے زیر اثر انھوں نے اپنے نام کا یہ ترجمہ کیا تھا۔

۲۲ ستمبر کی شام کا کھانا "بشپ ہاؤس" میں تھا۔ یہ ایک محل نما عمارت ہے جو کئی سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس میں بشپ کی رہائش گاہ اور اس کے دفاتر واقع ہیں۔

۲۳ ستمبر کو میلانو سے واپسی تھی۔ فجر کی نماز یہاں کے ہوٹل میں پڑھی اور صبح سات بجے اپنے کمرہ سے نکلا۔ اس وقت بے اختیارانہ طور پر زبان پر یہ دعا جاری ہوگئی اَللّٰهُمَّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَاناً نَصِيراً

میلانو ایر پورٹ پر پہنچنے میں بعض اتفاقی اسباب سے دیر ہوگئی۔ ہماری فلائٹ روانہ ہوگئی اور ہم اس پر سوار نہ ہو سکے۔ دوسری فلائٹ میں ہمارا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا۔ وہ بھی نہ مل سکی۔ آخر تین گھنٹہ کی تاخیر سے تیسری فلائٹ لی گئی۔ اب یہ سوال تھا کہ لندن میں جو لوگ ہماری رہنمائی کے لئے آنے والے تھے ان سے ہم کیسے مل سکیں گے۔ اس احساس کو لئے ہوئے ہم برٹش ایرویز کی فلائٹ ۲۳/۵۶۵ کے ذریعہ لندن ایر پورٹ پر اترے تھے۔

میلان سے لندن کے راستہ میں لندن کا اخبار ٹائمس (The Times) کا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس شمارہ کے ساتھ ۱۶ صفحہ کا تین رنگ میں چھپا ہوا ضمیمہ شامل تھا جس کا نام سعودی عرب (Saudi Arabia) تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پچھلے چند برسوں کے حالات کے نتیجہ میں

سعودی عرب میں "ماڈرنائزیشن" کا عمل تیزی سے جاری ہوگیا ہے جو یہاں کے ہر شعبہ میں محسوس طور پر نظر آتا ہے۔ ایک مضمون کا عنوان تھا:

Arabs count the cost of peace.

اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۹۷۹ میں ایران کے "اسلامی ریولیوشن" کے بعد سعودی عرب پہلے سے زیادہ امریکہ پر (dependent) ہوگیا۔ کیوں کہ اس انقلاب کے بعد ایران اسلامک ورلڈ کی لیڈرشپ حاصل کرنے کے لئے سعودیہ کا حریف بن گیا تھا۔ اب ویسٹرن ٹکنالوجی کے لئے ریاض کی ضرورت بہت بڑھ گئی۔ سعودی عرب ساری دنیا کے مسلمانوں کو بہت بڑی مالی امداد دیتا ہے۔ ۱۹۹۲ میں سعودیہ نے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ۸۰۰ ملین پونڈ دئے۔ عراق۔کویت جنگ میں سعودیہ نے ۳۷ بلین پونڈ خرچ کیا۔

سعودیہ نے اس سے پہلے عراق کی بڑے پیمانہ پر مالی مدد کی تھی۔ مگر ۱۹۹۲ میں جب سعودیہ پر عراقی میزائل (scud missiles) گرنے لگے تو معلوم ہوا کہ پیسہ اچھے تعلقات کے لئے کافی نہیں۔

اردن اور پی ایل او کو سعودی عرب سے بہت بڑی مالی امداد مل رہی تھی۔ مگر دونوں نے عراق کا ساتھ دیا۔ یمن کا بہت بڑا اقتصادی انحصار سعودی عرب پر تھا مگر وہ بھی عراق کا ساتھی بن گیا۔ اس پورے علاقہ میں ایران کا خطرہ ایک مستقل مسئلہ تھا۔ ان چیزوں نے سعودی عرب کو اس قطعی رائے تک پہنچا دیا کہ وہ عربوں یا مسلم ملکوں کے مقابلہ میں مغربی ٹکنالوجی کے ذریعہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ بنا سکتے ہیں۔

مغربی پریس کتنی مہارت کے ساتھ چیزوں کو پیش کرتا ہے، اس کی ایک مثال ٹائمس کا صفحہ ۴ کا ایک مضمون تھا۔ اس مضمون کے اوپر ایک تصویر دی گئی تھی جس کو ہم اس صفحہ کے نیچے نقل کر رہے ہیں۔ فلسطین کے ایک بے حد چھوٹے سے علاقہ میں اسرائیل نے فلسطینیوں کو محدود آزادی (limited autonomy) کا حق دیا ہے۔ یہاں فلسطینیوں نے ایک سرحدی دیوار پر جلی حرفوں میں یہ لکھ دیا ہے: پی ایل او کی مملکت میں خوش آمدید۔ اس کے ساتھ کیپشن میں لکھا ہوا تھا کہ شرق اوسط کی تاریخ کے ایک نازک موقع پر، تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں اور خلیج کی جنگ کی قیمت نے سعودیوں اور فلسطینیوں کو نوشتۂ دیوار پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

فلسطینی سمیت پوری مسلم دنیا ستمبر ۱۹۹۳ سے پہلے فلسطین سے اسرائیلی حکومت ختم کرنے سے کم کسی بات کو سننے پر راضی نہ تھی۔ مگر آج اس کے محدود ٹکڑے پر وہ خوش آمدید کے الفاظ رقم کر رہے ہیں۔ شعوری فیصلہ کے تحت وہ حقیقت پسندی کو اختیار نہ کر سکے۔ مگر حالات کے دباؤ نے انھیں حقیقت پسندی کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہی ساری دنیا میں مسلمانوں کا حال ہے۔ فیصلہ صرف وہ ہے جو شعور اور ارادہ کے تحت ظہور میں آیا ہو۔ دباؤ کے تحت کیا جانے والا فیصلہ کوئی فیصلہ نہیں۔ اور نہ ایسے فیصلہ کا کوئی دور رس نتیجہ کبھی برآمد ہو سکتا ہے۔

۲۳ ستمبر کو دو بجے لندن پہنچا۔ جہاز سے اتر کر ایئر پورٹ پر چلتے ہوئے ایک جگہ تین دروازے بنے ہوئے تھے۔ دو دروازوں پر لکھا ہوا تھا:

European Community Nationals

اور ایک کنارے کے دروازہ پر یہ الفاظ تھے:

All other passports

یہ صرف گزرگاہ کے لئے تھا۔ انتظامی ضرورت کے تحت ایسی تقسیم میں کوئی حرج نہیں مگر مجرد گزرگاہ کے لئے یہ تقسیم racism کی طرف لے جاتی ہے۔

جس فلائٹ سے ہمیں لندن پہنچنا تھا چوں کہ وہ میلان میں چھوٹ گئی اور ہم دوسرے جہاز سے لندن پہنچے۔ اس لئے لندن ایئرپورٹ پر جو لوگ ہماری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ ان سے کس طرح ربط قائم کیا جائے۔ ہم نے برمنگھم میں جناب شمشاد خاں صاحب کو خبر دی کہ ہم لندن ایئرپورٹ پر ہیں۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لندن کے ساتھیوں نے بھی شمشاد خاں صاحب سے برائے معلومات ربط قائم کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لندن ایئرپورٹ پر پہنچ چکے ہیں۔ چنانچہ وہ دوبارہ ایئرپورٹ پر آئے اور آگے کے لئے ہماری رہنمائی کی۔ کیوں کہ ہمیں بذریعہ ٹرین وگن پہنچنا تھا۔

۲۳ ستمبر کی دوپہر کو، ہم برٹش ریلوے اسٹیشن ایوسٹن (Euston) پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ٹرین جلد ہی آنے والی تھی جس کے ذریعہ ہمیں وگن جانا تھا۔ اتنے میں پولیس کی وردی میں کلی

آدمی ظاہر ہوئے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ آپ لوگ اسٹیشن چھوڑ دیں۔ تمام لوگ اپنا سامان لے کر باہر آگئے۔ پولیس والے مزید ان کو دور جانے کی ہدایت کرتے رہے۔ آخر کار دور کے ایک فاصلہ پر سب لوگ جمع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کسی نے ٹیلیفون پر بم کی اطلاع کر دی۔ کچھ دیر کے بعد پولیس والوں نے ہری جھنڈی دکھائی اور تمام لوگ دوبارہ اسٹیشن کے اندر آگئے۔ تاہم اس درمیان میں ہماری پہلی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔

اکثر افواہیں غلط ہوتی ہیں۔ یہ بار بار کا تجربہ ہے۔ اس کے باوجود ہر افواہ پر لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ ہر افواہ کو صحیح گمان کر لیتے ہیں۔

میں اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک روشن بورڈ پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا ــــ کیا آپ کا مقصد بزنس میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ اس وقت آپ اپنے نشانہ سے صرف دو سو میل کے فاصلہ پر ہیں :

Aiming for business success?
Right now you're about 200 miles off target.

ڈگن میں میرا قیام ایک عرب نوجوان کے مکان پر تھا۔ یہ مکان انھوں نے ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا تھا۔ یہاں نصف درجن نوجوان جمع تھے۔ ان کے ساتھ دن اور رات کو مجلس کی صورت میں گفت گو ہوتی رہتی تھی۔ گفتگو کی صورت یہ تھی کہ میں اپنی بات عربی میں کہتا تھا جس کو وہ لوگ بیک وقت ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ کرتے رہتے تھے اور ساتھ ہی کاغذ پر لکھتے جاتے تھے۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد میں ان کی لکھی ہوئی تحریر کو سنتا تھا۔ اگر اس میں کوئی تعبیری فرق ہوتا تو اس کو درست کر دیتا۔ اس طرح یہ سلسلہ ۲۳ ستمبر کی شام سے آخر وقت تک مسلسل جاری رہا۔

اس درمیان بہت سی دینی و ملی و تاریخی باتیں زیر بحث آئیں۔ کثیر تعداد میں سوالات ہوئے جن کا جواب میں دیتا رہا۔ خود میرے پاس تو اس کا ریکارڈ موجود نہیں مگر ان عرب نوجوانوں کے پاس تمام چیزوں کا مکمل ریکارڈ ٹیپ یا تحریر کی صورت میں موجود ہے۔ وہ لوگ ان کو دوبارہ مرتب کر کے دوسرے عرب نوجوانوں تک پہنچائیں گے۔ ان ملاقاتوں میں میری خاص کوشش یہ رہی کہ دور جدید کے اعتبار سے اسلام کو واضح کروں اور لوگوں کو یہ بتاؤں کہ اسلام

کا اصل اقدامی عمل دعوت ہے۔

وگن (Wigan) برطانیہ کا ایک شہر ہے جو گریٹر مانچسٹر میں شامل ہے۔ وہ دریائے ڈگلس کے کنارے واقع ہے۔ وہ رومن عہد میں ۱۱۰۰ء میں بنایا گیا۔ اٹھارویں صدی میں صنعتی دور کا آغاز ہوا تو اس کے بعد وگن کو کافی ترقی ہوئی۔ یہاں کوئلہ اور کپاس اور لوہے کی صنعتیں قائم ہوئیں۔

مغرب کا فیملی اسٹرکچر ہندستان کے فیملی اسٹرکچر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کا بچہ "ہم" کی اصطلاح میں سوچتا ہے، جب کہ مغرب کا بچہ "میں" کو جانتا ہے۔ مغرب کے بچہ کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں:

'I' am the only one who matters.

مغرب کا پورا ماحول اسی آزادانہ انفرادیت کا مبلغ ہے۔ آزادی یا انفرادیت بذات خود غلط نہیں۔ مگر ہر چیز اپنی حد سے تجاوز کرنے کے بعد غلط ہو جاتی ہے۔ اور مغرب اس معاملہ میں آخری حد سے بھی زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔ بظاہر حالات مستقبل قریب میں اس کی واپسی کا امکان نہیں۔

مغربی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان کی تعداد تقریباً ۱ ملین ہے۔ ان میں سے نصف تعداد یورپ میں ہے اور نصف تعداد شمالی امریکہ میں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ کے اکابر نے اس نام پر قربانی دی کہ مغرب ہمارا دشمن ہے۔ اس کو مسلم ملکوں سے نکالنا ضروری ہے۔ مگر بے شمار قربانی کے بعد جب ان مغربی قوموں کا سیاسی اخراج ہو گیا تو ان اکابر کی اگلی نسل خود ہی دوڑ کر اہل مغرب کے ملکوں میں جا بسی۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کے اکابر غلط تھے یا آپ لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ وہ صاحب دونوں ہی کو صحیح ثابت کرتے رہے۔ یہی دو طرفہ سوچ ہے جو صحیح تفکیر میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اعتراف صحیح تفکیر کی لازمی شرط ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کا حوصلہ نہیں، وہ تفکیر صحیح سے بھی یقینی طور پر محروم رہے گا۔

ایک صاحب نے کہا کہ مغرب والوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انھیں ہر چیز میں اول (first in everything) بنے رہنا ہے۔ اس اسپرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے انھیں طاقت ور حریف (strong opponent) کی ضرورت ہے۔ پہلے کمیونزم یہ کام کر رہا تھا۔ اب کمیونزم کے خاتمہ کے بعد انھوں نے اسلام کو اپنا حریف بنا لیا ہے۔ اب وہ اسلام کا فرضی یا حقیقی خطرہ بتا کر مذکورہ اسپرٹ

کو اپنے لوگوں میں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر بالفرض ایسا ہو تو یہ وہی ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان ان سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان والے ہندستان کے خطرہ پر اپنے قومی جذبہ کو زندہ کئے ہوئے ہیں۔ عرب دنیا صہیونی خطرہ کو اپنی حیات قومی کی بنیاد بنائے ہوئے ہے۔ ہندستان کے مسلمان ہندو خطرہ کے نام پر جی رہے ہیں۔ اسی منفی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ سلمان رشدی یا بوسنیا کا مسئلہ ان کو متحد کر سکتا ہے مگر کوئی مثبت چیز انھیں متحد نہیں کرتی :

Salman Rushdie or Bosnia might bring them together, but not something positive.

۲۴ ستمبر کو وگن میں عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو عرب ممالک بہت بڑے پیمانہ پر مالی مدد دے رہے ہیں۔ حالاں کہ ان کے انقلابی نظریات ملوکیت کے سراسر خلاف ہیں۔ پھر یہ ملک کیوں ایسا کرتے ہیں۔ ایک عرب نوجوان نے کہا : لماذا البلاد العربية تدعم هذه الحركات. لان البلاد العربية تريد ان تحتوي هذه الحركات لتتجنب خطر هذه الحركات۔

میں نے کہا : گویا کہ یہاں عرب ملکوں اور ان تحریکوں کے درمیان ایک خاموش انڈر سٹینڈنگ ہے۔ تم ہم کو مال دیتے رہو، ہم تم سے ٹکراؤ نہیں کریں گے۔

مغربی یورپ میں نسلی امتیاز کی برائی پہلے سے موجود ہے۔ اب وہ مزید شدت کے ساتھ زندہ ہو رہی ہے۔ خاص طور پر جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں اس کی لہر زیادہ تیز ہے۔ نوآبادیاتی دور میں ان ملکوں میں بڑی تعداد میں ایشیائی اور افریقی باشندے بطور مزدور لے جائے گئے تھے۔ وہ لوگ وہیں آباد ہو گئے اور اب وہ وہاں کے شہری بن چکے ہیں۔ مگر نئے نسل پرستوں کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے مہمان کارکن (guest workers) تھے نہ کہ ہمارے ملک کے باقاعدہ شہری۔ س طرح جو نسلی پالیسی (racist policy) ابھر رہی ہے، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ‌‌دنیا میں ایک نئی سماجی تفریق (social divide) وجود میں آنے والی ہے جو وھائٹ اور غیر وھائٹ کی تقسیم پر مبنی ہو گی۔ اس میں غالباً صرف جاپانیوں کو آنریری وھائٹ (honorary whites) کے طور پر

تسلیم کیا جائے گا۔ تاہم یورپ کے سنجیدہ لوگ اس کو خود یورپ کے لئے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ ایک بوڑھے پروفیسر نے کہا :

If the Europe of the future deals with the rest of the world on the basis of race, it would make itself ineligible for world leadership.

یعنی اگر مستقبل کا یورپ بقیہ دنیا سے نسل کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عالمی قیادت کے لئے نااہل بنالے گا۔ ایک اور بوڑھے یورپین نے کہا کہ یہ چیز یورپ کے لئے اس کے عالمی کردار میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور امریکہ دوبارہ آزادی اور ترقی کا واحد علم بردار بن کر ظاہر ہو سکتا ہے :

It may deprive Europe of its world role. And the United States might again emerge as the real defender of liberty and progress.

یہاں تجارتی مقاصد کے لئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ میں وگن میں اپنی قیام گاہ کی بیرونی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ سامنے کی سڑک پر مسلسل دونوں طرف کاریں دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس درمیان سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا — ۶۷ پونڈ فی ہفتہ کے ذریعہ اس گھر کو اپنا لو :

Own this house from £ 67 per week.

انڈیا میں اس طرح کا بورڈ میں نے نہیں دیکھا۔ تاہم اگر یہاں ایسا بورڈ لگایا جائے تو شاید اس پر لکھا ہوا ہوگا کہ اس گھر کا کرایہ ۶۷ پونڈ فی ہفتہ ہے۔ مگر یورپ کے لوگوں کی نفسیات اس اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مذکورہ اشتہار اسی کی ایک مثال ہے۔

۲۴ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ چند عرب نوجوانوں کے ساتھ میں مانچسٹر گیا۔ وہاں کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یہاں کے امام کوئی فلسطینی یا اردنی تھے۔ انھوں نے فلسطین میں دشمنان اسلام کے ظلم اور سازش پر انگریزی میں پرجوش تقریر کی۔ دنیا کے جس حصہ میں بھی آپ جائیں وہاں کے مسلمانوں کے مجالس یا اجتماعات کا مشترک موضوع صلیبیوں، صہیونیوں وغیرہ کی سازش ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ان نام نہاد سازشوں کا اعلان تو سو سال سے کیا جا رہا ہے۔ مگر اس کا ذرہ برابر

بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر اس کو مزید جاری رکھنے کا کیا فائدہ۔

میں نے ایک مجلس میں کہا کہ دو سو سال پہلے مسلمان غلبہ کی حالت میں تھے۔ اس کے بعد ان پر ضعف کا دور آیا۔ اس کے بعد یورپی استعمار نے ان کو مغلوب کر لیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو فلسطینی لیڈروں کا اسرائیل کا اعتراف کر لینے کے بعد ملت کی تاریخ ذلت کے دور میں داخل ہوگئی۔ اس درمیان میں ہزاروں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں، سیکڑوں بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دیں مگر نتیجہ معکوس صورت میں نکلا۔ غلبہ کے بعد ضعف، اس کے بعد مغلوبیت اور اس کے بعد ذلت، یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں موجودہ پرشور تحریکوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر ان کی قیمت ہوتی تو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ انجام نہ ہوتا۔

یہاں کی ایک مسجد میں دیوار پر ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی۔ نیچے رحل کی صورت میں پیتل کی دو تلواریں بنی ہوئی تھیں اور اس کے اوپر اللہ لکھا ہوا تھا۔ پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ عرب ممالک میں اس قسم کی تختی عام ہوگئی ہے۔ مسجد، ادارہ، مکان ہر جگہ لوگوں نے اس کو لگا رکھا ہے۔

مجھے اس کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا کہ اللہ کے رسول نے تو دعا میں کہا تھا کہ اَللّٰھم انت السلام ومنك السلام والیك یرجع السلام۔ مگر یہ مسلمان اس پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کو بدل کر انھوں نے اپنی دیواروں پر یہ لکھ دیا کہ ——— اَللّٰھمَّ اَنْتَ السَّیف۔ یہ بلاشبہ جرم ہے نہ کہ کوئی اسلامی عمل۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق خدا لامحدود ہے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا کائنات محدود ہے اور محدود کو محدود پیدا نہیں کر سکتا۔ صرف لامحدود ہی محدود کو پیدا کر سکتا ہے۔ (الکون محدود وھذا یدل علیٰ ان الخالق لامحدود۔ فان لم یکن الخالق لامحدود لما استطاع ان یخلق المحدود)

وگن کا ایک علاقائی اخبار نکلتا ہے اس کا نام وگن رپورٹر (Wigan Reporter) ہے۔ اس کے شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ میں جیک وھٹکر (Jack Whittacker) کے نام سے ایک مراسلہ پڑھا۔ اس

کے آخر میں یہ الفاظ درج تھے کہ میں خود سوچتا ہوں اور میں خود اپنی رائے قائم کرتا ہوں۔ مگر ہمیشہ دوسروں کا نقطۂ نظر سننے کا خواہش مند رہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں ان سے اتفاق نہ کروں مگر میں ان کا احترام کرتا ہوں :

I do my own thinking and form my own opinions but always willing to listen to other people's opinions. I may not agree but I do respect them. (Jack Whittacker)

مکہ مدینہ کا فرق بتاتے ہوئے کچھ عرب نوجوانوں سے میں نے ہجرت کے بارہ میں کہا :

بعد ما نظرت فی هذه الحقائق فسوف تقول ان الهجرة لم يكن كفرار بل الهجرة كانت الذهاب من اللافرصة الى الفرصة۔

ایک عرب نوجوان نے ۲۵ ستمبر کی ملاقات میں بتایا کہ وہ اسلامی مرکز کی عربی مطبوعات سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد ایک تقلیدی شخص ان سے جھگڑنے لگا۔ اور کہا کہ "وحید الدین خاں کی کتاب مت پڑھو ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے"۔ آخر کار دونوں میں طے ہوا کہ وہ مانچسٹر کے ایک عالم کے پاس جائیں اور اس سے اس کا فیصلہ لیں۔ چنانچہ دونوں مانچسٹر کے عالم کے پاس گئے۔

عالم نے مذکورہ شخص سے پوچھا کہ وحید الدین خاں کی کتابوں میں آپ نے کیا غلطی پائی ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے "حکمة الدعوة" پیش کی اور اس کی ایک غلطی بتائی۔ عالم نے کتاب کا مذکورہ صفحہ پڑھا اور اس شخص نے کہا کہ تم مجھ کو عجمی معلوم ہوتے ہو۔ اس عبارت میں وہ بات موجود ہی نہیں جو تم اس کی طرف منسوب کرتے ہو۔ وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔

آخر میں جب دونوں وہاں سے اٹھے تو مذکورہ عالم نے عرب نوجوان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ : لقد أظهر الله لك الحق۔ یہ واقعہ ۱۰ جون ۱۹۹۳ کا ہے جو مانچسٹر میں پیش آیا۔

قاہرہ سے ایک مجلہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام احداث العالم الاسلامی ہے۔ اس کا شمارہ ۱۹۹۳ میں نے دیکھا جو ۷۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں ۸ صفحات کی رپورٹ تھی۔ اس کو پڑھ کر میں نے کچھ عربوں سے کہا :

اذا ما قرأتم هذه الصفحات عن الهند فسوف تستنبطون منها ان الهند هي بلد المشاكل وليست بلد الامكانيات۔ والهند في الحقيقة، كغيرها من البلدان، هي بلد الفرص

والإمكانيات. وكيف لا تكون كذالك. والله سبحانه وتعالىٰ يقول في القرآن: إنَّ مع العسر يسراً، إنّ مع العسر يسراً۔

۲۶ ستمبر کو لیبیا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی ضرورت کے تحت انگلینڈ آئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ نے لیبیا کے خلاف جو پابندیاں لگائی ہیں ان کے بارہ میں لیبی عوام کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے فوراً کہا:

الليبيون نتيجة الظلم السياسي والحرمان الاقتصادي وللتحرر من القيد الداخلي ينتظرون أميركا كي تأتي وتستلم البلاد۔ فهذا حديث رجل الشارع اليوم۔

میں نے کہا کہ یہ صرف لیبیا کی بات نہیں ہے بلکہ تقریباً تمام مسلم ملکوں کا معاملہ یہی ہے۔ ہر جگہ یہی صورت حال ہے کہ اگر کسی طرح امریکہ ان ملکوں پر قابض ہو جائے تو ہر ملک کے عوام خوش دلی کے ساتھ اس کو قبول کر لیں گے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر مسلم ملک میں جس شخص کو موقع ملتا ہے وہ فوراً پرواز کر کے امریکہ پہنچ جاتا ہے:

هذه حالة كل البلدان الاسلامية۔ والدليل على هذا هو ان كل من تواتيه الفرصة فانه يستقل اول طائرة لكي يصل الى امريكا۔

۲۴ ستمبر کی شام کو میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ قریب کے ایک پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا۔ ہم لوگ ایک راستہ پر چل رہے تھے۔ اتنے میں دو سفید فام نوجوان ہمارے پاس سے گزرے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک شخص نے کہا:

Nigger, Nigger, Black

سفید فاموں کی خاص کمزوری نسل پرستی ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر وہ ایشیائی اور افریقی لوگوں کو بلیک (سیاہ) کہتے ہیں۔ مذکورہ جملہ تحقیر اور استہزاء کے طور پر تھا۔

میں نے ایک ہندستانی مسلمان سے کہا کہ آپ لوگ انگلینڈ میں آکر بسے ہوئے ہیں۔ ور وہ آپ کو بلیک کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب انگریز ایسے نہیں۔ انگریزوں کی اقلیت یسا کرتی ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں بھی ہندوؤں کی صرف اقلیت مسلم مخالف بات کرتی ہے نہ کہ سارے ہندو۔ پھر یہی اصول آپ انڈیا میں بھی کیوں اختیار نہیں کرتے۔ جس طرح یہاں

آپ اس طرح کی باتوں کو اقلیت کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، اسی طرح انڈیا میں بھی اس طرح کی باتوں کو اقلیت کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیجئے اور پھر انڈیا آپ کے لئے انگلینڈ بن جائے گا۔

اخوانی مزاج کے بعض عرب نوجوانوں کی مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے فاعرض عمن تولی۔ یہ نہیں فرمایا کہ قاتل عمن تولی یا حارب عمن تولی۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ اسلامی عمل (Islamic activism) کا بنیادی اصول ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ اعراض ہے۔

اعراض کوئی سادہ چیز نہیں وہ نہایت گہرا عمل ہے۔ اعراض کا طریقہ اختیار کر کے داعی ایک مدعو کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی روش پر مزید غور کرے، دوسری طرف داعی خود اپنے لئے یہ امکان حاصل کرتا ہے کہ اس کو صبر کا انعام دیا جائے جو کہ قرآن اور حدیث کے مطابق، سب سے بڑا اسلامی عمل ہے۔

اسی کے ساتھ اعراض کا طریقہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ جنگ اور ٹکراؤ میں اپنی طاقت کو ضائع نہ کرے بلکہ اپنی پوری طاقت کو اپنی تعمیر اور اپنے استحکام میں لگائے۔ اعراض اگرچہ ابتدائی مرحلہ میں برداشت کی قیمت چاہتا ہے۔ مگر جب اعراض کے ذریعہ فرصتِ عمل حاصل کر کے کوئی گروہ اپنے کو طاقت ور بنالے تو اس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس کے مقاصد کسی جنگ کے بغیر پورے ہو جاتے ہیں۔

ایک مغربی نوجوان نے سوال کیا کہ قرآن میں ہے کہ عورتیں نافرمانی کریں تو ان کو مارو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن عورتوں کے حق میں غیر عادل ہے۔ وہ مرد کو مارنے کی اجازت دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ خود مغربی ذرائع میں چھپی ہوئی رپورٹیں بتاتی ہیں کہ عورتوں کو مارنے کا عمل سب سے زیادہ مغربی ملکوں میں ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس طرح انسانی سماج کا یہ عمومی ظاہرہ بتاتا ہے کہ مخصوص اور استثنائی حالات میں عورت کے حق میں

تنبیہی ضرب ضروری ہے۔ ورنہ خاندان کا نظام چل نہیں سکتا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اسلام کی عظیم مثبت دین یہ ہے کہ اس نے یہ تعلیم دی کہ عورت کی طرف سے نشوز (نافرمانی) کا مظاہرہ ہو تو ابتداءً ہر قسم کی پر امن تدبیریں کرو۔ اگر پر امن تدبیروں سے اصلاح نہ ہو تو آخری مرحلہ میں انتہائی استثنائی تدبیر کے طور پر عورت کو مار سکتے ہو۔ مگر یہاں بھی اسلام نے اس کی حد مقرر کر دی۔ اور وہ یہ کہ بس مسواک یا ٹوتھ برش جیسی چیز سے مارنا۔ یعنی علامتی مار نہ کہ حقیقی مار۔

آج ستمبر ۱۹۹۳ کی ۲۷ تاریخ ہے۔ مجھ کو دہلی سے نکلے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں۔ امت کی موجودہ حالت اور قیامت کی ہولناکی کو یاد کر کے دل کا عجیب حال ہوا۔ میں نے سوچا کہ حشر کے میدان میں جب لوگ گروہ در گروہ جمع ہوں گے تو کوئی شخص ہوگا جو متمردین کے گروہ کا جھنڈا لے کر آئے گا۔ کوئی منافقین کا سردار بن کر چل رہا ہوگا۔ اسی طرح کوئی وہاں منحرفین کا گروہ ہوگا، کوئی محرفین کا گروہ اور کوئی مستغلین کا گروہ۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے عاجزین کے ساتھ اٹھائیے۔ حشر کے دن میں عاجزین کے گروہ کے پیچھے اس احساس کے ساتھ چل رہا ہوں کہ شاید میرے عجز پر خدا کو رحم آجائے اور وہ مجھے بخش دے۔

اس سفر کے دوران یورپ کے دو ملکوں (اٹلی اور انگلینڈ) کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ میرا احساس یہ ہے کہ انگریزوں کی نفسیات برتری کی نفسیات ہے، اور اطالویوں کی نفسیات مقابلۃً تواضع کی نفسیات۔ سچائی کو قبول کرنے کے لئے برتری کی نفسیات ہمیشہ رکاوٹ بنتی ہے اور تواضع کی نفسیات ہمیشہ مددگار ہوتی ہے۔ نو آبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد مسلمان بہت بڑی تعداد میں انگلستان میں آئے۔ کیوں کہ یہاں ان کو مادی نفع کے مواقع زیادہ دکھائی دئے۔ اگر ان مسلمانوں کی نظر دعوتی مواقع پر ہوتی تو شاید وہ سب سے زیادہ اٹلی کے شہروں میں جاتے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے قاہرہ کی چھپی ہوئی ایک کتاب دی۔ اس کا نام تھا: تصفیۃ الوجود الاسلامی (عبد الرحمٰن عبد الوہاب) کھول کر مختلف مقامات پر اسے دیکھا تو کتاب جہاد کے نام پر سیف وقتال کی باتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ

اسلام کی تاریخ صرف تلواروں نے بنائی ہے، اسلام کی تاریخ صرف جنگ نے بنائی ہے۔
(ان تاریخنا لم تصنعه الا السیوف، ان تاریخنا لم یصنعه الا القتال) صفحہ ۱۴۶

میں نے کہا کہ یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے۔ میں نے اسلامی تاریخ کے کچھ واقعات بیان کرنے کے بعد کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ آرنلڈ اور کیتھ جیسے مسیحی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی تاریخ اس کی نظریاتی طاقت کے ذریعہ بنی اور مسلم دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی تاریخ تلوار کی طاقت نے بنائی ہے۔ یہ سن کر حاضرین میں سے ایک عرب نوجوان نے کہا: فکأن المسیحیین یعظّمون الاسلام والقادة المسلمون یصغرون الاسلام (عادل محمد الربانی)

۲۴ ستمبر کی شام کو ایک عرب نوجوان نے سوال کیا کہ رسول اللہ ؐ کے بعد ہمیں دنیا میں انذار و تبشیر والا دعوتی کام نظر نہیں آتا۔ پھر بعد کی غیر مسلم قوموں کا انجام کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا: السؤال یرجع الی علماء هذه الامة۔ لان الداعی اذا لم یقم بعمله فسوف یکون هو المسئول دون المدعو۔ فسوف تسئل عن علماء الامة الذین عاصروا الامم۔ لِمَ انتم فشلتم وما استطعتم ان تقوموا للشهادة امامَ الامم فلعل الامم سوف توقف یوم القیامة فی قاعة الانتظار والعلماء سوف یجدون انفسهم فی قاعة الاستجواب۔

اٹھارویں صدی میں ہندستان کے لوگ خاص طور پر مسلمان، انگریزوں کو صرف ظالم اور لٹیرے کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ اس وقت انگریز قوم کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہالت کی تاریکی سے نکل کر ایک علم دوست قوم بنے ہوئے تھے۔ آج بھی یہ حال ہے کہ یہاں کے بہت سے لوگ ۸۰ سال کی عمر میں بھی نئی معلومات حاصل کرنے کے شوق میں ایوننگ کلاس میں داخلہ لے لیتے ہیں۔

۱۸۵۷ میں ہندستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت منظم کی گئی۔ عین اسی سال یہاں کی قدیم برٹش لائبریری میں مشہور راؤنڈ ریڈنگ روم (round reading room) بن کر تیار ہوا تھا جس میں ڈکنس، لینن، مارکس، تھیکرے، شا، ہارڈی جیسے نامور لوگوں نے بیٹھ کر مطالعہ کیا۔ برطانیہ کے شہروں میں بے شمار تعداد میں پبلک اور پرائیویٹ لائبریریاں قائم ہیں۔

ٹی وی کے موجودہ دور میں بھی یہاں کتابوں کے مطالعہ کا وسیع ذوق پایا جاتا ہے۔ لوگ بہت بڑے پیمانہ پر کتابیں خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ میں میں نے حسب ذیل سطریں پڑھیں کہ ایک کتابی ادارہ نے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ اس نے اعلان کیا کہ کتاب خرید کر اپنے گھر لے جاؤ۔ دیکھنے کے بعد کتاب پسند نہ آئے تو اس کو لوٹا کر اپنی رقم واپس لے لو۔ یہ اندیشہ بہت مبالغہ آمیز ثابت ہوا کہ ہر آدمی دوبارہ کتاب لے کر اپنی رقم واپس مانگنے آجائے گا:

One chain offered a unique plan. Buy a book, take it home and if you are not happy, get your money back. The fears that every one will come back to claim a refund were exaggerated.

وگن میں مجلہ احداث العالم الاسلامی کا شمارہ ۱۹۹۲ دیکھا۔ یہ مجلہ ۷۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ ہر سال چھپتا ہے۔ اس کا پتہ یہ ہے:

دار الاعتصام، ۸ شارع حسین حجازی، القاہرہ ۱۱۵۱۱۔

اس میں مختلف ملکوں سے متعلق اسلامی خبریں درج تھیں۔ اٹلی کے عنوان کے تحت ایک خبر یہ تھی کہ ایک اطالوی خاتون نے اپنی ریسرچ کے نتائج چھاپے ہیں۔ اس میں بتایا گیا کہ یورپ میں سب سے پہلا عربی قرآن اٹلی میں ۳۸ - ۱۵۳۷ میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ۲۳۲ صفحہ پر مشتمل تھا۔ یہ ساڑھے چار سو سال پہلے کی بات ہے۔ چھپنے کے بعد اس قرآن کے نسخے پوپ کے حکم سے جلا دئے گئے تھے۔ تاہم اس قرآن کا ایک نسخہ مذکورہ خاتون کو اطالوی کتب خانہ میں ملا ہے جس کی نشاندہی انھوں نے اپنے مقالہ میں کی ہے۔

مجلہ احداث العالم الاسلامی (۱۴۱۳ھ، ۱۹۹۳) میں ایک باب کشمیر کے بارہ میں تھا۔ اس میں کارنامۂ جہاد کے طور پر درج تھا کہ کشمیر کے مجاہدین نے ہندو فوج کے دس ہزار سے زیادہ افراد کو قتل کیا: ان العملیات الجهادیة ادت الی قتل اکثر من عشرة آلاف من الجنود الهندوس) صفحہ ۲۴۰

اس کو پڑھ کر میں نے کہا کہ اسلام میں جہاد کا عمل یہ تھا کہ "دس ہزار" انسانوں کو خدا کے دین میں داخل کیا جائے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مجاہدوں کے نزدیک جہادی عمل یہ ہے کہ دس ہزار انسانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔

۱ ویکلی میگزین راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر سیتا رام نے ۲۴ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کٹرتا نہ اسلام میں ہے اور نہ کسی دوسرے مذہب میں۔ اصل یہ ہے کہ کسی مذہب کے لوگوں میں جب مذہب کی اسپرٹ باقی نہیں رہتی تو فارم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اسی سے کٹرپن پیدا ہوتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ لوگوں میں پھر سے اسپرٹ پیدا کی جائے۔

۲ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر کملیش ترپاٹھی نے ۲۶ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ کامن سول کوڈ کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ مفروضہ کامن سول کوڈ نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید۔ حتی کہ زبردستی ایسا ایکٹ بنا دیا جائے تو عملاً وہ ہرگز چلنے والا نہیں۔ پھر ایسے بے فائدہ کام میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت۔

۳ مسز اسماء عرشی نے ۲۷ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو انگریزی اخبار سنڈے آبزرور کے لئے لیا گیا اور اس کا موضوع کامن سول کوڈ تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ جدید طبقہ نے کامن سول کوڈ کو ایک فرضی آئیڈیل بنا لیا ہے۔ حالاں کہ وہ موجودہ حالات میں نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔

۴ انگریزی ماہنامہ لیگل نیوز اینڈ ویوز (نئی دہلی) کے ایڈیٹر ڈاکٹر بھرت جھن جھن والا نے ۲۷ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ انڈین نیشن کی تعمیر کے لئے تمام فرقوں میں یکساں تاریخی شعور پر زور دینا ایک غیر متعلق بات ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں کہیں بھی تاریخی شعور کی یکسانیت پر قوم نہیں بنی ہے۔ بلکہ سادہ طور پر یکساں وطن کی بنیاد پر قوم بنی ہے، اور اسی طرح انڈیا میں بھی بن سکتی ہے۔

۵ ایک صاحب نے صدر اسلامی مرکز کی کتاب 'پیغمبر انقلاب' کا تامل زبان میں

ترجمہ کیا ہے۔ جس کو وہ دعوتی جذبہ کے تحت چھپوا کر مفت یا علامتی قیمت پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں مالی تعاون درکار ہے۔ جو اہل خیر حضرات اس کام میں تعاون دینا چاہتے ہیں وہ ازراہِ کرم حسب ذیل پتہ پر براہ راست رابطہ قائم فرمائیں۔

۶ دی فیڈریشن آف انڈین پبلشرس کی طرف سے ہر سال ملک کی مختلف زبانوں (مثلاً ہندی، اردو اور انگلش وغیرہ) میں چھپنے والی مطبوعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور ان میں سے جو کتابیں اپنی خصوصیات کی بنا پر سال کی بہترین مطبوعات سمجھی جاتی ہیں ان پر انعامات دئے جاتے ہیں۔ سال ۱۹۹۴ کے لئے جن کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا ان میں ایک اسلامی مرکز کی مطبوعہ "عظمت اسلام" کا پیپر بیک اڈیشن ہے۔ یہ انعام ایک تمغہ اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

۷ ۴ جون ۱۹۹۵ کی شام کو شاہدرہ (جگ جیون نگر) سرودھرم سمبھاؤ سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مثبت طرز فکر اور مذہبی احترام پر تقریر کی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اختلافات کی اس دنیا میں ایک دوسرے کا احترام کر کے ہی صحت مند سماج بنایا جا سکتا ہے۔

۸ رشی کیش میں پرمارتھ نکیتن آشرم کے زیر اہتمام ایک بڑا مذہبی جلسہ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ۹ جون ۱۹۹۵ کو جلسہ سے خطاب کیا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کی ترقی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے نیشنل اسپرٹ اور پازیٹو تھنکنگ۔ نیشنل اسپرٹ یہ ہے کہ ذاتی مفاد کی خاطر دیش کے مفاد کو قربان نہ کیا جائے۔ اور پازیٹو تھنکنگ یہ ہے کہ شکایات کے موقع پر منفی ردعمل سے بچنا اور مثبت رویہ اختیار کرنا۔

۹ دہلی کی ٹی وی تنظیم (کمیونی کیشن گروپ) کی ٹیم ۱۴ جون ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کامن سول کوڈ ہونا

چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کامن سول کوڈ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس کا کوئی امکان نہیں۔ حتی کہ ایکٹ بنا دیا جائے تب بھی وہ لاگو نہیں ہو سکے گا۔ اور وہ اسی طرح معطل ہو کر رہ جائے گا جس طرح سول میرج ایکٹ معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۰ ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے ۱۶ - ۱۹ جون ۱۹۹۵ کو بمبئی کا سفر کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۱ دہلی کے ہندی روزنامہ پبلک ایشیا کے نمائندہ مسٹر محمد رؤف الرحمٰن نے ۲۰ جون ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دستوری دفعہ ۴۴ (یونیفارم سول کوڈ) خود دستور کی دفعہ ۲۵ (مذہبی آزادی) سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دستور میں ایک اور ترمیم کر کے دفعہ ۴۴ کو حذف کر دیا جائے۔

۱۲ یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ وقت کا نہایت اہم ملی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس پر ایک مضمون دہلی کے انگریزی میگزین نیشن اینڈ دی ورلڈ (یکم جون ۱۹۹۵) وغیرہ میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا تفصیلی مضمون "یکساں سول کوڈ" الرسالہ (ستمبر ۱۹۹۵) میں نیز علاحدہ کتابچہ کی شکل میں چھپ چکا ہے۔ اس کا انگریزی اور ہندی ترجمہ بھی ان شاء اللہ جلد چھپ جائے گا۔

۱۳ انڈین ٹیلیویژن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (گل مہر پارک) کی ٹیم نے سویڈش ٹی وی (ZEN ZAT AB) کے لئے ۱۱ جولائی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ کامن سول کوڈ کو قانونی طور پر نافذ کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔

۱۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: وقت کا استعمال۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وقت ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ وقت کو نہ کھوئے اور اس کو پوری طرح استعمال کرے۔

۱۴ میڈیا اسٹار کے نمائندہ مسٹر سلیم صدیقی نے ۱۳ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ٹیلیفون پر لئے گئے اس انٹرویو کا تعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ (کامن سول کوڈ) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جوڈیشیری اور لیجسلیچر میں واضح فرق ہے۔ اس فیصلہ میں جزئی طور پر جوڈیشیری نے اپنی حد سے تجاوز کر کے لیجسلیچر کے دائرہ میں قدم رکھ دیا ہے۔

۱۵ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر شیام سندر سنگھ نے ۲۴ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ کے سوال سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دستور کی دفعہ ۲۵ (مذہبی آزادی) دستور کی دفعہ ۴۴ (کامن سول کوڈ) سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے اگر کامن سول کوڈ لانا ہے تو مذہبی آزادی کی دفعہ کو ختم کیجئے۔ اور اگر مذہبی آزادی کی دفعہ کو باقی رکھا جاتا ہے تو کامن سول کوڈ کی دفعہ کو حذف کرنا پڑے گا۔ پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی یہ کہتے تھے کہ جب تک مسلم سماج کی طرف سے مانگ نہ کی جائے ہم کامن سول کوڈ نہیں بنائیں گے۔ یہ مسلمانوں کے تسلی کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا کہ دستور میں دی ہوئی مذہبی آزادی کی بنا پر حکومت ایسا نہیں کر سکتی کہ قانون کے زور پر کامن سول کوڈ کو لاگو کر دے۔

۱۶ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ مئی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی اس کا موضوع تھا: صوفی نورالدین کشمیری، حالات اور اقوال۔ ان کا ایک قول جو نقل کیا گیا وہ یہ تھا کہ: میں نے تلوار توڑ دی اور اس سے درانتی بنالی۔

۱۷ اُرن کول پروڈکشن (بمبئی) کی ویڈیو ٹیم ۲۳ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ موجودہ زمانہ میں "نظام مصطفیٰ" یا اسلامی حکومت قائم کرنے پر جو لوگ مختلف مقامات پر بطور خود جنگ چھیڑے ہوئے ہیں، وہ محض سطحی لیڈری ہے نہ کہ کوئی دینی عمل اسلامی جہاد۔ اس طرح بم اور گن چلانے سے صرف فساد پیدا ہوتا ہے، اس سے کبھی کوئی حقیقی اصلاح ظہور میں نہیں آسکتی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۵، شمارہ ۲۲۹

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ
اسلامی اصول	۴	اکثریت کی آواز	۱۳
اثر قبول نہ کرنا	۵	بے عملی کا سبب	۱۴
اسلامی کلچر	۶	مذہب کا غلط استعمال	۱۵
اشاعت اسلام	۷	بعضکم من بعض	۱۶
قیادت کی تربیت	۸	فخر و ناز	۱۸
پُر عافیت زندگی	۹	غلطی کہاں ہے	۲۰
تنقید و اختلاف	۱۰	سب سے مشکل، سب سے آسان	۲۵
غاصب، مغصوب	۱۱	بڑودہ کا سفر	۲۶
شعور نہ کہ نظام	۱۲	خبرنامہ اسلامی مرکز — ۱۰۴	۴۷

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

اسلامی اصول

عن حذیفۃ، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: قال: لا ینبغی لمسلم ان یذل نفسہ۔ قیل وکیف یذل نفسہ۔ قال یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔

(مسند الامام احمد بن حنبل ۵/۴۰۵)

حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کسی مسلمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص کیسے اپنے آپ کو ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسی بلا کا سامنا کرے جس سے وہ مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

اس حدیثِ رسول سے اسلامی زندگی کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب کسی کی طرف سے کوئی بلا یا کوئی ناپسندیدہ صورتحال پیش آئے تو اس وقت یہ درست نہیں ہے کہ آدمی بھڑک کر صاحب بلا سے ٹکرا جائے۔ بلکہ اس کو سوچ سمجھ کر یہ طے کرنا چاہئے کہ دو ممکن راستوں میں سے کون سا راستہ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس اتنی کافی قوت ہے کہ وہ کامیاب طور پر مقابلہ کر کے زیادتی کرنے والوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زیادتی سے باز آئیں۔ اگر ایسا ہو تو آدمی کو چاہئے کہ وہ جم کر مقابلہ کرے تاکہ فساد ختم ہو اور اصلاح کی حالت قائم ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ٹھنڈے غور و فکر کے بعد آدمی اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں فریقوں میں طاقت کا تناسب ناقابل عبور حد تک غیر متناسب ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو برعکس نتیجہ نکلے گا اور چھوٹا نقصان زیادہ بڑا نقصان بن جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو لازم ہے کہ آدمی صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اور صاحب بلا سے نہ الجھے۔

مزید یہ کہ اعراض کا مطلب بزدلی نہیں ہے بلکہ وقفۂ تیاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے وقت اور اپنی طاقت کو ٹکراؤ سے بچا کر مزید تیاری میں لگائے، وہ اپنے آپ کو زیادہ مستحکم بنانے کی تدبیر کرے۔ تاکہ آئندہ کوئی شخص اس کے خلاف زیادتی کی ہمت نہ کرے، اور اگر کوئی زیادتی کی کارروائی کرے تو آدمی کے پاس اس کے توڑ کے لئے کافی طاقت موجود ہو۔

یہ بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے۔

اثر قبول نہ کرنا

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ لوگوں سے اختلاط کرو اور یہ دیکھتے رہو کہ تم اپنے دین کو زخمی نہ کرلو (خالطوا الناس و انظروا الا تکلموا دینکم) فتح الباری لابن حجر العسقلانی ۱۰/۵۴۳

اسلام میں یہ پسندیدہ بات نہیں کہ آپ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ بلکہ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ آپ ہر قسم کے لوگوں سے ملتے رہیں۔ یہ اختلاط اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام ایک دعوتی مذہب ہے، اور اختلاط کے بغیر دعوت کا کام نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ آپ کی شخصیت کی تکمیل کے لئے بھی اختلاط ضروری ہے۔ جب آپ لوگوں سے ملتے جلتے ہیں تو بار بار ایسے حالات پیش آتے ہیں جو آپ سے کسی ردعمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی آدمی نے کڑوی بات کہہ دی۔ اب آپ کو اس کا جواب دینا ہے۔ کسی سے آپ نے ایک وعدہ کرلیا، اسے آپ کو پورا کرنا ہے۔ کسی کی کوئی امانت آپ کے پاس آگئی جسے آپ کو ادا کرنا ہے۔ اس طرح کے معاملات کے دوران ہی آپ تربیت پاکر اسلامی اخلاق کے مالک بنتے ہیں۔

تاہم اختلاط کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ دوسروں کا غلط اثر قبول کرلیں۔ مثلاً ایک خاتون نے ایک صاحبہ کو اپنی سہیلی بنایا۔ خاتون سادہ انداز میں رہتی تھیں اور سہیلی کے اندر فیشن والا مزاج تھا۔ سہیلی نے بار بار خاتون سے کہنا شروع کیا کہ تم کیا یہ بیوہ عورتوں کی طرح بالکل سادہ کپڑے پہنتی ہو۔ اس طرح کی باتیں کرکے سہیلی نے مذکورہ خاتون کو رنگین کپڑوں کی طرف راغب کیا پھر ان کے ڈھیلے کپڑے کی جگہ چست کپڑے سلوائے۔ اس طرح سہیلی کے اثر سے خاتون کی ایک ایک چیز بدلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ باقاعدہ فیشن پسند ہوگئیں اور روزانہ ان کے کئی کئی گھنٹے صرف میک اپ کی نذر ہونے لگے۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی دینی شخصیت کا ہمیشہ محافظ بنا رہے۔ وہ دوسروں سے اثر قبول کرنے کے بجائے خود دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگوں کے درمیان داعی بن کر رہے، نہ کہ خود دوسروں کا مدعو بن جائے۔

اسلامی کلچر

قرآن میں رب العالمین ہے، رب القوم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آفاقیت کو پسند کرتا ہے نہ کہ محدودیت کو۔ قرآن میں پیغمبر کو رحمت عالم کہا گیا ہے، آپ کو زحمت عالم نہیں کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام محبت کا مذہب ہے، وہ نفرت کا مذہب نہیں۔ قرآن میں الصلح خیر ہے، قرآن میں الحرب خیر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام صلح کا ماحول لانا چاہتا ہے نہ کہ جنگ اور ٹکراؤ کا ماحول۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ پڑھو (اقرأ)، یہ نہیں فرمایا کہ گولی مارو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام علم کلچر کا نام ہے نہ کہ گن کلچر کا۔ قرآن میں صبر پر زور دیا گیا ہے، قرآن میں بے صبری کی تعلیم نہیں دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کی ایذاؤں پر تحمل سے کام لیا جائے، نہ یہ کہ کسی سے ایذا پہنچے تو مشتعل ہو کر اس سے لڑائی شروع کر دی جائے۔ قرآن میں بلند اخلاقی (خلق عظیم) کی تعریف کی گئی ہے نہ کہ برابری کے اخلاق کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک صحیح طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے سلوک کو نظر انداز کر کے ان کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا معاملہ کیا جائے۔

ان چند حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ اور اسلامی کلچر حقیقۃً کسے کہتے ہیں۔ اسلام خداوند عالم کی حیثیت خداوندی کا ظہور ہے۔ اسلام ساری کائنات کا دین ہے۔ اسلام وسیع تر انسانیت کا نمائندہ ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی وہی تشریح درست ہوگی جو اس کی ان حیثیتوں سے مطابقت رکھتی ہو۔ جو تشریح اسلام کے ان اعلیٰ تقاضوں کے مطابق نہ ہو وہ صحیح اسلامی تشریح بھی نہیں۔

سچا اسلام وہ ہے جو لوگوں کے اندر خدا کا خوف پیدا کرے۔ جو لوگوں میں دنیا پرستی کے مقابلہ میں آخرت پسندی کا ذہن بنائے۔ جو لوگوں کے دلوں میں انسان کی محبت پیدا کرے۔ جو لوگوں کو اپنے اور غیر کا فرق کیے بغیر سب کا خیر خواہ بنائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ آدمی اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھنے لگے۔

اسلام جن لوگوں کے دلوں میں اترتا ہے وہ انھیں رحمت اور سلامتی کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اسلام اور نفرت وعداوت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

اشاعت اسلام

ہندو دھرم میں یہ مانا گیا ہے کہ سچائی ایک ہے، مگر اس کے راستے جدا جدا ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کو سچائی کے مختلف راستے تصور کرتا ہے۔ چنانچہ ہندو دھرم ہر مذہب کے احترام کی اپیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ہزار سال سے ہندستان میں مذہب بدلنے کا عمل جاری ہے۔ مگر ہندو دھرم پر عقیدہ رکھنے والوں نے کبھی اس کو برا نہیں مانا، کیوں کہ ان کے عقیدہ کے مطابق، یہ سچائی کی طرف جانے والے ایک راستہ کے بجائے دوسرے راستہ کے ذریعہ سچائی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کے ہم معنی تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ ہندستان میں مذہب کی تبدیلی پر اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ سیاسی سبب سے ہوتا ہے نہ کہ مذہبی سبب سے۔

ہندو سنسکرتی کی یہ روایت ۱۹۴۷ کے بعد ملک کے کانسٹی ٹیوشن (دستور) میں بھی باقاعدہ طور پر شامل کر دی گئی۔ چنانچہ دستور کی دفعہ ۲۵ میں ملک کے ہر شہری کا یہ ناقابل تنسیخ بنیادی حق قرار دیا گیا ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے۔

اسی آزادانہ فضا کا یہ نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی ہندستان میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کرتے رہے، اور آج بھی ہر روز ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ اپنی ضمیر کی آواز کے تحت مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۵ جون ۱۹۹۵ میں صفحہ ۱۲ پر نام کی تبدیلی (Change of Name) کے زیر عنوان یہ اعلان شائع ہوا ہے:

> I, Arvind Kumar, son of Shri Prem Kumar, r/o 67/6, Zamrud Pur, Greater Kailash Part-1, New Delhi 110048, by faith Hindu, would hereafter be called as Ateeq and has embraced Islam. (The Times of India, New Delhi, June 25, 1995)

میں اروند کمار ولد شری پریم کمار ساکن زمرد پور، گریٹر کیلاش، نئی دہلی، ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والا، اب عتیق کے نام سے پکارا جائے گا۔ اور میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

، الرسالہ دسمبر ۱۹۹۵

قیادت کی تربیت

ایک مشہور مسلم شاعر کا انسانہ کے بارہ میں دو شعر یہ ہے:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا جانے یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ بات موجودہ دور زوال کی نمازوں کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ اصل نماز اگر اپنی روح کے ساتھ زندہ ہو تو خود مذکورہ شاعر کے مطابق، وہ ایک عظیم انقلابی چیز بن جائے گی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی — اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حقیقت یہ ہے کہ نماز پوری زندگی کے لئے ایک تربیت ہے۔ نماز ایک اعتبار سے مسجد کا ایک وقتی عمل ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایسا انقلاب انگیز عمل ہے جو انسانی زندگی میں ہمہ گیر نتائج پیدا کرنے والا ہے۔

نماز کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق امامت سے ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آئے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں سے جو آدمی سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرے (واذا حضرتِ الصلاۃ فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم) ایک اور روایت میں ہے کہ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب اللہ) فتح الباری ۲/۲۰۰

اکبر اور اقرأ (زیادہ علم والا) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسے شخص کی امامت پر راضی ہو جایا کریں جو ان کے درمیان زیادہ پختہ کار اور زیادہ واقف کار ہو۔ جو آدمی علم اور عمر میں بڑا ہوگا۔ اس کے اندر لازماً یہ صفتیں دوسروں سے زیادہ پائی جائیں گی۔

اس طرح مسجد میں یہ تربیت دی جاتی ہے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمان کس طرح رہیں۔ وہ اس طرح رہیں کہ جب بھی کوئی اجتماعی معاملہ ہو تو پختگی اور واقفیت میں جو لوگ کم ہوں وہ اپنے کو پیچھے کر لیں اور جو آدمی پختگی اور واقفیت میں زیادہ ہے اس کو اپنا قائد بنانے پر راضی ہو جائیں۔

پرعافیت زندگی

ایک عالم کے حلقہ میں ایک شخص تھا جوان سے بہت زیادہ قریب تھا۔ وہ اس کو دوسروں سے زیادہ مانتے تھے، اور دوسروں سے زیادہ ان پر بھروسہ کرتے تھے۔ عالم نے اس شخص کو ایک کاروبار پر لگا دیا۔ اس میں اسے کامیابی ہوئی اور وہ پیسہ والا آدمی بن گیا۔

اس کے بعد ایک روز وہ مذکورہ عالم کی صحبت میں تھا۔ کسی بات پر عالم نے اس کو سختی سے منع کیا۔ وہ شخص بگڑ گیا۔ اس نے سخت انداز میں جواب دیا اور اٹھ کر عالم کے پاس سے چلا گیا۔

چند دن کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ دوبارہ آیا اور عالم سے معذرت کرنے لگا۔ عالم نے جواب دیا کہ تم کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی اس معاملہ کو اس طرح ختم کر چکا ہوں کہ اب تک میں تم کو اپنے معیار سے دیکھتا تھا، اب میں تم کو تمہارے معیار سے دیکھوں گا۔

اس دنیا میں عافیت کی زندگی گزارنے کا یہی واحد کامیاب اصول ہے۔ ایک لفظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ —— لوگوں سے خود ان کے لحاظ سے معاملہ کرو نہ کہ اپنے لحاظ سے۔

ایک آدمی زیادہ امید پر پورا نہیں اترتا تو اس سے اپنی امید کو کم کر لیجئے۔ ایک آدمی آپ کی پابندی کو قبول نہیں کرتا تو اس سے پابندی کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیجئے۔ ایک شخص آپ کا خاص آدمی بننے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس کو عام آدمیوں میں شمار کرنا شروع کر دیجئے۔ ایک آدمی پر آپ کا قابو نہیں چلتا تو اس سے موافقت کی روش اختیار کر لیجئے۔ ایک آدمی آپ کو دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس سے اپنی توقعات کو ختم کر دیجئے۔ ایک آدمی اس خانہ کا اہل نظر نہیں آیا جہاں آپ نے اس کو رکھا تھا تو آپ سادہ طور پر صرف یہ کیجئے کہ ایک خانہ سے نکال کر اس کو دوسرے خانہ میں ڈال دیجئے۔

زندگی خارجی حقیقتوں سے موافقت کرنے کا نام ہے۔ سورج اور ہوا اور بارش اور پہاڑ اور سمندر سے موافقت کر کے ہی ہم اس دنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ یہی اصول انسانوں کے بارہ میں بھی ہے۔ آپ انسانوں سے موافقت کے اصول پر معاملہ کیجئے، اور دنیا آپ کے کے لئے خوشی اور عافیت کا گہوارہ بن جائے گی۔

تنقید و اختلاف

تنقید کو بند کرو، اختلاف رائے کو ختم کرو، تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے ——— یہ جملہ قواعد کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید و اختلاف انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لئے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ زیادہ صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلاف رائے کو برداشت کرو تاکہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور امت مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوا اتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ و تابعین کے درمیان اختلافات تھے۔ اسی طرح محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتی کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو ختم کرکے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ وہ غیر شرعی بھی ہے۔

تنقید و اختلاف کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدان جنگ کا انتخاب ممکن ہو گیا۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالب خویش اور دوسرا طالب حق۔ طالب خویش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دل چسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید و اختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالب حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب و مقصود تھی۔

غاصب، مغصوب

جب کوئی غاصب کسی کی چیز غصب کرتا ہے تو بظاہر غاصب پانے والا ہوتا ہے اور مغصوب کھونے والا۔ مگر اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وسیع تر نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ غاصب محروم ہے، اور جو مغصوب ہے وہی وہ شخص ہے جس نے حاصل کیا۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ غاصب کو اس کا عمل سمٹاؤ کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے استحقاق کے بغیر ایک چیز پر قبضہ کیا ہے، اس لئے وہ ہر آن یہ سوچتا رہتا ہے کہ ملی ہوئی چیز پر اپنے قبضہ کو بحال رکھے۔ وہ تحفظ کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی ساری سوچ بس ملی ہوئی چیز پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ وہ محدودیت کے خول میں بند ہوتا چلا جاتا ہے۔

دوسری طرف مغصوب کی صورت حال اس کو پھیلاؤ کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ اپنے دائرہ سے نکل کر چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے کہ کہاں کوئی موقع ملے جس کو استعمال کرکے وہ مزید کچھ حاصل کرے اور اس طرح اپنے کھونے کی تلافی کر سکے۔ پہلے اگر وہ محدود دائرہ میں جی رہا تھا تو اب وہ آفاقیت کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

یہ فرق دونوں کے لئے الگ الگ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ غاصب کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ جہاں تھا وہیں ٹھہر کر رہ جاتا ہے۔ غصب کے ذریعہ اس نے جو چیز پائی تھی وہی اس کی آخری یافت بن جاتی ہے۔ فکری اور عملی دونوں اعتبار سے وہ ایک غیر ترقی پذیر مخلوق بن کر رہ جاتا ہے۔

اس کے برعکس معاملہ مغصوب کا ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ اس کو سراپا عمل بنا دیتا ہے۔ وہ ایک مسلسل ترقی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بھر جاتی ہے کہ اس کو مزید حاصل کرنا ہے۔ یہ مزاج اس کو دائماً متحرک رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ کامیاب زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ جو آدمی ایک بار غصب کا معاملہ کرلے اس نے گویا اپنے آپ کو ایک خول میں بند کر لیا۔ اس کے برعکس جس شخص کے ساتھ غصب کا واقعہ ہوا ہے وہ اپنے خول سے نکل آئے گا اور وسیع تر دنیا میں دوبارہ اپنے لئے نیا مقام حاصل کرنا چاہے گا۔ غاصب کو اس کا فعل محدودیت کی طرف لے جاتا ہے اور مغصوب کو اس کا تجربہ وسعت اور پھیلاؤ کی طرف۔

شعور نہ کہ نظام

موجودہ زمانہ میں جاپان کی غیر معمولی ترقی ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ جاپان نے یہ ترقی احتجاجی مظاہروں کے ذریعہ حاصل نہیں کی۔ بلکہ اپنے افراد کے اندر شعور پیدا کرکے حاصل کی ہے۔ جاپانی امور کے ایک ماہر رابرٹ ہیز (Robert Hayes) نے لکھا ہے کہ جاپان نے اپنے افراد کے لئے معیار کو ایک طرز فکر (Way of thinking) بنا دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہ الفاظ لکھے ہیں :

> You don't get quality into a product by inspection, you have to build it in.

معیاری پیداوار کو آپ انسپکٹروں کی جانچ کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکتے۔ آپ کو ہر ایک کارکن کے اندر اس کا احساس پیدا کرنا ہوگا (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۹)

امریکہ نے دوسری عالمی جنگ میں اور اس کے بعد جاپان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کے مطابق امریکہ جاپان کے لئے دشمن نمبر ایک کی حیثیت رکھتا تھا۔ جاپان نے جنگ کے بعد جو اپنی تعمیر نو شروع کی تو پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افراد کو منفی طرز فکر سے پاک کیا۔ اس نے نفرت اور انتقام کے احساسات سے اوپر اٹھ کر امریکیوں سے معاملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان اس سے بچ گیا کہ وہ اپنی طاقت کو غیر ضروری قسم کی منفی کارروائیوں میں صرف کرے۔ منفی نفسیات سے اوپر اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خود اپنے دشمن کو اپنی خوراک بنالیا۔

امریکہ کی بیل لیبارٹریز (Bell Laboratories) نے سب سے پہلے ٹرانسسٹر ایجاد کیا تھا۔ جاپانی اگر امریکہ کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتے تو وہ امریکہ سے کچھ سیکھ نہیں سکتے تھے۔ مگر ان کے مثبت طرز فکر کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے فوراً اس ایجاد کو پکڑ لیا۔ قبل اس کے کہ بیل لیبارٹریز ٹرانسسٹر بنائے جاپانیوں نے بہت بڑی مقدار میں ٹرانسسٹر بنا کر عالمی مارکیٹ پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح فیکس کی تکنیک امریکہ میں دریافت ہوئی۔ مگر جاپان نے سب سے پہلے اس کا تجارتی فائدہ حاصل کیا۔

اکثریت کی آواز

ٹائمس آف انڈیا (یکم جنوری ۱۹۹۱) میں مسٹر بینی پرساد اگروال نے ملکی حالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمارا ملک اس وقت رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے مسئلہ پر اختلافات کا بری طرح شکار ہو رہا ہے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ وہ لوگ جو اس مقام پر ہر قیمت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ وہاں رام مندر بنا سکیں، انھوں نے اپنے آپ سے ایک سادہ مگر اہم سوال دریافت نہیں کیا ہے۔ وہ یہ کہ رام خود اس بارے میں کیا کہیں گے۔ رام کو معقولیت اور حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی کی کہانی میں بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ غصہ اور انتقام کے مقابلہ میں معاف کر دینا زیادہ عظیم ہے۔ کیا ایسا ایک شخص اس کی اجازت دے گا کہ ایک اور مذہب کی عبادت گاہ پر جبراً اس کا مندر بنایا جائے:

Our country is presently torn apart by the controversy over Ramjanmabhoomi-Babri Masjid issue. It occurs to me that those who demand the site at any cost in order to build a Ram temple, have not asked themselves a simple but important question as to what Lord Ram himself would have said on this. Lord Ram is known as the supreme human example of propriety and there are innumerable instances in his life's story which exemplify that forgiveness is greater than revenge or anger. Would such a person have permitted the forcible removal of a place of worship of another religion in order to build a temple for him? (Beni Prasad Agarwal)

مسٹر بینی پرساد اگروال نے جو بات کہی تھی، اس طرح کی باتیں مسلسل ہندو حضرات مختلف صورتوں میں کہتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو فرقہ میں کم از کم ۹۰ فیصد اسی قسم کے لوگ ہیں جن کی ایک نمائندگی مسٹر اگروال نے کی۔ جنوبی ہند کے ہندو تقریباً صد فی صد اسی ذہن کے ہیں۔ شمالی ہند میں کچھ انتہا پسند ہندو ہیں۔ مگر وہ اقلیت میں ہیں۔

مگر مسلمانوں کی نااہل لیڈرشپ اس امکان کو سمجھ نہ سکی۔ اس نے نہایت احمقانہ طور پر بابری مسجد کے مسئلہ کو سارے ملک کے لئے ایجی ٹیشن اور ہنگامہ آرائی کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ امکان استعمال ہونے سے رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔

بے عملی کا سبب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں قرآن کی دعوت کا اعلان کیا تو وہاں کے بیشتر لوگوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ وہی قدیم نفسیات تھی جو پچھلے پیغمبروں کے انکار کا باعث بنی تھی۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور جب ان کے پاس ہدایت آگئی تو ان کو ایمان لانے سے اس کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اس میں چلتے پھرتے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے (بنی اسرائیل ۹۴-۹۵)

پیغمبر لوگوں کے پاس ہدایت لے کر آیا۔ مگر وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر کو ان کے لئے انسانی نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مگر وہ اس کو آسمانی پیکر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکے کہ پیغمبر اگر آسمانی پیکر کے روپ میں آئے تو وہ ان کے لئے نمونہ کیسے بنے گا۔ انسانی عمل کے لئے نمونہ وہی شخصیت بن سکتی ہے جس پر انسانی تجربات گزریں۔ جو انسانی طاقت اور انسانی ضعف کے ساتھ دنیا میں رہے۔ جو پیغمبر انسانی اوصاف سے ماورا ہو وہ کسی غیر انسانی مخلوق کے لئے نمونہ ہو سکتا ہے۔ مگر وہ انسان جیسی مخلوق کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا۔

موجودہ زمانہ کا کیس بھی عملی نتیجہ کے اعتبار سے یہی ہے۔ قدیم زمانہ کے منکر پیغمبروں سے اس لئے حیات انسانی کا نمونہ نہ لے سکے کہ وہ انھیں برتر مخلوق کے روپ میں دکھائی نہیں دیا۔ موجودہ مسلمان اس لئے پیغمبر سے نمونہ حاصل کرنے میں ناکام ہیں کہ وہ پیغمبر کو ہیرو پیغمبر کے روپ میں دیکھتے ہیں نہ کہ اسوہ پیغمبر کے روپ میں۔ ہیرو فخر کے لئے ہوتا ہے نہ کہ تقلید کے لئے۔ ہیرو کو دیکھ کر قصیدہ خوانی کا جذبہ ابھرتا ہے نہ کہ اس کی پیروی کرنے کا۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ انھوں نے پیغمبر کو اپنا قومی ہیرو بنا لیا۔ اس لئے وہ پیغمبر کے لئے بڑے بڑے الفاظ بول کر خوش ہوتے ہیں۔ مگر پیغمبر جیسا عمل کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہیں ابھرتا۔

مذہب کا غلط استعمال

انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (۸ مارچ ۱۹۹۵) میں مسٹر کے آر ملکانی کا ایک خط چھپا تھا جس میں انھوں نے دعویٰ کیا تھا کہ اسلام دہشت گردی اور فرقہ بندی کو فروغ دیتا ہے۔ اس کی تردید میں دہلی کے ایک تعلیم یافتہ ہندو مسٹر این کنجو (N. Kunju) کا خط ٹائمس آف انڈیا ۹ مارچ میں شائع ہوا ہے۔

مسٹر کنجو لکھتے ہیں کہ خرابی خود مذہب میں نہیں ہوتی، مذہب کا نام لینے والے اس کو غلط مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سیاست دانوں نے ہمیشہ مذہب کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ گاندھی جی نے ہندوازم کو عدم تشدد کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا تھا۔ اب اسی ہندوازم کو مسٹر ملکانی کی پارٹی (بی جے پی) فرقہ وارانہ تشدد اور نفرت کے لئے استعمال کر رہی ہے:

Politicians have always used religion to attain their objective. Gandhiji used Hinduism to spread non-violence, while Mr Malkani's party and 'parivar' use it to spread communal violence and hatred. (p. 10).

پریس اور ڈیموکریسی کے دور میں بدقسمتی سے ہر مذہب کے لوگ یہی کر رہے ہیں۔ خود مسلم لیڈروں نے بھی بہت بڑے پیمانے پر اسلام کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے۔ مسلم علاقوں میں اس وقت جگہ جگہ جہاد کے نام پر جو خوں ریزی اور تباہی ہو رہی ہے وہ سب اسی استحصالی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

اس مذہبی برائی کو قرآن میں آیات الٰہی کے بدلے دنیا خریدنا کہا گیا ہے اور اس سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے (لا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا)

سیاست اور اقتدار کے کھیل کو اگر سیاست اور اقتدار کے نام پر کھیلا جائے تو یہ بھی اگرچہ گناہ ہے مگر وہ چھوٹا گناہ ہے۔ لیکن اگر سیاست بازی اور اقتدار پسندی کا ہنگامہ مذہب کے نام پر جاری کیا جائے تو وہ گناہ کبیرا اور جرم عظیم بن جاتا ہے۔

بعضکم من بعض

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو عورت اور مرد آسمان اور زمین کی نشانیوں میں غور کرتے ہیں وہ تخلیق کے اس نظام میں خالق کے وجود کو پالیتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ کائنات کے خالق نے اس کو بے مقصد نہیں بنایا۔ پھر خالق کی دریافت ان کو داعی حق کی دریافت تک پہنچاتی ہے۔ وہ اس کا اعتراف کرکے اس کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ آخرت میں ان کو نجات یافتہ گروہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ اس کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ان کے رب نے ان کے حق میں ان کی دعا قبول فرمائی اور کہا کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے، ان کی خطاؤں کو ضرور میں ان سے دور کردوں گا۔ اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے (آل عمران ۱۹۵)

قرآن کے اس بیان میں مرد اور عورت کے لئے بعضکم من بعض (آل عمران ۱۹۵) کا لفظ آیا ہے۔ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کا جزا ہو:

You are members, one of another.

دوسرے لفظوں میں یہ کہ عورت مرد کا نصف آخر ہے، اور مرد عورت کا نصف ثانی۔ گویا قرآن کے مطابق، مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے یکساں حصہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے برابر کے ساتھی ہیں۔ انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔

فرق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے جسمانی فرق، دوسرا ہے انسانی فرق۔ جسمانی فرق مرد اور مرد، عورت اور عورت میں بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت اور مرد کے درمیان بھی جسمانی فرق پایا جاتا ہے۔ مگر جس طرح مرد اور مرد یا عورت اور عورت میں جسمانی فرق سے انسانی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسی طرح

عورت اور مرد کے درمیان جسمانی فرق کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں جنسوں کے درمیان انسانی فرق کیا جائے۔ میدان کار کے اعتبار سے دونوں میں تقسیم ہے مگر انسانی مرتبہ کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تقسیم نہیں۔

جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے، دنیا کی طرح آخرت میں بھی مرد اور عورت کا معاملہ یکساں ہے۔ دونوں کا یکساں طور پر حساب لیا جائے گا۔ دونوں کے قول و عمل کو ایک ہی معیار پر جانچا جائے گا۔ جو چیز مرد کے لئے نجات کا ذریعہ ہوگی، وہی عورت کے لئے بھی نجات کا ذریعہ ہوگی۔ اور جو چیز عورت کی فلاح و کامیابی کا فیصلہ کرے گی وہی مرد کے لئے بھی فلاح و کامیابی کی ضامن ہوگی۔

جانچ کا وہ معیار کیا ہے، مذکورہ آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معیار یہ ہے ــــــ کائنات میں غور و فکر سے معرفت حاصل کرنا، خداوند عالم کا اقرار، خدا کے پیغمبر پر ایمان، آخرت کی تڑپ، خدا کے لئے ہجرت۔ خدا کی راہ میں جدوجہد، تقوی اور خشوع، صبر۔

کائنات معرفت کا خزانہ ہے۔ مرد اور عورت جب اس میں گہرائی کے ساتھ غور کرتے ہیں تو ان کو اس سے روحانی غذا ملتی ہے، ان کو اس میں حق کی تجلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح کائنات میں غور کرکے وہ خالق کائنات کو پالیتے ہیں۔

کائنات کی معنویت اور خدا کی موجودگی کی دریافت ان کو بتاتی ہے کہ کوئی مرد یا عورت اس دنیا میں آزاد نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ ہر ایک سے اس کے قول و عمل کا حساب لیا جائے۔ اور اس کے ریکارڈ کے مطابق اس کو اس کا بدلہ دیا جائے۔ وہ خدا پر ایمان کے ساتھ پیغمبر خدا پر ایمان کے لئے بھی مجبور ہوجاتا ہے کیوں کہ پیغمبر کی رہنمائی کے بغیر خدا کی عبادت و اطاعت نہیں کی جاسکتی۔

ہجرت سے مراد محض ترک وطن نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت اللہ کی خاطر ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔ نامطلوب کو چھوڑنا اور مطلوب کو لینا، یہ ایک مستقل عمل ہے جو مومن اور مومنہ کی پوری زندگی میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح ان کی زندگی سراپا جدوجہد کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس عمل کے دوران وہ بار بار تقوی اور خشوع کی کیفیات کا تجربہ کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی خاطر صبر کرنے والے بن جاتے ہیں۔

فخر و ناز

قدیم اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ملک کے بڑے حصہ پر قائم ہوگئی تھی۔ تاہم اسپین کا شمالی علاقہ ہمیشہ مسیحیوں کے قبضہ میں رہا۔ ان مسیحیوں سے برابر مسلمانوں کا ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔

اسی نوعیت کی ایک جنگ ۱۰۸۶ء میں ہوئی۔ اس موقع پر پیش آنے والے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسیحی حکمراں الاذفونش ششم (Alfonso VI) نے آغاز جنگ سے پہلے ایک خواب دیکھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک ہاتھی پر سوار ہے، اس کے سامنے ایک طبل ہے جس کو وہ بجا رہا ہے۔ اس نے اپنا یہ خواب پادریوں سے بیان کیا۔ مگر وہ اس کی تعبیر نہ بتا سکے۔

اس کے بعد اس نے ایک مسلمان عالم کو بلایا جو خواب کی تعبیر جانتا تھا۔ مسیحی بادشاہ نے اس کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ مسلمان نے تعبیر سے معذرت چاہی۔ مگر بادشاہ نے اصرار کیا۔ مسلمان نے سورہ الفیل اور سورہ المدثر (آیت ۸) کی روشنی میں اس کی تعبیر یہ بتائی کہ تم نے جو لشکر جمع کیا ہے وہ سب ہلاک ہوگا۔

مسیحی بادشاہ کے پاس اس وقت جو لشکر تھا اس کے فوجیوں کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ بادشاہ جب اپنی فوج کے سامنے آیا اور اس کو دیکھا تو اس کے اندر اپنی قوت پر ناز پیدا ہوگیا۔ اس نے دوبارہ مذکورہ مسلمان عالم کو بلایا اور کہا کہ میرے اس لشکر کو دیکھو۔ اپنے اس عظیم لشکر کے ساتھ میں تمہارے پیغمبر کے لشکر سے لڑوں گا اور اس کو شکست دے کر رہوں گا۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

وقال لبعض المسلمين. هذا الملك هالك وكل من معه. وذكر قول رسول الله صلى الله عليه وسلم. ثلاث مهلكات (الحديث) وفيه: وإعجاب المرء بنفسه.

مسلمان عالم نے کچھ مسلمانوں سے کہا کہ یہ بادشاہ ہلاک ہونے والا ہے اور اس کے سب ساتھی بھی۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کی جس میں ہے کہ تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے آدمی کا اپنے اوپر فخر کرنا۔

اس جنگ کی تفصیل عظمت اسلام (صفحہ ۹۲ - ۲۹۰) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ زلاقہ کے مقام پر دونوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ مسیحی فوج کی تعداد ۵۰ ہزار تھی اور مسلم فوج کی تعداد ۲۰ ہزار۔ مگر مسیحی فوج کو مکمل شکست ہوئی۔ مسیحی فوج میں سے صرف ۳۰۰ سوار بچ کر اپنے ملک کو واپس جاسکے اور مسلمانوں نے ان کا تمام مال، ہتھیار اور جانور وغیرہ غنیمت میں حاصل کیا (ولم یرجع من الفرنج الی بلادھم غیر ثلاث مائۃ فارس وغنم المسلمون کل مالھم من مال وسلاح ودواب وغیرذالک) الکامل فی التاریخ، تالیف ابن اثیر، جلد ۱۰، صفحہ ۵۴ - ۱۵۱

انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، انسان کے لئے مناسب رویہ صرف تواضع کا رویہ ہے۔ فخر و ناز کا رویہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو تواضع کی روش اختیار کرے۔ جو لوگ فخر و ناز کی روش اختیار کریں۔ وہ یقینی طور پر تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔

تواضع کی روش آدمی کے اندر حقیقت پسندی پیدا کرتی ہے۔ وہ آدمی کو اس وہم سے بچاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کرکے بے جا اقدام کر بیٹھے اور پھر ہلاکت سے دوچار ہو۔ تواضع کی کیفیت جس آدمی کے اندر ہو وہ کبھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوگا، بلکہ سنجیدگی اور تحمل کے ساتھ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ ایسا آدمی بے جا خود اعتمادی میں مبتلا نہیں ہوگا بلکہ لوگوں سے مشورہ کرکے صحیح رائے تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔

فخر و ناز کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو آدمی فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوگا۔ اس کے اندر بے جا خود اعتمادی ہوگی۔ وہ اپنے بارہ میں غلط اندازہ کا شکار رہے گا۔ وہ کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔ وہ غیر ضروری طور پر لوگوں سے ٹکرائے گا اور اپنی غیر سنجیدہ حرکات سے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بناتا رہے گا۔ جن لوگوں کے اندر اس قسم کے اوصاف ہوں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں ہلاکت کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

غلطی کہاں ہے

مولانا امین احسن اصلاحی (مقیم لاہور) کو ایک بار فرصت کے ساتھ علامہ اقبال کو پڑھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزارلیا۔ اس مطالعہ کے نتیجہ کے طور پر طویل عرصہ تک ایک خاص کیفیت مولانا اصلاحی پر طاری رہی۔ وہ اپنے تاثرات کا اظہار بھی برملا اور واشگاف الفاظ میں کرتے رہے۔ چنانچہ ایک بار فرمایا: اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اس امت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہماشما کے کرنے سے کیا ہوگا (ماہنامہ حکمت قرآن، لاہور، جولائی ۱۹۹۵، صفحہ ۱۷)

مولانا امین احسن کا یہ تبصرہ تاریخی طور پر درست نہیں ہے کہ اقبال کی حُدی خوانی سے مسلم قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اصل حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم نہ صرف ٹس سے مس ہوئی بلکہ وہ حرکت وعمل کا سیلاب بن گئی۔ اس کے بحر کی موجوں میں طوفانی اضطراب کا سماں پیدا ہوگیا۔ اقبال کو خود اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بارے میں کہا:

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا　　ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی "بانگ درا" سے کاروان ملت نہ صرف جادہ پیما ہوا بلکہ اس نے ایک عالم کو زیر وزبر کردیا۔ اقبال کے یہ الفاظ ان کے بارہ میں کسی مبالغہ کے بغیر درست ہیں:

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

واقعات کا تاریخی مطالعہ غیر مشتبہ طور پر اس کی صداقت کو ثابت کرتا ہے۔ یہاں میں اس سے تعلق رکھنے والے چند حوالوں کی طرف مختصر اشارے کروں گا۔

اس سلسلہ میں پہلی مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان کے نام پر برصغیر ہند میں جو دھواں دھار تحریک اٹھی وہ براہ راست طور پر اقبال کی دین تھی۔ یہ اقبال ہی کے افکار تھے جنھوں نے مسلمانان ہند کے اندر پاکستان کے حق میں جوش وخروش پیدا کیا۔

اقبال کے شارح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "نقوش اقبال" کے دیباچہ

میں لکھتے ہیں کہ انھیں اسلام کے اس عظیم شاعر کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک تفصیلی اور تاریخی ملاقات کا موقع ملا تھا۔ یہ ملاقات ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ کو لاہور میں علامہ اقبال کے مکان پر ہوئی۔

حضرت مولانا علی میاں کے بیان کے مطابق، اقبال نے (پاکستان کے وجود میں آنے سے دس برس پہلے) پاکستان کے بارے میں فرمایا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ دین و تہذیب حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتی ہے۔ اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے، اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے۔ (نقوش اقبال، لکھنؤ، ۱۹۸۵، صفحہ ۳۷)

اقبال کے تمام پرستار، خاص طور پر، پاکستان کے تمام علماء اور دانشور فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اقبال پاکستان کے حقیقی بانی ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ حکمت قرآن (لاہور) کے مذکورہ شمارہ میں "مصور پاکستان" کے عنوان کے تحت ایک مضمون چھپا ہے جس میں پاکستان کے ایک مشہور بزرگ لکھتے ہیں:

"اقبال نے برصغیر ہند و پاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی، بلکہ کہنا چاہئے کہ سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہ دوررس و دوربیں تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانہ کی رفتار کو پہچان کر (۱۹۳۰ میں) مسلمانان ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندستان کے کم از کم شمال مغربی گوشہ میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم ہو جائے۔ پاکستان کے ساتھ علامہ اقبال کا تعلق صرف مصور کا نہیں، اس سے کہیں زیادہ ہے، انھوں نے موجود الوقت حالات میں مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمہ کی پیروی کے لئے صحیح ترین وکیل کو ڈھونڈ نکالا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہ دوررس نے مسلمانان ہند کی قیادت عظمیٰ کے لئے محمد علی جناح کو تاکا بلکہ خود ان میں اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اس طرح علامہ اقبال نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصور پیش کیا بلکہ اس کے خاکہ میں رنگ بھرنے کی عملی جد و جہد کے ابتدائی مراحل میں بنفس نفیس شرکت بھی کی۔ اور گویا تحریک پاکستان کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے" (صفحہ ۹ - ۱۰)

اقبال کے تمام معتقدین کا متفقہ طور پر یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کی تحریک میں جان ڈالنے والی شخصیت صرف علامہ اقبال کی تھی۔ اقبال کی "حدی خوانی" نے لوگوں کے اندر ایک "اسلامی وطن" حاصل کرنے کی سرشاری پیدا کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ مملکت وجود میں آگئی۔ ایسی حالت میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان اقبال کی حدی خوانی سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

اس کے علاوہ بے شمار لوگ ہیں جو اقبال کے پرجوش کلام کو پڑھ کر "مجاہد" بن گئے۔ مثلاً کشمیر کے مسلمان ۱۹۸۹ سے بزعم خود جس خونی جہاد میں مشغول ہیں اس کی تحریک انھیں اقبال ہی کے کلام سے ملی ہے۔ بوسنیا کے لیڈر اور مجاہد عالیجاہ عزت بیگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ موجودہ انقلابی جدوجہد کا جذبہ ان کے اندر اقبال کے کلام کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر ہی آیا تھا۔ افغانستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں کے مجاہدین کو بھی اقبال کے فارسی کلام سے جنگ و جہاد کا حوصلہ ملا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ اقبال کی رجز خوانی کے بالواسطہ اثرات کی فہرست بھی کم نہیں۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پورے ہندستان کو ہلا دیا تھا، وہ بھی اقبال کے کلام سے متاثر تھے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی جن کے متعلق ان کے معتقدین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کوشش سے ایک نیا عالمی عہد پیدا کر دیا، وہ بھی اپنے اقرار کے مطابق، اقبال کے کلام سے فیضیاب ہوئے تھے۔ پاکستان کے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آجکل عالمی خلافت کی ہنگامہ خیز تحریک چلا رہے ہیں وہ بھی بار بار یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ انھوں نے اقبال کے کلام سے غیر معمولی طور پر اثر قبول کیا ہے۔ وغیرہ۔

ان حقائق کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مولانا امین احسن اصلاحی کا مذکورہ جملہ اصل واقعہ کی معکوس ترجمانی ہے۔ حقیقی صورت حال برعکس طور پر یہ ہے کہ اقبال کی حدی خوانی نے امت کو حرکت و عمل کا سمندر بنا دیا۔ ان کی حدی خوانی سے نئے ملک وجود میں آئے۔ سر دھڑ کی بازی لگانے والوں کی فوج کی فوج تیار ہوگئی۔ کتنے ممولے شہباز سے لڑگئے۔ اور کتنے مردِ مومن آتش نمرود میں کود پڑے۔ مزید یہ کہ ان کی اس انقلابی فیض رسانی کا سلسلہ آج تک بدستور مختلف صورتوں میں جاری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس واضح واقعہ کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی نے مذکورہ قسم کا برعکس تاثر کیوں ظاہر کیا۔ اس کی سادہ سی وجہ نتیجہ اور عمل کا فرق نہ سمجھنا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اقبال کے کلام نے بھرپور طور پر مسلمانوں کو متحرک کیا اور ان کو عمل کے راستہ پر ڈالا۔ البتہ اس عمل کا مطلوب نتیجہ امت کو نہیں ملا۔ مولانا اصلاحی اور ان کے جیسے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ نتیجہ کے فقدان کو عمل کا فقدان قرار دے رہے ہیں۔

نتیجہ کے فقدان کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے نام سے اقبال کے خوابوں کا ملک بن گیا۔ مگر وہ ملت اسلام کی شوکت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ مختلف ملکوں میں اقبال کے نوجوانوں نے شیری دکھائی۔ حتی کہ وہ بے خطر نمرود کی دہکائی ہوئی آگ میں کود پڑے۔ مگر ان کی موت امت کو زندگی دینے کا سبب نہیں بنی۔ اقبال کی ضرب کلیم اور بانگ درا سے ہمالیائی شخصیتیں اور آفاقی تحریکیں وجود میں آئیں مگر وہ ملت مسلمہ کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

معلوم ہوا کہ جو چیز مفقود ہے وہ نتیجۂ عمل ہے نہ کہ خود عمل۔ اقبال کے پرستاروں کو چونکہ مطلوب نتیجہ دکھائی نہیں دیتا، اس لئے وہ غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ عمل بھی ظہور میں نہیں آیا۔ حالاں کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے وہ مسلسل طور پر جاری ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی رہنمائی ہی درست نہ تھی۔ انھوں نے جس راستہ پر قوم کو دوڑایا وہ منزل کی طرف جانے والا راستہ ہی نہ تھا۔ اس لئے سو سال تک دوڑنے کے باوجود منزل بھی سامنے نہیں آئی۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں کے مسائل کا حل جغرافیہ کی تقسیم نہ تھا بلکہ خود مسلمانوں کو تعلیم ترقی کے راستہ میں آگے بڑھانا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کو شہباز و شاہین سے لڑانا نہ تھا بلکہ شہباز و شاہین کو دعوت حق کا مخاطب بنانا تھا۔ مسلمانان ہند کی ضرورت شاعرانہ حدی خوانی نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ سنجیدہ نثر میں ان کے فکر و شعور کو تربیت دے کر انھیں زمانۂ جدید کا شہری بنایا جائے۔ امت مسلمہ کے کرنے کا کام یہ نہ تھا کہ اپنے آپ کو الگ قوم اور دوسروں کو الگ قوم بتا کر علیحدہ جغرافی گوشہ میں سمٹ جائیں۔ بلکہ ان کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ ساری انسانیت کو ایک سمجھیں اور تمام قوموں کو ایک آفاقی تہذیب کے تحت لانے کی کوشش کریں۔

خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو حقیقت پسندی کی خوراک درکار تھی۔ مگر اقبال نے مسلمانوں کو جذباتی ہلچل اور رومانی پرواز کی خوراک دی۔ ایسی الٹی رہنمائی کا انجام وہی ہو سکتا تھا جو ہوا ــــ اقبال کا کیس غلط رہنمائی کا کیس ہے نہ کہ رہنمائی کو قبول نہ کرنے کا کیس۔

شیخ سعدی شیرازی کا ایک شعر اقبال اور ان کے کروروں متبعین پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ سعدی نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا کہ وہ زیارت کعبہ کے ارادہ سے سفر کر رہا ہے۔ مگر اس کا سفر الٹی سمت میں ہے۔ انھوں نے اس سے کہا کہ اے اعرابی، مجھے اندیشہ ہے کہ تم کعبہ تک نہ پہنچ سکو گے۔ کیوں کہ تم جس راستہ پر چل رہے ہو وہ راستہ برعکس رخ پر ترکستان کی طرف جا رہا ہے:

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

یہی اقبال نے زیادہ بڑے پیمانے پر کیا۔ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں کو تعلیمی جہاد کی ضرورت تھی مگر اقبال نے مسلمانوں کو سیاسی جہاد کا سبق دیا۔ مسلمانوں کے اندر سب سے پہلے فکری انقلاب لانا تھا۔ مگر اقبال نے مسلمانوں کو خارجی ہنگاموں میں ڈال دیا۔ مسلمانوں کو آج حقیقت پسندی کی خوراک درکار تھی مگر اقبال نے انھیں ہوائی اچھل کود میں مصروف کر دیا۔ مسلمانوں کو زمانہ سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنی کامیابی کا منصوبہ بنانا تھا مگر اقبال نے سکھایا کہ زمانہ سے لڑکر اس کے نظام کو توڑ پھوڑ ڈالو۔ مسلمانوں کو ہر اعتبار سے داخلی تیاری کی ضرورت تھی مگر اقبال نے اچانک مسلمانوں کو اقدام کے میدان میں دوڑا دیا۔ "گلوبل ویلیج" کے دور میں سارا عالم مسلمانوں کے لئے میدان عمل بن چکا تھا مگر اقبال نے مسلمانوں کو سبق دیا کہ تم ایک جغرافی گوشہ حاصل کرکے اس کے اندر محدود ہو جاؤ، وغیرہ۔

اقبال کے لفظی جوش و خروش نے مسلمانوں کے اندر زبردست ہلچل پیدا کی۔ مگر یہ ہلچل غلط سمت میں تھی، اور جو ہلچل غلط سمت میں ہو وہ لوگوں کو صحیح سمت میں لے جانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اور نہ اس عالم اسباب میں اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

سب سے مشکل، سب سے آسان

"تم نے غلطی کی" اور "میں نے غلطی کی" ان دونوں جملوں میں ظاہر کے اعتبار سے صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ پہلا جملہ کہنے والے کروروں انسان دنیا میں موجود ہیں، مگر دوسرا جملہ کہنے والا شاید کوئی ایک شخص بھی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ دوسرے شخص کی نفی کرتا ہے اور دوسرا جملہ خود قائل کی نفی کرتا ہے۔ اور دوسرے کی نفی کرنا بلاشبہ سب سے زیادہ آسان کام ہے، اور اپنی نفی کرنا بلاشبہ سب سے زیادہ مشکل کام۔

موجودہ زمانہ کی وہ تمام تحریکیں جن کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے، وہ سب وہی تحریکیں ہیں جو "تم نے غلطی کی" کے نعرہ پر اٹھیں۔ تمام مقبول تحریکوں اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کی مقبولیت کا واحد راز یہ ہے کہ وہ باہر کے کسی شخص یا قوم کو غلط ثابت کرنے کے لئے اٹھے۔ اگر وہ خود اپنی نفی کرنے کا پیغام لے کر اٹھتے تو وہ اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتے، نہ یہ کہ ان کے گرد انسانوں کی بھیڑ اکٹھا ہو۔

"تم نے غلطی کی" ایک جھوٹا کلمہ ہے، اور "میں نے غلطی کی" ایک سچا کلمہ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں جھوٹا کلمہ جڑ نہ پکڑ سکے، وہ جھاڑ جھنکاڑ بن کر رہ جائے۔ اس کے برعکس جو کلمہ سچا کلمہ ہو، وہ خدا کی اس دنیا میں جڑ پکڑتا ہے۔ وہ زمین میں بھی اپنی جگہ حاصل کرتا ہے اور آسمان کی وسعتوں میں بھی۔

"میں نے غلطی کی" معرفت کا کلمہ ہے۔ وہ آدمی کی شخصیت میں ارتقاء پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس "تم نے غلطی کی" ایک سطحی کلمہ ہے۔ وہ آدمی کو گہرے معانی سے آشنا نہیں کرتا۔ وہ آدمی کو ایک ایسے کام میں مشغول کر دیتا ہے جو سرے سے کرنے کا کوئی کام ہی نہیں۔ "میں نے غلطی کی" اصلاح ہے اور "تم نے غلطی کی" تخریب۔ "میں نے غلطی کی" خدا پرستی ہے اور "تم نے غلطی کی" نفس پرستی۔ "میں نے غلطی کی" ایک نیکی ہے اور "تم نے غلطی کی" صرف لیڈری۔ "میں نے غلطی کی" دینداری ہے اور "تم نے غلطی کی" دنیا داری۔

بڑودہ کا سفر

بڑودہ میں ۱۲-۱۳ نومبر ۱۹۹۴ کو ایک آل انڈیا سیمنار ہوا۔ اس سیمنار کا موضوع تھا ریلیجن اینڈ پالٹکس۔ اس کی دعوت پر بڑودہ کا سفر ہوا۔

بڑودہ (موجودہ نام وڈودڑا) گجرات کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس شہر کا قدیم ریکارڈ ۸۱۲ء کی ایک دستاویز میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہی سال ہے جب کہ اس وقت کے سب سے بڑے اسلامی شہر بغداد کو ایک بڑی فوج اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ یہ کسی دشمن کی فوج نہیں تھی۔ بلکہ المامون کی فوج تھی جو اپنے بھائی الامین کو عباسی تخت سے ہٹانے کے لئے اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ تقریباً ایک سال کے محاصرہ کے بعد الامین کو قتل کر دیا گیا اور المامون عباسی سلطنت کا ساتواں خلیفہ بنا۔

بڑودہ کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً دس فیصد مسلمان ہیں۔ پچھلے ہزار سال کے دوران یہ شہر مختلف سلطنتوں کے ماتحت رہا۔ اس اعتبار سے اس کا نام بھی بار بار بدلتا رہا۔ چنانچہ تاریخ میں اس شہر کے حسب ذیل مختلف نام پائے جاتے ہیں:

Vadapadraka, Chandanavati, Varavati, Vatpatraka, Baroda, Vadodara.

دہلی سے ہوائی جہاز کا وقت صبح ۶ بجے تھا۔ ۱۱ نومبر کو فجر سے پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ سڑکوں پر اور چاروں طرف سیکڑوں کی تعداد میں، بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلب جلتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ اگر سورج نکل آئے تو اچانک یہ تمام بلب یا تو بجھا دئے جائیں گے یا اپنے آپ بے نور ہو جائیں گے ——— حقیقت اعلیٰ کا ظہور وحدت پیدا کرتا ہے اور تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔ تعدد کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ ختم ہو جائے۔

فجر کی نماز ساڑھے پانچ بجے ایرپورٹ پر پڑھی۔ کچھ دیر کے بعد گیٹ کے اوپر لگے ہوئے شیشہ کے بورڈ پر جل اٹھا:

Now Boarding — 817

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمارا جہاز تیار ہے۔ مسافر ایک ایک کر کے چل کر انڈین ایرلائنز کی فلائٹ

نمبر ۸۱۷ میں داخل ہو گئے۔

دہلی سے جہاز تقریباً وقت پر روانہ ہوا۔ آسمان کے کنارے شفق کی سرخی نظر آنے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ غائب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ روشن سورج افق پر نمایاں ہوگیا۔ حسب معمول میں کاغذ نکال کر کچھ تاثرات لکھنے لگا۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے بزرگ نے کہا: آپ اردو لکھ رہے ہیں یا فارسی" میں نے پوچھا کیا آپ فارسی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ یہ مسٹر مکند دوبے (Muchkund Dubey) تھے۔ وہ فارین سروس سے ۱۹۶۹ میں ریٹائر ہوئے۔ اب وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 3718047)

انھوں نے بتایا کہ ملازمت کے زمانہ میں فارسی سیکھنے کے لئے انھیں ایران بھیجا گیا تھا۔ وہاں وہ ڈھائی سال رہے۔ انھوں نے اتنی کافی فارسی سیکھ لی کہ فارسی میں تقریر کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ فارسی کا کوئی مقولہ جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے شیخ سعدی کا یہ مقولہ لکھ دیا: چگونہ شکر نعمت گزارم کہ مردم آزاری ندارم (خدا کی نعمت کا میں کس طرح شکر ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا)

ہماری پہلی منزل احمد آباد تھی۔ یہاں جہاز اترا تو میں باہر آ گیا۔ احمد آباد کے مناظر دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ پہلی بار میں ۱۹۷۱ میں احمد آباد آیا تھا۔ دہلی سے احمد آباد کا سفر میں نے ٹرین کے ذریعہ کیا تھا۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی۔ یہ ہوائی جہاز سے میرا پہلا سفر تھا۔ اس کے بعد سے اب تک میں ۱۰۰ سے زیادہ سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ کر چکا ہوں۔ اور اگر آمد و رفت دونوں کو ملا کر شمار کیا جائے تو ۲۰۰ سے زیادہ۔

احمد آباد کا یہ سفر اگست ۱۹۷۱ میں ہوا تھا۔ الجمعیۃ ویکلی۔ ستمبر ۱۹۷۱ میں اس کی روداد شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر نامہ کا ایک سبق آموز پیراگراف یہ تھا:

"یہاں میں ایک مسلم نوجوان سے ملا۔ وہ بزنس کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنا کام کتنے سرمایہ سے شروع کیا۔ انھوں نے بتایا کہ دس روپیہ سے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اتنے کم سرمایہ سے کس طرح کام کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پر اعتماد لہجہ میں جواب دیا: زبان سچی ہو اور ایمان دل میں ہو تو سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ آپ زبان دے کر کتنا بھی سودا بازار سے اٹھا سکتے ہیں۔"

احمد آباد گجرات کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سلطان احمد شاہ نے ۱۴۱۱ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی کے نام پر اس کو احمد آباد کہا جانے لگا۔ ۱۵۷۲ء میں مغل حکمراں اکبر نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۸ء میں وہ برطانیہ کے ماتحت آگیا۔ انگریزی دور میں یہاں پہلی کاٹن مل ۶۱-۱۸۵۹ء میں قائم کی گئی۔ احمد آباد اس وقت ہندستان کا پانچواں سب سے بڑا شہر ہے۔

راستہ میں مختلف اخبار دیکھے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ نومبر) کے ادارتی صفحہ کے اوپر حسب معمول ویلیس (W.R. Wallace) کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ جو ہاتھ گہوارہ کو چلاتا ہے وہی وہ ہاتھ ہے جو دنیا پر حکومت کرتا ہے:

The hand that rocks the cradle
is the hand that rules the world.

یہی عورت کا اصل مقام ہے جو فطرت نے اس کو عطا کیا ہے۔ وہ اس نسل کو تیار کرتی ہے جو بالآخر باہر آکر دنیا کے تمام کاروبار کو سنبھالتی ہے۔ اس اعتبار سے عورت گویا معمار انسانیت ہے۔ مگر جدید تہذیب نے برابری کے مصنوعی اور غیر فطری تصور کے تحت عورت کو گھر کے اندر کے عظیم کردار سے محروم کر دیا۔ اور گھر کے باہر کا رول ادا کرنے کے قابل تو وہ تھی ہی نہیں۔

انگریزی اخبار دی ہندو (۱۲ نومبر) میں مسٹر اندرسین کے ایک آرٹیکل (ہندو ۲۲ اکتوبر) کی حمایت میں مسٹر ڈی کیبوران (مدراس) کا خط چھپا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے کانسٹی ٹیوشن کے بنانے والوں نے یہ بہت بڑا بلنڈر کیا کہ انھوں نے بالغ رائے دہی (adult franchise) کے اصول کو دستور میں جگہ دی۔ ہمارے ملک کی اکثریت جاہل اور بے شعور ہے۔ ایسی حالت میں ہر بالغ آدمی کو ووٹ کا حق دینا گویا قوم کو ایسے لیڈروں کے حوالے کرنا ہے جو خوش نما نعروں کے ذریعہ انھیں بے وقوف بناتے رہیں۔

اس کے نتیجہ میں جو سیاسی کرپشن پیدا ہوا اس کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ رومن ایڈمنسٹریٹر پبلی کولا (Publicola) جب مرا تو اس نے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی تھی جس سے اس کی آخری رسوم ادا کی جاسکیں۔ جب کہ ہمارے ملک کے حکمراں ایک بار حکومت میں آنے کے بعد اتنی دولت جمع کرلیتے ہیں جو ان کی کئی پشتوں کے عیش کے لئے کافی ہو۔

جہاز بڑودہ پہنچا تو یہاں سیمنار کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ چوں کہ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا اس لئے ٹھہرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایرپورٹ سے مسٹر عظیم بندوق والا کے ساتھ روانگی ہوئی۔ وہ مسٹر جے ایس بندوق والا کے صاحبزادے ہیں اور کمپیوٹر انجنیرنگ کا کورس کر رہے ہے۔ جب میں بڑودہ کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو یہاں کی ہر چیز مجھے دہلی کے مقابلہ میں پسماندہ نظر آئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اسی طرح دہلی، یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ شہروں کے مقابلہ میں پسماندہ محسوس ہوتا ہے۔ ذہن کا مسافر مزید آگے بڑھا تو خیال آیا کہ آدمی جب جنت کے شہر میں داخل ہوگا تو وہ پائے گا کہ پیرس اور واشنگٹن بھی مزید اضافہ کے ساتھ جنتی شہر کے مقابلہ میں انتہائی پس ماندہ تھے۔

ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ ہم لوگ اس علاقہ میں پہنچ گئے جس کو فرٹلائزر نگر کہا جاتا ہے۔ یہاں گجرات فرٹیلائزر کا وسیع گیسٹ ہاؤس (Shin Atami Guest House) ہے۔ میرے قیام کا انتظام اس کے اندر کیا گیا تھا۔ لیکن جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو ریسپشن ڈیسک پر کوئی موجود نہ تھا۔ صرف سیکورٹی گارڈ کا ایک آدمی پستول لٹکائے ہوئے گھوم رہا تھا۔ عظیم بندوق والا ڈھونڈنے کے لئے نکلے اور کچھ دیر میں ایک آدمی کو لے کر آئے۔ اس نے روم نمبر ۶ ہمارے لئے الاٹ کیا۔

ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ سرکاری گیسٹ ہاؤس ہے اس لئے یہاں ایسا پیش آیا۔ اگر یہ پرائیویٹ ہوتا تو آپ دیکھتے کہ گیٹ میں داخل ہوتے ہی ایک شخص یہاں آپ کے استقبال کے لئے موجود ہے۔

ایک گفتگو کے دوران ایک "گاندھی بھگت" نے کہا کہ مہاتما گاندھی تو دیش کے بٹوارہ کے لئے آخر وقت تک راضی نہیں تھے۔ مگر نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے دیکھا کہ انگریز مسٹر جناح کے ذریعہ آزادی میں اڑنگا لگائے ہوئے ہے۔ وہ اس اڑنگے کو استعمال کرتا رہے گا اور کبھی ہم کو آزادی نہیں دے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم لوگ ایک ایک کر کے مرجائیں گے اور بھارت کو اپنے خوابوں کا دیش نہیں بنا سکیں گے۔ اس بنا پر نہرو وغیرہ نے بٹوارہ کو مان لیا تاکہ انگریزوں کے سیاسی قبضہ سے چھٹکارا حاصل کر کے دیش کی تعمیر کی جاسکے۔

نہرو کا خواب کیا تھا۔ وہ پہلے ہی انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دیا تھا کہ میں انڈیا کو ایک سوشلسٹ انڈیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ اقتدار پر قبضہ کر کے ہم بڑے پیمانہ پر پبلک سکٹر بنائیں گے اور ہر شعبہ میں ایسے معیاری ادارے قائم کریں گے جو پرائیویٹ سکٹر کے لئے بطور نمونہ کام دے گا۔ چنانچہ نیشنل گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد نہرو اور ان کے ساتھیوں نے ملک کی دولت کا بڑا حصہ پبلک سکٹر قائم کرنے میں جھونک دیا۔ مگر چالیس سالہ تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ نام نہاد پبلک سکٹر صرف کرپشن کا ذریعہ ہے۔ مزید یہ کہ اس نے پوری قوم کو کاہل (lethargic) بنا کر رکھ دیا۔

اس طرح نہرو کی قیادت نے ملک کو دہرا نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے مسٹر جناح کے "اڑنگے" کو غیر ضروری اہمیت دی جس کے نتیجہ میں ملک کے ٹکڑے ہو گئے۔ اور دوسری طرف حاصل شدہ ہندستان کو اقتصادی تباہی کی خندق میں گرا دیا۔ نہرو کو ہندستان سے بے پناہ محبت تھی جس کا اندازہ ان کے وصیت نامہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر سوچ درست نہ ہو تو محبت بھی الٹا نتیجہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مسلم ملکوں میں بھی پیش آیا۔ مسلم ملکوں کے اسلام پسند مخلصین نے اپنی فکری غلطی کے تحت ہر جگہ سیاسی چھلانگ لگائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور جدید میں اسلامی دعوت کے تمام امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔

گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ دیواروں کے پردے ہٹا دئے۔ اس طرح کے کمروں میں عام طور پر باہر کی طرف قدرتی مناظر ہوتے ہیں۔ مگر جدید تہذیبی رواج کے مطابق، اس پر لمبا پردہ پڑا رہتا ہے۔ مجھے ایسا پردہ پسند نہیں۔ پردہ کو ہٹانے کے بعد لمبے شیشہ کے اُس پار فطرت کے ہرے بھرے مناظر دکھائی دینے لگے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسٹر بندوق والا سے گفتگو ہوئی۔

مسٹر عظیم بندوق والا گویا مسلمانوں کی "کمپیوٹر جنریشن" کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میرے گھر کے لوگ اگرچہ روایتی طور پر مذہبی رہے ہیں۔ مگر میں تو ایک ملحد (atheist) ہوں۔ میں مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتا:

I don't believe in religion.

سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ اس الحاد کے پیچھے کوئی گہرا شعور یا کوئی سوچا سمجھا فکر نہیں ہے۔ بس آزادی اس کا سبب ہے۔ ایسے نوجوانوں کو اینٹی مذہب سے زیادہ اینٹی اتھارٹی (anti authority) کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری نسل کے لوگ جب مل کر بیٹھتے ہیں تو وہ مذہب یا پالی ٹکس کی بات نہیں کرتے۔ ان کی بات چیت کا موضوع فلم، کھیل، وغیرہ ہوتا ہے

میں نے کہا کہ آپ لوگ اپنے کو لامذہب نہ کہئے بلکہ آزادی پسند کہئے۔ کیوں کہ آپ لوگوں کی لامذہبیت کے پیچھے کوئی عقلی یا سائنٹفک دلیل نہیں ہے۔

یہاں انڈین ایکسپریس کا بڑودہ اڈیشن (۱۲ نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس میں لیٹرس کے کالم میں احمد آباد کے مسٹر سد صیر تر ویدی کا خط تھا۔ انھوں نے ایک صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سردار پٹیل کو انڈیا کا لوہ پرش (Iron Man) کہا جاتا ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کو سنہہ پرش (Lion man) کہا جائے۔ یعنی شیر ہند۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے سر فضل الحق کو شیر بنگال کہا۔ کچھ لوگوں نے شیخ عبد اللہ کو شیر کشمیر کا لقب دیا۔ وغیرہ۔ مگر شیروں کی اس کثرت کے باوجود ہمارے ملک کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہمیں دھاڑنے والے شیروں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایسے خاموش انسانوں کی ضرورت تھی جو تدبیر اور حکمت کے ساتھ ملک کو ترقی کی طرف لے جانے کا منصوبہ بنائیں۔

۱۲ نومبر کو دوپہر سے پہلے میں بڑودہ پہنچ چکا تھا۔ ایک بجے گیسٹ ہاؤس کا آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ کھانا تیار ہے۔ میں کمرہ سے نکلا تو دروازہ کا تالا بند کرنے کے لئے چابی موجود نہیں تھی۔ میں نے آدمی سے کہا کہ "چابی تو تم نے دی نہیں"۔ اس نے جواب دیا: "چابی کا ضرورت نہیں صاحب"۔ چنانچہ میں دروازہ مقفل کئے بغیر نیچے اتر گیا۔

کھانے کی میز پر میں اور پروفیسر رشید الدین صاحب (جامعہ ہمدرد) تھے۔ جو آدمی کھانا رکھ رہا تھا، اس سے میں نے نام پوچھا۔ اس نے کہا "عبدل بھائی"۔ میں نے کہا کہ یہ تو اصل نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس نے کہا کہ میرا اصل نام عبدالغنی ہے۔ یہاں لوگ مجھ کو عبدل بھائی کے نام سے پکارتے ہیں۔

پروفیسر رشید الدین ایک ذی علم اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے قصے سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۴ کو کانپور میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ اس جلسہ کے صدر جن ستا کے اڈیٹر مسٹر پربھاش جوشی تھے۔ اور پروفیسر رشید الدین اس میں مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کی بنیاد چار چیزوں پر ہے ــــــ علم، عقل، عدل، رحیمیت (compassion)۔ پربھاش جوشی جو پہلے سے پروفیسر رشید الدین کو جانتے تھے، انھوں نے آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مجھے اگر پروفیسر رشید الدین جیسے ۱۰۱ مسلمان مل جائیں تو میں اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔

پروفیسر رشید الدین نے الرسالہ مشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کا دل جیتا جائے۔ آج ہمیں کنفرنٹیشن کی نہیں بلکہ پرسویشن (Persuasion) کی ضرورت ہے۔

۱۲ نومبر کی شام کو میں اپنے کمرہ کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ یہ دروازہ ایک پارک کی طرف کھلتا تھا۔ دور تک پھول اور درخت اور ہریالی کا منظر تھا۔ میں نے سوچا کہ پارک اس گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی رونق ہے۔ عمارت کے ساتھ اگر یہ "باغ" نہ ہو تو گیسٹ ہاؤس بالکل سونا دکھائی دینے لگے۔

یہ سوچتے ہوئے قرآن کی آیت یاد آئی : ومساکن طیبۃ فی جنات عدن۔ ان الفاظ میں قرآن نے جنت کی منظر کشی کی ہے۔ یعنی جنت میں پاکیزہ مکانات ابدی باغوں میں ہوں گے۔ ایک عمدہ مکان کے بارہ میں انسان کا تصور یہی ہے کہ وہ باغ کے درمیان ہو۔ انسانی تخیل آج بھی اس سے آگے نہ جا سکا۔ قرآن یا اسلام کی صداقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی ہر بات اپنے آخری معیار پر ہے۔ کوئی فلسفی یا کوئی آرٹسٹ کسی بھی چیز میں قرآن کے معیار سے آگے کا معیار پیش کرنے پر قادر نہیں۔

۱۲ نومبر کی شام کو کھانے کا اجتماعی نظام جیوتی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ مغرب کی نماز سے فراغت کے بعد پروفیسر رشید الدین، پروفیسر امریک سنگھ اور میں کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ یہ

تقریباً آدھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ راستہ میں دونوں صاحبان بات کرتے رہے۔ میں زیادہ تر ان کی باتیں سنتا رہا۔

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ گری لال جین (سابق اڈیٹر ٹائمس آف انڈیا) سے میری بہت باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اسلام کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام صرف اپنے کو برحق بتاتا ہے، باقی جتنے مذہب ہیں سب اس کے نزدیک کمتر یا غلط ہیں۔ پروفیسر امریک سنگھ نے ان کو جواب دیا کہ تم یہ نہ دیکھو کہ کتابوں میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تمام آدمی سماجی دباؤ (social compulsion) کے تحت کام کرتے ہیں۔ مسلمان اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ سماجی دباؤ مسلمانوں کو اپنے آپ معتدل بنا دیتا ہے۔

پروفیسر رشید الدین نے کہا کہ یہ صرف اسلام یا مسلمانوں کی بات نہیں۔ جب بھی آدمی کسی راستہ کو اختیار کرتا ہے تو اس کو یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ یہی واحد راستہ ہے:

It is the only right path.

آدمی کو جب تک اپنے مذہب پر یقین نہ ہو وہ اس کو پوری طرح اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے لوگوں کو اپنے اپنے یقین پر رہنے دیجئے۔ البتہ ان کو یہ بتائیے کہ اپنے مذہب پر یقین رکھتے ہوئے تم دوسرے مذہب والوں کا احترام کرو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہماری گاڑی جیوتی گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوگئی۔ یہ شہری ماحول کے درمیان گویا ایک نخلستان تھا۔ یہاں خوبصورت لان میں لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے کھانا کھایا۔ یہاں تمام لوگ صرف انگریزی زبان استعمال کر رہے تھے۔ یہاں ہر چیز "انگلش" معیار پر نظر آئی۔

میں نے سوچا کہ ہندستان دو ہندستان ہے۔ ایک وہ ہندستان جس میں اس ملک کے ۹۵ فیصد لوگ رہتے ہیں۔ دوسرا وہ جس میں صرف پانچ فیصد لوگ آباد ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے۔ مگر آزادی کے بعد جو ہندستان بنا وہ عملاً اس کے برعکس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ ہندستان ہو یا اور کوئی ملک، محض سیاسی حکمرانوں کی تبدیلی سے سماجی حالات نہیں بدل سکتے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر آگئے۔ خلاف معمول آج مجھے دیر میں نیند آئی۔ میری حالت اس انسان کی سی تھی جو نہ مروجہ ماحول میں خوش رہ سکے۔ اور نہ وہ دوسرا ماحول اپنے موافق بنانے پر قادر ہو۔

سیمنار میں شریک ہونے والے لوگوں سے، نیز شہر کے اہل علم سے مختلف اوقات میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان سے جو باتیں ہوئیں ان میں سے کچھ مختصر طور پر یہ ہیں۔

ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ جین دھرم کے بانی مہاویر ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے۔ ان کا گرنتھ بہت دنوں تک زبانی طور پر چلتا رہا۔ صرف ایک ہزار سال پہلے اس کو لکھا گیا۔ ہندوؤں کے وید اور بھی ہزاروں سال پہلے سے ہیں۔ مگر وہ بھی صرف پہلی صدی عیسوی میں لکھے گئے۔ ایسی حالت میں کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ جین دھرم اور ہندو دھرم کے جو گرنتھ پستکوں کی صورت میں ہمارے پاس ہیں وہ ٹھیک وہی ہیں جیسا کہ وہ شروع میں تھے۔ زبانی روایت میں ہمیشہ بات بدل جاتی ہے۔ اس لئے ان گرنتھوں میں بھی ضرور تبدیلی آئی ہوگی۔ پھر انھوں نے کہا کہ قرآن میں بھی ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آج جو قرآن ہے وہ وہی نہیں ہوسکتا جو پیغمبر صاحب کے زمانہ میں تھا۔

میں نے کہا کہ دوسرے مذہب کے گرنتھوں کے بارہ میں آپ کی بات درست ہے۔ مگر قرآن کے بارہ میں تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں۔ کیوں کہ قرآن جب اترتا تھا اسی وقت وہ لکھ بھی لیا جاتا تھا۔ دوسرے مذہبی گرنتھوں کے برعکس، قرآن وہ استثنائی کتاب ہے جس میں تلاوت اور تحریر دونوں اول دن سے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس لئے قرآن میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ ہم دنیا میں ایک بلین سے زیادہ ہیں۔ اگر سب مل کر کام کریں تو ہم بہت بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے چند تجویزیں پیش کیں ــــ مسلم ممالک اپنے درمیان کامن ڈیفنس کا ایک نظام بنائیں۔ مسلمان اپنی ایک عالمی نیوز ایجنسی قائم کریں۔ مسلم ملکوں کی ایک یونائیٹڈ آرگنائزیشن ہو۔ مسلم ملکوں کا ایک سنٹرل بینک بنایا جائے۔ مسلم ملکوں کا ایک کامن مارکٹ قائم کیا جائے۔ اس قسم کی کچھ بڑی بڑی تجویزیں پیش کرنے کے بعد انھوں نے کہا:

A beginning has to be made. Let us make a beginning.

میں نے کہا کہ یہ آغاز نہیں ہے۔ آپ اختتام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ آغاز تو ہمیشہ ابتدا سے ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ایک ہی نقطۂ آغاز ہے، اور وہ تعلیم ہے۔ ہمارے درمیان جب تک تعلیم عام نہ ہو جائے، کوئی بھی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کی غیرتِ ملّی کے خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غیرتِ ملّی کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ حیثیتِ ملّی کا مسئلہ ہے۔

مسلمان عام معنوں میں کوئی قوم نہیں ہیں۔ وہ پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان کو دعوت کا وہ کام انجام دینا ہے جس کے لئے پیغمبر آیا کرتے تھے۔ مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ ایک قوم اور دوسری قوم کا۔

مسلمان کی یہی حیثیت اس کے اوپر لازم کر دیتی ہے کہ وہ اپنی مدعو قوموں کی زیادتیوں پر صبر کرے۔ اس ملک میں مسلمان پندرہ فیصد ہیں اور غیر مسلم پچاسی فیصد۔ ایسی حالت میں لازماً ایسا ہوگا کہ دوسروں کی طرف سے مسلمانوں کو ناخوشگاری یا زیادتی کا تجربہ ہوگا۔ اس ناخوشگاری یا زیادتی کے مقابلہ میں انھیں دَعْ اَذَاھُم کے قرآنی اصول پر عمل کرنا ہے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں تو اس کے بعد ان کا امت محمدی ہونا خدا کی نظر میں غیر متحقق ہو جائے گا۔ جو ماں اپنے بچہ کی باتوں کو برداشت نہ کرے وہ ماں ہی نہیں۔

ایک طالب علم نے کہا کہ آج کا نوجوان پیچھے کی طرف نہیں دیکھتا۔ وہ صرف آگے کے بارہ میں سوچتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ہمارے کتنے نوجوان ایسے ہیں جو سائنٹفک ریسرچ میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تو آج تک کوئی اسٹوڈنٹ ایسا نہیں ملا جو یہ کہے کہ میں اپنی زندگی سائنسی ریسرچ کے لئے وقف کر دوں:

My intention is to devout my life in scientific research.

میں نے کہا کہ پھر آپ کو یہ کہنا چاہئے کہ آج کا نوجوان صرف پیسہ یا کیریر کے بارہ میں سوچتا ہے۔ یہ آگے کی طرف سوچنا نہیں ہے۔ آگے کی طرف سوچنا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں ریسرچ کا شوق ہو۔

۔ وہ نئی نئی چیزیں دریافت کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دنیا کو کوئی نیا سائنسی تحفہ دینے کا حوصلہ رکھیں۔

۱۳ نومبر کی صبح کو ہم لوگ اپنی قیام گاہ سے وانیجیا بھون (ریس کورس سرکل) لے جائے گئے یہاں کے ہال میں ساڑھے نو بجے سمینار کا پہلا سشن شروع ہو رہا تھا۔ اس کے چیئر پرسن پروفیسر رشید الدین خاں تھے۔ اس کا موضوع تھا —— کیا پالٹکس اور مذہب کو الگ کیا جا سکتا ہے:

Can politics and religion be separated?

انیس آدمیوں نے اس بحث میں حصہ لیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ سمینار گویا ذہنوں کا اختلاط (interaction of minds) ہے۔ تاہم میرا تجربہ ہے کہ یہ اختلاط تو ہے مگر وہ اتحاد نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ کا ہر فرد خود پسند (egoist) ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ لوگوں کو کسی ایک نقطۂ نظر پر متفق کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس سمینار میں ہر آدمی نے کوئی ایک پہلو لے کر اس پر ایک خوبصورت تقریر کر ڈالی۔ چند باتیں بطور مثال یہاں نقل کی جاتی ہیں:

۔ ایک صاحب نے کہا کہ اجودھیا میں رام رحیم ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا کے تمام مسائل کی جڑ جہالت اور ناخواندگی ہے۔ کسی نے کہا کہ تمام مسائل کی جڑ اقتصادی پسماندگی ہے۔ کسی نے مذہب کو، کسی نے پولٹیکل کرپشن کو، کسی نے پارٹیشن کو، کسی نے سیکولر کانسٹی ٹیوشن کو ساری خرابیوں کا ذمہ دار بتایا۔

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ جس دن مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا جائے گا اس دن انڈیا تباہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے ملانے ہی کی وجہ سے انڈیا تباہ ہوا ہے، اس لئے دونوں کو الگ کر دینا ضروری ہے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے مذہب کو اس کے اصل پہلو کے لحاظ سے لیا تھا اور آجکل کے لوگ مذہب کو سیاسی استحصال کے لئے لے رہے ہیں۔

ایک صاحب کی بات کے جواب میں میں نے کہا کہ سیاست وہی ہے جو حالات کے اعتبار سے قابل عمل ہو۔ موجودہ حالات میں مذہبی سیاست قابل عمل نہیں۔ کیوں کہ اس کے موافق ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں۔ اس وقت ہم جن حالات کے درمیان ہیں اس میں قابل عمل سیاست صرف ایک ہے، اور وہ سیکولر سیاست ہے۔

۱۲ نومبر کی سہ پہر کو دوسرا سشن تھا۔ اس کا موضوع تھا : ہیومن رائٹس اینڈ ریلیجن۔ اس سشن میں مجھ کو لیڈ اسپیکر بنایا گیا تھا۔ جب کارروائی شروع ہوئی اور میرے بولنے کا وقت آیا۔ تو میرے پاس بیٹھے ہوئے پروفیسر گوہن نے کہا کہ صبح کے سشن میں آپ نے "ہندی" میں تقریر کی۔ میرا تعلق کیرالا سے ہے اور میں ہندی بالکل نہیں جانتا۔ اس لئے آپ انگریزی میں بولیں تاکہ میں بھی سمجھوں :

Dr. S. Guhan, Institute of Development Studies
79, Second Main Road, Gandhi Nagar,
Adyar, Madras 600 020 (Tel. 4914191)

میں نے پہلے سے انگریزی میں بولنے کی تیاری نہیں کی تھی۔ مگر ڈاکٹر گوہن کے کہنے پر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے انگریزی ہی میں بولنا ہے۔ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کے بعد تقریر شروع کی۔ خدا کے فضل سے دیر تک نہایت کانفیڈنس کے ساتھ انگریزی میں بولتا رہا۔ ڈاکٹر گوہن بہت خوش ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ انشاء اللہ آپ کو انگریزی لٹریچر بھیجنے کی کوشش کی جائے گی۔

میں نے ۹ نومبر کے ٹائمس آف انڈیا کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں مسٹر روسی مودی (Russi Mody) کا ایک بیان چھپا ہے۔ وہ ایرانڈیا اور انڈین ایرلائنز کے مشترک چیرمین مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ دونوں ہوائی کمپنیوں کے بڑھتے ہوئے مسائل کو کس طرح حل

1. Soli Sorabjee, New Delhi
2. Madhu Mehta, Bombay
3. Maulana Wahiduddin Khan, New Delhi
4. Dharma Kumar, New Delhi
5. Veenaben, New Delhi
6. Kaokab Durry, New Delhi
7. Rasheeduddin Khan, New Delhi
8. Nirmal Verma, New Delhi
9. Satish Chandra, New Delhi
10. Amrik Singh, New Delhi
11. Nagindas Sanghavi, Bombay
12. Arvind Deshpande, Bombay
13. Nikhil Wagle, Bombay
14. Teesta Setalvad, Bombay
15. S. Guhan, Madras
16. M.N. Srinivas, Bangalore
17. Sofia Khan, Ahmedabad
18. Narayan Sheth, Ahmedabad
19. Manubhai Pañcholi, Ahmedabad
20. Vishnu Pandya, Ahmedabad
21. Hasanali Firashta, Surat
22. Joseph Mecwan, Anand
23. Chunibhair Patel, Baroda
24. V.N. Kothari, Baroda
25. Tulsi Boda, Baroda
26. Bhaskar Vyas, Baroda
27. I.G. Patel, Baroda
28. Nanubhai Amin, Baroda
29. G.N. Devy, Baroda
30. Alaknanda Patel, Baroda
31. J.S. Bandukwala, Baroda
32. Sanjeev Shah, Baroda

کریں گے، خاص طور پر پائلٹوں کے مسائل جو آئے دن اسٹرائک کرکے سارا نظام درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں یونین کے پاس صنعتی تعلقات پر لکھی ہوئی بہترین کتاب کے ساتھ جاؤں گا۔ یہ بائبل ہے۔ اس کے مشہور دس احکام میں سے دو یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو، اور اپنے پڑوسی سے اسی طرح محبت کرو جیسی محبت تم اپنے لئے پسند کرتے ہو:

Iwill go to the unions by the best book on industrial relation ever written — The Bible. As two of the ten commandments say: do unto others as you would do unto yourself, and love your neighbour as you would love yourself.

میں نے کہا کہ یہ دونوں حکم تمام مذہبوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ بلاشبہ سماجی اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ اخلاقی اصول لوگوں کی زندگیوں میں آجائے تو تمام سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

میرا مقالہ اور میری یہ تقریر دونوں ہی سیمنار کے منتظمین نے اپنی رپورٹ کے ساتھ شائع کر دی ہیں۔ ان کا پتہ یہ ہے:

12 Amee Society
Old Padra Road
Baroda 390015

مسٹر الکنندا پٹیل (Alaknanda Patel) مسلم صوفیوں سے متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ پیغمبر اسلام کے بارہ میں بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کا خلاصہ ایک لفظ "اخلاق" میں بتایا تھا۔ اور راما کرشنا دیو نے دھرم کا خلاصہ ایک لفظ میں مہربانی بتایا:

The Prophet of Islam is supposed to have summarised his philosophy with one word, 'Akhlaq', - sincerity, and Ramakrishnadev with the word 'compassion'.

نئی دہلی کی وینا بہن (Tel. 4620066) نے یونیفارم سول کوڈ کے بارہ میں کہا کہ مسلمانوں کے اوپر جبراً ایک سول کوڈ لاگو کرنا اس وقت الٹا نتیجہ پیدا کرے گا۔ ان کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ آزادانہ طور پر خواہ یونیفارم سول کوڈ کے تحت اپنے نکاح کو رجسٹر کروائیں یا مسلم پرسنل لا کے تحت:

Imposing a civil code on Muslims will produce a negative result at this moment. An option should be thrown open and they should be free to get their marriages registered under either uniform civil code or Muslim personal law.

مسٹر مدھو مہتا نے کہا کہ پالی ٹکس آج کریمنل لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ پولیس کو اپنے مجرمانہ منصوبوں کے لئے ٹول کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کو یہ کہنا پڑا کہ مجھ کو پولیس سے بچاؤ۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق چیف جسٹس مسٹر وینکٹ چلیا (Mr. Venkatachelliah) نے کہا تھا کہ یہ (رول آف لا) کے خاتمہ کا آغاز ہے:

This is the beginning of the end.

بروڈہ یونیورسٹی میں اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر وی این کوٹھاری نے کہا کہ ہندستان کی مسلم کمیونٹی ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو شاید کسی بھی دوسرے ملک کی مسلم کمیونٹی کو درپیش نہیں۔ ماضی میں وہ اس ملک میں ایک حکمراں اقلیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آج وہ ایک ایسی اقلیت ہے جس کو حاکمانہ حیثیت حاصل نہیں۔ مسلم جماعتیں عام طور پر اقتدار کی حیثیت میں رہی ہیں۔ ہندستان میں اس نے یہ حیثیت کھو دی ہے۔ اب اس غیر حاکمانہ حیثیت کو تسلیم کرنا ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے:

The Islamic community in India faces a problem which perhaps Islamic community in no other country faces. It has been in the past a minority community in a ruling position in India. Today it is a minority community without that status. Islamic communities have been either in majority or if in minority, generally in ruling position. In India today, it is in a minority without the status of a ruling class. Acceptance of this status has been difficult for it.

بمبئی کے مسٹر اروند دیشس پانڈے نے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان کے کیمونل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہندستانی ایتھوز کو مانیں اور یہاں کے مذہب، عقائد، روایات اور ہندو ہیروؤں کا احترام کریں۔ اسی طرح ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ قوم کو ذات، زبان، نسل، فرقہ وغیرہ سے اوپر

رکھیں:

Muslims should accept the Indian ethos and respect for the faith, beliefes, heritage and heroes of Hindus.
Hindus must put the nation above caste, language, race, sect, etc.

سیمنار میں ایک صاحب کی تقریر مجھے پسند آئی۔ وہ بڑودہ شہر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

G.N. Devy, Department of English
M.S. University, Baroda 390 002

انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ کانفلٹ بھی پارٹ آف لائف ہے۔ اس دنیا میں کانفلٹ فری سوسائٹی (Conflict-free society) ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں کانفلٹ کے خلاف شکایت کرنے کے بجائے کانفلٹ کے ساتھ جینے کا گر سیکھنا چاہئے

پروفیسر امریک سنگھ نے کہا کہ دو قومی نظریہ کا الزام مسٹر محمد علی جناح پر نہیں جاتا۔ کیونکہ سب سے پہلے لالہ لاجپت رائے نے ۱۹۱۶ میں یہ کہا تھا کہ ہندستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ تاہم یہ بات نہایت عجیب ہے کہ کیوں مسٹر جناح نے اس کی تردید نہیں کی۔ اور اس کے بجائے انھوں نے اسی کو اپنی تحریک کی بنیاد بنالیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑے کی جڑ تاریخی یادیں ہیں۔ مسلمان کے دماغ میں یہ ہے کہ ہم نے ہندستان کے اوپر ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ اور ہندوؤں کے دماغ میں ہے کہ مسلمانوں نے یہاں آکر ہمیں ایک ہزار سال تک غلام بنائے رکھا۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو جھگڑے ہیں ان کو ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ سب کا ہیرو ایک ہو جائے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں پر اسی طرح فخر ہونے لگے جس طرح خود ہندوؤں کو ہے۔ اس کے بغیر یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

ایک سردار جی نے کہا کہ پارٹیشن نے مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں مسلمانوں کی پوزیشن ۲۵ فیصد تھی۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد وہ کم ہو کر ۱۰ فیصد پر آگئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایک وقت آئے گا جب مسلمانوں کو اس کا احساس ہوگا اور اس وقت یہ حال ہوگا کہ جس طرح روس میں لینن کا مجسمہ گرایا گیا

اسی طرح مسٹر جناح بھی مسلمانوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائیں گے۔

سمینار ۵ بجے شام کو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہم لوگ پریانند ساہتیہ سدن کے لئے روانہ ہوئے۔ میرے علاوہ مسٹر بندوق والا، مسٹر مدھو مہتا، مسٹر اروند دیش پانڈے بھی ساتھ تھے۔ راستہ میں ملکی مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔

مسٹر اروند دیش پانڈے نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے جسٹس کھنا نے مسٹر لال کرشن آڈوانی سے کہا تھا کہ "دیکھو آڈوانی، ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ میرے جیسے ہندو کو انڈیا میں رہتے ہوئے شرم آئے"۔ مسٹر پانڈے نے بتایا کہ بھاجپا کے ایک لیڈر سے ان کی ایک گھنٹہ تک بات ہوئی۔ ان کی باتوں کا وہ جواب نہ دے سکے۔ آخر میں مسٹر اروند دیش پانڈے نے ان سے کہا: "آئندہ جب انڈیا کی ہسٹری میں آپ کا نام درج کیا جائے گا تو آپ کے خانہ میں صرف دو کارنامہ لکھا جائے گا۔ ایک یہ کہ مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ دوسرے یہ کہ آپ نے تاریخی بابری مسجد کو ڈھا دیا"۔

پریانند ساہتیہ سدن کے ہال میں میری تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ وسیع ہال پورا کا پورا بھرا ہوا تھا۔ نشست کا انتظام فرش پر کیا گیا تھا۔ اس جلسہ کا اعلان میرے نام کے ساتھ مقامی گجراتی اخبارات میں کر دیا گیا تھا۔ کافی لوگ اس میں شریک ہوئے۔ شرکا میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو مثبت سوچنے والا (Positive thinker) بنایا جائے۔ یعنی وہ انسان جو خلاف مزاج باتوں پر نہ بھڑکے۔ جو ناموافق چیزوں کے درمیان معتدل طور پر رہ سکے۔ حتی کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر دے۔ تفصیلی تقریر میں مختلف مثالوں سے اس حقیقت کو واضح کیا۔

صدر جلسہ ایک مقامی ہندو تھے۔ انھوں نے آخر میں بولتے ہوئے میری تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "جب مولانا صاحب بول رہے تھے تو ایسا معلوم پڑتا تھا جیسے مہان رشی بول رہا ہے"۔

جلسہ کے بعد اسٹیج سے اترا تو مختلف لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے آٹو گراف لیا۔ ادھیڑ عمر کے ایک مسلمان جو ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور جن کے چہرے پر داڑھی بھی تھی،

انھوں نے قریب آکر پوچھا : آپ کا رسالہ ابھی نکل رہا ہے۔ اس عجیب سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ پوچھ رہے ہوں : " آپ کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی۔" مذکورہ بزرگ کی طرف میں نے حیرانی کے ساتھ ایک نظر ڈالی اور پھر ان کو سلام کرکے خاموشی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گیا جو مجھ کو قیام گاہ لے جانے کے لئے وہاں کھڑی ہوئی تھی۔

۱۴ نومبر کی صبح کو نیند کھلی تو باہر پھیلے ہوئے درختوں کی قطاروں سے مختلف چڑیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوا، کوئل اور بلبل وغیرہ۔ صبح کے سہانے میں یہ آوازیں عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ خدا کے باغ میں کوّے کی کائیں کائیں بھی ہے اور بلبل کے چہچہے بھی۔ یہاں کوئل کی کوک بھی ہے اور فاختہ کی غٹرغوں بھی۔ یہ خدا کی تخلیقی اسکیم ہے۔ اب جو لوگ انسانی زندگی میں یکسانی لانے کے لئے اس کے اوپر اپنا کلچرل رولر چلانا چاہتے ہیں وہ خدا کی تخلیقی اسکیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا منصوبہ فطرت کے خلاف ہے، اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب ہونے والی نہیں۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر پروفیسر رشید الدین خاں (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی) کا ساتھ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جواہر لال نہرو کو اقبال کے یہ معنی خیز اشعار بہت پسند تھے، اور وہ اکثر ان کو اپنی تقریروں میں دہرایا کرتے تھے :

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔۔۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔۔۔ صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

انڈین ایکسپریس کے بروڈہ اڈیشن (۱۴ نومبر ۱۹۹۴) میں ایودھیا ورڈکٹ پر مسٹر کلدیپ نائر کا ایک مضمون چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندو یہ دعویٰ کرتے ہیں بابری مسجد کے مقام پر ایک رام مندر تھا، اس کو توڑ کر عین اسی مقام پر مسجد بنائی گئی۔ مسلمان اس دعویٰ کو چیلنج کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسجد بنانے کے لئے مندر کو ڈھایا گیا تھا تو وہ خود اس کو چھوڑ دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون اس کو طے کرے کہ وہاں کون سی عمارت موجود تھی، مندر یا مسجد :

They (Muslims) have gone to the extent of saying that if it is proved that the temple was destroyed to raise the mosque, they would themselves disown it. Who is to decide? Which structure was there initially: temple or mosque?

مسٹر کلدیپ نایر یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھول گئے جو ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کو نئی دھلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں پیش آیا تھا۔ یہاں بابری مسجد اور رام مندر کے سوال پر ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی تھی جس میں خود مسٹر کلدیپ نایر بھی موجود تھے۔ اس میں ہندو سائڈ اور مسلم سائڈ دونوں طرف کے لوگ شریک ہوئے۔ یہ بحث کلیم اور کاونٹر کلیم کی صورت میں دیر تک چلتی رہی۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس طرح کی بحث سے تو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ ثالثی (آربٹریشن) کے اصول پر اس کو حل کیا جائے۔ میں نے کہا کہ تاریخ دانوں کا ایک بورڈ بنا دیا۔ یہ بورڈ تاریخی جائزہ لے کر جس نتیجہ تک پہنچے اس کو دونوں فریق مان لیں۔

اس تجویز سے کلدیپ نایر سمیت، شرکا کی اکثریت نے اتفاق کیا۔ قریب تھا کہ وہ اتفاق رائے سے منظور ہو جائے کہ عین اسی وقت بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر صاحب نے باواز بلند کہنا شروع کیا کہ ہم اس تجویز کو نہیں مانتے۔ اس کے بعد انھوں نے اتنا شور مچایا کہ مزید گفتگو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ مجلس چائے کے لئے اٹھ گئی اور کوئی بات طے نہ ہو سکی۔

میرے کمرہ میں ایک ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا، مگر میں نے اس کو کبھی نہیں کھولا۔ ۱۴ نومبر کی صبح کو روانگی کے وقت تجربہ کے لئے میں نے اس کی سوئچ دبا دی تو اسکرین پر روشن حروف میں ہندی، اردو، انگریزی میں یہ الفاظ لکھ اٹھے:

نمستے جی، خوش آمدید، ہیلو۔

یہ انتظام شاید اس لئے ہوگا کہ آنے والا آدمی جب کمرہ میں داخل ہو کر اس کو کھولے تو وہ نئے آنے والے کو گیسٹ ہاؤس کی طرف سے استقبال کا کلمہ پیش کر سکے۔ مشین نے اپنا کام کیا۔ مگر مشین کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس وقت اسے اپنے مہمان کو الوداع کہنا ہے نہ کہ خوش آمدید۔

مشینی دماغ اور انسانی دماغ کا فرق یہی ہے۔ مشینی دماغ فیڈ کئے ہوئے سبق کو دہراتا ہے، جب کہ انسان خود اپنی سوچ کے تحت اپنا جواب وضع کرتا ہے۔

۱۴ نومبر کو واپسی کا دن تھا۔ صبح چائے سے فارغ ہونے کے بعد میں اور پروفیسر رشید الدین

صاحب ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی بڑودہ کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کہیں امیری کے مناظر تھے اور کہیں غریبی کے مناظر۔ میں نے سوچا کہ آدمی کا حال بڑا عجیب ہے اگر وہ غریب ہو تو پست ہمت ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خوش حال ہو تو گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ امیری میں معتدل رہتا ہے اور نہ غریبی میں۔

راستہ میں پروفیسر رشید الدین صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی معلومات وسیع ہیں اور حافظہ بھی اچھا ہے۔ وہ چالیس سال کا تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ نہایت وضع دار ہیں۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے نکلے تو انھوں نے وہاں کے آدمی کو حسب قاعدہ ٹپ دی۔ اسی طرح ایرپورٹ پہنچے تو یہاں بھی وہ ڈرائیور کو ٹپ دینا نہیں بھولے۔

رشید الدین صاحب ۱۹۷۹ میں پاکستان گئے تھے۔ وہاں کے بارہ میں بہت سے لطیفے سناتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ایک شاعر ہیں۔ ان کا تخلص فارغ ہے۔ ان کا ایک شعر رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ پاکستانی تجربہ کے بعد ہی یہ شعر نکل سکتا ہے:

اب تو یوں لگتا ہے فارغ کہ معاذ اللہ جیسے اسلام یزیدوں کے لئے آیا ہو

انھوں نے دو شعر سنایا جو ان کے الفاظ میں گویا اس ملک میں اردو اور مسلمان دونوں کی کہانی کا خلاصہ ہے۔ ۱۹۰۵ میں داغ دہلوی نے فخر کے ساتھ کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آج کیا حال ہے، اس کا اظہار مجروح سلطانپوری کے ایک شعر سے ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا یہ شعر اردو زبان کی موجودہ حالت کی تصویر ہے:

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

ایک اور شعر انھوں نے شاہد صدیقی کا سنایا۔ وہ حیدر آبادی تھے اور جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں کہا:

مجھے رہبروں سے ہے یہ گلہ کہ انھیں شعور نظر نہ تھا کبھی راستوں میں الجھ گئے کبھی منزلوں سے گزر گئے

اس طرح بات کرتے ہوئے ہم لوگ ایرپورٹ پہنچ گئے۔ بڑودہ سے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۸۱۷ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک ہی پرواز ہے جو دہلی۔ احمد آباد۔ بڑودہ۔ دہلی کے درمیان

روزانہ چلتی ہے۔

راستہ میں انڈین ایرلائنز کی فلائٹ میگزین سواگت (نومبر ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے ہندی حصہ میں پہلا مضمون تھا ـــــ مہان صوفی سنت، حضرت نظام الدین اولیاء۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں جو شخص بھی پرائم منسٹر بنتا ہے، وہ درگاہ نظام الدین جا کر وہاں چادر ضرور چڑھاتا ہے۔ کیوں کہ عام عقیدہ یہ ہے کہ حضرت نظام الدین کی مرضی کے بغیر کوئی شخص دہلی پر حکومت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ سلطان جی کہے جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انھوں نے سب کو ہمیشہ مانو پریم کا سندیش دیا (صفحہ ۲۹)

انگریزی میں ایک مضمون مسٹر ہومی جے وکیل کے قلم سے تھا، اس کی تصویریں مسٹر ڈی بالو نے فراہم کی تھیں۔ اس کا موضوع تھا تلاش امن:

In search of Peace

اس مضمون میں اقوام متحدہ کے ادارۂ امن کے لٹریچر سے ایک جملہ نقل کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ چوں کہ جنگیں لوگوں کے دماغ میں شروع ہوتی ہیں، اس لئے انسانی دماغ ہی سے ہمیں امن قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کرنا چاہئے:

Since wars begin in the minds of men, it is there that we must begin to construct the defences of peace. (p. 12)

پر امن سماج بنانے کا ذریعہ پر امن انسان بنانا ہے۔ جب تک پر امن سوچ والے انسان وجود میں نہ آئیں پر امن سماج کا وجود بھی ممکن نہیں۔

۱۴ نومبر ۱۹۹۴ کی دوپہر کو جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ میں جہاں سے چلا تھا وہیں دوبارہ واپس آگیا۔ یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آتا ہے اور دوبارہ پھر وہ آخرت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ دنیا میں ہماری واپسی پردیس سے گھر کی طرف ہوتی ہے، آخرت میں ہماری واپسی عمل کی دنیا سے انجام کی دنیا کی طرف ہو گی۔

واپسی کے بعد بڑودہ سے چند خطوط ملے۔ مسز الکنندا پٹیل (Tel. 0265-339026) جو سمینار

کی آرگنائزر تھیں۔ ان کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۴ کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں اپنا خط لکھنے کی کوشش کی۔ پہلی سطر میں لکھا "عزیز مولانا صاحب، آداب" اس کے بعد اس طرح انگریزی میں شروع کیا :

Unfortunately, my Urdu writing does not go beyond this. So I will continue in English. It is difficult for me to express how grateful we are that you came for the seminar last Sunday. For all of us it was a special blessing and I would not belittle the experience of hearing you and being with you by trying to thank. Both the Rajiv Gandhi Institute and we in Baroda are very keen that a volume containing a few papers and the proceedings should come out soon. It will be wonderful for us if you write a piece, even a short one. An article from you will mean so much.

۱ حیدر آباد میں تعلیم یافتہ افراد کا ایک فورم پرجنا بھارتی ہے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد کا سفر کیا۔ وہاں ان کے دو خطاب ہوئے (۱) لِونگ وِدھ اسلام اِن انڈیا۔ (۲) مسلم ایجنڈا۔ اس سلسلہ میں ورنگل، بیدر اور رون پرتی کا بھی سفر ہوا اور وہاں بھی عمومی خطابات ہوئے۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ یہ سفر یکم جولائی ۱۹۹۵ کو شروع ہوا اور ۶ جولائی کو واپسی ہوئی۔

۲ مسٹر انیل ساری اور مسٹر ایس این سنہا نے ۷ جولائی ۱۹۹۵ کو انگریزی ہفت روزہ ایشیا ویک کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کے سیاسی فکر سے تھا۔

۳ ارن کول پروڈکشن (نئی دہلی) کی ٹی وی ٹیم نے ۱۱ جولائی ۱۹۹۵ صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اغوا کرنے کا طریقہ اسلام میں جائز نہیں۔ حدیبیہ معاہدہ میں ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکین مکہ کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو واپس نہیں کریں گے۔ لیکن اگر کوئی مشرک مدینہ کے مسلمانوں کو مل جائے تو وہ اس کو واپس کر دیں گے۔ اس دفعہ سے معلوم ہوا کہ فریق ثانی اگر مسلمان کو ہاسٹج بنا رہا ہو تب بھی مسلمان کسی غیر مسلم کو ہاسٹج نہیں بنائیں گے۔

۴ انڈین ٹیلیویژن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۳ جولائی ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کامن سول کوڈ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ کامن سول کوڈ کا نفاذ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔

۵ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر گلشن رائے کھتری نے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مذہب کی بنیاد پر حکومت قائم کرنا اس طرح نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی نہ کسی طرح سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لیں اور اس کے بعد ڈنڈے کے زور پر مذہبی قانون نافذ کرنا شروع کر دیں۔ ایسا کرنے سے مذہبی نظام نہیں آئے گا۔ بلکہ فساد اور تخریب کا نظام آئے گا۔ جو لوگ مذہبی نظام قائم کرنا چاہیں ان کے لئے

نقطۂ آغاز سیاسی اقتدار پر قبضہ نہیں ہے۔ بلکہ عوام کا مزاج بنانا اور سماج سدھارلانا ہے۔

۶ ۱۶ جولائی ۱۹۹۵ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع ساؤتھ ایشیا (انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، مالدیپ، بھوٹان) کے درمیان کوآپریشن کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر ایک تقریر کی اور گفتگو میں حصہ لیا۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ساؤتھ ایشیا کا ایک کنفیڈریشن بننا چاہئے۔

۷ راجیو گاندھی فاؤنڈیشن (نئی دہلی) کے زیر اہتمام ۲۸ جولائی ۱۹۹۵ کو ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: کیمونل وائلنس ان انڈیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ فرقہ وارانہ تشدد کو حکمت اور ضبط وتحمل کے ذریعہ کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

۸ یونی فیکیشن اینڈ ورلڈ پیس کی طرف سے ۳۰ جولائی ۱۹۹۵ کو گاندھی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: ورلڈ پیس تھرو آئیڈیل فیملیز (معیاری خاندانوں کے ذریعہ عالمی امن) اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور قرآن کی آیت خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (الروم ۲۱) کی روشنی میں ایک تقریر کی۔

۹ نئی دنیا (دہلی) کے نمائندہ جناب عقیدت اللہ قاسمی نے ۵ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اس مسئلہ سے تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے علماء نے تقسیم ملک کی مخالفت کیوں کی۔ اور یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تقسیم کا طریقہ مناسب تھا یا نہیں۔

۱۰ نئی دہلی کے انگریزی اخبار آبزرور کے نمائندہ مسٹر سریش نوٹیال نے ۵ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلے سے تھا کہ ہندستان میں نیشنل سوچ اور نیشنل کیرکٹر کی حالت کیا ہے اور اس کو کس طرح ترقی دی جاسکتی ہے۔

۱۱ جھروکا ویڈیو میگزین (گوڑگاؤں) کی ٹیم نے ۶ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا

ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق مسلمانان ہند کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کے مسائل کا سبب کوئی خارجی ظلم یا تعصب نہیں ہے۔ اس کا سبب تمام تر یہ ہے کہ ناقص رہنمائی نے مسلمانوں کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ پیدا نہیں کیا۔ جب کہ تمام مسائل کا واحد حل حقیقت پسندانہ عمل ہے۔

۱۲ آل انڈیا پروہبشن کونسل کی طرف سے ۹ اگست ۱۹۹۵ کو ماؤلنکر ہال (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ یہ شراب بندی کے موضوع پر تھا۔ اس کا عنوان تھا "شراب چھوڑو، دیش جوڑو" اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں شراب کو ام الخبائث کہا گیا ہے۔ یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ ملک کی اصلاح کے لئے شراب کو بند کرنا ضروری ہے۔ شراب کو تمام مذہبوں میں برا بتایا گیا ہے۔ اسلام میں اس کے لئے کڑی سزا مقرر کی گئی ہے۔

۱۳ ہندی روزنامہ جن ستہ (دہلی) کے نمائندہ مسٹر صفدر رنے ۱۶ اگست ۱۹۹۵ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بچنے کی سب سے زیادہ موثر تدبیر یہ ہے کہ جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو باہر کے لیڈروں کو اس میں دخل دینے سے روکا جائے اور مقامی ہندو اور مسلمان آپس میں بات چیت کر کے معاملات کو طے کر لیں۔

۱۴ کرنال (سکندر پور ماجرا) میں ۲۰ اگست ۱۹۹۵ کو "لائبریری اندولن" کے عنوان سے ایک جلسہ ہوا۔ اس کا مقصد گاؤں میں لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کرنا تھا۔ اس کے آرگنائزر شری مول چند جین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مطالعہ اور حصول علم کے موضوع پر تقریر کی۔

۱۵ مسٹر ارن کمار ترپاٹھی نے ۲۴ اگست ۱۹۹۵ کو روزنامہ لوک مت سماچار (ناگپور) کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملک کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ملک کو جس المناک حالات میں آزادی ملی وہ گویا ایک قسم کا قومی ایکسڈنٹ تھا۔ سڑک کے حادثات میں لوگ زخمی ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر انھیں دوبارہ اچھا

کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے پولیٹکل ڈاکٹروں کی ناکامی ہے کہ پچاس سال گزرنے بھی وہ قوم
دوبارہ صحت مند نہ بنا سکے۔

۱۶ یو این آئی (ہندی) کی خاتون نمائندہ انا پورنا جھانے ۲۶ اگست ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے بھی تھا اور ملکی مسائل سے بھی۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندو اور مسلمان عام طور پر مل جل کر ہی رہتے ہیں۔ یہ کچھ اخبار اور کچھ لیڈر ہیں جو نفرت کی باتیں کر کے دوری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر دونوں فرقوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو فطرت ان کی رہنمائی کرے گی۔ اور فطرت کبھی غلط رہنمائی نہیں کرتی۔

۱۷ یورپ کے ایک مسیحی ادارہ کے زیر اہتمام ۳۰ - ۳۱ اگست ۱۹۹۵ کو یروشلم میں ایک انٹرنیشنل مذہبی کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے یروشلم (فلسطین) کا سفر کیا اور وہاں "پالیسی آف پیس اِن اسلام" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۸ حلقۂ الرسالہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں یکم ستمبر - ۳ ستمبر ۹۵ قیام رہا۔ وہاں دیگر پروگراموں کے علاوہ دو گھنٹہ کی ایک تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا: "مسائل ملت کا حل سیرت کی روشنی میں"۔ اس تقریر کی ویڈیو ریکارڈنگ کی گئی۔ یہ ویڈیو کیسٹ مندرجہ ذیل پتہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، ۵۶ تانڈیل اسٹریٹ (نارتھ) ڈونگری، بمبئی ۴۰۰۰۰۹

۱۹ انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز (واردھا) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے وہاں کا سفر کیا۔ اور ۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو ملکی اور غیر ملکی نوجوانوں کے ایک اجتماع سے خطاب۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دو لکچر دئے اور اسلام سے متعلق کثیر تعداد میں سوالات جواب دیا۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں ہوا۔ لکچروں کا عنوان یہ تھا:

1. The Spiritual Goal of Islam
2. Behaviour of a Muslim in his Environment

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
...ہ اول	200/-
...لد دوم	200/-
	45/-
	40/-
...پیلنج	45/-
	50/-
	50/-
	7/-
	50/-
	40/-
	70/-
	25/-
	40/-
	50/-
	40/-
	50/-
...م	70/-
...مز	50/-
	40/-
	45/-
	30/-
	25/-
...خالق	25/-
	35/-
...نغار	85/-
...نا	–
	35/-
	–
	25/-
	95/-
	20/-
	20/-
	7/-
...وجہ	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعہ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتاب زندگی	55/-
انوار حکمت	–
اقوال حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	35/-
عقلیات اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-

نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعدد ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علما اور دور جدید	8/-
سیرت رسول	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوش	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

آڈیو کیسٹ	Rs
حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسول	25/-
میدان عمل	25/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

	Rs
God Arises	95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	-
The Teachings of Islam	-
The Good Life	-
The Garden of Paradise	-
The Fire of Hell	-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	75/-
Islam The Voice of Human Nature	30/-
Islam Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر